کے لیے جیسا کچھ ہوتا ہے۔ نہ غلام ہو اپنے پروردگار کے! وہی تمہارا مرکزِ محبت ہو، وہی تمہارا سہارا ہو، وہی تمہارا مسجود ہو، وہی تمہارا حاکم اور فرماں روا ہو۔ اس کی راہ پر چلو اور دنیا میں اس کی مرضی پوری کرنے کے لیے جان لڑا دو ـــــ خلاصہ یہ کہ وہی ایک تمہارا "سب کچھ" ہو، اور تم بھی صرف اس کے سب کچھ بن جاؤ۔ اور اس بے میل توحید اور مکمل غلامی کی محسوس خارجی علامت کے طور پر صلوٰۃ (نماز) کی دعوت دی گئی، جو ایمانی دعوت کی بنیاد اول ہے، پر انھوں نے مُصلّین کی جماعت میں داخل ہونے سے انکار کیا اور نہ صرف انکار کیا بلکہ اس کے خلاف محاذ بنایا۔ اسی کے ساتھ ان سے کہا گیا تھا کہ یہ پورا معاشرہ سگے بھائیوں کا معاشرہ ہے۔ تمام انسان آپس میں سگے بھائی ہیں، کیونکہ یہ سب ایک ماں (حوا) اور ایک باپ (آدم) کی اولاد ہیں۔ اس لیے انھیں آپس میں دو سگے بھائیوں کی طرح رہنا چاہیے، اور تمہارے سگے بھائیوں میں جو لوگ کمزور رہوں ان کی کمزوری کو دور کرو، جو لوگ بے سہارا ہوں انہیں سہارا دو، جن کی معاشی حالت گر گئی ہو ان کی مدد کرو تاکہ وہ پاؤں پر کھڑے ہو جائیں، جو لوگ بھوک کا شکار ہو جائیں ان کے لیے غذا فراہم کرو، غرض جو جس پہلو سے مدد کا محتاج ہو اس کی مدد کرو ـــــ لیکن انھوں نے اس بنیاد کو بھی نہیں مانا بلکہ اس کا مذاق اڑایا اور اس کی طرف بلانے والوں سے کہا کہ تم لوگ بہت گمراہ کن قسم کی دعوت لے کر اٹھے ہو ـــــ پھر ان کے سامنے یہ حقیقت رکھی گئی کہ جزا و سزا کے دن کا آنا یقینی ہے، جو ان دونوں بنیادوں اور ان کے تقاضوں پر اپنی زندگی کی عمارت اٹھائیں گے وہ دائمی راحت سے ہم کنار ہوں گے اور ان بنیادوں کو جھٹلانے والے دائمی سزا اور کبھی نہ ختم ہونے والے دکھ کا نشانہ بنیں گے، تو انھوں نے یہ کہا کہ بالکل غلط، بالکل جھوٹ، جزا و سزا کے جس دن کی تم خبر دے رہے ہو وہ کبھی نہ آئے گا، تم لوگ جھوٹی بات پیش کر رہے ہو۔

اوپر ہم نے قدرے تفصیل سے انبیائی قرآنی دعوت کا ذکر محض اس لیے کیا ہے کہ اہلِ دوزخ کا جواب اچھی طرح روشنی میں آ جائے اور بعد میں جو آیتیں آ رہی ہیں انھیں بھی اس تفصیل کی روشنی میں سمجھا جا سکے۔

یہ آیتیں صاف صاف بتاتی ہیں کہ اہلِ جنت آپس میں کس موضوع پر بات چیت کریں گے۔ ان کی گفتگو کا موضوع ان کی ایمانی زندگی ہوگی۔ ان کے دل خدائے رحمٰن کی حمد و سپاس کے جذبے سے سرشار ہوں گے کہ اس نے اپنا رسول بھیجا، اپنی کتاب اتاری اور ہمیں ایمانی دعوت پر لبیک کہنے کی توفیق بخشی اور اسی کی توفیق ارزانی سے ہمیں دارالسلام (سلامتی کے گھر) میں جگہ ملی۔ دنیا میں ہم نے ایمان لانے کے بعد یہ اور تکلیف اٹھائی۔ یوں بار بار اقتدار کے غیظ و غضب کا نشانہ بنے، اور ہر ہر گلی کوچہ میں قوم کے سرداروں، اعزا اور رشتہ داروں کے مطعون و ملامت بنے، گھر سے نکالے گئے، زندگی بھر کی کمائی سے یوں ہاتھ دھونا پڑا۔ غرض پوری ایمانی دعوتی زندگی کی

رو دا و ایک دوسرے کو سنائیں گے، اسی اثنا میں انھیں دعوت اسلامی کے مخالفین یاد آجائیں گے اور پوچھیں گے بھائیو! وہ ہمارے مخالفین کہاں ہیں؟ ان کا حشر کیا ہوا وہ تو دوزخ میں پہنچے، چلو ذرا چل کر دیکھیں! چنانچہ وہاں پہنچیں گے، انھیں دیکھیں گے اور پوچھیں گے کن جرائم کی پاداش میں تمہارا یہ حشر ہوا وہ کہیں گے کہ ہم نے توحید کا انکار کیا، ہم نے توحید کی عملی شکل نماز کا انکار کیا، ہم مصلین (نمازیوں) کی جماعت میں شامل نہ ہوئے اور ہم نے دعوت کی دوسری بنیاد مواساۃ و مرحمۃ (ہمدردی و غم خواری) کا انکار کیا، غریبوں کی مدد نہیں کرتے تھے، ہمارے گھر کے کھتے غلہ سے بھرے ہوئے تھے اور ہمارے سگے بھائی، آدم کی اولاد ہماری بستی میں، ہمارے پڑوس میں بھوکے رہتے تھے، بھوکے سوتے تھے، پر ہمارے کھتے کا دہانہ نہیں کھلتا تھا، ہم نے غلہ سے بھرے گودام کے تالے کی کنجی ادھر اُدھر کر دی تھی، لوگ مرتے رہے، غلہ سڑتا رہا، لیکن ہمارا دل ذرا نہیں پسیجا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ خدا کا غصہ ہم پر بھڑکا اور ہم پہنچا دیے گئے جہاں آگ کے کھتے ہیں، آگ کے گودام ہیں اور ہمارے غلہ کا ایک ایک دانہ سانپ اور بچھو بنا ہوا ڈس رہا ہے۔

(۲)

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۝ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝

(سورۂ بلد آیت ۸ تا ۱۶)

کیا ہم نے انسان کو دو آنکھیں نہیں دیں (ہاں دو آنکھیں اس کو ملیں) اور ہم نے اس کو ایک زبان اور دو ہونٹ دیے۔ اور ہم نے اس کو دونوں نمایاں راستے دکھائے، لیکن یہ دشوار گزار گھاٹی میں گھس پڑا اور کیا تم کو پتہ ہے کہ اس گھاٹی کی پوری حقیقت اور ماہیت بتا سکتی ہے؟ وہ ہے غلام کو غلامی کے بندھن سے چھڑانا، وہ ہے شدید قحط اور بھوک کے زمانے میں رشتہ دار یتیموں کو اور فقر و فاقے کے مارے ہوئے مسکینوں کو کھانا کھلانا۔

یہ سورۂ بلد بھی وہی دو بنیادیں پیش کرتی ہے جن کی تھوڑی تفصیل اوپر پیش کی گئی ہے۔ سورہ کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی ذرا سرکشی اور ڈھٹائی دیکھو، یہ پہلے کچھ نہ تھا، پھر ہم نے اس کی پرورش کی، یہ عجز و ناتوانی کا پیکر تھا، بے سہارا، فقر و احتیاج تھا، اس کی ناتوانی، بے بسی اور محتاجی کا یہ عالم تھا کہ بھوک لگے تو کھانا تک نہیں

ماہنامہ

زندگی

رامپور، یوپی

فی پرچہ ۶۰ پیسے   وپئے

سلسلہ سیرۃ النبی صلی علیہ وسلم

دارالمصنفین کے سلسلہ تصنیفات میں سب سے مقبول ترین سلسلہ سیرۃ النبی ہے جس کی چھ جلدیں شائع ہو کر تمام عالم اسلام سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ اس کا بعض ترقی یافتہ زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ مثلاً ترکی و فارسی و تامل زبانوں میں۔

حصہ اول

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات تک ذکر مع مقدمہ۔ قیمت Rs. 9·50 n P.

حصہ دوم

اقامت دین، تاسیس خلافت، تکمیل شریعت، آنحضرت کی وفات اخلاق و عادات کا مفصل بیان " " 7 50 "

حصہ سوم

فضائل نبوت، معجزات، وحی، معراج، نزول ملائکہ وغیرہ کی تفصیل " " 13·25 "

حصہ چہارم

منصب نبوت کی تشریح، آنحضرت کا پیغمبرانہ کام، اسلام اور اس کے عقائد پر مفصل و حکیمانہ بحث " " 13·25 "

حصہ پنجم

حصہ عبادات، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد پر سیر حاصل بحث " " 7·00 "

حصہ ششم

حصہ اخلاق، اسلامی و اخلاقی تعلیمات، فضائل، رذائل اور اسلامی آداب کی تفصیل " " 16·25

— ملنے کا پتہ —

منیجر مکتبہ زندگی و کانشی رامپور۔ یو۔ پی

ماہنامہ

زندگی رامپور

جلد: [illegible] — شمارہ: ۱

شعبان و رمضان [illegible] — جنوری ۱۹۶۵ء

(مدیر: سید احمد قادری)

● خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ — منیجر زندگی رامپور ـ یوپی

● بدل سالانہ: ـ چھ روپیہ — ششماہی: ـ تین روپیہ — فی پرچہ: ـ ۶۰ پیسے

● ـــــ ممالک غیر سے دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

[illegible] ایڈیٹر: سید احمد عروج قادری ـ پرنٹر و پبلشر: احمد حسن ـ مطبع: [illegible] پرنٹنگ پریس [illegible]

مقام اشاعت: دفتر زندگی رامپور

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۵

اشارات

(نومبر ۱۹۶۴ء کے اشارات سے پیوستہ)

سید احمد قادری

خود سورۂ بقرہ کی منقولہ بالا آیتوں میں اور قرآن کی دوسری آیتوں میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ زمین میں انسان کو کس غرض سے خلیفہ بنایا گیا ہے۔ فرشتوں کے اس استفہام پر غور کیجیے جو انھوں نے انسان کی خلافت کے بارے میں کیا تھا۔ انھوں نے اللہ رب العالمین سے سوال کیا:۔

اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا — کیا تو اس میں اس کو خلیفہ مقرر کرے گا جو

وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ — اس میں فساد مچائے اور خوں ریزی کرے۔

غور کیجیے فرشتوں کو انسان کے بارے میں یہ اندیشہ کیوں پیدا ہوا؟ اور انھوں نے انسان کی جس کمزوری اور اس کے جس عیب کا ذکر کیا اس کا تعلق کس چیز سے ہے؟ کیا اس کا تعلق حکومت و سیاست اور انتظام مملکت سے نہیں ہے؟ حکومت نام ہی ہے اس ادارے کا جو ملک کے انتظام کو درست رکھے، اس کو فساد سے بچائے اور باشندگان ملک کی جان و مال کی حفاظت کر کے امن و امان قائم کرے۔ فرشتوں کا شبہ یہ تھا کہ جو مخلوق تیری زمین کے انتظام کو بگاڑ دے گی اور امن و امان کو درہم برہم کرے گی۔ آخر تو اس کے ہاتھ میں عنان حکومت کس مصلحت سے دے رہا ہے۔

فرشتوں کے اس سوال کے تحت اوپر میں نے مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر کا جو اقتباس دیا ہے اس پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔ تفسیر کبیر میں بھی ہمیں فرشتوں کے سوال کی ایک توجیہ ان الفاظ میں ملتی ہے۔

اذا کان معنی الخلیفۃ من یکون — جب خلیفہ کے معنی ہیں وہ شخص جو اللہ کا نائب

نائبًا لله تعالیٰ فی الحکم والقضاء ثم الاحتیاج
الی الحاکم والقاضی انما یکون عند التنازع
والتظالم کان الاخبار عن وجود الخلیفۃ
اخبارًا عن وقوع الفساد والشر بطریق الالتزام (بیضاوی)

ہے حکومت اور فیصلے میں اور حاکم و قاضی کی ضرورت
اس وقت ہوتی ہے جب تنازع اور جور و ظلم
موجود ہو تو وجودِ خلیفہ کی خبر میں التزاماً یہ خبر بھی
موجود تھی کہ فساد اور شر واقع ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر نوعِ انسانی کو اختیارات دے کر حکومت اور لوگوں کے درمیان اقامتِ عدل کے لیے خلافت نہ عطا کی جا رہی ہوتی تو فرشتے یہ سوال ہرگز نہ کرتے ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اختیارات دے کر ایک ایسی مخلوق پیدا ہی کیوں کی جائے جو فساد مچائے اور خون ریزی کرے۔ ایک ایسی مخلوق کو منصبِ خلافت عطا کیے جانے کی حکمت ان کے فہم سے باہر تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو علمِ اسماء عطا کیا اور اس کا مظاہرہ کرا کے فرشتوں کو اپنی حکمت سمجھائی اور انسان کو منصبِ خلافت عطا کیے جانے پر مطمئن کیا۔

"خلیفہ" کا لفظ قرآن میں ایک جگہ اور استعمال ہوا ہے اس پر بھی غور کر لینا چاہیے۔

يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي
الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا
تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللهِ
إِنَّ الَّذِينَ يَضِلُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللهِ
لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا
يَوْمَ الْحِسَابِ ۝ (ص ۲۶)

اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین میں اپنا نائب
بنایا ہے لہٰذا تم لوگوں میں حق و انصاف کے ساتھ حکومت
کرو اور اپنی خواہش کی پیروی نہ کرو ورنہ وہ تمہیں اللہ
کے راستے سے بھٹکا دے گی بے شک جو لوگ اللہ
کے راستے سے بھٹک جاتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب
ہے اس وجہ سے کہ انھوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا

معلوم ہوا کہ انہیں خلافت اسی لیے دی گئی تھی کہ وہ خدا کے اتارے ہوئے قانونِ عدل کے مطابق حکومت کریں اور مقدمات کا فیصلہ سنائیں اور اس معاملے میں اپنی خواہشِ نفس کو ذرہ برابر دخل انداز نہ ہونے دیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو ایک ذرا سی لغزش پر تنبیہ کی گئی تھی جس کا ذکر اس آیت سے پہلے موجود ہے۔

ان تمام دلائل سے یہ بات بلا اشتباہ ثابت ہوتی ہے کہ زمین میں نوعِ انسانی کی تخلیق اور خدا کے فرماں بردار بندوں کی زندگی کا مقصد خدا کے قانون کی پابندی اور دنیا میں اس کی اقامت و تنفیذ ہے۔

منصبِ خلافت کا اہل کون ہے؟

منشائے تخلیق اور حاملِ خلافت ہونے کی جہت سے ہر انسان خدا کا خلیفہ ہے لیکن یہ بات خلافت کی عین حقیقت میں داخل ہے کہ انسان خدا کے دیے ہوئے اختیارات کو اس کی مرضیات کے مطابق استعمال کرے وہ اپنے مالک کے احکام کا خود پابند ہو اور دوسروں

بلند بنائے ورنہ وہ خلافت کی بلندی سے لڑھک کر بغاوت کی کھڈ میں جا گرے گا۔ مولانا امین احسن اصلاحی خلافت کے تقاضے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

چوتھا یہ کہ عین منصب خلافت کی فطرت کا تقاضا ہے کہ یہ منصب صفات کے ساتھ مشروط ہو غیر مشروط نہ ہو یعنی منشائے خلقت کے لحاظ سے تو یہ منصب تمام بنی نوع انسان کے لیے عام ہے۔ ہر انسان خدا کا خلیفہ ہے لیکن اس منصب کی فطرت کا تقاضا ہے کہ اس کے جائز حقدار وہی ہوں جو خدا کی خلافت کے حق کو اس کی وفاداری کے ساتھ ادا کریں جو اس حق کو ادا نہ کریں وہ خدا کے خلیفہ نہیں بلکہ اس کے باغی اور غدار ہیں۔

(میثاق ج ۲ عدد ۶)

جب مومنین صالحین ہی خلافت الٰہی کے مستحق ہیں تو ان کے منصب کا یہ عین تقاضا ہے کہ وہ دوسرے گرے ہوئے انسانوں کو بغاوت کی پستی سے اٹھا کر خلافت کی بلندی تک پہنچانے کی سعی کریں۔ آج دنیا میں انسانوں کی اکثریت خدا کی بغاوت پر کمربستہ ہے اور منصب خلافت اپنے مستحقین کو آواز پر آواز دے رہا ہے کہ وہ اس بغاوت کو اطاعت سے بدلنے کے لیے کمربستہ ہو جائیں ورنہ وہ کار خلافت کی انجام دہی میں ناکام ہو جائیں گے

نظریہ خلافت پر مبنی ایک نظام کی ضرورت

اوپر کی تفصیل سے یہ بات خود ظاہر ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرماں بردار بندوں کو جو خدمت سپرد کی ہے وہ ایک ایسے اجتماعی نظام کی متقاضی ہے جس کی بنیاد نیابت الٰہی کے نظریے پر رکھی گئی ہو جب تک ایک ایسا صالح اور طاقت ور نظام وجود میں نہیں آجاتا۔ یہ خدمت پوری طرح انجام نہیں دی جا سکتی۔ خدا کی بغاوت اور خواہش نفس پر مبنی نظام کی ماتحتی میں کار خلافت کی تکمیل ایک ایسا خیال ہے جس کو خیال خام ہی کہا جا سکتا ہے مولانا امین احسن اصلاحی تحریر فرماتے ہیں:۔

"پانچواں یہ کہ یہ منصب اپنے مزاج کے لحاظ سے صرف ایک انفرادی منصب نہیں ہے بلکہ ایک اجتماعی اور سیاسی منصب بھی ہے۔ تمام انسانوں کو یا کم از کم ان سارے لوگوں کو جو اس منصب کی ذمہ داریوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ انفرادی طور پر بھی اس منصب کے فرائض پورے کرنے ہیں اور اجتماعی طور پر بھی اس کے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے ایک نظام قائم کرنا ہے کیونکہ اس نظام کے بغیر اس کے مقاصد پورے نہیں ہو سکتے"

(ماہنامہ میثاق جلد ۲)

ایک شبہے کا جواب

اگر کسی کو شبہہ ہو کہ جب تفسیر کی کتابوں میں انسان کو اس معنی میں بھی خلیفہ کہا گیا ہے

پیش رَو مخلوق جنات کا جانشین ہے تو پھر اس کو خدا کا خلیفہ قرار دینا متیقن کہاں باقی رہتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جنات کی جانشینی کا قول بہت ضعیف ہے اور اس کی کوئی قوی دلیل موجود نہیں ہے۔

قرآن میں متعدد مقامات پر تخلیق آدم کا واقعہ منقول ہے لیکن اس بات کا کہیں اشارہ بھی موجود نہیں ہے کہ ان کو جنوں کی جگہ لینے کے لیے پیدا کیا جا رہا ہے ان مقامات کے علاوہ بھی کہیں اس بات کی طرف اشارہ [illegible] جاتا کہ اس زمین پر پہلے جنات کی حکمرانی تھی اور ان کو بھگا کر ان کی جگہ پر انسان کو آباد کیا گیا ہے۔ اس قول کی تائید میں کوئی صحیح حدیث بھی نہیں عقل و درایت کے لحاظ سے بھی یہ قول کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ اس کے برخلاف انسان کے خلیفۃ اللہ ہونے کا قول قوی دلائل سے مدلل ہے اور قرآن میں اس کے واضح اشارات موجود ہیں بلکہ بقول مولانا امین اصلاحی:۔

"انسان کی حیثیت اس دنیا میں خدا کے خلیفہ اور نائب کی ہے۔ یہ بات قرآن مجید کے الفاظ میں نہایت واضح طور پر کہی گئی ہے"۔

یہی وجہ ہے کہ کسی ایک معتمد مفسر قرآن اور عالم دین نے بھی اپنی کسی کتاب میں جنات کی جانشینی کے قول کو ترجیح نہیں دی ہے بلکہ عام طور سے مفسرین کرام اور علمائے امت نے حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفۃ اللہ ہی قرار دیا ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے اب یہ بات علمائے امت کے درمیان تسلیم شدہ ہے۔ اس کی ایک اور مضبوط دلیل یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے لیے — جس کے سربراہ اور کارندے اللہ کے تشریعی قوانین کی تنفیذ میں محض اس کے نائب کی حیثیت رکھتے ہیں — نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت ہی کا لفظ اختیار فرمایا ہے اور خلافت راشدہ صحیح اور معیاری اسلامی حکومت کے لیے بلند ترین آئیڈیل بن گئی ہے اور یہ ہم سب کو معلوم ہے کہ خلافت راشدہ کا تصور خدا کی نیابتی حکومت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ لفظ قرآن ہی کے الفاظ کو سامنے رکھ کر استعمال فرمایا ہے۔ پھر اللہ نے بنی آدم کو اپنی دوسری مخلوقات کے مقابلے میں جو کرامت، عزت اور شرف عطا فرمایا ہے اس کے لحاظ سے دیکھیے جب بھی جنات کی جانشینی کا قول بہت ہی پست محسوس ہوتا ہے۔ حضرت آدم کو اللہ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا، ان کے کالبد میں اپنی روح پھونکی، ان کے سامنے فرشتوں کو جھکایا، ان کو اپنی صفت جمال و جلال کا مظہر بنایا، ان کے لیے تمام کائنات کو مسخر کیا، ان کی ذریت میں برگزیدہ انبیاء پیدا ہوئے اور انہیں کی ذریت میں [illegible] محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جو درجہ بخشا گیا جو بلا اختلاف خدا کی تمام مخلوقات سے افضل، اکرم، برتر اور اشرف ہیں ملائکہ [illegible] خلیفۃ الجن قرار دینا کس قدر ہلکی اور بے وزن بات معلوم ہوتی ہے۔ ان تمام

جنات کے باوجود اگر کوئی شخص انسان کو جنات کا جانشین سمجھتا ہے تو اس کو اختیار حاصل ہے۔ میں نے اس موضوع پر مستقلاً تفصیل سے لکھنے کی ضرورت اس لیے محسوس نہیں کی کہ میں نے اوپر جو کچھ ثابت کیا ہے اس میں انسان کو جنات کا جانشین مان لینے سے کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا۔ اگر بالفرض یہ بات مان بھی لی جائے کہ انسان جنات کا جانشین ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس مقصد سے اس زمین پر آباد کیے گئے تھے اور ان کی حیثیت اس زمین میں کیا تھی؟ اور ان کا وہ جرم کیا تھا جس کی پاداش میں فرشتوں کی فوج بھیج کر انہیں منتشر کیا گیا اور ان کی جگہ لینے کے لیے انسانوں کی ایک نئی مخلوق پیدا کی گئی۔ کیا ان پر اللہ نے یہ ذمہ داری عائد نہیں کی تھی کہ وہ زمین میں اس کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کریں اور اس کا انتظام اس کی مرضیات کے تحت چلائیں ظاہر ہے کہ کوئی صاحب عقل اس سوال کا جواب نفی میں نہیں دے سکتا تو پھر انسان کو جنات کا جانشین قرار دینے سے اصل بات پر کیا اثر پڑے گا اور اس میں کیا فرق واقع ہو جائے گا؟ بس فرق یہ واقع ہوگا کہ پہلے یہ ذمہ داری جنات کے سپرد کی گئی تھی اور اب انسان کے سپرد کر دی گئی ہے۔

انسان کے منصب خلافت کی اس تفصیل کو سامنے رکھ کر اب ہمیں قرآن کی ایک آیت وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝ پر غور کر لینا چاہیے کیونکہ سورۂ ذاریات کی اس آیت کا ایک بہت ہی محدود اور ناقص مفہوم کچھ لوگوں نے سمجھ رکھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس آیت میں عبادت کے معنی صرف پرستش ہیں۔ الٹی صرف پرستش ہی وہ چیز ہے جس کے لیے جن وانس کی تخلیق کی گئی ہے۔ اس غلط خیال نے چونکہ دین اسلام کے مفہوم کو محدود اور ناقص بنا کر رکھ دیا ہے اس لیے اس پر غور کر لینا بہت ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا خالق اور مالک ہے۔ یہاں جو چیز بھی موجود ہے سب اس کی مملوک ہے اور یہ بات بھی قرآنی نصوص سے معلوم ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں اپنے مالک کی عبادت و تسبیح میں مشغول ہیں۔ انسان بھی خدا کا بندہ اور اس کا غلام ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے اپنے اس با اختیار (جو حیوانات و جمادات کی طرح مجبور نہیں ہے) بندے کو کس قسم کی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے اور وہ کون سی عبادت ہے جس کا یہ مکلف بنایا گیا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں اعلان کر دیا ہے کہ میں نے جن وانس کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ انبیاء کرام بھی لوگوں کو اللہ کی عبادت ہی کی طرف بلانے کے لیے مبعوث ہوتے رہے ہیں اس لیے بہت ضروری ہے کہ ہم اس "عبادت" سے واقف ہوں جس کے لیے ہمیں پیدا کیا گیا ہے۔ اس پر ہماری نجات و فلاح موقوف ہے۔ لغت، قرآن اور احادیث میں "عبادت" کے ایک معنی پرستش کے بھی آئے ہیں اس لیے

اس آیت میں "عبادت" کا مفہوم متعین کرنے کے لیے ایک طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے اس کو پرستش کے معنی میں لے لیا جائے اور اپنی زندگی کو مختلف خانوں میں تقسیم کر کے اس کا صرف ایک خانہ اللہ کی پرستش کے لیے وقف کر دیا جائے اور پورے اطمینان کے ساتھ یہ سمجھ لیا جائے کہ ہم نے اپنے مقصدِ تخلیق کو پورا کر دیا اور ہم خدا کی نعمتوں، برکتوں، رحمتوں، خوشنودیوں اور اس کی جنتوں کے مستحق بن گئے۔ یہ طریقہ آسان تو بہت ہے لیکن صحیح بالکل نہیں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ تمام لغوی معانی، قرآن کی متعلقہ آیات، مسئلے سے متعلق احادیث اور شریعت کے تمام واجب التعمیل احکام کو سامنے رکھ کر "عبادت" کا مفہوم متعین کیا جائے۔ ورنہ ہم اپنے آپ کو ایک بہت بڑے خطرے میں مبتلا کر لیں گے۔ ہمارے عام دینی لٹریچر میں بھی اور جماعت اسلامی کے لٹریچر میں بھی اس اہم موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور قرآن کی آیات سے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ ہم سے جس عبادت کا مطالبہ کیا گیا ہے اور جس عبادت کے لیے ہم پیدا کیے گئے ہیں وہ صرف پرستش نہیں ہے۔ لغت اور قرآن کے نصوص پیش کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ عبادت کے معنی صرف پرستش نہیں ہیں۔ میں یہاں ان تمام دلائل کو دہرانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ میں چند دوسرے پہلو ذرا تفصیل سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اگر اس آیت میں عبادت کے معنی صرف پرستش لیے جائیں تو نہ صرف یہ کہ قرآن کی متعدد آیات سے اس کا تصادم ہوگا بلکہ فی الواقع پورے قرآن سے یہ مفہوم ٹکرا جائے گا۔ میں یہاں چند آیتیں پیش کرتا ہوں۔

(۱) اگر صرف سورہ بقرہ کی ان آیتوں کو سامنے رکھ لیا جائے جن میں انسان کی تخلیق سے متعلق سرگزشت بیان کی گئی ہے اور جس کی تفصیل گزشتہ قسطوں میں گزر چکی تو یہ سمجھنا دشوار نہیں ہے کہ سورۂ ذاریات کی اس آیت میں "عبادت" کو صرف پرستش کے معنی میں لینا کسی طرح صحیح نہیں ہے ورنہ آیت خلافت اور آیت عبادت میں ناقابل حل تضاد اور تناقض پیدا ہو جائے گا۔ یہ بات پہلے مدلل طور پر لکھی گئی ہے کہ انسان کو دنیا میں اللہ کا خلیفہ بنا کر بھیجا گیا ہے اور یہ بھی واضح کیا جا چکا ہے کہ یہ نیابت الٰہی کس چیز میں ہے اس لیے انسان کے ذمے جو "عبادت" کی گئی ہے وہ صرف پرستش کبھی نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے ساتھ زندگی کے ہر معاملے میں خواہ اس کا تعلق انفرادی زندگی سے ہو یا اجتماعی زندگی سے، اللہ کی کامل اطاعت بھی ضروری ہے۔ انسان کے ذمے جو عبادت کی گئی ہے وہ پرستش اور اطاعت و بندگی کا مجموعہ ہے صرف پرستش نہیں۔

(۲) سورۂ احزاب کے اخیر رکوع آیت (۷۲) میں اللہ نے ذکر فرمایا ہے کہ اس نے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے "امانت" پیش کی لیکن ان سب نے اس کو قبول کرنے سے انکار کیا اور خوف زدہ ہو گئے لیکن انسان نے وہ

بارِ امانت اٹھالیا۔

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید — قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

سوال یہ ہے کہ وہ کون سی امانت تھی جسے قبول کرنے سے آسمان، زمین اور پہاڑ تھرا گئے اور انسان نے اسے قبول کرلیا؟ کیا صرف اللہ کی پرستش؟ ظاہر ہے کہ یہ جواب صحیح نہیں۔ اس لیے کہ جہاں تک اللہ کی تسبیح و تقدیس اور اس کی پرستش کا تعلق ہے۔ آسمان، زمین، پہاڑ بلکہ پوری کائنات اس کام میں اپنے یوم پیدائش سے لگی ہوئی ہے اور لگی رہے گی ——— قرآن کہتا ہے:-

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ
وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ

ہر شے اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کر رہی ہے لیکن تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں۔

ایک دوسری جگہ کہا:-

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ (الحج ر۲)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ کو سجدہ کرتے ہیں وہ سب جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، جانور اور بہت سے انسان۔

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:-

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِیْحَهٗ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ بِمَا یَفْعَلُوْنَ ۝ (النور ر۶)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ کو یاد کر رہے ہیں وہ سب جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں اور پرندے پر کھولے ہوئے۔ ہر ایک کو اپنی عبادت اور تسبیح کا طریقہ معلوم ہے۔ اور جو کچھ وہ کرتے ہے اللہ اسے جانتا ہے۔

یہ تین آیتیں بھی یہ جاننے کے لیے کافی ہیں کہ کائنات کی ہر شے اللہ کی پرستش میں مشغول ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ سب کے سب اس کے اطاعت گزار اور فرماں بردار بھی ہیں۔ سورۂ بقرہ میں ہے:-

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ

اور وہ کہتے ہیں کہ اللہ کا کوئی لڑکا ہے۔ اس کی ذات ان باتوں سے پاک ہے۔ بلکہ حقیقت

(باقی صفحہ ۱۵ پر ملاحظہ ہو)

تذکیر القرآن

(مولانا جلیل احسن ندوی، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج ضلع اعظم گڈھ)

مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ۝	کس چیز نے تم کو یہاں جہنم میں پہنچایا؟ وہ
قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۝	جواب دیں گے، ہم (دنیا میں) نماز نہیں پڑھتے
وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۝	تھے، ہم مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، ہم خدا کی
وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَائِضِيْنَ ۝	بھیجی ہوئی تعلیمات پر اعتراض اور شکوک و شبہات
وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ	وارد کرتے تھے اور ہم حساب و جزا کے دن کو جھٹلاتے
الدِّيْنِ ۝ حَتّٰى أَتَانَا	تھے۔ یہاں تک کہ مرنے کے بعد اور یہاں عالم آخرت
الْيَقِيْنُ ۝	میں پہنچنے کے بعد آنکھوں سے دیکھ لیا کہ پیغمبر ٹھیک کہتے
(مدثر، آیۃ ۴۲ تا ۴۷)	تھے اور کتاب[1] یقینی بات پیش کرتی تھی۔

سورۂ مدثر کا یہ مکالمہ جو یہاں درج ہوا ہے اس کا تعلق عالم آخرت سے ہے اور یہ سوال و جواب اہل جنت اور اہل دوزخ کے درمیان میں ہوگا۔ ان آیتوں سے ذرا اوپر یہ مضمون بیان ہو رہا ہے کہ اہل جنت جب جنت میں پہنچ جائیں گے تو بیٹھ کر آپس میں باتیں کریں گے، گفتگو کے درمیان انھیں وہ لوگ یاد آجائیں گے جنھوں نے ایمان لانے کے جرم میں انھیں ستایا تھا، جنھوں نے خدائی تعلیمات کا، اس کی بھیجی ہوئی کتاب کا مذاق اڑایا تھا، جنھوں نے لایعنی اعتراضات کیے تھے، جنھوں نے دعوت اسلامی کا راستہ روکنے کے لیے ہزاروں بے معنی شکوک و شبہات کے طوفان اٹھائے تھے، ان کو توحید کی دعوت دی گئی، ان سے کہا گیا کہ اپنے رب کے بندے بنو، اس کی بندگی میں کسی اور کو ساجھی نہ بناؤ کیونکہ تمہاری ربوبیت میں کسی اور کا کچھ بھی ساجھا نہیں ہے۔ ایک وفادار غلام اپنے بہترین آقا

[1] عام طور سے مفسرین نے اس آیت میں "الیقین" کی تفسیر موت سے کی ہے (ادارہ)

وہی تمہارا مرکزِ محبت ہو، وہی تمہارا سہارا ہو، وہی کے لیے جیسا کچھ ہوتا ہے، ویسے غلام ہوا کرتے ہیں پروردگار کے۔ تمہارا مسجود ہو، وہی تمہارا حاکم اور فرماں روا ہو، اسی کی راہ پر چلو اور دنیا میں اس کی مرضی پوری کرنے کے لیے جان لڑا دو ــــــ خلاصہ یہ کہ وہی ایک تمہارا "سب کچھ" ہو، اور تم بھی صرف اس کے سب کچھ بن جاؤ۔ اور اس بے میل توحید اور مکمل غلامی کی محسوس خارجی علامت کے طور پر صلوٰۃ (نماز) کی دعوت دی گئی، جو انبیائی دعوت کی بنیاد اول ہے، پر انھوں نے مصلّین کی جماعت میں داخل ہونے سے انکار کیا اور نہ صرف انکار کیا بلکہ اس کے خلاف محاذ بنایا۔ ان کے سامنے ان سے کہا گیا تھا کہ یہ پورا معاشرہ سگے بھائیوں کا معاشرہ ہے۔ تمام انسان آپس میں سگے بھائی ہیں کہ یہ سب ایک ماں (حوّا) اور ایک باپ (آدم) کی اولاد ہیں۔ اس لیے انھیں آپس میں دو سگے بھائیوں کی طرح رہنا چاہیے، اور تمہارے سگے بھائیوں میں جو لوگ کمزور ہوں ان کی کمزوری کو دور کرو، جو لوگ بے سہارا ہوں انہیں سہارا دو، جن کی معاشی حالت گر گئی ہو ان کی مدد کرو تاکہ وہ پاؤں پر کھڑے ہو جائیں جو لوگ بھوک کا شکار ہو جائیں ان کے لیے غذا فراہم کرو۔ غرض جو جس پہلو سے مدد کا محتاج ہو اس کی مدد کرو ــــــ لیکن انھوں نے اس بنیاد کو بھی نہیں مانا بلکہ اس کا مذاق اڑایا اور اس کی طرف بلانے والوں سے کہا کہ تم لوگ بہت گمراہ کن قسم کی دعوت لے کر اٹھے ہو۔ پھر ان کے سامنے یہ حقیقت رکھی گئی کہ جزا و سزا کے دن کا آنا یقینی ہے، جو ان دونوں بنیادوں اور ان کے تقاضوں پر اپنی زندگی کی عمارت اٹھائیں گے وہ دائمی راحت سے ہم کنار ہوں گے اور ان بنیادوں کو جھٹلانے والے دائمی سزا اور کبھی نہ ختم ہونے والے دکھ کا نشانہ بنیں گے، تو انھوں نے یہ کہا کہ بالکل غلط، بالکل جھوٹ، جزا و سزا کے جس دن کی تم خبر دے رہے ہو وہ کبھی نہ آئے گا تم لوگ جھوٹی بات پیش کر رہے ہو۔

اوپر ہم نے قدرے تفصیل سے انبیائی قرآنی دعوت کا ذکر محض اس لیے کیا ہے کہ اہلِ دوزخ کا جواب اچھی طرح روشنی میں آ جائے اور بعد میں جو آیتیں آ رہی ہیں انھیں بھی اس تفصیل کی روشنی میں سمجھا جا سکے۔

یہ آیتیں صاف صاف بتاتی ہیں کہ اہلِ جنت آپس میں کس موضوع پر بات چیت کریں گے ان کی گفتگو کا موضوع ان کی ایمانی زندگی ہوگی، ان کے دل خدائے رحمٰن کی حمد و سپاس کے جذبے سے سرشار ہوں گے کہ اس نے اپنا رسول بھیجا، اپنی کتاب اتاری اور ہمیں ایمانی دعوت پر لبیک کہنے کی توفیق بخشی اور اسی کی توفیق ارزانی سے ہمیں دارالسلام (سلامتی کے گھر) میں جگہ ملی۔ دنیا میں ہم نے ایمان لانے کے بعد بڑی تکلیف اٹھائی۔ یوں ارباب اقتدار کے غیظ و غضب کا نشانہ بنے، اور رہبر رہزن ہر گلی کوچہ میں قوم کے سرداروں، اعزا اور رشتہ داروں کے ہدفِ ملامت بنے، گھر سے نکالے گئے، زندگی بھر کی کمائی سے یوں ہاتھ دھونا پڑا۔ غرض پوری ایمانی دعوتی زندگی کی

روداد ایک دوسرے کو سنائیں گے۔ اسی اثنار میں انھیں دعوت اسلامی کے مخالفین یاد آجائیں گے اور پوچھیں گے بھائیو! وہ ہمارے مخالفین کہاں ہیں؟ ان کا حشر کیا ہوا وہ تو دوزخ میں پہنچے! چلو ذرا چل کر دیکھیں! چنانچہ وہاں پہنچیں گے، انھیں دیکھیں گے اور پوچھیں گے کن جرائم کی پاداش میں تمہارا یہ حشر ہوا وہ کہیں گے کہ ہم نے توحید کا انکار کیا، ہم نے توحید کی عملی شکل نماز کا انکار کیا، ہم مصلین (نمازیوں) کی جماعت میں شامل نہ ہوئے، اور ہم نے دعوت کی دوسری بنیاد مواساۃ و مرحمۃ (ہمدردی و غمخواری) کا انکار کیا، غریبوں کی مدد نہیں کرتے تھے، ہمارے گھر کے کھتے غلہ سے بھرے ہوئے تھے اور ہمارے سگے بھائی، آدم کی اولاد ہماری بستی میں، ہمارے پڑوس میں بھوکے رہتے تھے، بھوکے سوتے تھے، پر ہمارے کھتے کا دہانہ نہیں کھلتا تھا، ہم نے غلہ سے بھرے گودام کے تالے کی کنجی ادھر اُدھر کردی تھی، لوگ مرتے رہے، غلہ سڑتا رہا، لیکن ہمارا دل ذرا نہیں پسیجا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ خدا کا غصہ ہم پر بھڑکا اور ہم پہنچا دیے گئے جہاں آگ کے کھتے ہیں، آگ کے گودام ہیں اور ہمارے غلہ کا ایک ایک دانہ سانپ اور بچھو بنا ہوا ڈس رہا ہے۔

(۲)

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝	کیا ہم نے انسان کو دو آنکھیں نہیں دیں
وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۝ وَ	(ہاں دو آنکھیں اس کو دیں) اور ہم نے اس کو
هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝ فَلَا	ایک زبان اور دو ہونٹ دیے۔ اور ہم نے اس کو
اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ	دو اونچے راستے دکھائے، لیکن یہ دشوار گزار گھاٹی
مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝	میں نہیں چلا اور کون سی چیز ہے جو اس گھاٹی کی پوری
اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ	حقیقت اور اہمیت بتا سکتی ہے؟ وہ ہے غلاموں
يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِيْنًا	کو غلامی کے بندھن سے چھڑانا، وہ ہے شدید قحط
ذَا مَتْرَبَةٍ ۝	اور بھوک کے زمانے میں رشتہ دار یتیموں کو اور
(سورۂ بلد آیت ۸ تا ۱۶)	فقر و فاقے کے مارے ہوئے مسکینوں کو کھانا کھلانا

یہ سورۂ بلد بھی وہی دو بنیادیں پیش کرتی ہے جن کی تھوڑی تفصیل اوپر پیش کی گئی ہے۔ سورہ کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی ذرا سرکشی اور ڈھٹائی دیکھو، یہ پہلے کچھ نہ تھا پھر ہم نے اس کی پرورش کی یہ عجز و ناتوانی کا پیکر تھا، یہ سراپا فقر و احتیاج تھا، اس کی ناتوانی، بے بسی اور محتاجی کا یہ عالم تھا کہ بھوک لگے تو کھانا تک نہیں

مانگ سکتا تھا، غذا اور پانی کا محتاج، لیٹنے اور سونے میں محتاج، ہر چیز کا محتاج تو ہم نے اس کے لیے ماں کی گود مہیا کی، اس کے لیے دودھ اتارا، اس کے لیے ایک پورے خاندان کو خدمت گار بنایا اور اس طرح ہم اس کو پالتے رہے، اس کی جسمانی اور فکری قوتوں کو بڑھاتے رہے، اس کی لاچاری اور بے بسی دور کرتے رہے یہاں تک کہ اس کو پال کر بچہ سے بڑا کیا، جوان بنایا، فکری اور جسمانی قوتوں کو حد کمال پر پہنچایا، اس کو دو آنکھیں دیں، اس کو بولنے کی قوت بخشی، اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے نوازا، پھر اس سے ہم نے کہا تم کو دو بلندیوں پر چڑھنا ہے۔ ان دونوں دشوار راستوں پہ چلے بغیر اور گھاٹی کو پار کیے بغیر تم ہم تک نہیں پہنچ سکتے، سعادت اور کامیابی سے ہم کنار ہونا ہے تو اس گھاٹی کو پار کرنا ناگزیر ہے۔ ان میں سے پہلا راستہ یہ ہے کہ اپنے محسن کو پہچانو، اپنے پالنے والے سے محبت کرو، اس کے شکر گزار بنو، اسی کے آگے جھکو اور گرو، اسی کی مرضی پوری کرو اس کی مرضی پوری کرنے کے لیے اپنی جان لڑا دو جیسا کہ وفا شعار غلامی کا تقاضا ہے۔ اور دوسرا مشکل راستہ جس پر چلنا ہے یہ ہے کہ اپنے سگے بھائیوں کے ساتھ بالخصوص دبے اور پسے ہوئے بھائیوں کے ساتھ غم خواری اور ہمدردی کرو۔ اگر کچھ لوگوں کی گردنوں میں غلامی کا پھندا پڑا ہوا ہے تو ان بندھنوں کو کاٹو کیونکہ غلامی صرف ایک ہی کی روا ہے، رب العلمین کی غلامی اور یہی ایک غلامی صحیح اور قانونی غلامی ہے۔ باقی سب غیر قانونی ہیں اسی طرح اگر دنیا فساد سے بھر جائے، خدا سے بغاوت کے نتیجے میں، اجتماعی نظام کے سارے شعبوں میں خرابی پھیل جائے اور لوگ خود غرضی، رشوت خوری کو، غلہ کے گوداموں کو اور سونے چاندی کے ڈھیروں کو اپنا معبود بنالیں اور لوگ شدید بھوک کا شکار ہونے لگیں تو ایسے وقت میں تم اپنی جیب کھول دو، غلہ سے بھری ہوئی بوریوں کا منہ کھول دو اور اپنے دل کا تالا توڑ کر پھینک دو، اپنے یتیم رشتہ داروں کو، غریبوں کو بھوک سے تڑپنے والوں کو غلہ دو، کھانا پکا کر کھلاؤ — یہ ہے دوسرا راستہ جو اگرچہ مشکل راستہ ہے لیکن اس پہ چلے بغیر گھاٹی کو پار کیسے کرو گے، اور ہم تک کیسے پہنچو گے، کیسے ہماری خوشنودی حاصل کر سکو گے، پس جنھیں اپنے رب سے ملنے کا یقین ہے جنھیں مالک کے حضور پیشی کا ڈر ہے، جو ان دونوں بنیادوں پر مبنی زندگی گزاریں گے وہی سعادت اور کامیابی سے ہم کنار ہوں گے، وہی انعام پانے والے ہیں، انھیں کے ہاتھ میں کامیابی کا کاغذ دیا جائے گا۔ (أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ) اور جنھوں نے ان راستوں پر چلنے کی ہمت نہیں کی۔ وہ گھاٹی کو پار نہ کر سکیں گے اور کامیابی کی منزل پر نہ پہنچ سکیں گے، ان کا شمار خدا کے منحوس بندوں میں ہوگا اور نحوست و بدبختی کا کاغذ انہیں تھمایا جائے گا۔ (اولئک اصحاب المشئمۃ) ان کے اوپر جہنم کی آگ بھڑکی

اور جہنم کا منہ بند ہوگا سخت آنچ اور دائمی دکھ!

(۳)

وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ۝ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ ۝ وَمَا لِأَحَدٍ عِندَهُ مِن نِّعْمَةٍ تُجْزَىٰ ۝ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ ۝ وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ ۝

(سورہ لیل ۱۷ تا ۲۱)

یقیناً جہنم سے دور رکھا جائے گا وہ بندہ جس نے بہت زیادہ تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کی جو اپنا مال خدا کی راہ میں دیتا رہا، نفس کی گندگیوں سے پاک ہونے کے لیے اور ایمان کو بڑھانے کے لیے۔ اس کے ذمے کسی (غریب محتاج) کا احسان نہ تھا کہ اس کا بدلا اتارنا مقصود ہو، وہ تو صرف اس لیے غریبوں کو دیتا ہے کہ اس کا ربِّ برتر اس سے خوش ہو، اس کی نظرِ رحمت اس کی طرف متوجہ ہو (تو ایسے بندے کو خوشخبری ہو کہ) وہ عنقریب ہماری طرف سے اتنا انعام پائے گا کہ نہال ہو جائے گا۔

(۴)

يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ۝ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۝ إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ۝ فَوَقَاهُمُ اللَّهُ شَرَّ ذَٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا ۝

یہ خدا کے وفاشعار بندے بندگیِ رب کی نذر جب دل سے مانی ہے اسے بہ تمام و کمال پورا کر رہے ہیں اور ان کو ڈر لگا ہوا ہے ایک سخت و شدید دن کا، اور یہ لوگ فقر و احتیاج کے باوجود مسکینوں کو، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں، وہ اپنی زبانِ حال سے کہتے ہیں کہ یہ جو ہم تمہیں کھلا رہے ہیں محض اس لیے کھلا رہے ہیں کہ ہمارا رب ہم سے خوش ہو۔ ہم تم پر احسان نہیں کر رہے ہیں کہ تم اس کا بدلہ کبھی چکاؤ، یا احسان مانو ہمیں تو ڈر لگا ہوا ہے ایک ہولناک بھیانک دن کا جس کا آنا ہمارے رب کی طرف سے یقینی ہے۔ چنانچہ اللہ نے ان کو اس دن کے برے انجام سے بچا لیا اور ان کو شادابیِ چہرہ

(سورۂ دہر آیۃ ۷ تا ۱۱) اور سرور سے شاد کام کیا۔

یعنی شکر گزار، پرستار حق اور وفا شعار بندے خدا کے حق بندگی کا پورا حق ادا کر رہے ہیں اور سوسائٹی کے تمام بے سہارا، محتاج اور گرفتار مصیبت لوگوں کی مدد کرتے ہیں، اور اس معاملے میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان کسی فرق و امتیاز کے وہ قائل نہیں ہیں ایسا نہیں ہے کہ وہ صرف اپنے اعزا اور ہم عقیدہ محتاجوں کو تو دیتے ہوں اور اجنبی اور دوسرے عقائد رکھنے والوں کو نہ دیتے ہوں۔

یاد رہے سورۂ دہر مکی ہے اور حال بیان ہو رہا ہے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا، ان کا جنھوں نے دعوت اسلامی پر لبیک کہا ہے۔ مکہ میں مسکین مسلمان بھی تھے اور غیر مسلم بھی تھے، یتیموں میں دونوں طرح کے لوگ تھے، اور قیدی تو سب غیر مسلم ہی تھے۔ عرب کے لوگ لڑائیوں میں دشمن کے سپاہیوں کو گرفتار کر کے اپنے یہاں لاتے، ان سے محنت شاقہ لیتے اور کھانے کو نہ دیتے ان کی خبر لینے والا اگر کوئی گروہ تھا تو وہی لوگ تھے جو توحید اور روزِ جزا پر ایمان لاتے تھے۔

کیا آج کے زمانے میں، اس بھوک کے زمانے میں انبیائی دعوت اور دعوتِ محمدی پر لبیک کہنے والے نہیں ہیں؟ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهٗ۔

ہماری ذلّت ونکبت کا اصل سبب

مولانا جلیل احسن ندوی جامعۃ الفلاح، بلیریا گنج

عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْشِكُ الْأُمَمُ أَنْ تَدَاعٰى عَلَيْكُمْ كَمَا تَدَاعَى الْأَكَلَةُ إِلٰى قَصْعَتِهَا، فَقَالَ قَائِلٌ وَمِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ؟ قَالَ بَلْ أَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ كَثِيْرٌ وَلٰكِنَّكُمْ غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيْلِ وَلَيَنْزِعَنَّ اللهُ مِنْ صُدُوْرِ عَدُوِّكُمُ الْمَهَابَةَ مِنْكُمْ وَلَيَقْذِفَنَّ فِيْ قُلُوْبِكُمُ الْوَهْنَ، قَالَ قَائِلٌ يَا رَسُوْلَ اللهِ وَمَا الْوَهْنُ؟ قَالَ حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ

(مشکوٰۃ)

حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تم مسلمانوں پر عنقریب وہ زمانہ آنے والا ہے جب تم کو نگل جانے اور فنا کر دینے کے لیے دنیا کی قومیں تم پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گی جس طرح کھانے والے دسترخوان پر گرتے ہیں، صحابہ میں سے کسی نے پوچھا کیا اس زمانے میں ہم مسلمان کم تعداد میں ہوں گے؟ آپ نے فرمایا نہیں بلکہ اس زمانے میں تم مسلمان بڑی تعداد میں ہوگے، لیکن تم سیلاب کے جھاگ کی طرح ہو جاؤ گے، اور تمہارے دشمنوں کے سینوں میں جو تمہاری دھاک بیٹھی ہے اسے اللہ تعالیٰ کھینچ لے گا اور تمہارے دلوں میں کمزوری اور پست ہمتی پیدا کر دے گا۔ اس پر کسی نے سوال کیا یہ کمزوری اور پست ہمتی کیوں آجائے گی؟ آپ نے فرمایا اس کا سبب یہ ہوگا کہ اس زمانے کے مسلمان حبِ دنیا کے مرض میں مبتلا ہو جائیں گے اور خدا کی راہ میں مرنا ناپسندیدہ بن جائے گا۔

یہ حدیث بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے اور خصوصیت سے اس دور کے مسلمانوں کو ٹھہر کر سوچنے اور غور کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ آپ نے یہ حدیث صحابہ کرام کے مجمع میں ارشاد فرمائی اور اس زمانے میں ارشاد فرمائی جب عرب میں کفر و جاہلیت کا چراغ گل ہو چکا ہے اور اسلام کی روشنی پورے طور پر ہر جگہ، ہر گھر اور ہر دل کو منور کیے ہوئے ہے، دین غالب ہو چکا ہے اور اہل دین اپنی قربانیوں سے زیادہ اس دنیا میں صلہ پا چکے ہیں اور جو کچھ انھیں آخرت میں ملنا ہے اس کی خوش خبری سن چکے ہیں اور یہ حدیث آپ نے اس غرض سے بیان فرمائی کہ بعد میں آنے والے مسلمان اس خطرے سے ہوشیار رہ جائیں جن سے وہ دوچار ہو سکتے ہیں

یہاں پہ تھوڑی دیر رک کر ذرا اپنے ماضی پر نظر ڈالیے، سوچیے کہ دور اول کے مسلمان اپنی قلت تعداد اور وسائل کے فقدان کے باوجود کیوں خدا کی رحمت اور مدد کے مستحق ہوئے، کس وجہ سے اللہ نے انھیں عزت و اقتدار کا وارث بنایا، اور کیوں ایسا ہوا کہ جو لوگ عزت و اقتدار کے مالک تھے اور ہر طرح کے وسائل و ذرائع رکھتے تھے ان لوگوں کے حصے میں کیوں ذلت و نامرادی آئی۔ یہ دنیا اندھیر نگری نہیں ہے، ظاہر ہے کوئی بات ہوگی جس کی وجہ سے دبائے جانے والے، پیسے جانے والے اقتدار کی مسند پر پہنچے اور اقتدار والے سرنگوں اور سر بہ خاک ہوئے۔

اس کی وجہ خود اوپر کی حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرما دی ہے جس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو پیغمبر بنایا اور دعوت الی اللہ کی ذمہ داری آپ پر ڈالی اور آپ نے اپنا کام پیغمبرانہ جوش و انہماک کے ساتھ شروع کیا تو آہستہ آہستہ لوگ آپ پر ایمان لانے لگے اور جو لوگ ایمان لاتے وہ اس بات پر ایمان لاتے کہ اب خالق کائنات کے سوا کسی اور کی بندگی اور غلامی نہیں کرنی ہے اور اس بات کا عہد کرتے کہ خدا کی بندگی اور غلامی کی راہ میں صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قائد اور رہنما بنانا ہے۔ اسی عہد کا وہ اقرار و اعلان ان الفاظ میں کرتے۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ (میں شہادت[1] دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں)

اور تیسری چیز جس پر وہ ایمان لاتے وہ آخرت ہے۔ یعنی وہ اس حقیقت کو اپنے دماغ و دل میں اتار لیتے کہ یہ دنیا کمائی کرنے کی جگہ ہے اور اصل وطن آخرت ہے۔ یہ دنیا گھر نہیں ہے اصلی گھر یہاں سے دور اور آنکھوں سے اوجھل ہے۔ یہاں آدمی جیسی کچھ کمائی کرے گا وہی عالم آخرت میں پائے گا ــــــ یہ تین

[1] شہادت کے لفظ میں اعلان اور عہد و قسم کا مفہوم شامل ہے اور "الٰہ" وہ جو ہر کر محبت ہو جس کی غلامی کی جائے اور جسے اپنا سہارا اور ملجا و ماویٰ بنایا جائے۔

بنیادی باتیں تھیں جن پر وہ ایمان لائے تھے۔ تاریخ گواہ ہے جس دن سے وہ ایمان لائے اس کے تقاضے پورے کرتے رہے۔ انھوں نے کبھی عہد کو نہیں توڑا، کبھی غداری اور خیانت نہیں کی۔ مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں ظلم و ستم کی بارش ہوتی رہی۔ مصائب کے طوفان آتے رہے لیکن اپنے عقیدے پر آنچ نہیں آنے دی اور جن اصولوں پر اپنی زندگی کی عمارت اٹھائی تھی انھیں متزلزل نہیں ہونے دیا۔ یہاں تک کہ آخر میں ان کے سامنے یہ فیصلہ کن موڑ آیا کہ یا تو ہجرت یا اسلام، یا تو یہ علاقہ چھوڑو اپنا وطن چھوڑو، اپنا زندگی بھر کا اثاثہ چھوڑ دو یا پھر اپنے ایمان و اسلام سے دست کش ہو۔ لیکن انھوں نے کہا، ہم سب کچھ قربان کر سکتے ہیں۔ ایمان و اسلام کی قربانی نہیں دے سکتے۔ پھر تاریخ ان کے سامنے ایک دوسرا موڑ لے آئی کہ ہم تم کو اور تمہارے دین کو تلوار کے زور سے فنا کر دیں گے۔ انھوں نے کہا ہمارے جیتے جی ایسا ہوگا؟ نہیں، یا تو ہم جانیں دے دیں گے، یا تمہاری جانیں لے لیں گے۔ جب تک ہمارے جسموں میں جان باقی ہے اس وقت تک اسلام کے حلقوم تک تمہاری تلواروں کو ہم نہیں پہنچنے دیں گے ——— یہ جانی و مالی قربانیوں کا دور نو دس سال تک ممتد رہا لیکن انھوں نے کسی قربانی سے نہ جی چرایا، نہ منہ چھپایا۔ جب وہ عہد بندگی کے ہر امتحان میں کامیاب ہوئے تب اللہ کی مدد آخری طور پر آئی، اور کفر و جاہلیت کا زور ٹوٹ گیا۔ "ان" کے لیے رب کائنات کی عدالت سے حیات (زندگی) کا، اور "ان" کے لیے موت کا فیصلہ ہوا۔

یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا چیز تھی جس کی وجہ سے اتنے شدید زلزلوں میں بھی وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلے؟ کس نے انھیں ٹھوس فولاد اور نہ ہلنے والا پہاڑ بنائے رکھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ حب آخرت سے سرشار تھے۔ یہ حقیقت ان کے دل میں اتر گئی تھی کہ یہ دنیا "پردیس" ہے، ہمارا دیس تو کہیں اور ہے، ہم یہاں کمائی کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اور جب تک وہ اس "پردیس" میں رہے، "دیس" بھولا نہیں، برابر اس کی یاد آتی رہی، حب وطن کی آگ برابر ان کے سینے میں دہکتی رہی۔ وہ جانتے تھے کہ یہ زندگی چند روزہ ہے، اس کے بعد اصلی وطن کو لوٹنا ہے۔ مالک کے حضور جانا ہے، اسے منہ دکھانا ہے اور کمائی اس کے سامنے رکھنی ہے۔ اگر نہ کمائیں گے یا کمائیں گے تو، پر کنکر پتھر اور سانپ بچھو اپنی جھولی میں بھر کر لے جائیں گے تو مالک کو کیسے منہ دکھائیں گے اور کیا جواب دیں گے!! یہ ہے جس کی فکر انھیں زندگی بھر رہی، اس لیے انھوں نے ہر مصیبت کا خندہ پیشانی کے ساتھ سامنا کیا، ہر تکلیف کو جھیل لے گئے اور ان کے ایمان و اسلام نے ان سے جس قربانی کا مطالبہ کیا اسے بہ تمام و کمال پورا کیا۔ یہاں تک کہ جان جیسی

پیاری اور قیمتی چیز کی قربانی ان کی سب سے بڑی آرزو بن گئی۔ اِنَّا اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ (ہم نے ان کو نکھارا ایک خلوص والی چیز کے ذریعہ یعنی گھر (آخرت) کی یاد کے ذریعہ) اور فرمایا:- اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ؀ (یہ وہ لوگ ہیں جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انھیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے) غرض جب انھوں نے اپنا سب کچھ اللہ کے لیے کھویا، تب اللہ نے انھیں اس سے زیادہ اس دنیا میں دیا جتنا انھوں نے کھویا تھا، زمین کی وراثت انھیں بخشی گئی اور وہ عروج انھیں نصیب ہوا جس کا وہ تصور تک نہیں کرتے تھے۔

اوپر کی تفصیل سے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آئی کہ دورِ اول کے مسلمانوں کے عروج و اقبال کا راز کیا ہے، اور اس سوال کا جواب بھی ملا کہ موجودہ دور کے مسلمانوں کے حصے میں پستی و نکبت کیوں آئی ہے؟ ان کے پیشوا ــــ عہدِ نبوت اور عہدِ خلافت کے مسلمان ــــ آخرت کی محبت سے سرشار تھے اور ہم لوگ عشقِ دنیا کے مارے ہوئے لوگ ہیں، وہ خدا کی راہ میں جان تک کی قربانی پیش کرنے کی بے تاب تمنا رکھتے تھے اور ہمارے نزدیک خدا کے لیے، خدا کے دین کے لیے قربانی پیش کرنا مکروہ، ناپسندیدہ اور ناگوار خاطر، پھر خدا اپنی رحمت و نصرت سے کیوں نوازے، اور برکتوں کے دروازے کیوں کھولے؟ اس کی تائید و نصرت ہمیں اسی وقت مل سکتی ہے جب ہم عشقِ ایمانی اور حبِ آخرت سے سرشار اس کے دین کی سربلندی کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ یہاں یک طرفہ معاہدہ نہیں ہے جب تم اللہ کے مددگار بن کر اٹھو گے تب اللہ کی مدد تم کو ملے گی اور پھر تمہارے قدم اکھاڑے نہ جا سکیں گے۔

(۴)

جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ الرَّجُلُ يَأْتِيْنِيْ يَأْخُذُ مَالِيْ قَالَ ذَكِّرْهُ بِاللّٰهِ قَالَ فَاِنْ لَمْ يَذَّكَّرْ قَالَ فَاسْتَعِنْ عَلَيْهِ بِمَنْ حَوْلَكَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ قَالَ فَاِنْ لَمْ يَكُنْ حَوْلِيْ اَحَدٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ	مخارق سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے آپ سے پوچھا کوئی آدمی میرے پاس آتا ہے میرا مال لوٹنے کے لیے تو مجھے ایسے موقع پر کیا کرنا چاہیے۔ آپ نے فرمایا۔ اس کو اللہ کی یاد دلاؤ، نصیحت کرو، اس نے کہا اگر اس پر نصیحت کا کوئی اثر نہ ہو تب؟ آپ نے فرمایا تو اپنے آس پاس کے

قَالَ فَاسْتَعِنْ عَلَيْهِ بِالسُّلْطَانِ قَالَ فَإِنْ نَأَى السُّلْطَانُ عَنِّي ؟ قَالَ قَاتِلْ دُونَ مَالِكَ حَتَّى تَكُونَ مِنْ شُهَدَاءِ الْآخِرَةِ أَوْ تَمْنَعَ مَالَكَ

(مخارق ــ نسائی جمع الفوائد جلد اول ص ۲۳۴)

مسلمانوں کی مدد حاصل کرو۔ اس نے کہا اگر میرے قرب جوار میں کوئی مسلمان نہ ہو تب؟ آپ نے فرمایا وقت کے اقتدار کی مدد حاصل کر۔ اس نے کہا اگر اقتدار و حکومت مجھ سے دور ہو تب؟ آپ نے فرمایا اپنے مال کی حفاظت میں تو حملہ آور سے لڑ۔ یہاں تک لڑ کہ یا تو تیرا نام آخرت کے شہیدوں میں لکھا جائے یا پھر تو اپنے مال کو بچانے جانے میں کامیاب ہو جائے۔

یہ حدیث اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے۔ اگر کوئی مفسد شخص یا فسادیوں کا کوئی گروہ مومن کا مال لوٹنے اور تباہ کرنے کے لیے آتا ہے تو اس کی ایمانی حالت کا تقاضا یہ ہے کہ گھر بار چھوڑ کر نہ بھاگے، اپنی جائداد کو فسادیوں کے لیے حلوائے بے دود اور لقمۂ تر نہ بننے دے بلکہ موقع ہو تو وعظ و نصیحت کرے تاکہ خدا کا ڈر ان کے اندر پیدا ہو اور انسانیت کے جذبات ابھریں اور اس کام کو پاپ سمجھ کر باز آجائیں لیکن اگر وعظ کا موقع نہ ہو تو پاس پڑوس کے مسلمانوں کو اپنے مظلوم مصیبت زدہ بھائی کی مدد کے لیے دوڑ پڑنا چاہیے۔ اسی طرح اس علاقے میں قانون کی حکومت قائم ہو اور وہاں سے خستگی کی داد پانے کی توقع ہو تو اس کی مدد حاصل کرنے کی فکر کی جائے اور اگر کہیں سے کوئی مدد نہ ملنے والی ہو تب بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ مشورہ نہیں دیتے کہ وہاں سے بھاگ کھڑے ہو بلکہ یہ ہدایت دیتے ہیں کہ تو غاصب اور مفسد کا مقابلہ کر۔ یہاں تک کہ تو اپنے مال کو بچانے جانے میں کامیاب ہو جائے یا پھر تیری جان چلی جائے۔ اگر تیری جان چلی گئی تو یہ گھاٹے کا سودا نہیں بلکہ نفع ہی نفع ہے تیرا نام شہیدوں کی فہرست میں لکھا جائے گا اور آخرت میں تیرا قیام اُس قیام گاہ میں ہوگا جو شہداء کے لیے تیار کی گئی ہے۔

مومن کی سب سے بڑی آرزو، مومن کی سب سے بڑی خوش قسمتی ! !

بنگلور میں زندگی ملنے کا پتہ:۔

بنگلور بک ہاؤس۔ ۱۷ اخلاصی پالم مین روڈ بنگلور ۲

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

(سید جلال الدین عمری)

اصلاح امت کا کام بہت ہی وسیع کام ہے۔ اس کے سلسلے میں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ یہاں ہمیں اسی سوال پر غور کرنا ہے۔ وہ یہ کہ امت کی اصلاح کس کی ذمہ داری ہے۔ امت کو بگاڑ سے بچانا اور اس کے اندر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا کام کرنا ہر شخص کا فرض ہے یا یہ کسی خاص جماعت کے کرنے کا کام ہے۔ قرآن مجید نے اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا ہے:۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ	مومن مرد اور مومن عورتیں یہ سب کے سب
اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ معروف کا حکم دیتے
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ	ہیں اور منکر سے منع کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں
الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ	زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت
اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰۗىِٕكَ سَيَرْحَمُهُمُ	کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ ضرور رحم کرے گا
اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (التوبۃ ۷۱)	یقیناً اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر امت کے کسی مخصوص طبقہ اور جماعت کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ یہ پوری امت کے کرنے کا کام ہے۔ قرآن ایمان والوں کو اس حال میں دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو معروف کا حکم دے رہے ہوں اور منکر سے منع کر رہے ہوں۔ کیونکہ یہی ان کی صحیح ترین حالت ہے۔ اگر یہ وصف کسی فرد میں نہیں ہے تو وہ مسلم معاشرے کا ایک نااہل فرد ہے۔ امام غزالی فرماتے ہیں:۔

فقد نعت المومنین بانهم	اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی یہ صفت بیان
یامرون بالمعروف وینهون عن	کی ہے کہ وہ معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے

المنکر فالذی هجر الامر بالمعروف والنهی عن المنکر خارج عن هؤلاء المومنین المنعوتین فی هذه الآیة[۱]

منع کرتے ہیں۔ پس جو شخص امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو ترک کر دے وہ ان مومنین سے خارج ہے جن کا اس آیت میں بیان ہوا ہے۔

علامہ عبدالقادر عودہ شہید فرماتے ہیں:۔

ان جمهرة الفقهاء توجب الامر بالمعروف والنهی عن المنکر علی کافة افراد الامة لا علی فئة معینة منها[۲]

بیشتر فقہاء امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو امت کے کسی مخصوص گروہ پر نہیں بلکہ اس کے سب ہی افراد پر واجب قرار دیتے ہیں۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ کام کسی خاص وقت، کسی خاص ماحول اور کسی خاص دور میں انجام دینے کا نہیں ہے بلکہ اس کی نوعیت ایسی ہے کہ کسی بھی وقت اس سے غفلت نہیں برتی جا سکتی۔ امام غزالی فرماتے ہیں:۔

عموم الامر بالمعروف والنهی عن المنکر تقتضی لوجوب بکل حال[۳]

امر بالمعروف ونہی عن المنکر (سے متعلق آیات احادیث) کا عموم ہر حال میں اس کے واجب ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ جو شخص امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا کام انجام دے اس کے اندر چند شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ ان شرائط میں سے بعض پر فقہاء کا اتفاق ہے اور بعض کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام غزالیؒ نے اس طرح کی کل پانچ شرطیں بیان کی ہیں۔ "تکلیف (آدمی کا شرعی طور پر مکلف ہونا) ایمان، عدالت (نیکی اور تقوی) حاکم وقت کی اجازت اور قدرت[۴]" ہم یہاں ان تمام شرائط پر کسی قدر تفصیل سے بحث کریں گے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ کسی شخص پر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کن حالات میں واجب ہوتا ہے اور کن حالات میں یہ وجوب اس سے ساقط ہو جاتا ہے اور پھر ان مختلف حالات میں اس کام کے انجام دینے کی صحیح نوعیت کیا ہو گی۔

---

[۱] احیاء علوم الدین مطبوعہ دار الکتب العربیہ مصر ۱۳۳۴ھ ج ۲ ص ۲۸۷ [۲] التشریع الجنائی الاسلامی مقارنا بالقانون الوضعی الجزء الاول ص ۴۹۱ [۳] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۲۸۸ [۴] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۲۸۸ تا ص ۲۹۳ یہ شرائط امام غزالی نے احتساب کی بیان کی ہیں لیکن چونکہ احتساب امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہی کا ایک نمایاں پہلو ہے اس لیے بعض دوسرے اصحاب علم نے ان پر اسی پہلو سے بحث کی ہے کہ وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے سلسلہ کی شرائط ہیں۔ دیکھیے التشریع الجنائی ص ۴۹۲ تا ص ۵۰۵

پہلی شرط - جو شخص امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام کرے، اس کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ شرعاً مکلف ہو کیونکہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر واجب ہے اور کسی غیر مکلف پر کوئی حکم واجب نہیں ہوتا اور وہ تمام شرعی فرائض سے مستثنیٰ ہوتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر کوئی نابالغ لڑکا معروف کا حکم دیتا اور منکر سے روکتا ہے تو یہ اس کے لیے ناجائز ہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اگر وہ اس کام کو چھوڑ دے تو گناہ گار نہ ہوگا۔ ہاں اگر وہ اسے انجام دے تو لازماً ثواب کا مستحق ہوگا۔ امام غزالیؒ اس شرط کے بارے میں فرماتے ہیں :

انہ شرط الوجوب فاما امکان	یہ صرف وجوب کی شرط ہے۔ باقی رہا اس عمل
الفعل وجوازہ فلا یستدعی الا العقل	کا امکان اور جواز تو یہ عقل کے سوا کسی اور چیز کا
حتی ان الصبی المراھق للبلوغ الممیز	مطالبہ نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ ایک بچہ جو بالغ ہونے
وان لم یکن مکلفا فلہ	کے قریب ہو اور صاحب تمیز ہے، اگرچہ وہ مکلف
انکار المنکر ولہ ان یریق الخمر	نہیں ہو لیکن اسے اجازت ہے کہ شراب کو بہا دے
ویکسر الملاھی واذا فعل	اور آلات لہو کو توڑ دے[1]۔ اگر وہ اس پر عمل کرے تو
ذالک نال بہ ثوابا ولم یکن	اس کا ثواب بھی پائے گا کسی کو اسے اس وجہ سے
لاحد منعہ من حیث انہ	منع کرنے کا حق نہیں ہے کہ وہ مکلف نہیں ہے۔
لیس بمکلف فان ھذہ قربۃ	کیونکہ یہ خدا سے تقرب کا ذریعہ ہے اور وہ یقیناً
وھو من اھلھا[2]	اس کا اہل ہے۔

دوسری شرط - اس فرض کے انجام دینے کے لیے دوسری شرط ایمان ہے۔ مومن ہی کا یہ کام ہے کہ معروف کا حکم دے اور منکر سے منع کرے۔ اس شرط کی وجہ امام غزالی یہ بیان فرماتے ہیں۔

ھذہ نصرۃ للدین فکیف	یہ دین کی نصرت ہے تو اس کام کا اہل وہ
یکون من اھلہ من ھو جاحد	شخص کیسے ہو سکتا ہے جو اصل دین ہی کا منکر اور
لاصل الدین وعدو لہ[3]	اس کی نافرمانی کرنے والا ہو۔

علامہ عبدالقادر عودہ شہید اس شرط کی ایک اور وجہ بیان فرماتے ہیں :-

---

[1] اس مسئلہ پر ہم آئندہ بحث کریں گے کہ اسلامی ریاست میں ایک مسلمان کو خواہ وہ نابالغ ہو یا بالغ بذریعہ قوت منکر کے مٹانے کا حق ہے یا نہیں؟ [2] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۲۷۲ [3] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۲۷۲

"معروف ومنکر میں پوری شریعت شامل ہے اگر کسی غیر مسلم پر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو واجب قرار دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ لازماً وہی عقیدہ رکھے جو ایک مسلمان کا عقیدہ ہے اور وہی بات کہے جو ایک مسلمان کہتا یا کہہ سکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ اکراہ فی الدین ہے جس کی اسلام میں قطعاً اجازت نہیں ہے۔ حقیقت میں اس شرط کے ذریعہ اسلامی ریاست کے غیر مسلموں کو اس بات کی مکمل آزادی دی گئی ہے کہ وہ جو عقیدہ چاہیں رکھیں اور جس عقیدے کا چاہیں انکار کر دیں۔ ان پر کسی قسم کا جبر نہیں ہے"[1]

تیسری شرط: بعض لوگوں نے کہا ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا کام کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود بھی معروف پر عمل کرے اور منکر سے باز رہے جو شخص نہ تو معروف پر عمل کرے اور نہ منکر سے باز رہے، اس کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا حق نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن وحدیث میں ان لوگوں پر سخت تنقید کی گئی ہے جو دوسروں کو تو نیکیوں کی دعوت دیتے ہیں اور خود ان کا دامن نیکیوں سے خالی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ	کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور
تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (البقرہ: ۴۴)	اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ	اے وہ لوگو جو ایمان کا دعویٰ کرتے ہو
مَا لَا تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ	تم ایسی باتیں دوسروں سے کیوں کہتے ہو جن پر خود عمل
اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا	نہیں کرتے۔ اللہ کو یہ بات سخت ناپسند ہے کہ تم کہو
تَفْعَلُوْنَ ۝ (الصف ۲-۳)	وہ جس پر خود عمل نہ کرو۔

اسی طرح احادیث میں واعظین بے عمل کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ یہ تو نقلی دلائل ہیں۔ عقلی طور پر بھی کسی بے عمل کا دوسروں کو عمل کی تبلیغ کرنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اصلاح نفس دوسروں کی اصلاح پر مقدم ہے۔ خود سیدھی راہ پر چلنا اور دین پر ثابت قدم رہنا اصل ہے اور دوسروں کو راہ دکھانا اور دین پر استقامت کی تبلیغ کرنا اس کی فرع ہے۔ ظاہر ہے جب اصل ہی موجود نہ ہو تو فرع کا وجود کیسے ہو سکتا ہے؟ آدمی کا خود صلاح یافتہ ہونا اصل سرمایہ ہے اور دوسروں کی اصلاح کرنا اس کی زکوٰۃ ہے۔ اگر اصل سرمایہ موجود نہ ہو تو زکوٰۃ کس چیز کی ادا ہوگی؟

امام غزالیؒ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:۔

کل ما ذکروہ خیالات وانما	جو کچھ ان لوگوں نے کہا وہ سب محض بے بنیاد

---

[1] التشریع الجنائی ص ۔۔۔

الحق ان للفاسق ان يحتسب وبرهانه هو ان نقول هل يشترط في الاحتساب ان يكون متعاطيه معصوما عن المعاصي كلها فان شرط ذالك فهو خرق للاجماع ثم حسم لباب الاحتساب اذ لا عصمة للصحابة فضلا عمن دونهم[1]

خیالات ہیں اور صحیح بات یہ ہے کہ فاسق کو احتساب کا حق ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ہم پوچھتے ہیں کہ جو شخص احتساب کا فرض انجام دے کیا تمام گناہوں سے اس کا معصوم ہونا شرط ہے؟ اگر یہ شرط لگائی جائے تو یہ اجماع امت کی مخالفت ہے اور پھر یہ احتساب کے دروازے کو بند کرنا ہے۔ کیونکہ دوسرے لوگوں سے قطع نظر صحابہ بھی معصوم نہیں ہیں۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا کام انجام دینے والے کے لیے جو لوگ تقویٰ اور نیکی کو شرط قرار دیتے ہیں ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسے ہر چھوٹے بڑے گناہ سے پاک ہونا چاہیے' بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اس کے اندر کم سے کم موٹی موٹی نیکیاں موجود ہوں اور وہ کبائر سے بچا رہے۔ امام غزالی اس پر بھی تنقید کرتے ہیں۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ جب ایک شرابی جہاد میں حصہ لے سکتا ہے اور لیتا رہا ہے اور ایک زانی قتل سے منع کر سکتا ہے تو یہ شرط فضول ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ گناہ سے خود باز رہنا ایک الگ چیز ہے اور دوسروں کو گناہ سے منع کرنا دوسری چیز ہے۔ ان دونوں کو ایک ساتھ جوڑ دینا صحیح نہیں ہے ایک شخص جو گناہ گار ہے وہ کہہ سکتا ہے۔

يجب علي الانتهاء والنهي فمن اين يلزمني من العصيان باحدهما ان اعصي الله تعالى بالثاني واذا كان النهي واجبا علي فمن اين يسقط وجوبه باقدامي[2]

گناہوں سے خود رکنا اور دوسروں کو روکنا دونوں مجھ پر واجب ہیں۔ ان میں سے ایک کی نافرمانی سے مجھ پر یہ کہاں لازم آتا ہے کہ دوسرے معاملہ میں بھی خدا کی نافرمانی کروں منکر سے منع کرنا جب مجھ پر واجب ہے تو اس کا وجوب منکر کے ارتکاب سے کیسے ساقط ہو جائے گا؟

امام غزالیؒ اس سلسلے میں اصول کلیہ کے طور پر فرماتے ہیں:۔

اصلاح الغير لا يراد لاصلاح النفس ولا اصلاح النفس

دوسروں کی اصلاح اپنی اصلاح کے لیے نہیں چاہی جاتی اور نہ اپنی اصلاح دوسروں کی اصلاح

[1] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۲۷۵   [2] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۲۷۵

اصلاح الغیر فالقول بترتب احدہما	کے لیے۔ اس لیے یہ کہنا کہ ان میں سے ایک دوسرے
علی الآخر تحکم[1]	پر موقوف ہے محض بے دلیل دعویٰ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ایک فرض ہے۔ اس کی ادائیگی کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ پہلے دوسرے فرائض ادا کر دیے جائیں تب اسے ادا کیا جائے۔ شریعت کا ہر فرض اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اگر اس کے ادا ہونے کا وقت آگیا ہے تو لازماً اسے ادا کیا جائے۔ خواہ دوسرے فرائض ادا ہو رہے ہوں یا نہ ہو رہے ہوں۔ یہی بات علامہ ابوبکر جصاص نے ان الفاظ میں کہی ہے۔

ان ترک الانسان لبعض	انسان کا بعض فرائض کو چھوڑ دینا، اس سے
الفروض لا یسقط عنہ فروضا غیرہ الا	بعض دوسرے فرائض کو ساقط نہیں کر دیتا۔ دیکھو
تری ان ترکہ للصلوۃ لا یسقط عنہ	کہ اگر وہ نماز کو ترک کر دے تو اس کی وجہ سے روزہ
فرض الصوم و سائر العبادات فکذالک	اور دوسری عبادات اس سے ساقط نہیں ہو جاتیں
من لم یفعل سائر المعروف و لم ینتہ	اسی طرح جو شخص تمام معروفات پر عمل نہ کرے اور تمام
سائر المناکیر فان فرض الامر بالمعروف	منکرات سے باز نہ رہے تو اس کی وجہ سے امر بالمعروف
والنہی عن المنکر غیر ساقط عنہ[2]	و نہی عن المنکر کا فرض اس سے ساقط نہیں ہو جائے گا

بے عمل انسانوں کی دوسروں پر تبلیغ کا مسئلہ ایک اور پہلو سے بھی قابل غور ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا ان ہی انسانوں کی باتوں کو قبول کرتی ہے جو باعمل ہوتے ہیں اور جن کے کردار سے ان کے خیالات کی تصدیق ہوتی ہے۔ بے عمل انسانوں کی تبلیغ بالعموم رائگاں جاتی ہے اور اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اب فرض کیجیے! ایک بے کردار انسان کو کسی وقت اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اس کا امر بالمعروف و نہی عن المنکر بے فائدہ ہوگا تو سوال یہ ہے کہ کیا اس صورت میں بھی اس کے لیے فرض "فرض" ہی رہے گا اور اس کا انجام نہ دینے پر وہ قابل مواخذہ قرار پائیگا یا نہیں؟ امام غزالی فرماتے ہیں:۔

من علم ان قولہ لا یقبل	جو شخص یہ جانتا ہو کہ اگر وہ احتساب کرے
فی الحسبۃ لعلم الناس بفسقہ	تو اس کے فسق کی وجہ سے اس کی بات نہیں سنی جائے گی
فلیس علیہ الحسبۃ بالوعظ	تو اس پر وعظ و نصیحت کے ذریعہ احتساب ضروری

[1] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۲۷۰ [2] احکام القرآن ج ۲ ص ۳۲

اذ لا فائدۃ فی وعظہ فالفسق یؤثر فی اسقاط فائدۃ کلامہ ثم اذا سقطت فائدۃ کلامہ سقط وجوب الکلام[1]

نہیں کیا اس لیے کہ اس کے وعظ ونصیحت کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا فسق اس کے کلام کے فائدے کو ساقط کرنے میں مؤثر ہو رہا ہے۔ جب اس کے کلام کا کوئی فائدہ ہی نہیں رہا تو کلام کا وجوب بھی ساقط ہوگیا۔

یہ بات صرف زبانی نصیحت کے سلسلے میں ہے لیکن امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ایک شکل اور بھی ہے وہ یہ کہ آدمی قوت وطاقت کے ذریعہ معروف کو قائم کرے اور منکر کو مٹائے۔ اس کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ آدمی نیک اور متقی ہی ہو۔ اگر کسی غلط کار اور فاسق کو قوت حاصل ہے، تو اسے اپنی قوت کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ امام غزالی فرماتے ہیں:۔

اما الحسبۃ القہریۃ فلا یشترط فیہا ذالک فلا حرج علی الفاسق فی اراقۃ الخمور وکسر الملاہی وغیرہا اذا قدر[2]

طاقت کے ذریعہ احتساب تو اس میں یہ (تقویٰ اور نیکی) شرط نہیں ہے۔ فاسق کے لیے اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ شراب کو بہا دے اور آلات لہو کو توڑ دے اگر وہ اس پر قادر ہو۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لیے جن لوگوں نے نیکی اور تقوے کو شرط قرار دی ہے، جیسا کہ گزر چکا، انہوں نے قرآن کی دو آیتوں سے بھی استدلال کیا ہے۔ امام غزالیؒ ان کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

اما الآیات التی استدلوا بہا فہو انکار علیہم من حیث ترکہم المعروف لا من حیث امرہم ولکن امرہم دل علی قوۃ علمہم وعقاب العالم اشد لانہ لا عذر لہ مع قوۃ علمہ[3]

جن آیات سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے ان میں بے عمل انسان پر اس پہلو سے تنقید ہے کہ انھوں نے معروف پر عمل کو ترک کر دیا۔ اس پہلو سے نہیں کہ انھوں نے امر بالمعروف کا فرض انجام دیا۔ ان کا معروف کا حکم دینا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کو علم کی قوت حاصل ہے۔ (لیکن اس کے باوجود جب انھوں نے عمل نہیں کیا تو ظاہر ہے کہ) عالم کے لیے عذاب زیادہ سخت ہو گیا کیونکہ قوت علم کی وجہ سے اس کے پاس کوئی عذر نہیں ہے۔

[1] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۲۷۱ [2] ایضاً [3] ایضاً

اس سلسلے میں حضرت سعید بن جبیرؒ نے بہت ہی حقیقت پسندانہ اور فطری بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

لو کان المرء لا یأمر بالمعروف ولا ینھی عن المنکر حتی لا یکون فیہ شیئ ما امر احد بمعروف ولا نھی عن منکر

اگر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے یہ شرط ہو کہ انسان کے اندر کوئی عیب نہ ہو تو کوئی بھی شخص نہ معروف کا حکم دے سکتا ہو اور نہ منکر سے منع کر سکتا ہے

امام مالک نے یہ بات سنی تو فرمایا:۔

صدق من ذا الذی لیس فیہ شیئ[1]

(سعید بن جبیرؓ نے) سچ کہا کون ایسا شخص ہے جس کے اندر کوئی نقص نہ ہو۔

یہ تو اس مسئلہ کا قانونی پہلو ہے لیکن جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آدمی کے قول و عمل میں مطابقت ہونی چاہیے اس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ علامہ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:۔

ذھب بعضھم الی ان مرتکب المعاصی لا ینھی غیرہ وھذا ضعیف ...... والصحیح ان العالم یامر بالمعروف وان لم یفعلہ وینھی عن المنکر وان ارتکبہ .... لکنہ والحالۃ ھذہ من موم علی ترکہ الطاعۃ وفعلہ المعصیۃ لعلمہ بھا ومخالفتہ علی بصیرۃ فانہ لیس من یعلم کمن لا یعلم[2]

بعض لوگ اس طرف گئے ہیں کہ معاصی کا ارتکاب کرنے والا دوسروں کو منع نہیں کر سکتا لیکن یہ رائے کمزور ہے ...... صحیح بات یہ ہے کہ علم رکھنے والا معروف کا حکم بھی دے گا اگرچہ وہ اس پر عمل نہ کرے اور منکر سے منع بھی کرے گا اگرچہ اس کا ارتکاب کرے ...... لیکن وہ جب کہ اس کی یہ حالت ہے یقیناً قابل مذمت ہے کیونکہ اس نے جانتے بوجھتے اطاعت نہیں کی اور معصیت کا ارتکاب کیا اور بصیرت کے باوجود مخالفت کا رویہ اختیار کیا۔ ظاہر ہے جو شخص جانتا ہے وہ اس کی مانند نہیں ہے جو نہیں جانتا۔

دوسروں کو دین کی تبلیغ کرنا اور اپنے عمل سے اس کی مخالفت کرنا دین کے ساتھ کھلا ہوا مذاق ہے۔ اس

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۸۶ [2] ایضاً

سے دین کا وقار مجروح ہوتا ہے اور اس کی عظمت کو صدمہ پہنچتا ہے۔ بے عملی نہ صرف ایمان کی کمزوری کی دلیل ہے بلکہ اس سے خود کہنے والے کی بات کا بھی کوئی وزن باقی نہیں رہتا۔ قرآن کا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ تم کہتے ہو اس پر عمل بھی کرو۔ نفاق کی روش نہ اختیار کرو کہ باتیں تو تمہاری فرشتوں کی طرح معصومانہ ہوں اور کردار ایسا ہو کہ شیطان بھی پناہ مانگے۔ حضرت شعیبؑ خدا کے پیغمبر تھے اور خدا کا دین انسانوں تک پہنچا رہے تھے، لیکن اس کی اہمیت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ جن معاصی سے میں تمہیں باز رہنے کی تبلیغ کرتا ہوں خود ان سے آلودہ نہیں ہوں کہ تم میری باتوں کو واعظ بے عمل کی نصیحت سمجھ کر نظر انداز کر دو۔

وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ	اور میں یہ نہیں چاہتا کہ جن باتوں سے میں تم کو
إِلَىٰ مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ إِنْ أُرِيدُ إِلَّا	منع کر رہا ہوں خود ان کی مخالفت کروں۔ میں تو اپنی
الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ	طاقت کی حد تک صرف اصلاح چاہتا ہوں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم واعظ بے عمل کے بارے میں فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز اسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا اور وہ اسی میں گھوم رہا ہوگا۔ اسے دیکھ کر جہنم کے دوسرے لوگ پوچھیں گے۔

أَلَسْتَ كُنْتَ تَأْمُرُ بِالْمَعْرُوفِ	کیا تو معروف کا حکم نہیں دیتا تھا اور منکر سے
وَتَنْهَىٰ عَنِ الْمُنْكَرِ	منع نہیں کرتا تھا؟ (تو پھر تو یہاں کیسے نظر آ رہا ہے؟)

وہ جواب دے گا۔

إِنِّي كُنْتُ آمُرُ بِالْمَعْرُوفِ	ہاں بلاشبہ میں معروف کا حکم دیتا تھا لیکن اس
لَا أَفْعَلُهُ وَانْهَىٰ عَنِ الْمُنْكَرِ	پر عمل نہیں کرتا تھا اور منکر سے منع کرتا تھا اور خود
وَافْعَلُهُ[1]	اس کا ارتکاب کرتا تھا۔

چوتھی شرط بعض لوگوں نے کہا ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر عام لوگوں کے کرنے کا کام نہیں ہے اسے حاکم وقت انجام دے سکتا ہے یا وہ شخص جسے حاکم کی اجازت حاصل ہو۔

اس میں شک نہیں کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی نوعیت ایسی ہے کہ بعض اوقات اس میں طاقت کے استعمال کی بھی ضرورت پڑتی ہے لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ عام لوگوں کے کرنے کا کام نہیں ہے اور اسے اسی وقت بجا لایا جا سکتا ہے جب کہ آدمی کے پاس اقتدار و حکومت ہو۔ کیونکہ یہ ان صحیح احادیث کے خلاف ہے

[1] بخاری، کتاب الفتن، باب الفتنۃ التی تموج کموج البحر

جن میں ظالم حاکموں اور جابر فرماں رواؤں کے خلاف حق و انصاف کے اظہار کی تعریف کی گئی ہے۔ ہم یہاں دو حدیثیں نقل کرتے ہیں:-

أَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ عَدْلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ [1]

سب سے زیادہ فضیلت والا جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کا کلمہ کہنا ہے۔

سید الشہداء حمزۃ بن عبد المطلب ورجل قام الی امام جائر فامرہ ونہاہ فقتلہ [2]

شہیدوں کے سردار حمزہ بن عبد المطلب ہیں اور وہ شخص جو کسی ظالم امام کے سامنے کھڑا ہوا اور اسے (نیکی) کا حکم دے اور (برائی) سے منع کرے (اور اس کے نتیجے میں) حاکم اس کو قتل کر دے۔

امام نووی فرماتے ہیں:-

قال العلماء ولا یختص الامر بالمعروف والنہی عن المنکر باصحاب الولایات بل ذالک ثابت لآحاد المسلمین قال امام الحرمین والدلیل علیہ اجماع المسلمین فان غیر الولاۃ فی الصدر الاول والعصر الذی یلیہ کانوا یامرون الولاۃ بالمعروف وینہونہم عن المنکر مع تقریر المسلمین ایاہم و ترک توبیخہم علی التشاغل بالامر بالمعروف والنہی عن المنکر من غیر ولایۃ [3]

علماء نے کہا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر حکام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ حکم مسلمانوں کے عام افراد کے لیے بھی ثابت ہے۔ امام الحرمین فرماتے ہیں کہ اس کی دلیل مسلمانوں کا اجماع ہے۔ کیونکہ دور اول اور اس سے قریب کے زمانے میں وہ لوگ جو صاحب اقتدار نہیں تھے حاکموں کو معروف کا حکم دیتے اور منکر سے منع کرتے تھے۔ ان کے اس عمل پر عام مسلمان خاموش رہے اور کسی نے اس بات پر انہیں سخت سست نہیں کہا کہ وہ بغیر حکومت کے حاکموں کو معروف کا حکم دیتے اور منکر سے منع کرتے ہیں۔

قرآن نے سورۂ حج میں اہل ایمان کی یہ صفت بیان کی ہے کہ "اگر ان کو زمین میں اقتدار عطا کیا جائے تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے۔" یہ واضح دلیل ہے اس

[1] ابو داؤد، کتاب الملاحم، باب الامر والنہی۔ [2] رواہ الترمذی والحاکم وقال صحیح الاسناد (الترغیب والترہیب جلد ۳ ص)
[3] شرح مسلم جلد ۱ ص ۵۱

کی کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر مسلمان حاکموں کا مخصوص وصف نہیں ہے بلکہ یہ ہر مسلمان کا فرض ہے جس کے ادا کرنے سے کوئی بھی شخص اسے باز نہیں رکھ سکتا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سورۂ حج کی اس آیت کے بارے میں فرماتے ہیں :۔

الا انها ليست على الوالي وحده	سن لو! یہ صرف حاکم ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ
ولكنها على الوالي والمولى عليه[1]	یہ حاکم اور محکوم دونوں کے لیے ہے ۔

اب آئیے اس پہلو سے غور کریں کہ کیا امر بالمعروف ونہی عن المنکر حاکم وقت کی اجازت ہی سے انجام دیا جا سکتا ہے یا اس کے لیے اس کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے ؟

جو لوگ یہ شرط لگاتے ہیں ان کے پیش نظر دراصل اس کام کو منظم کرنا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہر شخص کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی اجازت دے دی جائے تو اس میں کوئی ترتیب وتنظیم باقی نہیں رہ سکتی۔ بلکہ بسا اوقات بگاڑ کا بھی اندیشہ ہے۔ امام غزالی اس شرط کے مخالف ہیں لیکن وہ فرماتے ہیں کہ اس شرط کے حق میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ :

ربما ينتدب لها من ليس اهلا	بسا اوقات احتساب کا فرض ایسا شخص بھی انجام
لها لقصور معرفته او قصور ديانته	دینے لگتا ہے جو اپنے علم اور دیانت وتقوی کی کمی کی
فيؤدي ذالك الى وجوه من	وجہ سے اس کا اہل نہیں ہوتا ۔ اور یہ چیز بہت سی خرابیوں
الخلل[2]	کا سبب بن جاتی ہے ۔

علامہ عبدالقادر عودہ شہید کہتے ہیں :۔

والذين يشترطون اذن الامام	جو لوگ اس کام کے لیے امام کی اجازت کی
يقصدون من هذا الشرط تنظيم	شرط لگاتے ہیں وہ اس شرط کے ذریعہ امر بالمعروف
الامر بالمعروف والنهي عن المنكر[3]	نہی عن المنکر کو منظم کرنا چاہتے ہیں ۔

قرآن وحدیث میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے متعلق جو ہدایات ہیں وہ بالکل عام ہیں اس لیے علماء نے اس شرط کو غیر ضروری قرار دیا ہے اور اس سے اتفاق نہیں کیا ہے۔ امام غزالی فرماتے ہیں :۔

هذا الاشتراط فاسد فان	یہ شرط فاسد ہے کیونکہ (ان بابوں میں) جو آیات
الآيات والاخبار التي اوردناها	احادیث ہم نے نقل کی ہیں وہ بالکل عام انداز میں

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۲۲۶ [2] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۲۸۱ [3] التشریع الجنائی ص ۵۰۰

تدل على ان كل من رأى منكرا فسكت عليه عصى اذ يجب نهيه اينما رآه وكيفما رآه على العموم فالتخصيص بشرط التفويض من الامام تحكم لا اصل له[1]

اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جو شخص کسی منکر کو دیکھے اور خاموش ہو جائے تو اس نے خدا کی نافرمانی کی۔ کیونکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ جہاں کہیں اور جس حالت میں بھی منکر کو دیکھے روک دے۔ پس اس حکم عام میں اس شرط کے ذریعہ تخصیص پیدا کرنا کہ نہی عن المنکر اسی وقت ضروری ہے جب کہ یہ ذمہ داری امام کی طرف سے سونپی جائے بے دلیل بات ہے، جس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

ہم نے ابھی وہ احادیث نقل کی ہیں جن میں حکام کے جور و ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی تعریف کی گئی ہے امام غزالیؒ ان احادیث کا حوالہ دے کر فرماتے ہیں:۔

فاذا جاز الحكم على الامام على مراغمته فكيف يحتاج الى اذن الامام[2]

جب خود امام کے علی الرغم اس پر حق کا اظہار جائز ہے تو وہ امام کی اجازت کا کیسے محتاج ہوگا۔

اسی سلسلے میں مزید فرماتے ہیں:۔

استمرار عادات السلف على الحسبة على الولاة قاطع باجماعهم على الاستغناء عن التفويض بل كل من امر بمعروف فان كان الوالى راضيا به فذاك وان كان ساخطا له فسخطه له منكر يجب الانكار عليه فكيف يحتاج الى اذنه[3]

سلف کا یہ مسلسل رویہ کہ وہ حکام کے خلاف احتساب کرتے رہے ہیں اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ اس کام پر حکام کی طرف سے مامور کیے جانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ جو بھی شخص معروف کا حکم دے اگر حاکم اس سے خوش ہے تو ٹھیک ہے اور اگر وہ اس سے ناخوش ہے تو معروف پر اس کا ناخوش ہونا خود ایک منکر ہے جس پر تنقید ضروری ہے تو پھر یہ کام اس کی اجازت کا کیسے محتاج ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر نہ صرف مسلمان حاکموں کے کرنے کا کام ہے اور نہ اس کے لیے ان کی اجازت کی ضرورت ہے بلکہ یہ ہر مسلمان کا فرض ہے۔ جب بھی وہ اس فرض کو (باقی صفحہ ... پر ملاحظہ ہو)

---

[1] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۲۹۶-۲۹۷ [2] ایضاً ص ۲۷۲ [3] ایضاً ص ۲۷۲

آخرت اور اُس کے حریف عقائد

جناب سلطان مبین صاحب۔ ایم۔ اے (سنسکرت)

رب العالمین نے انسان کو ایسی فطرت بخشی ہے کہ وہ اپنے کاروبار میں دور تک سوچتا ہے۔ وہ اپنے مستقبل کو خوش حال بنانے کے لیے حال کو خطرے میں ڈالتا رہتا ہے۔ کسان مزید حصول کے لیے اپنے گھروں کے اناجوں کو باہر میدانوں میں پھینک آتا ہے۔ لڑکا عالم بننے کے لیے بیسوں سال تک مسلسل سخت ریاضت کرتا ہے۔ حالانکہ اس بات کی ضمانت موجود نہیں ہے کہ کسان فصل کاٹنے کے ایام تک زندہ رہے گا۔ اور نہ غلہ بونا فصل کے تیار ہو جانے کو مستلزم ہے۔ ہر چند کہ زندگی کی وفاداری مشکوک و مشتبہ ہے پھر بھی لڑکا حصولِ علم کے لیے مسلسل جد و جہد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسے تعقل و دانش سے سرفراز کیا ہے کہ وہ احتیاط کے پہلو کو اختیار کرتا رہتا ہے۔ مادی زندگی میں بھی انسان جہاں احتیاط اور تاجیل کی راہ کو چھوڑ کر تعجیل و شہوت کا سودا کر لیتا ہے وہاں لازماً خسران و نقصان سے پالا پڑتا ہے۔ انسان کی یہ احتیاط پسندی انسان پر حجت قائم کر دیتی ہے کہ وہ لذت پرستی اور شہوت کوشی کو چھوڑے اور سختیوں اور مکارہ سے پہلو نہ بچائے تاکہ وہ یوم الفصل کے بعد اپنی کوششوں کے میٹھے پھل کھا سکے۔ اس طرح سے آخرت کا عقیدہ جذبۂ احتیاط پسندی اور فکرِ مستقبل کے عین مطابق ہے۔

اور پھر انسان نے جس دن سے مدنی زندگی گزارنی شروع کی ہے اسی دن سے اس کے شعور نے قانون عدل و انصاف کی ضرورت کی شہادت دی ہے۔ حتیٰ کہ جو فلسفے اور نظام حکومت، یوم دین کے منکر ہیں اور جنھوں نے انسان کے اخلاقی وجود کا انکار کر کے اس کو معاشی وجود بتلایا ہے وہ بھی قیام عدالت کے لیے مجبور ہیں۔ ان کے یہاں بھی عدلیہ کے عملہ اور قانون کے مجلدات جیسی لازم الوجود چیزیں ہیں۔ لطف یہ ہے کہ اب یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ انسان ماحول کا غلام ہے۔ برائیوں کا محرک تنہا آدمی کا ارادہ ہی نہیں ہے بلکہ سماج بھی کم و بیش انسانوں کو گناہ کے ارتکاب کی ترغیب دیتا ہے۔ پھر بھی دنیا بھر کی عدالتیں فقط مجرموں کو ہی سزا دیتی ہیں۔ یہاں تک انسانوں کو معصوم

سمجھنے والے اشتراکی مفکرین رشوت خوار افسروں کو سزائے موت دے کر اپنے کو عادل و حق پرست ہی سمجھتے ہیں —
غرضیکہ ہمارے عدل و انصاف کا معیار کم و بیش یہی ہے کہ ہم سکنڈوں اور منٹوں میں کیے گئے جرائم کی سزا مہینوں اور برسوں میں دیتے ہیں اور پھر ہم جب کو قانون کی گرفت میں پا جاتے ہیں اس کو بخش نہیں سکتے۔ جرم ثابت ہو جانے کے بعد سزا نہ دینا گویا عدالت کی شان کے منافی ہے۔ ذرا سوچیے تو ہم کتنے سخت گیر ہیں ہمارے قانون کا احتساب کتنا کٹھور ہے کہ بے چارہ آدمی جذبات کی رَو میں بہہ کر ایک آدھ منٹ کے لیے کوئی قصور کر بیٹھتا ہے اور پھر ہمارا قانون اس کو سالوں سال کے لیے قید بامشقت کی سزا دے دیتا ہے۔ اور یہ سخت گیری کسی جاہل مطلق العنان شہنشاہ کی نہیں ہے یہ ستمگری فضلا اور حکما کی صوابدید کی سند سے کی جاتی ہے۔ انسانی ہمدردی و مروت رکھنے کے باوجود ہم آخر کیوں اتنے سخت گیر ہیں؟ بات یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اتنی پاکیزہ فطرت پر پیدا کیا ہے کہ اس کا اجتماعی ضمیر جرم کے تصور سے کانپ اٹھتا ہے۔ وہ برائیوں کے اندیشوں سے تلملا اٹھتا ہے۔ اس کا انفرادی ضمیر گناہوں پر اپنے کو کوستا ہے اور آنسو بہاتا ہے۔ ہمارے خالق نے ہمارے اندر ایک محتسب بٹھا رکھا ہے جو ہم کو ارتکاب معاصی سے روکنے کی متواتر کوشش کرتا ہے اور پھر انسانی سماج نے اپنی پاکیزہ فطرت سے مجبور ہو کر اجتماعی طور پر احتساب کا پورا محکمہ کھول رکھا ہے کہ لوگ گناہوں سے باز رہیں اس دائمی اور دوہری نگرانیوں کے باوجود اگر جرم ابھرتا ہے تو لازماً اس کے خلاف ہمارے جذبات بڑے شدید ہوں گے۔ ہماری گرفت اس کو کس کر باندھ لے گی
خلاصۃً ہماری عدالت کا معیار یہ ہے کہ جرم کے اثبات کے بعد سزا لازماً دی جاتی ہے اور منٹ دو منٹ میں کیے گئے ایک آدھ جرم کے بدلے دس دس سال اور بیس بیس سال کے لیے قید و بند میں ڈالا جاتا ہے اور پھر ہماری صوابدید نے عدالت کا یہ بھی معیار قائم کیا ہے کہ تنہا مجرم ہی کو سزا دی جائے اس کے بال بچوں پر ہاتھ نہ بڑھایا جائے۔ جرم کا اثبات ثبوت و صفائی کے بعد ہی ہو۔ ملزم کو بغیر فرد جرم بتلائے قید و بند میں نہ ڈالا جائے۔ اب ذرا آگے بڑھ کر سوچیے۔ ہمارا یہ معیار عدل ہمارے اوپر کتنی بڑی حجت ہے۔ کتنی عظیم شہادت ہے۔ ہمارے پیدا کرنے والے نے ہم انسانوں کو اور فقط بنی نوعِ انسان کو جب جوہر عدل پروری، دادطلبی اور حق رسی سے ممتاز فرمایا ہے تو وہ کیوں نہ ہمارے معیار عدالت ہی کو حجت بناتے ہوئے ہماری زندگیوں کے بے شمار جرائم کے بارے میں بازپرس کرے۔ ہمارے دانشوروں نے عدل و انصاف کا جو معیار قائم کیا ہے قیامت کا عقیدہ اس کے عین مطابق ہے۔ اللہ کی عدالت میں فرداً فرداً ہر شخص کی پیشی ہوگی۔ اس کے کرتوت کا طومار (زندگی کے ہر لمحہ کی تصویریں اور آوازیں) بطور شہادت کھولا جائے گا بندہ کو عذر و معذرت کرکے صفائی پیش کرے گا۔ انسانوں کے حقوق انسانوں سے دلائے جائیں گے اور پھر سزا و

انعام کا فیصلہ ہوگا۔ سزا بھگتنے کے بعد بہت سے وفادار انسانوں کی خلاصی ہوگی۔ باغی انسانوں کو دائمی عذاب کی سزا ہوگی۔ الحاصل قیامت کا فیصلہ ایک معیاری عدالت کا فیصلہ ہوگا جس میں ثبوت و صفائی کے بعد ہی فیصلہ سنایا جائے گا۔ ہر شخص کو اپنا جرم بدیہی طور پر معلوم ہوگا۔ یہاں عقیدہ تناسخ کی طرح سے یا استبدادی حکومتوں کی طرح سے خفیہ کارروائیاں نہ ہوں گی کہ ماخوذ و ملزم کو نہ جرم بتایا جائے نہ سزا کی نوعیت بتائی جائے۔ بات یہ نہیں ہے کہ قیامت کا تصور معیاری عدالت کی کارروائی سے ماخوذ ہے بلکہ تدبیر الٰہی نے ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے کہ انسانی سماج اپنے نظام عدالت سے آسمانی عدالت کی شہادت فعلی دیتا رہے۔

ہر چند کہ قیامت یا یوم الدین کا تصور انسان کے رونگٹے کھڑا کر دینے کے لیے اور راہ راست پر لانے کے لیے بہت کافی ہے۔ مگر انسان غم غلط کرنے کے ہزاروں طریقوں سے واقف ہے۔ اس کی لذت کوشیوں نے عقیدۂ قیامت کے مقابلے میں دوسرے عقائد کو وضع کر لیا۔ ایک طرف ملحدین نے کہا کہ نہ کوئی خالق ہے نہ کوئی جواب دہی ہے دوسری طرف ساحرین نے کہا ہم انسان کو مکھی اور بکرا بنا سکتے ہیں۔ سحر سے متاثر لوگوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ مخلوقات کے انواع و اصناف ایک دوسرے میں بدلتی رہتی ہیں۔ غالباً اس طرح سے تناسخ کے عقیدے کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ عقیدہ بنیادی طور پر الحاد کا شاخسانہ ہی تھا۔ کیونکہ یہاں بھی کسی بازپرس، عدالت، فیصلہ اور دار و رسن کا سرے سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بلکہ یہاں سزا کے بدلے انعام ہی ملتا ہے۔ گناہ گار انسان کو جانوروں کی بے فکر زندگی کا انعام بخشا جاتا ہے۔ تیسری طرف اہل کتاب یہود نے قیامت کے عقیدے کو بھلا دیا اور مسیحی لوگوں نے کفارے کے عقیدے سے کڑکڑانے اور دانت پیسنے کے خطرے سے اپنے کو بچا لیا۔ چوتھی طرف امت مسلمہ نے بھی شفاعت کے عقیدے کو غلط رنگ دے کر قیامت کے عقیدے کو غیر موثر بنا دیا۔ فی الجملہ جنت و جہنم کا تصور کم و بیش ہر مذہب (الا ماشاء اللہ) کے مقدس ادب میں موجود ہے۔ مگر اس کو فلسفیانہ تاویل، تناسخ، کفارہ اور شفاعت کے محرف عقیدے سے بے جان کر دیا گیا ہے۔

ہندوؤں اور بودھوں کا آخرت کے بارے میں تذبذب اور الحاد سے مرعوبیت۔ ہر چند کہ ان دونوں کے پاس جو مقدس ادب ہے اس میں جنت و جہنم کی بڑی تفصیلی روداد ہے ہر چند کہ اکثر و بیشتر ہر مذہب میں آخرت و معاد کا تصور کم و بیش موجود ہے۔ مگر الحادی فلسفوں کی ترویج و اشاعت سے آخرت کا عقیدہ متزلزل ہو گیا ہے اور مرعوب ذہنیت کی وجہ سے بعض مذہبوں کے ترقی پسند و متجدد عالموں نے جنت و جہنم کا انکار کیا ہے اور رنگ جمانے کے لیے جنت و جہنم کی تردید بھی کی ہے۔ یقیناً انیسویں اور بیسویں صدی کے ہندو اور بودھ مذہبوں کے ان ترقی پسند

متکلمین کی یہ وکالت سراسر دیانت و صداقت کے خلاف ہے اور جب مذہبی لوگ دروغ گوئی اور حیلہ سازی پر اتر آئیں تو پھر ایمانداری اور صداقت کا خدا ہی حافظ ہے۔ ان اہل قلم و صاحب فکر بزرگوں پر یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی کہ پرلوک اور آواگون (آخرت و تناسخ) دو متباین و متضاد عقیدے ہیں۔ ان دونوں کو جمع کرنا یقیناً اجتماع ضدین سے کم درجہ کی چیز نہیں ہے۔ پس ہر معقول شخص کے لیے بس ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے اور دوسرے راستہ کی ضرورت خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ ہمارے اس انکار و الحاد کے زمانے میں جنت و جہنم مستبعد و بعید از قیاس سمجھ کر اور تناسخ کو فطری و قرین قیاس سمجھ کر ان بزرگوں نے تناسخ کی وکالت شروع کر دی اور جنت و جہنم کی شہادتوں اور تفصیلوں سے دیدہ و دانستہ آنکھیں بند کر لیں، یا ان کو تحریف و اضافہ کہہ کر عقیدۂ آخرت پر خط نسخ پھیر دیا۔ پھر بھی اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے ان دو آن جہانی ہندو اور بودھ بزرگوں پر یہ حقیقت کھل گئی تھی کہ پرلوک (آخرت) اور آواگون (تناسخ) دو متضاد عقیدے ہیں ان کو ساتھ ساتھ جمع نہیں کیا جا سکتا جب کہ بودھ مذہب و پورانک ہندو مذہب کے جمع و تدوین کرنے والے بزرگوں نے ان دونوں متغایر عقیدوں کو ہم آہنگ و ہم مزاج سمجھ کر پہلو بہ پہلو، شانہ بہ شانہ جمع کر دیا ہے۔ ہندو عوام اگرچہ سورگ و نرک کے قائل ہیں مگر یہ لوگ بڑے شد و مد کے ساتھ عقیدۂ تناسخ کی وکالت کرتے ہیں اور اسی پر زور وکالت سے اچھے خاصے پڑھے لکھے مسلم بزرگ اس دھوکہ میں ہیں کہ ہندو مذہب میں شاید جنت و جہنم کا تصور نہیں ہے۔ میرے مقالہ "خانہ داری و رہبانیت" کے دیکھنے کے بعد میرے ایک مسلم فاضل بزرگ نے فرمایا کہ اس مقالہ میں جنت و جہنم کو سورگ و نرک کا مترادف قرار دیا گیا ہے جبکہ ہندو مذہب میں ان کے خیال کے مطابق روحانی جزا سزا کا تصور ہے اور اسلام میں جنت و جہنم کا ٹھیٹھ تصور ہے۔ ہندو اہل فکر کی آخرت سے بے فکری کی وجہ سے میرے دو مسلم بزرگوں نے مجھ سے ہندو تصور آخرت، سورگ و نرک کی تفصیلات قلمبند کرنے کی فرمائش کی۔ مزید میرے علم میں یہ بات لائی گئی کہ ایک ہندو صاحب نے تناسخ کی اتنی پر زور وکالت کی ہے کہ ان کو قرآن مجید میں بھی تناسخ نظر آیا ہے اور انھوں نے فرمایا ہے کہ دراصل تناسخ ہی قرآنی عقیدہ ہے۔ ہندوستان کے ملا محض ضد و عناد کی وجہ سے تناسخ کی تردید کرتے ہیں اور پھر ان ہندو صاحب نے شاید تحدی کے طور پر اس کو ایک ممتاز مسلم بزرگ کی خدمت میں بھیجا ہے۔ چونکہ یہ خبر مجھ کو ضمناً و رمزاً معلوم ہوئی اس لیے مجھ کو ان کے استدلال کا یکسر علم نہیں ہے۔ میں ان بزرگوں سے فرمائش سے قبل ہی۔ بلکہ سالہا قبل اس عنوان پر کچھ ٹیڑھا سیدھا لکھنا چاہتا تھا مگر ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔ میں نے ارادہ تو کر ہی رکھا ہے کہ موجودہ مذاہب کے عقائد بعد الموت کو بالاستقصا نہیں تو بالاستیعاب

بیان کردوں اور ضمناً و ثانیاً ان پر تقابلی ترجیح کے واجبی اشارات پر بس کروں۔ مگر ملاؤں کی متذکرہ ہٹ دھرمی کا ذکر چھڑ جانے کی وجہ سے ملا ہونے کے ناتے — دس بیس سطروں کی بے ربطی کی معذرت کرتے ہوئے تناسخ کی بلند آہنگی کو مزید زحمت انتشار نہ دینے کی خاطر یہ ضروری ہوگیا ہے کہ کہا جائے کہ تناسخ و الحاد لازم و ملزوم ہیں بلکہ بوجوہ ذیل تناسخ ہمارے موجودہ الحاد سے بدرجہا غیر معقول ہے۔ یہاں فقط اشارات دیے جا رہے ہیں۔ مبحث تناسخ کے مالہ و ماعلیہ میں شواہد و نظائر آگے آرہے ہیں۔ (باقی)

(بقیہ صفحہ ۳۱) کو انجام دینے کی حیثیت میں ہوا سے انجام دینا چاہیے اور وہ انجام دے گا۔ علامہ سعدالدین تفتازانی لکھتے ہیں:-

فان المسلمون فی الصدر الاول وبعدہ یأمرون الولاۃ بالمعروف وینھونھم عن المنکر من غیر نکیر من احد ولا توقیف علی اذن فعلم انہ لا یختص بالولاۃ بل یجوز لاحاد الرعیۃ بالقول والفعل [1]

دورِ اول اور اس کے بعد (بھی) مسلمان حکام کو معروف کا حکم دیتے اور منکر سے منع کرتے تھے نہ تو اس پر کسی نے نکیر کی اور نہ اسے حکام کی اجازت پر موقوف گردانا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ حکام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ عام رعایا کو بھی اجازت ہے کہ وہ قول و فعل سے اس کو انجام دیں۔

[1] شرح المقاصد ج ۲ ص ۲۱۲

شرائطِ ایجنسی

۱۔ ایجنسی کم سے کم ۵ پرچوں پر دی جائے گی۔

۲۔ ۵/- ایڈوانس جمع کرنے ہوں گے۔

۳۔ ۵ سے ۵۰ پرچوں تک ۲۵٪ کمیشن دیا جائے گا۔ البتہ ۵۰ سے زائد رسالوں پر کمیشن ۳۳٪ دیا جائے گا۔

۴۔ رسائل کی روانگی کا خرچ دفتر برداشت کریگا۔ رجسٹری اور وی پی (V P) کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمے ہوگا۔

۵۔ ہر ماہ کا بل باقاعدگی سے ادا کرنا چاہیے۔

منیجر رسالہ زندگی رامپور۔ یوپی

روزہ — ایک ضرورت

جناب محمد فاروق خاں صاحب

انسانی فطرت

اسلام نے اصلاً جس چیز کا مطالبہ انسان سے کیا ہے وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اصل تقاضوں کو سمجھے اور انھیں پورا کرنے کی کوشش کرے۔ وحی کے ذریعہ اللہ نے انسان کو اس کی اپنی ہی فطرت کے تقاضے یاد دلائے ہیں۔ اللہ نے انسان کو اپنی خاص عنایت سے نوازا ہے۔ اسے عام مخلوقات کے مقابلے میں شرف اور عظمت عطا کی ہے اسے یہ صلاحیت بخشی ہے کہ وہ زندگی کے اعلیٰ مفہوم سے وقوف حاصل کر سکے۔ یہی چیز ہے جو اسے عام حیوانات سے ممتاز کرتی ہے لیکن کم لوگ ہیں جنھیں اس کا صحیح احساس ہو۔ عام طور پر ذہنوں پر ان کا حیوانی پہلو ہی غالب ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں کسی شے کو اس کی فطری پاکیزگی میں دیکھنا ممکن نہیں رہتا۔ یہی وجہ کہ بالعموم لوگ زندگی کی اہم قدروں اور بیش قیمت حقیقتوں کے سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔

روزہ کی ضرورت

انسان کی فطرت کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اس کی فطری صلاحیتوں اور قوتوں کے ابھرنے اور نشو و نما پانے کے لیے تعلیم و تربیت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ روزہ جسے اللہ نے ہم پر فرض کیا ہے ایک مقدس ترین عبادت ہی نہیں بلکہ وہ ہماری تربیت کا ایک بہترین ذریعہ بھی ہے۔ روزے کا اصل مقصد طہارت روح اور تقویٰ ہے (البقرہ ۔۔) پاکیزگی حاصل کرنے اور تقوے کے مقام مطلوب تک پہنچنے کے لیے روزہ ایک اہم ذریعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روزہ پچھلی امتوں پر بھی فرض رہا ہے۔ ضبط نفس کے بغیر انسان کے اندر تقویٰ کی کیفیت نہیں پیدا ہو سکتی۔ روزہ ضبط نفس کا ایک مؤثر اور فطری ذریعہ ہے۔ اس کے ذریعہ انسان کو اپنی نفسانی خواہشات پر قابو حاصل ہوتا ہے۔

خواہشات کا بندہ عقل کی عظمت سے بے خبر ہوتا ہے۔ اس کی خواہشات اسے زندگی کی اعلیٰ حقیقتوں اور ضرورتوں

کی طرف سے غافل بنا دیتی ہیں۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک بھرے ہوئے پیٹ سے زیادہ مبغوض شے اور کوئی نہیں ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ایسا آدمی غفلت کا شکار ہوتا ہے۔ غالب بہیمیت اسے اس کا موقع ہی نہیں دیتی کہ وہ اپنی فطرت کے حقیقی تقاضوں کی طرف متوجہ ہو سکے۔ روزہ اس بات کا عملی مظاہرہ ہے کہ اکل و شرب اور جنسی خواہش کی تکمیل کے علاوہ بھی کوئی چیز ہے جو ہماری پوری توجہ کی طالب ہے۔ روزہ بظاہر اس کا نام ہے کہ آدمی سحر کے وقت سے لے کر غروبِ آفتاب تک کھانے پینے اور جنسی خواہش کے پورا کرنے سے رکا رہے لیکن اپنی روح کے اعتبار سے روزہ جس چیز کا نام ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کو اپنی خواہشات پر قابو ہو اور اسے تقوے کی زندگی حاصل ہو۔ اسی حقیقت کے پیش نظر بعض علماء نے کہا ہے کہ بہت سے روزہ دار مفطر کے حکم میں ہوتے ہیں اور بہت سے مفطر روزہ دار کے حکم میں آتے ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ کتنے آدمی بظاہر روزے سے ہوتے ہیں لیکن حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو ان کا روزہ نہیں ہوتا۔ تقوے اور پاکیزگی کی زندگی انھیں حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف کتنے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو صائم نہ ہونے کی حالت میں بھی حقیقت کے اعتبار سے صائم ہوتے ہیں۔ ان کے کان غیبت سے ناآشنا، ان کی نگاہیں عفیف اور پاکباز اور اُن کی زندگی پاکیزگی اور خدا ترسی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ یہ بات اگر ہم میں پیدا نہ ہو سکی تو گویا ہم نے سرے سے روزہ ہی نہیں رکھا۔ چنانچہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

"جس کسی نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہیں چھوڑا تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ شخص اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔"

تشبّہ بالملائکہ

روزہ میں انسان کو فرشتوں سے ایک طرح کی مشابہت حاصل ہوتی ہے۔ فرشتے کھانے پینے کی ساری ضرورتوں سے مستغنی ہیں۔ خدا کی تسبیح و تقدیس ہی ان کی غذا ہے۔ روزہ میں انسان بھی خواہشاتِ نفس سے کنارہ کش ہو کر خدا کی طاعت و عبادت میں مصروف ہوتا ہے۔

جہاد کی روح

حق سے محبت اور باطل سے نفرت یہ انسان کی فطرت کا تقاضا ہے۔ حق سے محبت کا حق انسان سے اسی وقت ادا ہو سکتا ہے جب کہ اسے اپنی قوتوں، اپنی خواہشات اور اپنے ان جذبات پر قابو حاصل ہو جو اسے راستی سے ہٹا کر باطل راہوں پر لگا دیتے ہیں۔ اپنی قوتوں پر قابو پانے کے لیے مجاہدہ اولیں شرط ہے۔ روزہ رکھ کر انسان اپنے نفس سے جہاد شروع کر دیتا ہے۔ اس شخص سے جو اپنے نفس کو زیر نہ کر سکے، اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ حق کی حمایت اور باطل کے استیصال کے لیے جان توڑ کوشش

کرسکتا ہے۔ صبر و عزیمت کے بغیر جہاد ممکن نہیں اور صبر و عزیمت روزے کی خصوصیات میں سے ہے۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے کے مہینے کو "صبر کا مہینہ" فرمایا ہے۔

ہمدردی و مواسات روزے سے صاحب ثروت شخص کو بھی اس کا احساس ہوجاتا ہے کہ بھوک اور فاقے سے انسان کا کیا حال ہوتا ہے۔ عیش و عشرت کی زندگی میں انسان کو دوسروں کی تکلیف اور بھوک پیاس کا احساس نہیں ہو پاتا۔ ایسی حالت میں اس کا قوی اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ انسانی خصوصیات اور ہمدردی کے جذبے سے یکسر محروم ہوجائے۔ روزے کی حالت میں آدمی کو بھوک پیاس کا عملی تجربہ ہوتا ہے۔ اس طرح آدمی کے اندر فطری طور پر یہ احساس ابھرتا ہے کہ وہ ناداروں اور غرباء کے ساتھ ہمدردی سے پیش آئے اور انھیں ان کی پریشان حالی میں نہ چھوڑے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے مہینے کو "مواسات کا مہینہ" فرماتے تھے اور اس مہینے میں آپ حد درجہ فیاض ہوتے تھے۔

خدا کی عظمت کا اظہار روزہ خدا کی بڑائی اور عظمت کا مظہر ہے۔ رمضان کے مہینے میں ایک طرف بندے کی عبدیت اور محکومی کا مظاہرہ ہوتا ہے، دوسری طرف خدا کی آقائی اور بڑائی کا اظہار ہوتا ہے

شکر گزاری روزہ جس طرح سراپا تقوے اور حصول تقوی کا قریب ترین ذریعہ ہے۔ اس طرح وہ سراپا شکر گزاری بھی ہے اور اس میں لوگوں کو اللہ کا شکر گزار بندہ بنانے کی خاصیت بھی پائی جاتی ہے۔ روزہ کے ذیل میں جہاں لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (تاکہ تم تقوے حاصل کرو) فرمایا گیا ہے وہاں یہ بھی فرمایا گیا ہے۔

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ (بقرہ)

اور تاکہ اس ہدایت پر جو تمہیں بخشی ہے اللہ کی بڑائی کرو اور تاکہ تم (اس کا) شکر کرو۔

روزہ مقدس ترین عبادت ہے۔ اس کی حیثیت محض تربیتی کورس کی نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ روزہ اظہار شکر کا ذریعہ بن سکا۔ بنی نوع انسان پر خدا کے احسانات کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے ہمیں قرآن جیسی نعمت سے نوازا۔ قرآن بندوں کے لیے سب سے بڑی نعمت اور رحمت ہے۔ قرآن نے انسان کو حیات ابدی اور دائمی فلاح کا راستہ دکھایا۔ انسان کو اخلاق کے اس بلند مرتبے پر کھڑا کیا جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ روزہ رکھ کر بندہ اس نعمت پر خوشی اور شکر گزاری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ انسان کے مجد و شرف کی اصل حقیقت میں وہ تعلق اور نسبت ہے جو اس کے اور خدا کے درمیان پایا جاتا ہے۔

ہزار جان گرامی فدا بایں نسبت

انسان کے لیے خوشی اور مسرت کے اظہار کا بہترین اور کامل ذریعہ وہی ہے جس سے بندے اور خدا کے درمیان پائے جانے والے تعلق اور نسبت کا اظہار ہوتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ عیدین کے موقع پر اپنی خوشی کا اظہار ہم خاص طور پر تکبیر اور نماز کے ذریعہ کرتے ہیں۔ یہ نماز اور تکبیر مسرت کا اظہار بھی ہیں اور خدا کے حضور بندے کی طرف سے ادائے شکر بھی۔ اسی طرح روزے سے بھی شکر کا عملی مظاہرہ ہوتا ہے۔ خدا نے قرآن نازل فرما کر بندوں پر اپنی نعمت تمام کر دی بندے بھی اس کی خوشی اور شکر گزاری میں روزہ رکھتے اور کامل طہارت اور پاکی کے ساتھ خدا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

عاجزی و خاکساری روزہ سراپا عاجزی اور خاکساری کا اظہار بھی ہے۔ اس لیے کفارۂ سیئات میں روزے کا بڑا دخل ہے چنانچہ شریعت میں کفارے کے طور پر بھی روزہ رکھنے کا حکم آیا ہے۔

قدیم صحیفوں میں بھی اس کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ روزہ سراپا عاجزی و خاکساری ہے۔ اس لیے دعا کی قبولیت اور اللہ کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں اس کا بڑا دخل ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"...... اور خداوند اپنے لشکر کے سامنے للکارتا ہے کیونکہ اس کا لشکر بے شمار ہے اور اس کے حکم کو انجام دینے والا زبردست ہے کیونکہ خداوند کا روز عظیم (ایام اللہ) نہایت خوفناک ہے۔ کون اس کی برداشت کر سکتا ہے؟ لیکن خداوند فرماتا ہے اب بھی پورے دل سے اور روزہ رکھ کر اور گریہ وزاری اور ماتم کرتے ہوئے میری طرف رجوع لاؤ اور کپڑوں کو نہیں بلکہ دلوں کو چاک کرکے خداوند اپنے خدا کی طرف متوجہ ہو کیونکہ وہ رحیم و مہربان قہر میں دھیما اور شفقت میں غنی ہے اور عذاب نازل کرنے سے باز رہتا ہے۔

(یوایل ۲: ۱۱ - ۱۴)

ہمارا روزہ آج ہم روزہ رکھتے ہیں پھر بھی اس سے وہ نتائج حاصل نہیں ہوتے جو فطرتاً اس سے حاصل ہو جانے چاہییں۔ اس کی وجہ حقیقت میں یہ ہے کہ ہم روزہ تو رکھتے ہیں مگر اس کے پورے آداب و شرائط کو ملحوظ نہیں رکھتے روزے میں کھانے پینے سے تو ضرور رک جاتے ہیں لیکن ان بہت سی باتوں سے نہیں رکتے جن سے ہمیں احتراز کا حکم دیا گیا ہے۔ بظاہر ہم روزے سے ہوتے ہیں لیکن ہمارے تمام اعضاء و جوارح اور ظاہری و باطنی قویٰ اور جذبات صائم نہیں ہوتے۔ نہ تو ہم اپنے ہاتھ پاؤں اور اپنی نگاہ اور دل کو منکرات سے روکتے اور نہ ہماری زبانیں بدگوئی غیبت اور کذب وافترا سے محفوظ رہتی ہیں۔ ہمارے کان معصیت کی طرف مائل

آوازوں کو سنتے ہیں اور ہمیں کھانے پینے، لین دین اور دیگر معاملات میں حلال و حرام کا بہت کم خیال ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر ہم روزے سے ثمرات و برکات کی توقع رکھتے ہیں تو یہ ہماری نادانی ہے۔ روزہ تو درحقیقت وہی ہے جس میں اس کے آداب کا پورا لحاظ رکھا جائے اسی سے وہ زندگی میسر آسکتی ہے جسے تقوے اور احسان شناسی کی زندگی کہا جا سکے۔

قدیم صحائف میں بھی ایسے روزوں کو بے وقعت قرار دیا گیا ہے جس کا تقوے، اخلاص نیت اور اعلیٰ اخلاق سے کوئی تعلق نہ ہو۔ ذیل کے فقرے کس قدر مؤثر ہیں۔

"دیکھو تم اس مقصد سے روزہ رکھتے ہو کہ جھگڑا رگڑا کرو اور شرارت کے مکے مارو۔ پس اب تم اس طرح کا روزہ نہیں رکھتے ہو کہ تمہاری آواز عالم بالا پر سنی جائے۔ کیا یہ وہ روزہ ہے جو مجھ کو پسند ہے؟ ایسا دن کہ اس میں آدمی اپنی جان کو دکھ دے اور سر کو جھاؤ کی طرح جھکائے اور اپنے نیچے ٹاٹ اور راکھ بچھائے کیا تو اس کو روزہ دار اور ایسا دن کہے گا جو خداوند کو مقبول ہو؟ کیا وہ روزہ جو میں چاہتا ہوں یہ نہیں کہ ظلم کی زنجیریں توڑیں اور جوئے کے بندھن کھولیں اور مظلوموں کو آزاد کریں بلکہ ہر ایک جوئے کو توڑ ڈالیں کیا یہ نہیں کہ تو اپنی روٹی بھوکوں کو کھلائے اور مسکینوں کو جو آوارہ ہیں اپنے گھر میں لائے اور جب کسی کو ننگا دیکھے تو اسے پہنائے اور تو اپنے ہم جنس سے روپوشی نہ کرے؟ تب تیری روشنی صبح کی مانند پھوٹ نکلے گی اور تیری صحت کی ترقی جلد ظاہر ہو گی۔ تیری صداقت تیری ہراول ہو گی اور خداوند کا جلال تیرا چنڈاول ہو گا ...... اور اگر تو اپنے دل کو بھوکے کی طرف مائل کرے اور آزردہ دل کو آسودہ کرے تو تیرا نور تاریکی میں چمکے گا اور تیری تیرگی دوپہر کی مانند ہو جائے گی (یسعیاہ ۵۸: ۴-۱۰)

"خبردار اپنے راستبازی کے کام آدمیوں کے سامنے دکھانے کے لیے نہ کرو نہیں تو تمہارے باپ (رب) کے پاس جو آسمان پر ہے تمہارے لیے کچھ اجر نہیں ہے۔ (متی ۶: ۱)

"اور جب تم روزہ رکھو تو ریاکاروں کی طرح اپنی صورت اداس نہ بناؤ کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں تاکہ لوگ ان کو روزہ دار جانیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے۔ بلکہ جب تو روزہ رکھے تو اپنے سر میں تیل ڈال اور منہ دھو۔ تاکہ آدمی نہیں بلکہ تیرا باپ (یعنی رب) جو پوشیدگی میں ہے تجھے روزہ دار جانے۔ اس صورت میں تیرا باپ پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھے بدلہ دے گا۔ (متی ۶: ۱۶-۱۸)

اگر روزے سے واقعۃً فائدہ اٹھایا جائے تو وہ اس کو اس مقام پر کھڑا کر دیتا ہے کہ اسے ہر وقت اپنی

ذمہ داری کا احساس رہتا ہے۔ اس کے شب و روز کبھی بے خوفی اور بے پروائی میں نہیں بسر ہوتے۔ شاید آپ نے کبھی ان عورتوں کو دیکھا ہو جو کنوئیں سے پانی بھر کر گھروں میں پہنچاتی ہیں۔ ایسا ہوتا ہے کہ پانی سے بھرا ہوا ایک گھڑا سر پر ہے اور بغل میں بھی۔ پانی کا گھڑا لیے ہوئے ہیں راستے میں کوئی جان پہچان کی عورت مل گئی تو رک کر اس سے باتیں بھی کر لیتی ہیں۔ گفتگو کے وقت دیکھا گیا ہے کہ گھڑا سر پر ہے۔ ہاتھ اس سے الگ کیے ہوئے ہیں لیکن کیا مجال کہ سر سے گھڑا گر جائے۔ بظاہر وہ گفتگو میں مصروف ہوتی ہیں لیکن ان کی توجہ گھڑے کی طرف سے ہٹنے نہیں پاتی۔ انھیں اپنے گھڑے کا پورا خیال رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ گھڑا گرنے سے محفوظ رہتا ہے۔ روزہ کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے اس میں بھی آدمی کو ہمہ وقت اس کا احساس ہونا چاہیے کہ وہ روزے سے ہے۔ وہ اپنے روزے کی طرف سے غافل نہ ہو۔ روزے کی حفاظت کو اپنا فرض سمجھے۔ کامیاب ہے وہ شخص جس پر یہ حقیقت کھل گئی کہ اس کی ذمہ داری صرف روزے کے ظاہری آداب و شرائط کی نگہداشت تک محدود نہیں ہے بلکہ اس سے آگے یہ بھی اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ روزے کے اصل مقصد سے غافل نہ ہو۔ آپ جانتے ہیں روزے کی جو اصل غرض و غایت ہے وہ صرف روزے کے زمانے میں مطلوب نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق انسان کے پورے عرصۂ حیات سے ہے۔

مصلحت پرست منافق

مصلحت پرست آدمی جب دین کی راہ کٹھن دیکھتا ہے اور خوب ناپ تول کر دیکھ لیتا ہے کہ دینِ حق کا ساتھ دینے کے نقصانات، کفار کے ساتھ جا ملنے کے فوائد سے زیادہ ہیں تو خالص عافیت اور منفعت کی خاطر، دین اور اہلِ دین سے منہ موڑ لیتا ہے، کافروں سے رشتۂ دوستی استوار کرتا ہے اور اپنے مفاد کی خاطر ان کی کوئی ایسی خدمت بجا لانے سے بھی باز نہیں رہتا جو دین کے سخت خلاف اور اہلِ دین کے لیے نہایت نقصان دہ ہو لیکن اس کے ساتھ وہ اس امکان سے بھی آنکھیں بند نہیں کر لیتا کہ شاید کسی وقت دینِ حق ہی کا بول بالا ہو جائے اس لیے جب کبھی اسے مسلمانوں سے بات کرنے کا موقع ملتا ہے وہ ان کے نظریے کو حق ماننے اور ان کے سامنے اپنے ایمان کا اقرار کرنے اور راہِ حق میں ان کی قربانیوں کو خراجِ تحسین ادا کرنے میں ذرہ برابر بخل نہیں کرتا تاکہ یہ زبانی اعترافات سند رہیں اور بوقتِ ضرورت کام آئیں۔ (ماخوذ)

رسائل و مسائل

عورت کے سربراہ مملکت ہونے کا مسئلہ

سوال

(۱) ماہنامہ "برہان" دہلی نومبر ۱۹۶۴ء کے نظرات میں لکھا گیا ہے :۔

مس فاطمہ جناح کی حمایت اگر خالص سیاسی یا ملکی مصالح کے پیش نظر کی جاتی اور اسلام کا پاؤں درمیان میں نہ آتا تو غنیمت تھا۔ دین سے تلاعب اور شریعت محمدی سے بازیگری کے جرم کا ارتکاب تو نہ ہوتا لیکن ستم بالائے ستم یہ ہے کہ صدر ایوب کی مخالفت میں جو علما پیش پیش ہیں وہ اعلان پر اعلان کر رہے ہیں کہ اسلام میں ایک عورت کا سربراہ مملکت ہونا ممنوع نہیں ہے اور ایک بڑے مولانا نے تو چیلنج کیا ہے کہ اگر ممنوع ہے تو کوئی شخص بتائے کہ قرآن میں یا حدیث میں اس کا ذکر کہاں ہے ؟

ایک بڑے مولانا سے اشارہ غالباً مولانا مودودی کی طرف ہے اس لیے کہ انہیں کے بارے میں سنا گیا ہے کہ انھوں نے اس مسئلے میں کوئی چیلنج کیا ہے۔ آپ ہمیں بتائیے کہ کیا واقعی انھوں نے عورت کی سربراہی کے ممنوع ہونے کا ثبوت مانگا ہے اور چیلنج کیا ہے کہ یہ ممانعت کوئی شخص قرآن اور حدیث میں دکھائے ؟

(۲) پاکستانی جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے اپنے فیصلے میں کہا ہے :۔

"شریعت میں جو چیزیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں ان میں سے بعض کی حرمت ابدی اور قطعی ہے جو کسی حالت میں تبدیل نہیں ہو سکتی اور بعض کی حرمت ایسی ہے جو شدید ضرورت کے موقع پر ضرورت کی حد تک جواز میں تبدیل ہو سکتی ہے عورت کو امیر بنانے کی ممانعت اسی قسم میں ہے "

کیا واقعی شریعت نے حرمتوں کے درمیان یہ تقسیم کی ہے یا پاکستانی جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے یہ قاعدہ خود گھڑ لیا ہے ؟ اضطرار اور اکراہ کی صورت میں تو بعض حرام چیزوں کے استعمال کی رخصت مشہور ہے لیکن یہ شدید ضرورت کی نئی اصطلاح کہاں سے نکل آئی ؟

امید ہے کہ آپ زندگی کے رسائل و مسائل میں ان دو باتوں پر روشنی ڈالیں گے تاکہ ہماری الجھن دور ہو۔

جواب

اگر ایک بڑے مولانا سے مولانا مودودی مراد ہیں اور غالب قرینہ یہ ہے کہ وہی مراد ہیں تو میں ان کے الفاظ یہاں نقل کرتا ہوں جو انھوں نے اپنی تقریریں کہے تھے۔ دعوت دہلی نے اپنے ۱۶ اکتوبر کے سہ روزہ ایڈیشن میں نوائے وقت لاہور کے حوالے سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:-

"لاہور ۱۳ اکتوبر۔ امیر جماعت اسلامی پاکستان مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے چیلنج کیا ہے کہ کوئی شخص یہ ثابت نہیں کرسکتا کہ از روئے شریعت عورت کا سربراہ مملکت ہونا حرام ہے اور اس سلسلے میں استثنا کی قطعی گنجائش نہیں۔ آپ نے کہا کہ حکومت لوگوں کو مذہب کے نام پر گمراہ کر رہی ہے۔ آپ نے کہا کہ حکومت کی جانب سے جماعت اسلامی پر الزام عائد کیا گیا ہے کہ وہ دین میں اختراع کرنا چاہتی ہے"

اس چیلنج کا پس منظر یہ ہے کہ مولانا مودودی کے جیل سے باہر آنے سے پہلے ۵ اکتوبر کو جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے صدارتی انتخاب میں مس فاطمہ جناح کی حمایت کا فیصلہ کیا اور اپنے فیصلے میں صراحت کے ساتھ یہ بات کہی کہ موجودہ غیر معمولی حالات میں ایک عورت کا سربراہ مملکت ہونا شرعاً ناجائز نہیں ہے' اس نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ جماعت کو ایک شرعی قباحت کی بنا پر اس انتخاب کو قبول کرنے میں تامل رہا لیکن حالات غیر معمولی ہیں اور غیر معمولی حالات میں جو فیصلہ ہم نے کیا ہے وہ آئندہ کے لیے نظیر نہیں بن سکے گا اصل شرعی قاعدہ اپنی جگہ پر قائم رہے گا اس کے بعد اس نے وہ عبارت لکھی ہے جو آپ کے سوال ۲ میں درج ہے۔ اس فیصلے کا شائع ہونا تھا کہ حکومت اور اس کے حواریین جماعت کے خلاف پروپگنڈے میں سرگرم ہوگئے۔ مولانا مودودی جب جیل سے باہر آئے تو انھوں نے مجلس شوریٰ کے فیصلے کی توثیق کردی۔ اس توثیق نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور پروپگنڈے کی مشین پوری قوت سے چالو ہوگئی۔ اس کے بعد ۱۳ اکتوبر کو انھوں نے وہ چیلنج کیا جس کا ذکر اوپر گزرا۔ اب آپ خود دیکھ لیں کہ مولانا مودودی نے چیلنج کس چیز پر کیا ہے اور کن الفاظ میں کیا ہے اور مدیر برہان ان کی طرف کیا منسوب کر رہے ہیں۔ انھوں نے مودودی صاحب کے پہلے جملے کو لے لیا اور دوسرے جملے کو یعنی "اور اس سلسلے میں استثنا کی قطعی گنجائش نہیں" کو چھوڑ دیا جو پہلے جملے کی توضیح و تقیید کر رہا تھا۔ مولانا مودودی چیلنج اس بات پر کر رہے ہیں کہ کوئی شخص از روئے شریعت عورت کے سربراہ مملکت ہونے کو ایسا حرام ثابت نہیں کرسکتا جس میں استثنا کی قطعی گنجائش نہ ہو اور فاضل مدیر برہان ان کی طرف یہ منسوب کر رہے ہیں کہ وہ عورت کے سربراہ مملکت ہونے کی ممانعت ہی کو تسلیم نہیں کرتے اور اپنے مخالفین سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ یہ ممانعت قرآن اور حدیث میں دکھاؤ کہ کہاں ہے؟ اور لطیفہ

یہ ہے کہ مجلس شوریٰ کے فیصلے سے قطع نظر جس کی توثیق مودودی صاحب نے کی ہے خود انھوں نے بارہ چودہ سال کے عرصے میں اپنی متعدد تحریروں میں قرآن و حدیث کے دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ عورت سربراہ مملکت اسلامی نہیں ہوسکتی۔ مدیر برہان نے جو بات ان کی طرف منسوب کی ہے اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ انھوں نے صرف جماعت کی مجلس شوریٰ ہی کو چیلنج نہیں کیا جس کے فیصلے کی وہ توثیق کرچکے ہیں بلکہ اپنے آپ کو بھی چیلنج کیا۔ ناطقہ سربہ گریباں کہ اسے کیا کہیے۔

مدیر برہان اس سے پہلے بھی ۶۲ء میں منیر رپورٹ پر ایمان لاکر مولانا مودودی کی طرف ایک انتہائی غلط بات منسوب کرچکے ہیں اور اس مسئلے میں بھی شاید کسی دوسرے منیر کی رپورٹ پر ایمان لاکر یا بطور خود دوسری غلط بات منسوب کی ہے اور لطیفہ بر لطیفہ یہ ہے کہ فاضل مدیر نے "ان حضرت سے کوئی پوچھے" کے تحقیر آمیز خطاب سے قرآن و حدیث کے دلائل بھی ارشاد فرمائے ہیں اور یہ دلائل اس شخص کو بتائے گئے ہیں جو دس بارہ سال پہلے بدلائل ان سے بہتر طور پر یہ ثابت کرچکا ہے کہ عورت اور مرد کے حدود کار الگ ہیں اور عورت کا سربراہ مملکت ہونا جائز نہیں ہے اور یہ چیز اتنی مشہور ہے کہ مدیر برہان جیسے وسیع المطالعہ شخص کا اس سے ناواقف ہونا بہت مستبعد ہے جو ماشاء اللہ کناڈا کی مک گل یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات میں ایک سال قیام کرکے بہت سے لکچرز دے آئے ہیں۔

مولانا مودودی کے علاوہ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، جناب مفتی شفیع صاحب اور مفتی مہدی حسن صاحب کے فتوے بھی شائع ہوچکے ہیں کہ خاص حالات میں عورت سربراہ مملکت ہوسکتی ہے لیکن مدیر برہان کے نظرات میں اس کی طرف کوئی اشارہ بھی موجود نہیں ہے اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ یہ حضرات خاص حالات میں جواز کے قائل ہیں اور مولانا مودودی بقول مدیر برہان مطلق جواز کے قائل ہیں۔ "خاص حالات" میں جواز کے فتوے پر اعتراض نہ کرنے کی وجہ سے خیال ہوتا ہے کہ کہیں مدیر برہان بھی خاص حالات میں اس کے جواز کی تائید تو نہیں کرتے۔ اگر ایسا ہے تب تو مودودی صاحب اور مدیر برہان میں اختلاف ہی نہ رہا، کیونکہ فی الواقع مولانا مودودی بھی غیر معمولی حالات ہی میں جواز کے قائل ہیں۔

مولانا مودودی پر "دین سے تلاعب" اور "شریعت محمدی سے بازی گری" کا الزام لگانا بہت آسان ہے یہ الزام تو گلی گلی چاٹ بیچنے والا ان پڑھ اور بے عمل خوانچہ فروش بھی لگا سکتا ہے۔ فاضل مدیر برہان تو ماشاء اللہ صدر شعبۂ دینیات ہیں۔ اس میدان کے مرد مرد صرف وہی نہیں ہیں بلکہ اب تک اس مسئلے پر دو مرحلوں کے بھی بڑے بڑے لفظ نکل چکے ہیں لیکن کسی ایک میں بھی اصل مسئلے پر بحث نہیں کی گئی ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کیا عورت کی سربراہی کی حرمت منصوص

کی ہے کہ اس میں استثنار کی قطعی گنجائش نہیں ہے ، جہاں تک مجھے علم ہے آج ۲۵ نومبر ۸۴ء تک کسی مرد میدان نے اس کو دلیل سے ثابت نہیں کیا۔

لکھنؤ کے ایک محترم عالم دین نے مولانا تھانوی کے فتوے کو برحق قرار دے کر یہ ارشاد فرمایا ہے کہ پاکستان کے حالات پر اس کا انطباق صحیح نہیں ہے لیکن انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ اس سے مولانا مودودی کے دعوے کی تائید ہو رہی ہے یا تردید؟ مولانا تھانوی کے فتوے سے استثنار تو ثابت ہو ہی گیا۔ اس کا انطباق صحیح ہے یا نہیں یہ الگ مسئلہ ہے اور اس میں اختلاف ہو سکتا ہے چنانچہ مفتی شفیع صاحب کے نزدیک پاکستان کے موجودہ حالات پر اس کا انطباق صحیح ہے

بہت سے لوگ مولانا مودودی کی سابق تحریریں پیش کر کے یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ اپنے موقف سے ہٹ گئے ہیں لیکن اب تک کسی نے مولانا کی کوئی ایسی تحریر پیش نہیں کی جس میں انھوں نے لکھا ہو کہ اس مسئلے میں استثنار کی کوئی گنجائش نہیں ہے طفیل محمد صاحب قیم جماعت اسلامی پاکستان نے اپنے ایک بیان میں تبدیلی موقف کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے :-

> اسلامی ریاست کی سربراہی کے لیے دوسری شرائط کے ساتھ مرد ہونا بھی ایک شرط ہے اس قاعدے کا مولانا مودودی یا جماعت اسلامی کے کسی دوسرے شخص نے انکار کب کیا تھا کہ اس کے لیے اب مولانا مودودی صاحب کی تصنیفات سے لمبے چوڑے حوالے دینے کی ضرورت ہو — اصل مسئلہ یہ ہے کہ کیا عورت کو سربراہ مملکت بنانا فی الواقع ایسا حرام ہے کہ اس میں کسی شدید سے شدید ضرورت کی بنا پر بھی شریعت میں استثنار کی گنجائش نہ ہو۔ یہی ابدی اور قطعی حرمت کے لیے کوئی دلیل کسی کے پاس ہو تو وہ پیش کرے ۔ (شہاب لاہور ۸ نومبر ۶۴ء)

عقائد و کلام کی کتابیں پڑھ جائیے ہر کتاب میں آپ کو خلافت و امامت کی شرطیں مطلق انداز میں ملیں گی ان میں استثنار کی صراحت نہیں ملے گی لیکن فقہا نے دوسرے شرعی دلائل کے پیش نظر بعض شرطوں میں استثنار کیا ہے اور بعض شرطیں تو ایسی ہیں جن کو آج علمار کی کثیر تعداد شرط ماننے پر بھی تیار نہیں ہے۔ کتب عقائد کے مصنفین، امام نووی اور شاہ ولی اللہ وغیرہم نے خلیفہ کے قریشی ہونے کی شرط پر اہل السنۃ والجماعۃ کا اجماع نقل کیا ہے لیکن آج مولانا مودودی پر تالیاں پیٹنے والے حضرات بھی اس اجماعی شرط کا انکار کرتے ہیں ۔

امام المسلمین کے لیے جو شرطیں ہیں ان میں مرد ہونا بھی ایک شرط ہے اور بالغ ہونا بھی ایک شرط ہے یعنی کوئی بچہ صدر مملکت نہیں ہو سکتا اور یہ شرط مرد ہونے کی شرط سے زیادہ اجماعی اور متفقہ ہے کیونکہ مرد ہونے کی شرط میں ابن جریر طبری کا اختلاف ہے لیکن بالغ ہونے کی شرط میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ ایک ایسی اجماعی شرط میں بھی فقہا نے استثنار کیا ہے

درمختار میں ہے :-

وتصح سلطنة متغلب للضرورة	ضرورت کی بنا پر بزور قبضہ کر لینے والے کی سلطنت
وكذا اصبى	صحیح ہوتی ہے اسی طرح ضرورتاً بچے کی سلطنت بھی
(برحاشیہ شامی جلد ابحث امامت کبری)	صحیح ہوتی ہے۔

علامہ شامی (للضرورة) کے تحت لکھتے ہیں :-

هی دفع الفتنة ولقوله صلی	یہ ضرورت فتنے کو دفع کرنا ہے اور اس کی
الله علیه وسلم اسمعوا واطیعوا	دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول بھی ہے کہ سنو اور
ولو امر علیکم عبد حبشی	اطاعت کرو اگرچہ تم پر کوئی نکٹا حبشی غلام حاکم بنا دیا
اجدع	گیا ہو۔

چونکہ غیر مکلف بچہ امور سلطنت انجام نہیں دے سکتا اس لیے ایسی صورت میں فقہاء نے کہا ہے کہ کسی اہل شخص کو امور سلطنت کی انجام دہی کے لیے مقرر کیا جائے۔ رسمی طور پر تو وہ بچہ صاحب اقتدار رہا اور حقیقۃً اقتدار اس شخص کے ہاتھ میں ہو جو اس بچے کا تابع بنایا گیا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک غیر مکلف بچہ ضرورت کے وقت صدر مملکت بنایا جا سکتا ہے تو پھر ایک مکلف اور ذمہ دار عورت کیوں نہیں بنائی جا سکتی۔ اس قیاس کو رد کرنے کی وجہ کیا ہے؟

اس تفصیل سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ ہر حالت میں عورت کے صدر مملکت ہونے کی حرمت اب تک ثابت نہیں ہو سکی ہے اور دوسری یہ کہ مولانا مودودی پر دین سے تلاعب کا الزام غلط ہے۔

(۲) آپ کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ ائمہ احناف نے اصول شرع یا اصول فقہ پر جو کتابیں لکھی ہیں ان میں یہ تقسیم موجود ہے اس مسئلے پر مفصل اصولی بحث کا یہ موقع نہیں۔ ذیل میں محض اختصار سے چند باتیں عرض کرتا ہوں۔

ائمہ احناف کی کتابوں میں موجود ہے کہ بعض مامور بہ (جس کا شریعت نے حکم دیا ہے) ایسے ہیں کہ کسی حال میں بھی سقوط کو قبول نہیں کرتے یعنی کسی حال میں بھی مسلمان کے لیے اس کی گنجائش نہیں کہ وہ اس کی خلاف ورزی کر سکے ہر حال میں وہ اس حکم کا مکلف باقی رہتا ہے یہاں تک کہ اکراہ کی حالت میں بھی وہ حکم اس سے ساقط نہیں ہوتا — مثلاً ایمان یعنی تصدیق قلبی۔ اگر کسی مسلمان کی گردن پر تلوار بھی رکھی ہوئی ہو تو اسے رخصت نہیں کہ اپنی تصدیق قلبی کو ختم کر کے کفر و شرک کو قبول کرے۔ یہ تصدیق قلبی شریعت کا وہ حکم ہے جو کسی حال میں ساقط نہیں ہوتا —

بعض مامور بہ ایسے ہیں جو بعض حالات میں سقوط کو قبول کرتے ہیں یعنی مسلمان سے اس حالت میں وہ حکم ساقط ہو جاتا ہے اس کی دو مثالیں ہیں۔ (۱) اقرار لسانی۔ ایمان کے دو جز ہیں قلبی تصدیق اور زبانی اقرار۔ اس کا پہلا جز کسی حالت میں ساقط نہیں ہوتا جیسا کہ اوپر کہا گیا لیکن دوسرا جز یعنی زبانی اقرار حالت اکراہ میں ساقط ہو سکتا ہے یعنی اس حالت میں کلمہ شرک و کفر منہ سے نکالنے کی رخصت مل جاتی ہے شرط یہ ہے کہ دل ایمان پر مطمئن ہو۔ (۲) نماز۔ یہ عبادت اپنے ذاتی حسن کے باوجود ایک ایسا حکم ہے جو کسی عارض و مانع کی وجہ سے ساقط ہو جاتا ہے مثلاً حالت حیض و نفاس میں صرف یہی نہیں کہ عورت سے نماز کا حکم ساقط ہو جاتا ہے بلکہ اس حالت میں اس کے لیے نماز حرام ہو جاتی ہے۔

قلبی تصدیق بھی فرض ہے اور نماز بھی فرض ہے لیکن ایک کی فرضیت کبھی تبدیل نہیں ہوتی اور دوسرے فرض کی فرضیت بعض حالات میں حرمت سے تبدیل ہو جاتی ہے ——— اسی طرح بعض منہی عنہ (جس سے شریعت نے منع کیا ہے) ایسے ہیں کہ ہر حال میں ممنوع اور حرام رہتے ہیں ان کی حرمت کبھی نسخ کو قبول نہیں کرتی مثلاً کفر یعنی قلبی انکار۔ دل کا کفر ایک ایسا حرام ہے جس کی حرمت ابدی ہے اور کبھی تبدیل نہیں ہوتی یعنی کسی حال میں بھی اس کی رخصت نہیں ہے کہ مسلمان دل سے کفر کو قبول کرلے۔ اس کی دوسری مثال زنا ہے۔ یہ حرام بھی ایسا ہے کہ کسی حالت میں اس کی حرمت تبدیل نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بے حیائی کسی ملت اور کسی شریعت میں کبھی مباح نہیں ہوئی اور بعض حرام ایسے ہیں جو بعض حالات میں مباح ہو جاتے ہیں مثلاً سور کا گوشت اور شراب کہ ان دونوں کا استعمال حالت اضطرار میں مباح ہی نہیں بلکہ ضروری ہو جاتا ہے اگر کوئی شخص بھوک سے مر رہا ہو اور حرام گوشت کے سوا کوئی غذا موجود نہ ہو تو اسے حرام گوشت کھا لینا چاہیے۔ اگر نہ کھائے اور مر جائے تو گنہگار ہوگا۔ اسی طرح اگر پیاس سے کسی کی جان نکل رہی ہو اور شراب کے سوا کچھ موجود نہ ہو تو اس کو شراب پی لینی چاہیے اگر نہ پیے اور مر جائے تو گنہگار ہوگا۔

اتنی توضیح بھی یہ جاننے کے لیے کافی ہے کہ پاکستانی جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے جو بات کہی ہے وہ اس کی من گھڑت نہیں ہے۔ ائمہ احناف نے یہ جو کچھ کہا ہے بلا دلیل نہیں کہا ہے بلکہ قرآن و حدیث کے دلائل کو سامنے رکھ کر کہا ہے ان دلائل کو یہاں پیش کرنا موجب طوالت ہے اور اسی اندیشے کی بنا پر میں نے اصول فقہ کی عربی عبارتیں نقل نہیں کی ہیں۔

کوئی شخص اس تقسیم کو دلائل سے رد کر سکتا ہے لیکن اگر یہ کہے کہ فقہا نے یہ تقسیم شرعی دلیل کے بغیر ایجاد

کرلی ہے یا انھوں نے ایک ایسا اصول وضع کر دیا ہے جس سے پوری شریعت ختم ہو سکتی ہے تو اس کی بات ماخذ شرع سے واقفیت رکھنے والوں کے لیے لائق التفات نہ ہوگی۔ کوئی صاحب علم اس کی جرأت غصے کی مدہوشی میں تو کر سکتا ہے، ہوش و حواس کی سلامتی کے ساتھ یہ بات نہیں کہہ سکتا۔

اضطرار مجبوری کو کہتے ہیں اور اکراہ زبردستی کو۔ اکراہ میں کسی دوسرے شخص یا اشخاص کی طرف سے دباؤ ہوتا ہے اور اضطرار میں کسی دوسرے شخص کی طرف سے زبردستی ضروری نہیں ہے۔ "ضرورۃ" کا لفظ فقہی اصطلاح میں ایسی شدید احتیاج کے لیے استعمال ہوتا ہے کہ اس کو نظر انداز کرنا شخصی یا اجتماعی طور پر سخت نقصان کا سبب بن جائے اس لیے اضطرار اور "ضرورت" میں کوئی خاص فرق باقی نہیں رہتا۔ ویسے لغوی اعتبار سے بھی دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ اضطرار کے معنی بھی احتیاج الی الشیٔ کے ہیں اور ضرورت کے معنی بھی حاجت کے ہیں۔ لسان العرب میں ایک لغوی کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔

الضرورۃ اسم لمصدر الاضطرار	ضرورۃ مصدر اضطرار کا اسم ہے تم کہتے
تقول حملتنی الضرورۃ علی کذا وکذا	ہو کہ مجھے ضرورت نے فلاں اور فلاں کام پر مجبور کیا

ابھی آپ نے اوپر پڑھا ہے کہ زبردستی سلطنت پر قبضہ کر لینے کی صحت اور بچے کے سربراہ مملکت بنائے جانے کی صحت ثابت کرنے کے لیے صاحب درمختار نے "ضرورۃ" ہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور علامہ شامی نے ضرورت کی تشریح دفع فتنہ سے کی ہے۔ الضرورات تبیح المحذورات کا فقہی قاعدہ تو بہت مشہور ہے۔ یہی فقہی "ضرورت" ہے جس کو وہاں کی مجلس شوریٰ نے "شدید ضرورت" کہا ہے اور یہ احتیاطاً اس لیے کی گئی ہوگی کہ اردو میں ضرورت کا لفظ ہر چھوٹی بڑی حاجت کے لیے استعمال ہوتا ہے اس سے بچنے کے لیے اس پر "شدید" کا اضافہ کیا گیا ہے یہ اصطلاح بھی انھوں نے ایجاد نہیں کی ہے بلکہ فقہاء نے "ضرورۃ" کی اصطلاح اپنی کتابوں میں بکثرت استعمال کی ہے

یہ مسئلہ کی مختصر توضیح تھی۔ باقی رہی یہ بات کہ جماعت اسلامی پاکستان نے مس فاطمہ جناح کی حمایت کا جو فیصلہ کیا ہے وہ اسے کرنا چاہیے تھا یا نہیں؟ یا یہ بات کہ وہاں حالات اس استثناء کی گنجائش پیدا کرتے ہیں یا نہیں تو اس کے بارے میں وہیں کے لوگ بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔ راقم الحروف اس کے بارے میں پورے اعتماد کے ساتھ کوئی رائے نہیں دے سکتا۔

سید احمد قادری

انتہائی مشکل کام

جن واقعات پر تبصرہ مقصود ہے وہ تاریخ کے اعتبار سے پرانے ہو چکے ہیں لیکن اپنے اثرات کے اعتبار سے نئے ہیں اور معلوم نہیں کب تک نئے رہیں گے۔ ایک کا تعلق گاندھی جی کے قتل میں شریک دو قیدیوں کی رہائی اور ان کے قاتل ناتھورام گوڈسے کی برسی منانے سے ہے اور دوسرے کا تعلق بھارت کے انگریزی پریس سے ہے۔ گزشتہ ماہ جب گوپال گوڈسے اور کرکرے جیل سے رہا کیے گئے تو مہاراشٹر میں ان کا شاندار خیر مقدم کیا گیا۔ خیر مقدمی جلسے میں سیکڑوں مردوں اور عورتوں نے شرکت کی۔ جوشیلی تقریریں ہوئیں اور ایک اخبار نویس نے برملا اس کا اعلان کیا کہ وہ گاندھی جی کے قتل کی سازش سے واقف تھا اور اس نے یہ بھی کہا کہ اس وقت بمبئی کے وزیر اعلیٰ (جن کا انتقال ہو چکا ہے) بھی اس سے واقف تھے۔ جب اس نے اس طرح سربستہ رازسے پردے اٹھانے شروع کیے تو گوپال گوڈسے نے اس کو روکنے کی کوشش کی، اس پر اس نے پوری دلیری کے ساتھ کہا کہ اب حکومت مجھے گرفتار نہیں کر سکتی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگرچہ میں واقف تھا لیکن میں ناتھورام کو قتل سے روکتا رہا یعنی وہ گاندھی جی کے قتل کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن اس اخبار نویس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ اس خیر مقدمی تقریب میں کیوں شریک ہوا ہے؟

پھر غالباً نومبر کی ۱۵ تاریخ کو مہاتما گاندھی کے قاتل ناتھورام گوڈسے اور نارائن آپٹے کی سولھویں برسی منائی گئی جس میں تقریباً تین سو اشخاص نے شرکت کی۔ اس جلسے میں اکھنڈ بھارت کے نقشے پر گوڈسے کی تصویر لٹکائی گئی تھی۔ قاتل کے قریبی ساتھیوں گوپال گوڈسے، وشنو کرکرے اور اے جی کرندکا نامی جرنلسٹ نے پوجا کی۔ اکھنڈ بھارت کی سرحدوں کے نقشے کو بجلی کے چھوٹے بلبوں سے اور دریائے سندھ کو سرخ بلبوں سے نمایاں کیا گیا تھا۔ قاتل کے چھوٹے بھائی نے اپنے بڑے بھائی ناتھورام کی وصیت پڑھ کر سنائی۔ گاندھی جی کے قاتل نے اپنی وصیت میں لکھا ہے کہ اس کی راکھ دریائے سندھ میں اس وقت بہائی جائے جب وہ سبز پرچم کے

بجائے بھگوا جھنڈے کے نیچے آجائے۔ گوڈسے کے قریبی ساتھی مسٹر کرکرے نے اس تقریب میں بھگوت گیتا کا وہ نسخہ ہندو مہاسبھا کا بھگوا جھنڈا اور کرشن جی کی وہ تصویر دکھائی جو اس نے پھانسی کے وقت اپنے پاس رکھ لی تھی۔ متعدد مقررین نے ناتھورام کو کرشن جی اور شیواجی کا سچا پیرو اور "شہید" قرار دیا۔

ناتھورام بھارت کے اس طبقے کا ایک فرد تھا جس کی نمائندگی راشٹریہ سیوک سنگھ، جن سنگھ اور ہندو مہا سبھا کی جماعتیں کرتی ہیں۔ یہ بات بھی معلوم ہے کہ گاندھی جی کے قتل کا قریبی سبب یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے قتل عام کو پسند نہیں کرتے تھے اور پاکستان بن جانے کے بعد ان کا خیال تھا کہ اس ملک سے رشتہ، دشمنی کا نہیں دوستی کا رکھنا چاہیے۔ ان کا یہ جرم اس طبقے کے نزدیک ناقابل معافی تھا، اور جب گاندھی جی اپنی روش سے کسی طرح نہ ہٹے تو انہیں قتل کر دیا گیا۔ ناتھورام نے اپنی وصیت میں جو بات کہی ہے وہ صرف اس کی تمنا نہیں ہے بلکہ ان تمام جماعتوں کی تمنا ہے جن کا ذکر اوپر گزرا۔ اور یہ جماعتیں اپنے ماننے والوں کی تعداد کے لحاظ سے بھی کم نہیں ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ ان کا اصل ہدف مسلمان ہی ہیں۔

اب سوچیے کہ بھارت کے مسلمان کس طرح کے لوگوں کے درمیان گھرے ہوئے ہیں اور کیسی ذہنیت سے ان کا سابقہ ہے۔ کیا اس ذہنیت کو بدلنا انتہائی مشکل کام نہیں ہے؟

ہندوستان کے انگریزی اخبارات، اب بھی اس ملک میں اپنے اثرات کے لحاظ سے تمام دوسرے اخبارات سے زیادہ وزن رکھتے ہیں اور ان کی اکثریت، اپنی پالیسی کے اعتبار سے جارحانہ قوم پرستی کی قائل بھی نہیں ہے۔ اس پر ملک کی ترقی یا اس کے زوال کی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس سے توقع تھی کہ یہ جارحانہ قوم پرستی کو کمزور کرنے اور ملک میں ایسی فضا ہموار کرنے کے لیے کام کرے گا جس میں ہندوستان کے تمام باشندے امن و سکون سے رہ سکیں اور ملک کی ترقی میں اپنا حصہ ادا کر سکیں، لیکن اس پریس کی پانچ چھ کروڑ مسلمانوں کے بارے میں عجیب و غریب پالیسی ہے۔ آل انڈیا مجلس مشاورت کے وفد نے مدھیہ پردیش اور بمبئی کا دورہ کیا تھا اردو اخبارات میں جو رپورٹ شائع ہوئی ہے اس سے معلوم ہوا کہ وفد نے تقریباً ہر مقام پر ایک پریس کانفرنس بھی منعقد کی اور تمام بڑے بڑے انگریزی اخبارات کے نمائندوں اور خبر رساں ایجنسی کو دعوت دی لیکن بحیثیت مجموعی ایجنسی نے بھی اور انگریزی اخبارات نے بھی دورے کی روداد کو بلیک آؤٹ کیا۔ حد یہ ہے کہ بمبئی میں بھارت کے وزیراعظم نے مسلم مجلس مشاورت کے لیے بھی چند کلمات خیر کہے تھے لیکن ان کے وہ کلمات نہ ریڈیو سے شائع کیے گئے اور نہ انگریزی اخبارات میں چھاپے گئے۔ ان کے بیان کے اس حصہ کو سبھوں نے حذف کر دیا۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا انگریزی اخبارات کی بڑی تعداد مہا سبھائی یا جن سنگھی نہیں ہے اور ریڈیو تو براہ راست حکومت کے کنٹرول میں ہے لیکن اس کے باوجود ان سب کا رویہ بھارت کے مسلمانوں کے ساتھ وہ ہے جس کا ذکر اوپر گزرا۔ ایسا کیوں ہے ؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ حکومت اور اکثریت کے بیشتر ادارے بھی ایک بات پر متفق ہیں اور وہ یہ ہے کہ بھارت میں مسلمانوں کو قطعاً کوئی اہمیت نہ دی جائے۔ ان کو فائدہ پہنچانے والی خبروں کا بلیک آوٹ کیا جائے ان کی مشکلات کو حل کرنے والے مسائل سے دلچسپی نہ لی جائے۔ ان کی بڑی بڑی جماعتوں کو بھی نظر انداز کیا جائے اور ان کے باہمی اتحاد کو تقویت نہ پہنچائی جائے۔ اس ملک میں کچھ افراد تو ضرور ایسے ہیں جو مسلمانوں سے ہمدردی رکھتے ہیں اور ان کو مبتلائے مصیبت نہیں دیکھنا چاہتے لیکن غیر مسلموں کی کوئی ایک جماعت بھی ایسی نہیں ہے جو ان سے واقعی ہمدردی رکھتی ہو اور انہیں ان کے حقوق دینے پر تیار ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ان حالات میں اکثریت کے ذہن کو بدلنا انتہائی مشکل کام ہے لیکن کیا اس سے گھبرا کر ہمیں مایوس ہو جانا چاہیے ؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ مومن اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا۔ حالات کی شدت تقاضا کرتی ہے کہ ہم ذہنی انقلاب کی جدوجہد کو تیز سے تیز کر دیں سب سے پہلے خود مسلمانوں کو اپنے سوچنے کا انداز بدلنا ہوگا۔ انہیں دوسروں پر بھروسہ کرنے کی عادت ترک کرنی پڑے گی۔ اللہ پر توکل اور اپنے اخلاق و کردار کی قوت پر اعتماد کی عادت ڈالنی ہوگی۔ قوموں کی اہمیت یونہی تسلیم نہیں کی جاتی بلکہ قومیں اپنی اہمیت خود تسلیم کراتی ہیں۔ مسلمانوں کا مقام و منصب تو یہ ہے کہ وہ دوسرے مظلوموں اور بے کسوں کا سہارا بنیں، نہ یہ کہ خود دوسروں کا سہارا ڈھونڈیں۔ جس دن مسلمان اللہ کی ڈوری کو مضبوطی کے ساتھ تھام کر منظم ہو گئے اسی دن ان کی اہمیت وافادیت تسلیم کر لی جائے گی اور پھر کسی کے لیے ممکن نہ ہوگا کہ انہیں نظر انداز کر سکے۔ آئیے ہم اور آپ سب مل کر یہ عزم کر لیں کہ بھارت میں ہمیں مسلمان بن کر زندہ رہنا اور اسلام کا پیغام تمام باشندگان ملک تک پہنچانا ہے

قومی جمہوری کنونشن

قومی جمہوری کنونشن ۲۹-۳۰ نومبر کو دہلی میں منعقد ہوئی۔ اس میں کیا کچھ ہوا، اس کی تفصیل اردو اخبارات میں آچکی ہے۔ مجھے ان باتوں کو دہرانا نہیں ہے۔ صرف ایک پہلو پر چند سطریں لکھنی ہیں اور وہ یہ ہے کہ اکثریت کے بڑے بڑے انگریزی اور ہندی اخبارات نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ توقع تھی کہ اس کنونشن کی تقریروں،

تجویزوں اور کارروائیوں کو ان اخبارات میں ضرور جگہ ملے گی مگر ہوا یہ کہ تجویزیں اور کارروائیاں تو الگ رہیں خطبۂ صدارت اور خطبۂ استقبالیہ تک کا کوئی حصہ ان اخبارات کے صفحات میں بار نہ پاسکا۔ اس کا سبب اس کے سوا اور کیا تھا کہ ان خطبوں میں مسلمانوں کے مصائب کا ذکر ہمدردی کے جذبات کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ہاں ہندی اخبارات میں شرف قبولیت صرف مرارجی ڈیسائی کی تقریر نے حاصل کیا اور بس۔

اس کنونشن نے مزید ثبوت بہم پہنچایا کہ مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں اکثریت کے اخبارات کی پالیسی کیا ہے۔ مسلمانوں کے لیے ہمدردی کے کلمات چاہے جس منہ یا جس قلم سے بھی نکلیں وہ اس لائق نہیں ہیں کہ اس ملک کے بڑے بڑے اخبارات میں جگہ پاسکیں۔ اس صورت حال سے نمٹنا کس قدر مشکل کام ہے لیکن اکثریت کے ذہن کو بدلنے کا یہ مشکل کام بہرحال مسلمانوں کو کرنا ہے اور اتحاد و اتفاق کے ساتھ کرنا ہے۔

مدینہ – ۱۲ر دسمبر ۶۲ء

تنقید و تبصرہ

فوائدِ جامعہ بر عجالۂ نافعہ

تالیف شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی شارح مولانا محمد عبدالحلیم چشتی۔ قیمت قسم اول، پندرہ ۱۵ روپیہ
قسم دوم، بارہ ۱۲ روپیہ۔
ناشر:۔ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ۔ کراچی۔ پاکستان

مجلد رنگین گرد پوش کے ساتھ بڑے سائز کے چھ سو صفحات کی یہ کتاب نور محمد کارخانہ تجارت کتب نے بڑے اہتمام سے شائع کی ہے اور وہ اپنی اس علمی خدمت پر مبارک باد کا مستحق ہے۔ عجالۂ نافعہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا فارسی زبان میں ایک مختصر رسالہ ہے۔ یہ مختصر رسالہ علم حدیث کے طلبہ کے لیے بہت مفید ہے اور متعدد بار چھپ چکا ہے۔ اسی رسالے کی مولانا عبدالحلیم چشتی نے مزید تصحیح کی، ترجمہ کیا اور مفصل فوائد لکھے۔ اس طرح مختصر رسالہ ایک ضخیم کتاب بن کر شائع ہوا ہے اس کتاب کی ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے فارسی کا رسالہ چھاپا گیا ہے اس کے بعد اس کا ترجمہ اور پھر فوائد۔ فارسی رسالہ ۲۶ صفحات میں آیا ہے۔ ترجمہ ص۳۱ سے ص۶۲ تک اس کے بعد فوائد۔ اس ترتیب کا فائدہ یہ ہے کہ فارسی کا رسالہ اور اس کا اردو ترجمہ دونوں الگ الگ مستقل رسالے بن گئے ہیں، نہ فارسی رسالہ پڑھنے میں ترجمہ دخل انداز ہوتا ہے اور نہ ترجمہ پڑھنے میں فارسی دخل انداز ہوتی ہے۔ فوائد پر نمبر لگے ہوئے ہیں اور وہ الگ ایک مستقل کتاب بن گئی ہے —— یہ کتاب بڑی معلومات افزا اور قابل قدر ہے۔ اس کتاب پر جو محنت صرف کی گئی ہے وہ ماخذ کی فہرست سے واضح ہو جاتی ہے۔ اس فہرست میں دو سو سولہ ماخذوں کا مختصر تعارف موجود ہے۔ میں نے فارسی رسالہ اور اس کا ترجمہ پورا پڑھا ہے اور فوائد کے متعدد مضامین پڑھ سکا ہوں بالاستیعاب ان کے مطالعہ کا موقع نہ مل سکا۔ ص۲۲ کے بعد ۴۸ صفحات کا ایک مستقل حصہ اس کتاب میں شامل ہے جس میں صرف ملا علی قاری اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا تذکرہ ہے تقریباً چھ صفحات میں ملا علی قاری کا ذکر ہے اور باقی صفحات میں شیخ عبدالحق کا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں تذکرے

بعد کو مرتب کیے گئے ہیں۔ اس لیے ان کو کتاب کے درمیان میں الگ سے داخل کرنا پڑا۔ شیخ عبدالحق کا مفصل تذکرہ ہے اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مولانا عبدالحلیم چشتی نے ان کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ ملا علی قاری کے تذکرے میں مرتب نے مورخ عصامی شافعی کی ایک عبارت نقل کی ہے۔ میں یہاں صرف اس کا ترجمہ نقل کرتا ہوں جو مرتب نے کیا ہے :۔

> موصوف ائمہ پر اعتراض کی وجہ سے آزمائش میں آ گئے تھے خاص طور پر امام شافعی اور ان کے اصحاب پر اعتراض کی وجہ سے۔ موصوف نے ارسال کے مسئلے میں امام مالک پر بھی اعتراض کیا۔ اس لیے تم ان کی تالیفات کو نورِ علم سے خالی پاؤ گے اور اسی وجہ سے بہت سے علماء اور اولیاء اللہ نے ان کی کتابوں کے مطالعے سے منع کیا ہے۔"

اس عبارت کے آخری حصے پر لکیر تبصرہ نگار نے کھینچی ہے کیونکہ عبارت کا یہ حصہ حیرت انگیز ہے محض اس جرم میں کہ ملا علی قاری نے امام شافعی اور امام مالک پر علمی تنقید کی تھی، ان کی تالیفات کو نورِ علم سے خالی قرار دیا گیا، ان کے مطالعہ کی ممانعت کی گئی اور مزید کے طور پر بہت سے علماء اور اولیاء اللہ کی فوج بھی بلالی گئی۔ مورخ عصامی کو یہ کیا معلوم تھا کہ ان کی سعی رائگاں جائے گی، ملا علی قاری کی تصنیفات، مشرق و مغرب میں پھیلیں گی اور صرف حنفی ہی نہیں ہزاروں شافعی اور مالکی بھی ان سے استفادہ کریں گے اور ان تصنیفات کو نورِ علم سے مملو پائیں گے۔

اس کتاب میں امام ابن تیمیہ کا تذکرہ پڑھ کر احساس ہوا کہ فاضل مرتب کا ذہن ان کی طرف سے صاف نہیں ہے۔ مخالفین نے ان کی طرف اللہ تعالیٰ کی جسمیت و ترکیب کا جو عقیدہ منسوب کیا ہے اس کا ذکر بغیر کسی تنقید کے اس کتاب میں موجود ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب ہر علمی لائبریری کی زینت بننے کے لائق ہے۔

ہندو مت اور توحید مولانا سید حامد علی۔ صفحات ۹۶۔ کاغذ، کتابت، طباعت بہتر۔ قیمت مع محصول ڈاک ۸۰ پیسے۔ ناشر :- ادارۂ شہادت حق (وقف) خیر نگر۔ میرٹھ۔ یوپی۔

ادارہ شہادت حق سے مولانا سید حامد علی کی جو مفید تصنیفات شائع ہو رہی ہیں، یہ کتاب بھی اسی سلسلۂ مطبوعات کا نمبر ۱۱ و ۱۲ ہے۔ فاضل مرتب نے پیش لفظ میں لکھا ہے :۔

> "کسی مذہب کو پیش کرنے کے تین طریقے ہیں۔ (۱) مذہب پر اعتراض کرنے کے لیے اس کی صورت مسخ کر دی جائے۔ (۲) مذہب کو اس کے اصل مآخذ سے جوں کا توں پیش کر دیا جائے۔ (۳) کسی مذہب کے بہتر پہلو اگر

جس انداز میں سے پیش کرتے ہیں اسی انداز میں اسے سامنے رکھا جائے۔

ہم نے ہندومت کے سلسلے میں اکثر و بیشتر تیسرا اور پھر دوسرا طریقہ اختیار کیا ہے۔ پہلی صورت سے نہ صرف یہ کہ اجتناب کیا ہے بلکہ تنقید کی زبان بند رکھتے ہوئے ہم نے ہندومت کی وہ بہتر سے بہتر تصویر پیش کی ہے جو اس کے بہترین داعی پیش کرتے ہیں "

مولانا نے یہ جو کچھ لکھا ہے، یہ کتاب اس پر پوری اترتی ہو۔ مولانا نے اپنی اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے :-

اس موضوع پر اتنا مستند، سنجیدہ اور وافر مواد آپ کو ان شاء اللہ کہیں اور نہ مل سکے گا۔ ضرورت اس کے غائر مطالعہ اور اسے زیادہ سے عام کرنے کی ہے "

مولانا کی اس رائے سے بھی تبصرہ نگار کو اتفاق ہے۔ مسلمانوں کے لیے تو یہ کتاب معلومات افزا ہے ہی میرا خیال ہے کہ خود ہندو بھائی بھی اس سے اچھا خاصہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

جمالِ صابر کلیری مرتبہ وحید احمد صاحب مسعود صفحات ۷۶۔ قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ :— نظامی بک ایجنسی بدایوں۔ یوپی۔

اس مختصر کتاب میں مخدوم علاؤالدین علی احمد صابر قدس سرہ العزیز کے سوانح حیات شریعت اور طریقت کی روشنی میں مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے مرتب بدایوں کے ایک معروف فرد ہیں جنھوں نے مولانا محمد علی جوہرؒ کے ساتھ تحریکِ خلافت میں کام کیا ہے اور چھ برس تک یوپی گورنمنٹ میں پارلیمنٹری سکریٹری کے فرائض بھی انجام دیے ہیں۔ مرتب نے لکھا ہے کہ مخدوم علی صابر کے حالات کسی مستند تاریخ میں نہیں ملتے آپ کے حالات میں جو تذکرے لکھے گئے ہیں وہ آپ کے وصال سے چار سو برس کے بعد لکھے گئے ہیں اور محض قیاسی اور از قسم ایجاد بندہ ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے بارے میں بہت سے مہملات و خرافات مشہور ہو گئے ہیں۔ فاضل مرتب نے خرافات کی تردید کر کے معقول اصولوں کو سامنے رکھ کر حالات کی تحقیق کی ہے۔ فاضل مرتب کی اس تحقیق کو مخدوم صابر کے حلقۂ ارادت و عقیدت میں قبول کیا جائے گا یا نہیں؟ یہ ایک مشکوک بات ہے اس لیے کہ روحانیت کی دنیا کو عقل کی دسترس سے باہر تسلیم کیا جاتا ہے اور سیکڑوں برس پہلے کے بزرگوں سے براہ راست کسب فیض کو بھی خارج از امکان تصور نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کے دعوے کیے جاتے ہیں اور یہ دونوں باتیں فاضل مرتب نے بھی تسلیم کی ہیں اس صورت میں جن لوگوں نے بذریعہ کشف یا براہ راست مخدوم صاحب سے گفتگو

کرکے تذکرے مرتب کیے ہیں وہ فاضل مرتب کے قیاس پر اپنے مکاشفہ ومجاہدے کو کیوں قربان کریں گے
مرتب کی ایک عبارت تبصرہ نگار کی سمجھ میں نہ آئی لکھتے ہیں ۔

ان کے سلسلے کے اٹھارہویں خلیفہ حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہاجر مکی کی تبلیغ خاص طور پر سمجھنے کے قابل ہے۔ ان کے خلفا نے اگرچہ بہترین کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں مگر رہی سہی صابری تعلیم کو بھی مادیت میں تبدیل کر دیا ہے ۔ (صفحہ ۶۴ – ۶۵)

معلوم نہیں اس عبارت کا کیا مطلب ہے ۔ بہرحال کتاب محنت سے مرتب کی گئی ہے اور کم از کم سلسلۂ صابریہ سے تعلق رکھنے والوں کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے ۔ (ع ۔ ق)

بقیہ اشارات

وَالْاَرْضِ ۭ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ (روم)

یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب کا مالک ہے ۔ سب کے سب اس کے تابع دار ہیں ۔

پھر یہ تابعداری و اطاعت گزاری جبر و زور سے نہیں بلکہ خوشی اور رغبت کے ساتھ ہے ۔

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَاۗءِ وَهِىَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ۭ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَاۗىِٕعِيْنَ ○ حم السجدہ ۲ ۱۱

پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اس حال میں کہ وہ دھواں تھا اس نے آسمان اور زمین سے کہا ۔ بطوع و رغبت آؤ یا بجبر و زور ۔ ان دونوں نے کہا ۔ ہم رغبت اور خوشی کے ساتھ حاضر ہیں ۔

آسمان و زمین، سورج اور چاند، درخت اور پہاڑ، چرند و پرند کو ہم مجبور صرف اس معنی میں کہتے ہیں کہ جو خدمت ان کے ذمے لگائی گئی ہے وہ اس سے سرتابی کی مجال نہیں رکھتے اس معنی میں نہیں کہ جو خدمت و پرستش ان کے ذمے کی گئی ہے وہ اسے بجبر و اکراہ انجام دے رہے ہیں نہیں بلکہ سب کے سب اللہ کے حضور بطوع و رغبت سربسجود ہیں اور جو خدمت بھی انجام دے رہے ہیں پوری خوشی سے انجام دے رہے ہیں ۔

ان آیتوں کو پڑھیے اور اس کے بعد سورۂ احزاب کی آیت امانت کا مطالعہ کیجیے تو صاف معلوم ہوگا کہ اللہ نے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے جو امانت پیش کی تھی اور جسے قبول کرنے سے انھوں نے انکار کیا وہ

برگزیدہ خدمت اور وہ پرستش نہیں ہو سکتی جسے وہ اپنے یوم پیدائش سے انجام دیتے رہے تھے بلکہ یہ امانت کوئی اور شے تھی جسے قبول کرنے کے وہ اہل نہ تھے۔ اس تفصیل سے یہ سوال پھر لوٹ آیا ہے کہ وہ امانت کیا تھی جسے قبول کرنے سے انھوں نے انکار کیا اور انسان نے قبول کر لیا؟

اس سوال کا صحیح جواب یہ ہے کہ وہ "امانت" دنیا میں خدا کی خلافت و نیابت تھی جسے قبول کرنے سے پوری کائنات تھرا اٹھی۔ ایک ایسا "عہدۂ تکلیف" ایک ایسی باشعور و بااختیار ذمہ داری جس کی ٹھیک ٹھیک ذمہ داری پر سلطان کائنات کی خوشنودی اور اس کی لہلہاتی ہوئی جنت کا وعدہ اور جس میں خیانت و نافرمانی کے کرتوت پر اس کے غضب اور بھڑکتی ہوئی جہنم کی وعید تھی اور یہ بات ظاہر ہے کہ اللہ نے انسان کو صرف اپنی پرستش کا مکلف نہیں قرار دیا ہے بلکہ بہت سے فرائض و واجبات کا مکلف قرار دیا ہے اس لیے اگر سورۂ ذاریات کی آیت میں عبادت کا مفہوم صرف پرستش لیا جائے تو سورۂ احزاب کی آیت امانت سے ٹکراؤ پیدا ہو گا۔

(۳) سورۂ ہود آیت (۷) میں فرمایا:-

"اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا جب کہ اس سے پہلے اس کا عرش پانی پر تھا۔ تاکہ تم کو آزما کر دیکھے کہ تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے"

یہی مضمون ایک دوسرے انداز میں سورۂ کہف آیت (۷) میں یوں ادا کیا گیا ہے:-

"یہ جو کچھ سروسامان زمین پر ہے اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ ان لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے"

سورۂ ملک آیت (۲) میں ارشاد ہوا:-

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ — جس نے موت اور زندگی پیدا کی تاکہ تم کو
لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا — جانچے، تم میں کون اچھا عمل کرتا ہے۔

ان آیتوں نے واضح الفاظ میں بتایا کہ صرف انسان ہی کی تخلیق نہیں، بلکہ یہ سارا ہنگامۂ وجود جس غرض سے برپا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کے حسن عمل کی آزمائش کی جائے۔ یہ دیکھا جائے کہ ان میں کون اچھے عمل کرتا ہے اور کون برے عمل؟ آسمان و زمین کی غایت تخلیق بھی یہی تھی کہ زمین پر انسان کو بسا کر اس کے عمل کی آزمائش کی جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ "اچھا عمل" کیا صرف خدا کی پرستش میں محدود ہے؟ کیا قرآن نے معمولی واقفیت

رکھنے والا انسان بھی اس طرح کی بات کہہ سکتا ہے ؟ سورۃ انعام کی آخری آیت میں فرمایا :-

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ	وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور
الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ	تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں بلند درجے
دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ ۔	دیئے تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے

سوال یہ ہے کہ انسان کو جو کچھ دیا گیا ہے کیا اس کی آزمائش صرف پرستش سے پوری ہو جاتی ہے ؟ اگر انسانی اعمال کے دائرے میں پرستش کے علاوہ بھی بہت سے اعمال داخل ہیں اور یقیناً داخل ہیں اور اگر انسان کے زیر تصرف دنیا میں بہت سی چیزیں دی گئی ہیں جن میں اس کی آزمائش مقصود ہے تو پھر سورۃ ذاریات میں عبادت کے معنی صرف پرستش لینا کسی طرح بھی صحیح ہے ؟ اور اگر یہ مفہوم لیا جائے تو کیا ان آیتوں سے اس کا تصادم نہیں ہوتا ؟ اس طرح کا تضاد تو کسی عاقل انسان کے کلام میں بھی نہیں پایا جانا چاہیے۔ اللہ رب العلمین کے کلام میں کس طرح پایا جائے گا کہ کہیں تو وہ کہہ دے کہ انسان کو ہم نے دنیا میں اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے، کہیں کہے کہ ہم نے اس کو ایک ایسی امانت سپرد کی ہے جس کو قبول کرنے سے آسمان، زمین اور پہاڑ بھی لرز اٹھے، کہیں کہے کہ ہم نے یہ سارا ہنگامۂ وجود انسان کے اعمال و تصرفات کی آزمائش کے لیے برپا کیا ہے اور سورۂ ذاریات میں یہ فرما دے کہ ہم نے انسان کو صرف اپنی پرستش کے لیے پیدا کیا ہے۔ جو لوگ پرستش کے سوا زندگی کے دوسرے معاملات میں اللہ کی اطاعت سے راہ فرار اختیار کرنے کے لیے سورۂ ذاریات کی زیر بحث آیت کو استعمال کرتے ہیں ان سے گفتگو نہیں، ہاں جو لوگ واقعی خدا کے فرماں بردار بندے کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں انہیں ضرور غور کرنا چاہیے کہ انھوں نے اس آیت میں عبادت کے معنی صرف پرستش لے کر کس قدر دھوکا کھایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں بھی اللہ نے اپنی عبادت کا مطالبہ کیا ہے اس میں اس کی والہانہ پرستش اور غلامانہ اطاعت دونوں داخل ہیں اور انسانی زندگی کا کوئی شعبہ اس کی عبادت کے دائرے سے خارج نہیں ہے۔ مسجد میں جا کر نماز پڑھنا بھی عبادت ہے اور بازار میں بیٹھ کر صداقت و دیانت کے ساتھ تجارت کرنا بھی عبادت ہی ہے۔

(۴) اگر سورۂ ذاریات کی آیت میں 'عبادت' کے معنی صرف پرستش ہیں، اطاعت اس میں داخل نہیں تو سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پرستش کس طرح کی جائے ؟ کیا انسان کو اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہے اللہ کی پرستش کرے ؟ اگر اختیار حاصل نہیں ہے بلکہ اس میں اللہ کے احکام کی اطاعت ضروری ہے تو پھر ثابت

ہو گیا کہ اس آیت میں عبادت کے معنی صرف پرستش نہیں ہیں، پرستش اور اطاعت دونوں ہی ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ انسان صرف پرستش میں خدا کی اطاعت کا مکلف ہے اور دوسرے امور و معاملات میں مکلف نہیں ہے تو دوسرا سوال یہ پیدا ہوگا کہ اس تفریق کی دلیل کیا ہے؟ کیا اس تفریق کے لیے کوئی عقلی اور شرعی دلیل لانا ممکن ہے؟

صحیح بات یہ ہے کہ جو لوگ عبادت کو صرف پرستش کے معنی میں لیتے ہیں وہ سوچ سمجھ کر یہ بات نہیں کہتے اس لیے کہ کوئی مخلص مسلمان اس تفریق کا قائل نہیں ہو سکتا کہ اعمال پرستش میں تو انسان خدا کی اطاعت کا مکلف ہے اور دیگر معاملات میں مکلف نہیں ہے اور نہ یہ کہہ سکتا ہے کہ پرستش کے سوا انسان کسی اور چیز کا مکلف نہیں ہے۔

اگر ذرا گہرائی میں اتر کر دیکھیے تو واقعہ یہ ہے کہ کوئی پرستش بھی اطاعت سے خالی نہیں ہوتی، کبھی اس کی اطاعت ہوتی ہے جس کی پرستش کی جارہی ہے اور کبھی پرستش کسی کی ہوتی ہے اور اطاعت کسی اور کی یہاں تک کہ پتھر کے بتوں کی پرستش بھی اطاعت سے خالی نہیں ہوتی وہاں یا تو آباء و اجداد کی اطاعت ہوتی ہے یا شیطان کی یا اپنے نفس کی۔

اتنی وضاحت کے بعد اس کی ضرورت نہ تھی کہ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ کے بارے میں مفسرین کرام کی تفسیریں نقل کی جائیں لیکن مزید توثیق کے طور پر امام رازی کی تفسیر نقل کر رہا ہوں۔ وہ اس آیت کی تفسیر میں ایک سوال قائم کر کے اس کا جواب دے رہے ہیں۔

امام رازیؒ کی تفسیر

ما العبادة التی خلق الجن والانس لها؟ قلنا التعظیم لامر الله والشفقة علی خلق الله فان هذین النوعین لم یخل شرع منهما واما خصوص العبادات والشرائع مختلفة فیها بالوضع والهیئة والقلة والکثرة والزمان والمکان والشرائط والارکان ولما کان التعظیم اللائق بذی الجلال والاکرام لا یعلم عقلا لزم اتباع الشرائع فیها

وہ عبادت کیا ہے جس کے لیے جن و انس پیدا کیے گئے ہیں؟ ہم کہتے ہیں کہ وہ امر الٰہی کی تعظیم اور خلق خدا پر شفقت ہے اس لیے کہ ان دونوں سے کوئی شریعت خالی نہیں رہی ہے۔ ہاں، ان دونوں نوعوں کی عبادات اور جزئی احکام اپنی وضع و ہیئت قلت و کثرت، زمان و مکان اور شرائط و ارکان کے لحاظ سے مختلف رہے ہیں اور چونکہ ایسی تعظیم جو اللہ ذو الجلال والاکرام کے لائق ہو صرف عقل سے معلوم نہیں ہو سکتی اس لیے اس میں شرعی احکام کی پیروی اور قول رسول کی اتباع لازمی ہوئی اس لیے اللہ

والآخر يتعلق بالرسل عليهم السلام فقد انعم الله تعالى — نے رسول بھیج کر اور عبادت کی ان دونوں نوعوں
عباده بارسال الرسل ليوضحوا السبل في نوعي العبادة — کے طریقے واضح کرکے اپنے بندوں پر احسان فرمایا ہے"

اس عبارت سے بھی بصراحت معلوم ہوا کہ سورۂ ذاریات کی اس آیت میں "عبادت" صرف پرستش کے معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ اس عبادت کے دائرے میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں داخل ہیں اور انسان عبادت کی ان دونوں قسموں کا مکلف ہے۔ عبادت کی دو قسمیں ہیں، ایک کا تعلق حقوق اللہ سے ہے اور دوسری کا حقوق العباد سے۔ اللہ کا حق ادا کرنا بھی عبادت ہے اور بندوں کا حق ادا کرنا بھی عبادت ہے اور انسان کی تخلیق ان دونوں ہی عبادتوں کے لیے ہوئی ہے۔ امام رازی کی اس تصریح سے بھی یہ بات واضح ہوئی کہ انسان پورے دین اسلام کی پیروی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ کیونکہ دین اسلام حقوق اللہ اور حقوق العباد کے مجموعے ہی کا نام ہے۔ دین کا کوئی حکم بھی لے لیجیے اس کا تعلق حقوق اللہ سے ہوگا یا حقوق العباد سے، یا دونوں سے، اس کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جس کا تعلق نہ اللہ کے حق سے ہو اور نہ بندے کے حق سے۔

اس تفصیل سے پوری طرح یہ بات واضح ہوگئی کہ سورۂ ذاریات کی اس آیت کا غلط مطلب نکال کر جو لوگ صرف نماز، روزے، تسبیح و تہلیل اور اسی طرح کے دوسرے مظاہر پرستش ہی کو عبادت سمجھتے ہیں اور زندگی کے دوسرے معاملات میں اللہ و رسول کے احکام کی اطاعت کو عبادت نہیں سمجھتے وہ سخت دھوکے میں مبتلا ہیں آخرت میں تو جو کچھ ہوگا وہ ہوگا ہی اس دنیا میں بھی اس غلط فہمی نے امت مسلمہ کو بہت نقصان پہنچایا ہے اور پہنچا رہی ہے۔

اگر کوئی شخص یا گروہ ان دلائل کو تسلیم نہیں کرتا اور اپنے آپ کو جنات کا خلیفہ سمجھنے اور عبادت کو صرف پرستش ہی میں محدود کرنے پر اصرار کرتا ہے تو اس کو اس کا اختیار ہے۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست (باقی)

فہرست مندرجات ماہنامہ "زندگی" از جولائی تا دسمبر ۱۹۶۴ء

اشارات

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوع بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	ماہ
۱	سید احمد قادری	اقامتِ دین کے نصب العین پر کتاب و سنت کے دلائل	۳۳	۱	جولائی ۱۹۶۴ء
		"	"	۲	اگست ۶۴ء
		"	"	۳	ستمبر ۶۴ء
		"	"	۴	اکتوبر ۶۴ء
		امتِ مسلمہ کا نصب العین	"	۵	نومبر ۶۴ء
۲	مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی	مسلم مشاورتی اجتماع لکھنؤ پر مفصل اظہار خیال	"	۶	دسمبر ۶۴ء

ارشاداتِ رسولؐ و آثار صحابہؓ

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوع بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	ماہ
۱	شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ	شرح دعائے انسؓ (مترجمہ سید احمد قادری)	۳۳	۳	ستمبر ۶۴ء
۲	مولانا جلیل احسن ندوی	نبی صلی اللہ علیہ کی دو باتیں	"	۶	نومبر ۶۴ء
۳	مولانا ابو بکر اصلاحی	اسلامی معاشرے کی چند اقدار	"	۶	دسمبر ۶۴ء

مقالات

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوع بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	ماہ
۱	سید احمد قادری	انسان کا اخلاقی وجود و مکارم اخلاق کی تکمیل } آخری قسط	"	۲	اگست ۶۴ء
		ہمارے ہفتہ وار اجتماعات	"	۵	نومبر ۶۴ء
		جگر کی غزلیہ شاعری (تنقیدی مقالہ)	"	۶	دسمبر ۶۴ء
۲	جناب سلام اللہ پریمی	سیرت نبوی کی چند جھلکیاں	"	۴	اکتوبر ۶۴ء
۳	مولانا جلال الدین عمری	اسلام میں خدا اور رسول کا تصور	"	۳	ستمبر ۶۴ء
		امر بالمعروف و نہی عن المنکر (قسط ۵) (چار قسطیں مارچ تا جون ۶۳ء میں شائع ہوئی ہیں)		۵	نومبر ۶۴ء
		امر بالمعروف و نہی عن المنکر (قسط ۶)		۶	دسمبر ۶۴ء
۴	مولانا جلیل احسن ندوی	تذکیر القرآن	"	۵	نومبر ۶۴ء
		"	"	۶	دسمبر ۶۴ء
۵	جناب سلطان مبین ایم اے	جنت جہنم اور تناسخ	"	۳	ستمبر ۶۴ء
۶	ڈاکٹر عبد الحق انصاری	قرآن و سنت کا اخلاق	"	۳	ستمبر ۶۴ء

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوع بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	ماہ
۶	ڈاکٹر عبدالحق انصاری	تصوف کا اخلاقی آئیڈیل	۴۳	۳	اکتوبر ۱۹۶۴ء
۷	جناب محمد فاروق خاں	حکمت نبوی اور حسن اخلاق	؍؍	۱	جولائی ۶۴ء
۸	مولانا نجات اللہ صدیقی	امام ابو یوسف کا معاشی فکر (۱)	؍؍	؍؍	؍؍
		؍؍ (۲) ختم شد	؍؍	۲	اگست ۶۴ء
۹	مولانا محمد یوسف اصلاحی	قرآنی تعلیمات	؍؍	۱	جولائی ۶۴ء
		پردہ (۱)	؍؍	۲	اگست ۶۴ء
		؍؍ (۲)	؍؍	۳	ستمبر ۶۴ء
		قرآنی تعلیمات	؍؍	۴	اکتوبر ۶۴ء
		زکوٰۃ و صدقات (۱)	؍؍	۵	نومبر ۶۴ء
		؍؍ (۲)	؍؍	۶	دسمبر ۶۴ء
		تراجم واقتباسات			
۱	ادارہ ؍؍	گمراہ صوفیوں کی اصلاح (شیخ عبدالحق کے مکتوبات کے اقتباسات کا ترجمہ)	؍؍	۳	ستمبر ۶۴ء
۲	جناب ش۔ ن عثمانی	مذہب — کمیونسٹ پارٹی کے دل میں کھٹکتا ہوا کانٹا (وائی میرن کے مقالے کا ترجمہ)	؍؍	۴	اکتوبر ۶۴ء
		؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍	؍؍	۵	نومبر ۶۴ء
		اخبار و افکار			
۱	ادارہ ؍؍	مذہب کی قوت	؍؍	۱	جولائی ۶۴ء
		فرقہ پرست جماعتیں اور کانگریسی حکومت	؍؍	۲	اگست ۶۴ء
		لکھنؤ کا مشاورتی اجتماع	؍؍	۴	اکتوبر ۶۴ء
		مسلمانوں پر منظم حملوں کی ایک توجیہ		۵	نومبر ۶۴ء
		رسائل و مسائل			
۱	سید احمد قادری ؍؍	حضرت عثمانؓ پر آمریت کا الزام	؍؍	۲	اگست ۶۴ء
		سجدۂ سہو کے چند مسائل اور دیگر مسئلے	؍؍	۳	ستمبر ۶۴ء
		رودادیں			
۱	قیم جماعت	روداد مجلس شوریٰ (منعقدہ ۱۵ مئی تا ۱۷ مئی ۶۴ء)	۴۳	۱	جولائی ۶۴ء
		قسط رودادیں	؍؍	؍؍	؍؍

Only Title printed at Shanker Press, Rampur

ماہنامہ

زندگی

رام پور یوپی

سالانہ چھ روپئے

فی پرچہ ۶۰ پیسے

ماہنامہ

زندگی رامپور

جلد :- ۳۴
شمارہ :- ۲

شوال المکرم سنہ ۱۳۸۴ھ
فروری سنہ ۱۹۶۵ء

مدیر :- سید احمد قادری

● خط وکتابت و ارسال زر کا پتہ — منیجر رسالہ "زندگی" رام پور ۔ یوپی
● زر سالانہ :- چھ روپیہ ۔ ششماہی :- تین روپیہ ۔ فی پرچہ :- ۶۰ پیسے
● —— ممالک غیر سے دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

مالک :- جماعت اسلامی ہند ۔ ایڈیٹر :- سید احمد قادری ۔ پرنٹر پبلشر :- احتشام الحق ۔ مطبع :- دہلی پرنٹنگ ورکس چتلی قبر دہلی
مقام اشاعت :- دفتر زندگی رامپور یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

سید احمد قادری

امتِ مسلمہ کا نصب العین

آیت خلافت (وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً
اور آیت عبادت (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ)
سے عمومی انداز میں امت مسلمہ کا نصب العین اور اس کی حیثیت واضح ہوئی تھی لیکن قرآن نے اسی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ مخصوص طور پر بھی امت مسلمہ کے منصب کی توضیح کی ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۴۳ پڑھیے:۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا	اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی
لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ	امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم
عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ ۱۷)	پر گواہ ہو

قرآن کی موجودہ ترتیب کے لحاظ سے یہ سب سے پہلی آیت ہے جو براہ راست امت مسلمہ کے منصب کی وضاحت کرتی ہے۔ میں یہاں شیخ محمد عبدہٗ اور سید رشید رضا مصری کی تفسیر و تشریح کا حاصل اپنی زبان میں درج کرتا ہوں:۔

وسط، عدل و خیر کو کہتے ہیں وہ اس طرح کہ کسی امر میں شے مطلوب پر زیادتی افراط ہے اور کمی تفریط و تقصیر ہے۔ افراط و تفریط میں سے ہر ایک سیدھے اور ٹھیک راستے سے انحراف ہے اسی لیے ان میں ہر ایک شر ہے اور قابل مذمت ہے اور خیر وہ نقطۂ اعتدال ہے جو کسی امر کے دونوں کناروں کے درمیان ہوتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں لفظ "وسط" کیوں اختیار کیا گیا جبکہ مقصود اس امت کے خیر امت ہونے کا اعلان کرنا ہے۔ خیر کے صریح لفظ کو چھوڑنے کی وجہ کیا ہے؟ اس سوال کا پہلا جواب یہ ہے کہ لتکونوا شھداء علی الناس میں جو علت بیان کی گئی ہے یہ لفظ اس کے لیے بطور [illegible] اختیار کیا گیا

کیونکہ کسی شے کے شاہد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس کا عارف بھی ہو اور عارف وہی ہوگا جو دو کناروں کے درمیان ہو وہ ایک کنارے کو ایک جانب سے دیکھے گا اور دوسرے کو دوسری جانب سے اور جو کسی ایک کنارے پر ہوگا وہ دوسرے کنارے کی حقیقت حال سے ناواقف ہوگا بلکہ وہ وسط کی حقیقت حال سے بھی لاعلم ہوگا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ لفظ وسط سے امت مسلمہ کے خیر امت ہونے کا سبب بھی معلوم ہو رہا ہے یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان بہترین امت اس لیے ہیں کہ وہ امت وسط ہیں وہ نہ تو دین میں غلو کرکے افراط اختیار کرتے ہیں اور نہ کمی کرکے تفریط کے مرتکب ہوتے ہیں وہ عقائد اخلاق اور اعمال سبھی چیزوں میں توسط و اعتدال کے مرکز پر مقیم ہیں۔

بات یہ ہے کہ لوگ ظہور اسلام سے قبل دو قسموں میں بٹے ہوئے تھے ایک قسم تو وہ تھی جس پر مادیت چھائی ہوئی تھی اس کے نزدیک جسمانی لذت اندوزیوں کے سوا دوسری کوئی چیز قابل لحاظ نہ تھی اس قسم میں یہود و مشرکین داخل تھے۔ دوسری قسم دوسرے کنارے پر تھی وہ دنیا اور دنیا کی تمام جسمانی لذتوں کے ترک ہی کو خالص روحانیت سمجھتی تھی۔ اس قسم میں نصاریٰ، صابئین اور ہندستانی بت پرستوں کے چند گروہ داخل تھے۔ ان دونوں قسموں کے مقابلے میں امت اسلامیہ کے لیے اللہ نے ان کے دین میں روح اور جسم دونوں کے حق کو جمع کر دیا۔ دین اسلام تمام حقوق کا جامع ہے۔ اس لیے کہ انسان جسم بھی ہے اور روح بھی، حیوان بھی ہے اور فرشتہ بھی۔ گویا اس آیت میں اللہ نے امت مسلمہ کو امت وسط بنانے کی خوش خبری اس معنی میں دی ہے کہ یہی امت جسم و روح دونوں کے حقوق کی عارف ہے اور دونوں کے کمال تک ارتقاء کرے گی۔

لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ۔ اس ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے تم کو امت وسط بنایا تاکہ تم حق کے گواہ بنو ان لوگوں پر بھی جو محض مادہ پرست اور دینی پہلو سے تفریط و تقصیر کے مرتکب ہیں اور ان لوگوں پر بھی جنھوں نے اپنے آپ کو محض روحانیت کے حوالے کر دیا ہے کیونکہ یہ لوگ بھی دین میں غلو کرنے والے ہیں۔ تم ان لوگوں کے مقابلے میں بھی گواہی دوگے جو (ان ھی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیی وما یھلکنا الا الدھر) کے قائل ہیں اور تمہاری گواہی یہ ہوگی کہ ایسے لوگ صرف حیوانیت کی طرف مائل ہیں اور انھوں نے اپنی انسانی استعداد کو ۔ روحانی فضائل و خصوصیات سے محروم ہو کر ۔ ختم کر لیا ہے۔ اور تم ان لوگوں کے مقابلے میں بھی گواہی دوگے جو

دین میں غلو کرتے ہیں اور جن کا قول یہ ہے کہ انسان کا جسم روح کا قید خانہ ہے اور اس کے لیے عقوبت و سزا ہے۔ اس سزا سے نجات پانے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم تمام جسمانی لذتوں سے اپنے کو الگ کرلیں جسم کو سزا دیں اور نفس کو ان چیزوں سے محروم کردیں جو اللہ نے اس دنیوی زندگی کے لیے مہیا کی ہیں۔ ان لوگوں کے مقابلے میں تمہاری گواہی یہ ہوگی کہ انھوں نے راہِ اعتدال چھوڑ دی ہے اور جسموں اور ان کی زندگی بخش قوتوں کو سزا دے کر انھوں نے اپنی روحوں پر بھی ظلم کیا ہے تم اس گروہ کے خلاف بھی گواہی دوگے اور اُس گروہ کے خلاف بھی گواہی دوگے۔ اس طرح تم اپنے اعتدال اور تمام امور میں اپنے توسط کی وجہ سے دنیا کی تمام امتوں سے سبقت لے جاؤگے کیونکہ جس چیز کی تمہیں ہدایت دی گئی ہے وہ انسانی کمال کا وہ درجہ ہے جس کے بعد کوئی کمال نہیں ہے۔ دین اسلام کا ماننے والا ہر حق دار کا حق ادا کرتا ہے۔ وہ اپنے رب کے حقوق، اپنے نفس کے حقوق، اپنے جسم کے حقوق اپنے قرابت مندوں کے حقوق اور تمام انسانوں کے حقوق ادا کرتا ہے۔

(ویکون الرسول علیکم شہیداً)۔ اس ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی مرتبۂ اعتدال و توسط کی کامل ترین مثال ہیں اور آپ ہی کی سیرت و شریعت کی پیروی کرکے یہ امت امتِ وسط بن سکتی ہے۔ لوگوں میں کس نے آپ کی سنت کی پیروی کی اور کس نے اپنے لیے بدعت کا راستہ اختیار کیا اس مقدمے کے قاضی و حاکم اللہ کے رسول ہی ہیں جس طرح یہ امت اپنے جسمانی و روحانی ارتقاء کے ذریعہ دوسرے لوگوں کے خلاف گواہی دے گی کہ انھوں نے راہِ اعتدال گم کردی اسی طرح اللہ کے رسول متبعِ سنت امتیوں کے لیے اس بات کی گواہی دیں گے کہ یہ لوگ ہدایت کی صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رہے۔

گویا اس ٹکڑے میں یہ بات کہی گئی ہے کہ تمہارے لیے اعتدال و توسط کا وصف اسی وقت ثابت و متحقق ہوگا جب تم اپنے عمل کو رسولِ خدا کی سیرت اور آپ کے اسوۂ حسنہ کے مطابق رکھ کر اس کی محافظت کروگے اور اگر تم نے اس راہ سے انحراف کیا تو رسول خدا اپنی ذات، اور اپنے دین و سیرت کے ساتھ تمہارے خلاف اس کی گواہی دیں گے کہ تم ان کی اس امت میں داخل نہیں ہو جن کی تعریف اللہ نے اپنی کتاب کی اس آیت اور (کنتم خیر امۃ اخرجت للناس الخ) کی آیت میں کی ہے بلکہ تم بدعت کی وجہ سے توسط و اعتدال سے خارج ہوجاؤگے اور کسی ایک کنارے پر جا پڑوگے جیسا کہ ایک عربی شاعر نے کہا ہے اور زمخشری نے اس آیت کی تفسیر میں اس شعر سے استشہاد بھی کیا ہے

كانت هي الوسط المحمي فاكتنفت   بها الحوادث حتى أصبحت طرفا

وہ محفوظ وسط تھی پھر حوادث نے اسے گھیر لیا، یہاں تک کہ وہ ایک کنارہ ہو گئی

یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ جب اس آیت میں ایک بڑے حلیہ اور ایک بڑی نعمت کی بہتم بالشان خبر دی گئی ہے تو پھر اس کو تحویل قبلہ کی گفتگو میں ضمناً جملہ معترضہ کے طور پر کیوں لایا گیا اس کو ابتداء آگے سے یا جہاں اللہ نے اپنی نعمتیں شمار کرائی ہیں اس سیاق میں کیوں نہ لایا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کو معلوم تھا کہ تحویل قبلہ کا مسئلہ عنقریب ایک بڑے فتنے کا سبب بننے والا ہے اور عنقریب اہل کتاب یہ کہتے سنے جائیں گے کہ محمد اپنے رب کی طرف سے کسی واضح دلیل پر نہیں ہیں اس لیے کہ انھوں نے اپنا قبلہ بدل دیا اور اگر اللہ نے ان کو بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہوتا تو پھر وہ دوبارہ اس سے منع نہ کرتا اور انہیں اس قبلے سے نہ پھیرتا جو انبیاء علیہم السلام کا قبلہ ہے اور منافقین کہیں گے کہ انھوں نے پہلے بیت المقدس کی سمت، اہل کتاب کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے نماز پڑھی پھر ان پر اپنے وطن کی محبت اور اس کی تعظیم غالب آگئی اس لیے وہ پھر کعبے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے لگے لہذا وہ اپنے دین کے معاملے میں کسی یقین پر نہیں ہیں بلکہ مضطرب الخیال ہیں ۔۔۔ اس قسم کے شبہے شبہہ کرنے والوں کی فکری بے اعتدالی کی دلیل ہونے کے باوجود مسلمانوں پر اثر انداز ہونے والے تھے مطمئن اور راسخ الایمان مسلمان دین میں لوگوں کے شکوک اور دوسروں کو شک میں مبتلا کرنے کی وجہ سے محزون و مغموم ہوتے اور ضعیف و غیر راسخ مسلمان ممکن تھا کہ مضطرب اور متزلزل ہو جاتے، یہ سبب تھا کہ اللہ نے پہلے ہی مسلمانوں کو خبر دے دی کہ تحویل قبلہ کے بعد شکوک اور شک انگیزی کی ایک آندھی اٹھنے والی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس نے ان شکوک و شبہات کے مقابلے کے لیے مسلمانوں کو دلیل و برہان کی تلقین بھی کی اور انہیں یہ بھی بتایا کہ تمام امتوں کے درمیان ان کا درجہ امت وسط کا ہے جو نہ غلو کرتی ہے اور ظاہری سطح پر رک جاتی ہے بلکہ ہر حکم کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے اور انہیں یہ بھی بتایا کہ وہ لوگ تمام امور میں اپنے اعتدال اور دین کے حقائق و اسرار کے فہم کی وجہ سے دوسرے تمام انسانوں پر گواہ اور حجت ہیں۔ دینی حقائق میں سے ایک اہم حقیقت یہ ہے کہ جس قبلے کی طرف رخ کر کے وہ نماز پڑھتے ہیں اس کی اہمیت صرف یہ ہے کہ اللہ کی طرف توجہ کے وقت تمام اہل ملت کی جہت اور ہیئت ایک ہو۔

چونکہ تمام جہات کی نسبت اللہ کی طرف ایک ہی ہے کیونکہ وہ کسی جہت میں بھی محدود و محصور نہیں ہے اس لیے

کسی متعین سمت کے التزام میں اللہ و رسول کے حکم کی پیروی ضروری ہے۔ امر خداوندی کے بغیر بطورِ خود کسی جہت کی تعیین خواہشِ نفس کی پیروی اور ایک ایسی تخصیص ہوگی جس کی کوئی دلیل نہ ہوا اور یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جن کو کوئی معتدل المزاج عاقل اپنے لیے پسند نہیں کر سکتا۔ ہاں وہ تحویلِ قبلہ کی حکمت جاننے کی خواہش کر سکتا ہے اس لیے اللہ نے مسلمانوں کو اس کی حکمتیں بتائیں۔ اس طرح یہ آیت فتنوں اور شکوک و شبہات کے گھپ اندھیرے میں ایک روشن چراغ بن گئی جو مسلمانوں کے آگے آگے چلتا ہے اور افراط و تفریط کے درمیان مذبذب احمقوں کی احمقانہ تنقید کے مقابلے میں یہ حکمت و بصیرت عطا کرتا ہے۔ بخدا یہ قرآن کی ایسی بلند درجہ بلاغت ہے جس سے بلند کسی درجے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

(تفسیر المنار ج ۲)

شیخ محمد عبدہٗ اور سید رشید رضا مصری رحمہما اللہ کی یہ شرح بہترین اور جامع تشریح ہے۔ اس سے پوری طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس آیت میں امتِ مسلمہ کو جو منصب عطا کیا گیا ہے اور قول و عمل گفتار و کردار دونوں ہی کے لحاظ سے اس کو توسط و اعتدال کے جس مقام کا شاہد بنا کر کھڑا کیا گیا ہے اس کی ذمہ داری کتنی عظیم ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی تازہ کتاب "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش" میں لکھتے ہیں:

امتِ اسلامیہ آخری دینی پیغام کی حامل ہے اور یہ پیغام اس کے تمام اعمال اور حرکات و سکنات پر حاوی ہے، اس کا منصب قیادت و رہنمائی اور دنیا کی نگرانی و احتساب کا منصب ہے۔ قرآن مجید نے بہت قوت اور صراحت کے ساتھ اعلان کیا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران ۱۱۰)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی) تم تمام امتوں میں بہتر امت ہو جو لوگوں (کی ارشاد و اصلاح) کے لیے ظہور میں آئی ہے، تم نیکی کا حکم دینے والے برائی سے روکنے والے اور اللہ پر سچا ایمان رکھنے والے ہو۔

دوسری جگہ کہا گیا ہے :-

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (البقرہ ۱۴۳)

اور اسی طرح تو ہم نے تمہیں امت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو۔

اس لیے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس امت کی جگہ قافلہ کے پیچھے اور حاشیہ پر یا اس کے صف میں

ہو اور وہ دوسری اقوام کے سہارے زندہ رہے اور قیادت و رہنمائی، امر و نہی اور دینی و فکری آزادی کے بجائے تقلید اور نقل، اطاعت و سپراندازی پر راضی اور مطمئن ہو۔ (ص ۲۰۲ - ۲۰۱)

سورۂ بقرہ کی آیت ۱۴۳ کے بارے میں اس دور کے ان علماء کی تفسیر و تشریح کو نقل کرنا میں کافی سمجھتا ہوں اس آیت کے بارے میں تین سوالات سامنے آتے ہیں۔

(۱) امت مسلمہ کو یہ شہادت کہاں دینی ہوگی، دنیا میں یا آخرت میں یا دونوں جگہ

(۲) کیا اس آیت میں عملی شہادت مراد نہیں ہے؟

(۳) کیا شہادت (گواہی) صرف قولی ہوتی ہے۔

اوپر شیخ محمد عبدہ، رشید رضا اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کی جو رائیں نقل کی گئی ہیں ان میں ان تینوں سوالات کے جوابات موجود ہیں لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر سوال کے بارے میں یہاں تھوڑی سی مزید گفتگو کرلی جائے۔

پہلے سوال کا جواب

پہلے سوال پر امام رازی نے اپنی تفسیر میں مفصل اور مدلل بحث کی ہے ان کی پوری بحث کو یہاں نقل کرنا موجب طوالت ہے اس لیے مختصراً میں وہ اقوال پیش کروں گا جن کا ذکر انھوں نے کیا ہے اور پھر ان کا اپنا فیصلہ اور محاکمہ نقل کروں گا۔

اس شہادت کے بارے میں اصلاً مفسرین کے صرف دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا تعلق آخرت سے ہے اور دوسرا یہ کہ دنیا سے ہے۔ امام رازی نے پہلے قول کی دو تقسیمیں کی ہیں۔ ایک یہ کہ آخرت میں امت مسلمہ کو یہ گواہی دینی ہوگی کہ تمام انبیاء سابقین نے اپنی امتوں کو خدا کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ دوسرا یہ کہ اس امت کو خدا کے نافرمان لوگوں کے ان اعمال کے خلاف گواہی دینی ہوگی جن میں انھوں نے حق کی مخالفت کی تھی۔ اس طرح سب مل کر تین قول بن جاتے ہیں۔ امام رازیؒ کا اپنا خیال یہ ہے کہ اس آیت میں جس شہادت کا ذکر ہے وہ امت مسلمہ کو دونوں جگہ دینی ہوگی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تیسرے قول یعنی دنیوی شہادت کی صحت پر دلیل پیش کرنے کے بعد آخر میں اپنا یہ فیصلہ دیا ہے۔

واعلم ان الدلیل الذی ذکرنا ہ	اور جان لو کہ وہ دلیل جو ہم نے اس قول
علی صحۃ ہذا القول لا یبطل القولین	کی صحت پر دی ہے وہ پہلے قولوں کو باطل نہیں کرتی
الاولین لانا بینا بہذا الدلیل انہ	اس لیے کہ ہم نے اس دلیل سے یہ واضح کیا ہے کہ امت
لا بد وان یکونوا شہودا فی الدنیا	کا دنیا میں گواہ ہونا ضروری ہے اور یہاں بات کے

وھذا لاینافی کونھم شھودا فی القیامۃ	منافی نہیں ہے کہ یہ امت قیامت میں بھی گواہ ہوگی جیسا کہ
ایضا علی الوجہ الذی وردت الاخبار (تفسیر کبیر ج ۲)	حدیثوں میں ذکر کیا گیا ہے۔

اور واقعہ یہی ہے کہ اخروی شہادت اور دنیوی شہادت میں کوئی تضاد نہیں ہے اس لیے اس کو آخرت کے ساتھ خاص کر دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ بلکہ آخرت میں شہادت کے مقام پر وہی لوگ کھڑے کیے جائیں گے جنھوں نے دنیا میں خود حق کی شہادت دی ہوگی۔ آگے اس کی تفصیل آرہی ہے۔ پہلے سوال کے تحت، یہ مختصر بات یہ بتانے کے لیے پیش کی گئی ہے کہ اس آیت میں دنیوی شہادت کا قول کوئی نیا قول نہیں ہے بلکہ ماقبل رازی سے اب تک مسلسل نقل ہوتا چلا آرہا ہے۔

دوسرے سوال کا جواب

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں قولی شہادت کے ساتھ عملی شہادت بھی مراد ہے بلکہ قیامت میں شہادت علی الناس کے بلند مقام پر امت مسلمہ کے وہی لوگ کھڑے کیے جائیں گے جنھوں نے دنیا میں سچائی کی قولی و عملی دونوں گواہیاں دی ہوں گی۔

عن الضحاک فی قولہ لتکونوا	لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ کے
شھداء علی الناس یعنی بذلک	قول میں ضحاک کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ لوگ
الذین استقاموا علی الھدی فھم الذین	ہیں جو ہدایت پر ثابت قدم رہے تو وہی لوگ ہیں جو
یکونون شھداء علی الناس بتکذیبھم	لوگوں پر گواہ ہوں گے ان لوگوں پر جنھوں نے اللہ
رسل اللہ وکفرھم بآیات اللہ (ابن جریر)	کے رسولوں کی تکذیب اور اس کی آیتوں کا انکار کیا۔

اس عبارت میں ہمیں تینوں باتیں مل جاتی ہیں یہ بھی کہ شہادت علی الناس میں دنیوی شہادت داخل ہے۔ یہ بھی کہ اس آیت میں عملی شہادت بھی مراد ہے اور یہ بھی کہ شہادت قولی کے ساتھ عملی بھی ہوتی ہے کیونکہ استقامت علی الہدیٰ سے بلند عمل کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

قرآن کے طالب العلم کو یہ بات معلوم ہے کہ قرآن کے ایک مقام کو سمجھنے کے لیے دوسرے مقامات کی تفسیر بھی بڑی کارآمد ہوتی ہیں اس سلسلے میں سورۂ نساء کی آیت ۶۹ پڑھیے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ	اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا وہ
فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ	ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام کیا ہے
مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ	یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین [illegible]

(باقی صفحہ [illegible] پر ملاحظہ ہو)

مرحمت و مواسات

مولانا جلیل احسن ندوی، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ

(۱) اِنَّ الصَّدَقَۃَ لَتُطْفِیُٔ غَضَبَ الرَّبِّ وَتَدْفَعُ مِیْتَۃَ السُّوْءِ (اس۔ مشکوٰۃ و جمع الفوائد)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ خدا کے بھڑکے ہوئے غصے کو بجھا دیتا ہے اور صدقہ آدمی کو بری موت مرنے سے بچاتا ہے۔

یعنی جو شخص اپنی کمائی میں سے خدا کے محتاج بندوں کے لیے نکالتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا کا غصہ جو کسی دوسرے گناہ کے نتیجے میں بھڑکتا ہے اسے بجھا دیتا ہے اور اللہ کی نظر کرم کو بندے کی طرف موڑ دیتا ہے، نیز اس کا دوسرا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ آدمی کو نیکی کی توفیق ملتی ہے، برائیاں دور ہو جاتی ہیں اور جب وہ مرتا ہے تو وہ نیک بندوں کی حیثیت میں مرتا ہے اس کا خاتمہ ایمان و تقوے کی حالت میں ہوتا ہے۔

(۲) اِنَّ ظِلَّ الْمُؤْمِنِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ صَدَقَتُہٗ (مرثد۔ جمع الفوائد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ صدقہ قیامت کے دن مومن کے لیے سایۂ رحمت بن جائے گا۔

یہی مضمون اس سے زیادہ واضح لفظوں میں یوں بیان ہوا ہے۔ اِنَّمَا یَسْتَظِلُّ الْمُؤْمِنُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ بِظِلِّ صَدَقَتِہٖ۔ یعنی مومن اپنے صدقے کے سایے میں قیامت کے دن رہے گا۔ ظاہر ہے کہ قیامت کا دن بڑی تپش کا دن ہوگا۔ ہر شخص سایہ ڈھونڈے گا۔ حضور فرماتے ہیں کہ محتاج بندوں کی مدد قیامت کے دن ٹھنڈے سایے کی شکل اختیار کرے گی۔

(۳) اِنَّ الصَّدَقَۃَ لَتُطْفِیُٔ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے

هَتْ اَهْلِهَا حَرَّ الْقُبُوْرِ — ہیں کہ صدقہ آدمی کو قبر کی گرمی اور آنچ سے بچاتا ہے۔

یعنی صدقے کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ آدمی مرنے کے بعد جب دفن کر دیا جاتا ہے تو وہاں کی شدتوں اور تکلیفوں سے اس کی کی ہوئی نیکی اس کو نجات دیتی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "قبر کا مرحلہ آخرت کے مراحل میں سب سے پہلا مرحلہ ہے اور سخت مرحلہ ہے۔ جو قبر کے امتحان میں کامیاب ہوا اس کے لیے بعد کے تمام مراحل آسان ہوں گے۔ اور جو یہاں گر گیا اس کے لیے آگے کے مراحل میں کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔!

(۴) لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالَّذِيْ يَشْبَعُ وَجَارُهٗ جَائِعٌ (عبداللہ بن عباس۔ مشکوٰۃ) — حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ مومن ایسا نہیں ہوتا کہ وہ تو پیٹ بھر کر کھانا کھائے اور اس کا پڑوسی جو اس کے پہلو میں رہتا ہے بھوکا رہے

یعنی مومن کے ایمان سے یہ بات میل نہیں کھاتی کہ وہ اپنے پڑوسی (خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم) سے اور اس کے حال سے بے پروا ہو کر زندگی گزارے، نہیں بلکہ اس کے ایمان کا یہ عین تقاضا ہے کہ وہ ان کی خبرگیری کرے۔ دیکھے کہ وہ بھوکا تو نہیں ہے۔ اگر وہ بھوک کا شکار رہا اور اس کے پاس فاضل غلہ یا کھانا موجود ہو تو اس کی بھوک کو مٹائے۔ اسے نہ تو بھوکا رہنے دے، نہ بھوکا سونے دے

یہی مضمون ایک دوسری حدیث میں یوں بیان ہوا ہے۔ مَا اٰمَنَ بِيْ مَنْ بَاتَ شَبْعَانَ وَجَارُهٗ جَائِعٌ اِلٰى جَنْبِهٖ وَهُوَ يَعْلَمُ یعنی وہ شخص مجھ پر ایمان نہیں لایا جو زندگی بھر آسودہ رہا اور اسی حالت میں مرا اور اس کے پہلو میں رہنے والا پڑوسی بھوکا رہا اور یہ جانتا تھا کہ میرا پڑوسی بھوکا سوتا ہے۔

(۵) ان اللّٰهَ تعالٰی يقول يوم القيامة يا ابن آدم مرضت فلم تعدني قال يا رب كيف أعودك وانت رب العالمين؟ قال اما علمت ان عبدي — اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایک شخص سے فرمائے گا۔ اے آدم کے بیٹے میں دنیا کی زندگی میں بیمار پڑا تھا لیکن تو نے میری خبر نہ لی، وہ کہے گا آپ تو رب العالمین ہیں آپ کیونکر بیمار ہو سکتے ہیں کہ عیادت کا سوال پیدا ہو؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تھا

فُلَانًا مَرِضَ فَلَمْ تَعُدْهُ

أَمَا عَلِمْتَ أَنَّكَ لَوْ عُدْتَهُ

لَوَجَدْتَنِي عِنْدَهُ ؟

يَا ابْنَ آدَمَ اسْتَطْعَمْتُكَ

فَلَمْ تُطْعِمْنِي قَالَ يَا رَبِّ

كَيْفَ أُطْعِمُكَ وَأَنْتَ

رَبُّ الْعَالَمِينَ ؟ قَالَ

أَمَا عَلِمْتَ أَنَّهُ اسْتَطْعَمَكَ

عَبْدِي فُلَانٌ فَلَمْ تُطْعِمْهُ

أَمَا عَلِمْتَ أَنَّكَ لَوْ

أَطْعَمْتَهُ لَوَجَدْتَ

ذَالِكَ عِنْدِي ؟ يَا

ابْنَ آدَمَ اسْتَسْقَيْتُكَ

فَلَمْ تَسْقِنِي قَالَ يَا رَبِّ

كَيْفَ أَسْقِيكَ وَأَنْتَ

رَبُّ الْعَالَمِينَ ؟ قَالَ

اِسْتَسْقَاكَ عَبْدِي فُلَانٌ

فَلَمْ تَسْقِهِ أَمَا عَلِمْتَ

أَنَّكَ لَوْ سَقَيْتَهُ لَوَجَدْتَ

ذَالِكَ عِنْدِي

(ابوہریرہ ۔ مسلم)

اور بیمار رہا اور خبر گیری کا وہ محتاج بھی تھا اور

تو اس کی مدد کر سکتا تھا لیکن تو نے اس بیمار محتاج

کی قطعاً کوئی خبر نہیں لی۔ کیا تجھے خبر نہیں کہ اگر

تو خبر گیری کرتا تو تو مجھے اس مریض کے پاس پاتا۔

اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا لیکن

تو نے مجھے نہیں کھلایا۔ وہ کہے گا۔ اے میرے رب

آپ تو رب العالمین ہیں میں آپ کو کیسے کھلا سکتا تھا

کیا آپ کو بھی بھوک لگتی ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا

میرے فلاں بھوکے بندے نے تجھ سے کھانا مانگا

تھا اور تو اس کے پیٹ کی آگ بجھا سکتا تھا لیکن

تو نے اس کی بھوک نہیں مٹائی؟ کیا تجھے معلوم نہیں

کہ اگر تو اس کی غذائی مدد کرتا اگر تو اسے کھانا

کھلا دیتا تو اپنا کھانا یہاں میرے پاس پاتا۔

اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا مگر

تو نے نہیں پلایا، وہ کہے گا۔ اے میرے رب میں

آپ کو کیونکر پلاتا۔ آپ تو رب العالمین ہیں آپ

اور پیاس؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ کیا تجھے معلوم

نہیں، میرے ایک پیاسے بندے نے تجھ سے پانی

مانگا اور تیرے پاس ضرورت سے زیادہ پانی

موجود تھا لیکن تو نے اس پیاسے کا کلیجہ ٹھنڈا نہیں کیا

اگر تو اس کی پیاس بجھا دیتا تو اپنا وہ پانی یہاں تجھے میرے

پاس مل جاتا۔

یہ حدیث بیغمبرانہ زبان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی۔ کسی شرح و توضیح کی محتاج نہیں۔

یہ حدیث ان صاحبِ ایمان لوگوں کو پکارتی ہے جن کے گودام ان کی ضرورت سے فاضل غلہ سے بھرے ہوئے ہیں

(٦) أَيُّمَا مُسْلِمٍ كَسَا مُسْلِمًا ثَوْبًا عَلَى عُرْيٍ كَسَاهُ اللّٰهُ مِنْ خُضْرِ الْجَنَّةِ وَأَيُّمَا مُسْلِمٍ أَطْعَمَ مُسْلِمًا عَلَى جُوْعٍ أَطْعَمَهُ اللّٰهُ مِنْ ثِمَارِ الْجَنَّةِ وَأَيُّمَا مُسْلِمٍ سَقَى مُسْلِمًا عَلَى ظَمَإٍ سَقَاهُ اللّٰهُ مِنَ الرَّحِيْقِ الْمَخْتُوْمِ۔

(ابو سعید — مشکوٰۃ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کسی مسلمان نے اپنے کسی کپڑے کے محتاج مسلمان بھائی کو کپڑا پہنایا تو اللہ قیامت کے دن اس کو جنت کے سبز کپڑے پہنائے گا اور جس کسی مسلمان نے اپنے کسی بھوکے مسلمان بھائی کو کھانا کھلایا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو جنت کے پھل کھانے کو دے گا اور جس کسی مسلمان نے اپنے کسی پیاسے مسلمان بھائی کو پانی پلایا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جنت کے مہر بند مشروب سے اس کی پیاس بجھائے گا۔

(٧) أَصَابَ النَّاسَ قَحْطٌ فِي خِلَافَةِ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فَلَمَّا اشْتَدَّ بِهِمُ الْأَمْرُ جَاءُوْا إِلَى أَبِي بَكْرٍ وَقَالُوْا يَا خَلِيْفَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ إِنَّ السَّمَاءَ لَمْ تُمْطِرْ وَالْأَرْضُ لَمْ تُنْبِتْ وَقَدْ تَوَقَّعَ النَّاسُ الْهَلَاكَ فَمَا تَصْنَعُ؟ فَقَالَ لَهُمُ انْصَرِفُوْا وَاصْبِرُوْا فَإِنِّي أَرْجُوا اللّٰهَ أَنْ لَا تُمْسُوْا حَتّٰى يُفَرِّجَ اللّٰهُ عَنْكُمْ فَلَمَّا كَانَ آخِرُ النَّهَارِ وَرَدَ الْخَبَرُ بِأَنَّ عِيْرًا لِعُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ جَاءَتْ مِنَ الشَّامِ

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں لوگ خشک سالی اور قحط کا شکار ہوگئے جب قحط اپنے خطرناک مرحلے میں پہنچ گیا تو ابوبکر کے پاس لوگ آئے اور کہا اے رسول اللہ کے جانشین پانی ذرا بھی نہیں برسا اور زمین خشک پڑی ہے اور لوگوں کی جانوں کی ہلاکت کا خطرہ سامنے ہے تو ہم لوگ کیا کریں کس طرح ان کی جانیں بچائی جائیں حضرت ابوبکر صدیق نے ان سے کہا جاؤ اور صبر کرو مجھے اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ شام ہوتے ہوتے وہ تمہاری مصیبت کو دور کردے گا چنانچہ شام کو خبر مشہور ہوئی کہ عثمان بن عفان کا ذاتی قافلہ ملک شام سے واپس آ رہا ہے جب یہ قافلہ مدینہ پہنچا تو لوگ اسے دیکھنے کے لیے اپنے گھروں سے نکل پڑے۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک ہزار اونٹ ہیں جن پر گیہوں، زیتون کا تیل اور کشمش لدے ہوئے ہیں [illegible]

فَلَمَّا جَاءَتْ خَرَجَ النَّاسُ
يَتَلَقَّوْنَهَا فَإِذَا هِيَ أَلْفُ بَعِيرٍ
مُوسَقَةٌ بُرًّا وَزَيْتًا وَزَبِيبًا
فَأَنَاخَتْ بِبَابِ عُثْمَانَ فَلَمَّا
جَعَلَهَا فِي دَارِهِ جَاءَ التُّجَّارُ
فَقَالَ مَا تُرِيدُونَ؟ قَالُوا إِنَّكَ
لَتَعْلَمُ مَا نُرِيدُ، بِعْنَا مِنْ
هٰذَا الَّذِي وَصَلَ إِلَيْكَ
فَإِنَّكَ تَعْلَمُ ضَرُورَةَ النَّاسِ
إِلَيْهِ، قَالَ حُبًّا وَكَرَامَةً، كَمْ
تُرْبِحُونَنِي عَلَى شِرَائِي؟ قَالُوا
الدِّرْهَمُ دِرْهَمَيْنِ، قَالَ أُعْطِيتُ
زِيَادَةً عَلَى هٰذَا، قَالُوا أَرْبَعَةً
قَالَ أُعْطِيتُ زِيَادَةً عَلَى هٰذَا
قَالُوا خَمْسَةً قَالَ أُعْطِيتُ
أَكْثَرَ مِنْ هٰذَا، قَالُوا يَا
أَبَا عَمْرٍو مَا بَقِيَ فِي الْمَدِينَةِ
تُجَّارٌ غَيْرُنَا وَمَا سَبَقَنَا إِلَيْكَ
أَحَدٌ فَمَنْ ذَا الَّذِي أَعْطَاكَ
قَالَ إِنَّ اللهَ أَعْطَانِي بِكُلِّ
دِرْهَمٍ عَشَرَةً أَعِنْدَكُمْ
زِيَادَةٌ؟ قَالُوا لَا، قَالَ
فَإِنِّي أُشْهِدُ اللهَ أَنِّي جَعَلْتُ

اونٹ حضرت عثمان کے دروازے پر بٹھائے گئے اور یہ پورا سامان
حضرت عثمان کے گھر میں منتقل ہوا، غلہ کی تجارت کرنے والے
ان کے پاس آئے حضرت عثمان نے ان سے پوچھا آپ
لوگ کس غرض سے تشریف لائے؟ انھوں نے جواب دیا
آپ کو معلوم ہے کہ ہم لوگ کس مقصد سے حاضر ہوئے ہیں،
چاہتے ہیں یہ جو غذائی سامان آیا ہے آپ ہمارے ہاتھ
فروخت کر دیں کیونکہ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے لوگ اس کے
انتہائی ضرورتمند ہیں۔ حضرت عثمان نے فرمایا بہت اچھا
خرید و، تم مجھ کو کتنا نفع دوگے؟ انھوں نے کہا دوگنا نفع دیں گے
انھوں نے کہا مجھے تو اس سے زیادہ نفع مل رہا ہے۔ تاجروں
نے کہا اچھا چار گنا نفع لے لو حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ نہیں
بھائی مجھے اس سے زیادہ نفع مل رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ
اچھا پانچ گنا نفع ہم دیں گے۔ حضرت عثمان نے کہا نہیں، اس
سے زیادہ نفع مجھے مل رہا ہے۔ اس پر تاجروں نے کہا اے ابو عمرو
(یہ حضرت عثمان کی کنیت ہے) ہمارے علاوہ کوئی بھی تاجر مدینہ
میں اب باقی نہیں رہا ہے۔ غلہ کے تمام تاجر آپ کے پاس موجود
ہیں اور ہم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم سے پہلے آپ کے پاس
کوئی نہیں آیا ہے تو بتلایئے وہ کون ہے جو اس کو پانچ گنے
نفع سے زیادہ پر خرید رہا ہے۔ حضرت عثمان نے فرمایا
اللہ تعالیٰ ہر درہم کے بدلے مجھے دس درہم دے رہا ہے
کیا تم اس سے زیادہ دے سکتے ہو؟ تاجروں نے کہا
کہ نہیں، ہم اس سے زیادہ نہیں دے سکتے۔ حضرت عثمانؓ نے
فرمایا میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے یہ پورا غلہ

هٰذِهِ الْعِيْرُ صَدَقَةٌ لِلّٰهِ عَلَى	سامان صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مسلمان
الْمَسَاكِيْنِ وَفُقَرَاءِ الْمُسْلِمِيْنَ ٥	محتاجوں اور غیر مسلم مسکینوں کے لیے وقف کیا۔

یہ روایت جو اپنے متن و ترجمے کے ساتھ آپ کے سامنے ہے۔ اس کو متفقہ طور پر ان تمام مورخین نے اپنی تصانیف میں پیش کیا ہے جنھوں نے حکومت الٰہیہ محمدیہ کو اپنا تصنیفی موضوع قرار دیا ہے۔ لوگو! ایسا نظام حکومت لاؤ جو صدیقی مزاج رکھتا ہو، اور ایسا معاشرہ تیار کرو جس کے افراد 'عثمانی روح' سے سرشار رہوں، تب خدائی بحران سے نجات مل سکے گی اور تب ہی یہ سیاسی، معاشی، لسانی اور طبقاتی مسائل حل ہوں گے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

(مولانا جلال الدین عمری)

گزشتہ شمارے میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے سلسلے کی چار شرطوں پر گفتگو ہو چکی ہے

پانچویں شرط قدرت پانچویں شرط ہے قدرت۔ جو شخص امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی قدرت رکھتا ہو اسی پر معروف کا حکم دینا یا منکر سے منع کرنا واجب ہے۔ اگر کسی میں اس کی قدرت نہیں ہے تو وہ اس پر واجب بھی نہیں ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

من رای منکم منکرا فلیغیرہ	تم میں سے جو شخص بھی کسی منکر کو دیکھے تو اسے ضرور اپنے
بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ	ہاتھ سے بدل دے۔ اگر وہ اس کی استطاعت رکھتا ہو تو اپنی زبان
فان لم یستطع فبقلبہ وذالک	کے ذریعہ اس کو بدلے اور اس کی بھی اس میں طاقت نہ ہو تو اپنے
اضعف الایمان[1]	دل ہی سے اس کو برا سمجھے اور یہ ایمان کا بہت ہی کمزور درجہ ہے

اس سے معلوم ہوا کہ انسان پر تغییر منکر بذریعہ قوت اس وقت ضروری ہے جب کہ وہ اس کی استطاعت رکھتا ہو ورنہ اس کا فرض یہ ہے کہ برائی کے خلاف اپنی آواز اٹھائے۔ اگر اس کی بھی اس میں طاقت نہیں ہے تو اس کی ذمہ داری صرف یہ رہ جاتی ہے کہ منکر سے نفرت کرے اور دل سے اس کو برا جانے۔ امام ابوبکر جصاص کہتے ہیں:-

اخبر النبی صلی اللہ علیہ	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (یہ) بیان کیا ہے
وسلم ان انکار المنکر علی	کہ منکر پر نکیر کرنا مذکورہ تین طریقوں سے ہوتا ہے
ھذہ الوجوہ الثلاثۃ علی	ان میں سے جس کی بھی وہ طاقت رکھتا ہو۔ اور یہ کہ
حسب الامکان ودل علی	آپ نے یہ بھی بتایا ہے کہ منکر پر نکیر کرنے والا جب منکر کو

[1] مسلم کتاب الایمان۔ باب بیان کون النہی عن المنکر من الایمان۔ ترمذی ابواب الفتن باب ما جاء فی تغییر المنکر بالید و باللسان او بالقلب۔

انه اذا لم يستطع تغييره بيده فعليه تغييره بلسانه ثم اذا لم يمكنه ذالك فليس عليه اكثر من انكاره بقلبه[۱]

اپنے ہاتھ سے نہ بدل سکے تو اس کے لیے زبان سے منکر کو بدلنا ضروری ہے۔ اگر اس کا امکان بھی اس کے لیے نہ ہو تو اس کی ذمہ داری اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اپنے دل سے اس پر نکیر کرے۔

عدمِ قدرت کی شکلیں اب ہمیں اس سوال پر غور کرنا ہے کہ عدم قدرت کی کتنی صورتیں ہو سکتی ہیں اور ان مختلف صورتوں میں شریعت کے کیا احکام ہیں؟

عجزِ جسمی عدمِ قدرت کی پہلی شکل وہ ہے جسے فقہاء نے عجزِ جسمی سے تعبیر کیا ہے۔ اگر آدمی جسمانی طور پر اس قدر کمزور اور بے بس ہو کہ وہ نہ معروف کو قائم کر سکے اور نہ منکر کو مٹا سکے تو اس پر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں:-

ولا يخفى ان العاجز ليس عليه حسبة الا بقلبه[۲]

یہ کوئی پوشیدہ بات نہیں ہے کہ مجبور پر صرف دل سے احتساب کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے

خوفِ ضرر عدمِ قدرت کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض انجام دینے میں آدمی اپنے لیے خطرہ محسوس کرے۔ اس صورت میں یہ فرض اس سے ساقط ہو جائے گا۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں:-

لا يقف سقوط الوجوب على العجز الحسي بل يلتحق به ما يخاف عليه مكروها ينالہ فذالك فی معنى العجز[۳]

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا وجوب صرف عجزِ جسمی ہی سے ساقط نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ یہ صورت بھی شامل ہے کہ آدمی کو کسی تکلیف کے پہنچنے کا خوف ہو۔ یہ بھی عجز ہی کے حکم میں ہے

محدث ابن بطّال کہتے ہیں:-

والنصيحة لازمة على قدر الطاقة اذا علم الناصح انه يقبل

نصیحت اور خیرخواہی طاقت کی حد تک لازم ہے جب کہ نصیحت کرنے والا یہ جانتا ہو کہ اس

---

[۱] احکام القرآن ج ۲ ص ۳۱
[۲] احیاء علوم الدین جلد ۲ صفحہ ۲۸۵
[۳] احیاء علوم الدین جلد ۲ صفحہ ۲۸۵

نصحہ ویطاع امرہ وامن علی
نفسہ المکروہ فان خشی اذی
فہو فی سعۃ لہ[1]

کی نصیحت قبول کی جائے گی اور اس کے حکم پر عمل
کیا جائے گا، ساتھ ہی اسے کسی تکلیف کے پہنچنے کا
اندیشہ بھی نہ ہو۔ اگر اس کا اندیشہ ہو تو اس کے لیے
گنجائش ہے کہ نصیحت کرے یا نہ کرے۔

عزیمت کی راہ

لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر کوئی شخص ہر طرح کے خوف اور خطرے سے بے نیاز ہو کر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض انجام دے تو وہ کسی غلطی کا مرتکب ہوگا۔ یہ نہ صرف یہ کہ اس کے لیے جائز ہے بلکہ اس سے مطلوب بھی ہے۔ جان و مال کے خوف سے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو چھوڑ دینا محض ایک اجازت ہے جو شریعت نے کمزور ایمان والوں کو دی ہے۔ عزیمت اور فضیلت کی راہ یہ ہے کہ آدمی اپنا سب کچھ کھو دے اور حق کو حق اور باطل کو باطل کہنے سے باز نہ آئے۔ یہی بات اس حدیث میں کہی گئی ہے جس کی روایت حضرت عمرؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کی ہے۔ آپ نے فرمایا:

انہ تصیب امتی فی آخر
الزمان من سلطانہم شدائد
لا ینجو منہ الا رجل عرف دین
اللہ فجاہد علیہ بلسانہ ویدہ
وقلبہ فذلک الذی سبقت
لہ السوابق ورجل عرف دین
اللہ فصدق بہ ورجل عرف
دین اللہ فسکت علیہ فان
رای من یعمل الخیر احبہ
علیہ وان رای من یعمل
بباطل ابغضہ علیہ
فذلک الذی ینجو علی

یقیناً آخر زمانہ میں میری امت کو ان کے
بادشاہوں کی جانب سے سختیاں لاحق ہوں گی اس سے
وہی شخص نجات پائے گا جس نے خدا کے دین کو پہچانا اور اس
کے لیے اپنی زبان اور اپنے ہاتھ سے جہاد کیا۔ پس یہی شخص ہے
جس کے لیے خدا کی رحمت اور دنیا و آخرت کی سعادت آگے
بڑھے گی۔ اس کے بعد اپنے مرتبے کے لحاظ سے وہ شخص ہے
جس نے خدا کے دین کو پہچانا اور اپنے دل سے اور زبان سے
اس کی تصدیق کی۔ پھر اس کے بعد وہ شخص ہے جس نے خدا
کے دین کو پہچانا اور اس کے سلسلے میں خاموش رہا۔ وہ اگر
کسی کو نیک کام کرتے دیکھتا ہے تو اس کی وجہ سے اس
سے محبت کرتا ہے اور اگر کسی کو باطل کا ارتکاب کرتے دیکھتا
ہے تو اس کی بنا پر اس سے نفرت کرتا ہے تو یہ بھی نجات

[1] شرح مسلم نووی ج ۱ ص ۵۱

ابطانہ کلہ[1]　　پائے گا کیونکہ اس نے بھلائی سے محبت اور باطل سے دشمنی کو اپنے سینے میں چھپائے رکھا۔

حقیقت یہ ہے کہ حق کے اظہار و اعلان کے لیے جان و مال کی بازی لگا دینا آسان نہیں ہے۔ یہ ارباب عزیمت کا کام ہے اور ان ہی کا مقام خدا کے نزدیک سب سے اونچا بھی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

الا لا یمنعن رجلا مهابة	ہاں کسی شخص کو لوگوں کا خوف حق بات کہنے
الناس ان یتکلم بالحق	سے نہ روکے، جب کہ وہ اس کو جانتا ہو۔ ہاں سن لو کہ
اذا علمه الا ان افضل الجهاد	سب سے زیادہ ثواب والا جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے
کلمة حق عند سلطان جائر[2]	کلمۂ حق کہنا ہے۔

حدیث کا یہ ٹکڑا پہلے بھی گزر چکا ہے کہ ظالم فرماں روا کے سامنے کلمۂ حق کا اظہار سب سے بڑا جہاد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اظہار حق کے لیے آدمی جتنا بڑا خطرہ مول لے گا وہ اجر و ثواب کا اتنا ہی زیادہ مستحق ہوگا۔ سلطان جائر کے سامنے اظہار حق کو کیوں سب سے بڑا جہاد قرار دیا گیا ہے اس کی وجہ علامہ خطابی نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:-

انما صار ذلک افضل	یہ سب سے زیادہ فضیلت والا جہاد اس لیے
الجهاد لان من جاهد العدو	ہے کہ جو شخص دشمن سے جہاد کرتا ہے وہ امید اور خوف
وکان مترددا بین رجاء و	کے درمیان متردد ہوتا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ آیا غالب
خوف لا یدری هل یغلب او	آئے گا یا مغلوب ہوگا۔ (اس طرح جہاں اس کی زندگی کے
یغلب وصاحب السلطان مقهور	ختم ہونے کا اندیشہ ہے وہاں اس کے بچنے کا بھی امکان
فی یده فهو اذا قال الحق	ہے اس کے برعکس) جو شخص بادشاہ پر تنقید کرتا ہے وہ اس
وامره بالمعروف فقد تعرض	کے ہاتھ میں مجبور ہے۔ جب وہ اس کے سامنے حق کا اظہار
للتلف واهدف نفسه للهلاک	کرے گا اور اس کو معروف کا حکم دے گا تو اپنی بربادی
فصار ذلک من افضل انواع	کے درپے ہوگا اور اپنے آپ کو ہلاکت کا نشانہ بنائے گا

1. بیہقی، مشکوٰۃ المصابیح باب الادب، باب فی الامر بالمعروف والنہی عن المنکر
2. ورری الترمذی غیر قولہ الا ان افضل الجہاد الخ، کتاب الفتن باب ما اخبر النبی اصحابہ بما ہو کائن الی یوم القیامۃ

الجھاد من اجل غلبۃ الخوف[1]　　اس طرح غلبہ خوف کی وجہ سے یہ جہاد کی سب سے برتر قسم قرار پائی

یہ امت جس کو خدا نے آخری بار امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ذمہ داری سونپی ہے اور جسے اپنی اصلاح آپ ہی کرنی ہے، حق گوئی وبے باکی کی شاندار تاریخ رکھتی ہے۔ اس میں جہاں اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے ضعف ایمان کے باعث منکر کو برداشت کیا اور معروف کا اظہار نہیں کیا، وہاں ایسی مثالیں بھی کم نہیں ہیں کہ اصحاب عزیمت وارباب ہمت نے سینہ تان کر باطل کا مقابلہ کیا اور تلوار کی چھاؤں میں حق کی گواہی دی۔ یہی چیز اب تک اس امت کی زندگی کی ضامن رہی ہے۔ اگر کسی بھی دور میں یہ امت پوری کی پوری حق کے لیے قربانی اور بے خوفی کے جذبے سے خالی ہو جائے تو وہ اس کے انتہائی زوال اور پستی کا دور ہوگا۔ پھر وہ خدا کی رحمت سے دور ہو جائے گی اور کوئی چیز اس کو تباہی سے نہ بچا سکے گی۔ یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں بیان کی گئی ہے:۔

اذا رأیت امتی تھاب	جب تم دیکھو کہ میری امت ظالم کو ظالم کہنے سے ڈر
ان تقول للظالم یا ظالم	رہی ہو تو سمجھ لو کہ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا ہو
فقد تودع	(تاکہ اس کے درمیان معصیت پھیلتی رہے اور وہ خدا کے
منھم[2]	عذاب میں گرفتار ہو جائے)

— جان اور مال کی محبت امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی راہ میں بالعموم سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ جان کس کو عزیز نہیں ہوتی اور مال سے کون بے نیاز ہے؟ آدمی یہ سوچ کر سہم جاتا ہے کہ اگر باطل کو باطل کہوں خصوصاً اس وقت جب کہ وہ اقتدار کا مالک ہوا اور جور وظلم کے خلاف آواز اٹھاؤں جب کہ ہر طرف اسی کی حکم رانی ہو تو مجھے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اگر جسمانی موت سے بچ بھی جاؤں تو ہو سکتا ہے کہ معاشی موت واقع ہو جائے اور معاشی موت بعض پہلوؤں سے جسمانی موت سے بھی زیادہ سخت ہوتی ہے۔ لیکن یہ خوف اور ہراس ایک مومن کی شان سے فروتر اور اس کے ایمان کی کمزوری کی دلیل ہے۔ زندگی اور اسباب زندگی دونوں خدا کے ہاتھ میں ہیں کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ حق کے اظہار میں خوف کھانا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ آدمی اپنی زندگی اور معاش کا مالک انسانوں کو سمجھتا ہے یا کم سے کم اسے خدا پر وہ بھروسہ نہیں ہے جو فی الواقع ہونا چاہیے۔ اسی وجہ سے

[1] معالم القربۃ ص ۳۱۳　[2] رواہ الحاکم وقال صحیح الاسناد (الترغیب والترہیب ج ۳ ص ۱۷۰)

خدا کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ جان و مال کے خطرات سے بے نیاز ہو کر معروف کا حکم دو اور منکر سے منع کرو۔ کیونکہ یہی مومن کے ایمان کا تقاضا ہے۔

یا ایھا الناس مروا بالمعروف	اے لوگو تم معروف کا حکم دو اور منکر سے روکو
وانھوا عن المنکر قبل ان تدعوا اللہ	اس سے پہلے کہ تم خدا کو پکارو اور وہ تمہاری پکار
فلا یستجیب لکم وقبل ان تستغفروہ فلا	کا جواب نہ دے اور اس سے پہلے کہ تم اس سے معافی چاہو
یغفرلکم ان الامر بالمعروف والنھی	اور وہ تمہیں معاف نہ کرے یقیناً امر بالمعروف ونہی عن المنکر
عن المنکر لا یدفع رزقا ولا یقرب اجلا[1]	نہ تو رزق کو دور کرتا ہے اور نہ موت کو قریب کرتا ہے

کسی دوسری برائی کے پیدا ہونے کا خطرہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے پہلے آدمی کو اس کے متوقع نتائج پر بھی غور کر لینا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک نیکی کو قائم کرنے کی کوشش میں دوسری نیکی ختم ہو جائے اور کسی چھوٹے سے منکر کو مٹانے کی فکر میں اس سے بڑا منکر وجود میں آ جائے علامہ عزالدین عبدالملک فرماتے ہیں نہی عن المنکر بعض شرائط کے ساتھ واجب ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک شرط ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے:۔

ان یغلب علی ظنہ انہ	اس فرض کے انجام دینے والے کو اس بات کا ظن
ان نہاہ لا یلحقہ مضرۃ ولا یزید	غالب حاصل ہو کہ اگر وہ منکر کا ارتکاب کرنے والے کو منکر سے
المنھی عنہ ایضا فی منکرا نہ	منع کرے گا تو اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور نیز جس کو
متعنتا لانکارہ[2]	منع کیا جا رہا ہے وہ اس کی تنقید کی وجہ سے اپنے
	منکرات میں قصداً آگے نہیں بڑھ جائے گا۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے سلسلے میں کسی غلط ردعمل کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس فرض کے انجام دینے والے کو کوئی نقصان پہنچے۔ دوسری صورت یہ کہ وہ خود تو بچ جائے لیکن کوئی دوسری خرابی پیدا ہو جائے۔ مثلاً کوئی بے گناہ اور غیر متعلق شخص قتل ہو جائے یا منکر کا ارتکاب کرنے والا مزید اپنے منکر پر اصرار کرنے لگے۔ وغیرہ۔ جہاں تک ردعمل کی دوسری صورت کا تعلق ہے، علماء کا اتفاق ہے کہ اس صورت میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض

---

[1] رواہ الاصبہانی (الترغیب والترہیب ج ۴ ص ۹) اسی مفہوم کا ایک خطبہ حضرت علیؓ سے بھی مروی ہے (دیکھیے ابن کثیر ج ۲ ص ۷۲)

[2] مبارق الازہار شرح مشارق الانوار ج ۱ ص ۵

انجام نہیں دینا چاہیے۔ پہلی صورت کے بارے میں علامہ سعد الدین تفتازانی لکھتے ہیں:۔

منها (اى من شرائط الامر بالمعروف والنهى عن المنكر) انتفاء مضرة ومفسدة اكثر من ذالك المنكر او مثله فهذا فى حق الوجوب دون الجواز حتى قالوا يجوز وان ظن انه يقتل ولا ينكى نكاية بضرب ونحوه لكن يرخص له السكوت[1]

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ جس منکر کو مٹانے کی کوشش کی جارہی ہو اس سے بڑا یا اس جیسا منکر نہ پیدا ہو لیکن یہ بات وجوب کے حق میں ہے جواز کے حق میں نہیں ہے۔ علماء نے یہاں تک کہا ہے کہ اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ وہ قتل کر دیا جائے گا اور منکر کا ارتکاب کرنے والے کو کوئی معمولی نقصان تک جیسے زدوکوب وغیرہ نہیں پہنچا سکے گا تو بھی اس کے لیے اس فرض کا انجام دینا جائز ہے۔ ہاں اس حالت میں اس کو اجازت ہے کہ خاموش رہے۔

امام غزالیؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ دعویٰ اتنے عموم کے ساتھ صحیح نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دین کے لیے جان دینا شہادت ہے اور شہادت ایک مسلمان کے لیے سب سے بڑی دولت ہے۔ لیکن مومن کو بہرحال یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ اپنی جان دے کر دین کو کوئی فائدہ پہنچا بھی رہا ہے یا نہیں؟ بے فائدہ محض جان دے دینا نہ دانشمندی ہے اور نہ کارِ ثواب۔ فرماتے ہیں:۔

ان يعلم انه يصاب بمكروه ولكن يبطل المنكر بفعله كما يقدر على ان يرمى زجاجة الفاسق بحجر فيكسرها ويريق الخمر او يضرب العود الذى فى يده ضربة مختطفة فيكسره فى الحال ويتعطل عليه هذا المنكر ولكن يعلم انه يرجع اليه فيضرب رأسه فهذا ليس بواجب وليس بحرام

احتساب کرنے والا اگر یہ جانتا ہو کہ اس کو تکلیف تو پہنچے گی لیکن وہ اپنے عمل سے منکر کو مٹا سکتا ہے۔ مثلاً اس کو یہ طاقت ہے کہ کسی فاسق کا شراب سے بھرا ہوا گلاس توڑ دے اور اسے بہا دے یا اس کے ہاتھ میں ستار ہے تو اس پر اچانک ایسی ضرب لگائے کہ وہ فی الحال ٹوٹ جائے اور اس کے لیے بے کار ہو جائے۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کا نتیجہ نکلے گا کہ فاسق اس پر پلٹ پڑے گا اور اس کے سر پر دے مارے گا تو اس صورت میں احتساب نہ واجب ہے اور نہ حرام بلکہ مستحب ہے۔

[1] شرح المقاصد ۲، ۱۵۲

بل هو مستحب[1] — پسندیدہ ہے۔

آگے چل کر امام غزالی نے اس سلسلے میں مزید بحث کی ہے۔ ہم اپنے الفاظ میں ان کے خیالات کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:—

"اگر احتساب کرنے والے کو اس بات کا خطرہ ہے کہ اس کو مارا پیٹا جائے گا' یا ہلاک کر دیا جائے گا تو وہ اپنے آپ کو اس خطرے میں ڈال کر احتساب کا فرض انجام دے سکتا ہے۔ یہ اس کے لیے نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ مستحب ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس احتساب کا کوئی فائدہ ہو۔ مثلاً اس سے کوئی منکر مٹے یا منکر کا ارتکاب کرنے والے کا وقار اور حیثیت ختم ہو یا کم سے کم اس سے اہل ایمان کو تقویت حاصل ہو۔ لیکن اگر صورت ایسی ہو کہ ایک شخص شراب پینے کی تیاری کر رہا ہے اور ہاتھ میں تلوار لیے ہوئے ہے۔ حالات صاف بتا رہے ہیں کہ اگر اس پر تنقید کی جائے تو نہ صرف یہ کہ وہ تنقید کرنے والے کو ختم کر دے گا بلکہ شراب بھی پی جائے گا۔ اس صورت میں احتساب کرنا ہمارے خیال میں صحیح نہیں ہے اس لیے کہ یہ محض اپنی ہلاکت ہے اور اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ حالانکہ مطلوب یہ ہے کہ دین کا فائدہ ہو اور آدمی قربانی دے کر اس کو بچائے۔ بغیر کسی فائدے کے اپنے آپ کو ہلاکت کے لیے پیش کر دینا تو اس کے جواز کی کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ اسے حرام ہونا چاہیے۔ کسی بھی شخص کے لیے انکار منکر اسی وقت مستحب ہے جب کہ وہ منکر کے مٹانے پر قادر ہو یا اس کا کوئی دینی فائدہ متوقع ہو۔ یہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ پہنچنے والی تکلیف صرف احتساب کرنے والے کی ذات تک محدود رہے لیکن اگر اس کو یہ پہلے سے معلوم ہو کہ منکر کا ارتکاب کرنے والا اس کے ساتھ اس کے کسی ساتھی، کسی رشتہ دار اور کسی رفیق کو ایذا پہنچائے گا تو اس کے لیے احتساب ناجائز ہی نہیں بلکہ حرام ہوگا۔ کیونکہ قدرت اس کا نام نہیں ہے کہ آدمی ایک منکر کو اس طرح مٹائے کہ اس سے دوسرا منکر وجود میں آ جائے۔ اس سے آگے ہم یہ بھی کہیں گے کہ اگر محتسب کو یہ معلوم ہو کہ جس منکر پر وہ احتساب کر رہا ہے وہ تو مٹ جائے گا لیکن اس کے نتیجے میں ایک دوسرا شخص کسی دوسرے منکر کا ارتکاب کر گزرے گا تو بظاہر صحیح بات یہ ہے کہ اس کو احتساب نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ مقصد یہ نہیں ہے کہ کوئی خاص فرد منکر کا ارتکاب نہ کرے بلکہ یہ ہے کہ مطلقاً منکر وجود میں نہ آئے ...... انسان جس منکر کو مٹانا چاہتا ہے اور وہ منکر جو اس کے نتیجے میں پیدا ہو سکتا ہے ان دونوں کے درجات میں فرق کر کے اقدام کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کسی کی بکری ذبح کر کے کھانا چاہتا ہے۔ اگر اس پر احتساب کرنے والے کو یہ معلوم ہو کہ اس کو اس منکر سے

[1] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۲۸۵

روکنے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ کسی انسان کو ذبح کرکے کھا جائے گا تو ظاہر ہے اس وقت احتساب کا فرض انجام دینا بہت ہی نامعقول ہوگا۔ اس کے برعکس ایک شخص کسی انسان کو ذبح کرنے جا رہا ہے یا اس کا کوئی عضو کاٹنا چاہتا ہے اگر احتساب کرنے والے کو یہ معلوم ہو کہ احتساب کے نتیجہ میں وہ اس کو چھوڑ دے گا اور اس کے مال پر قبضہ کرلے گا تو اس وقت بلا شبہہ جواز کی صورت نکل سکتی ہے۔ اس طرح کے تمام معاملات میں محتسب کو اپنے اجتہاد سے کام لینا چاہیے۔ کیونکہ اس کے لیے کوئی ایک حکم اور لگا بندھا ضابطہ وضع نہیں کیا جا سکتا۔[۱]

عدمِ افادیت کا احساس ایک صورت یہ ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے نتیجے میں انسان کو کسی ضرر کا اندیشہ تو نہ ہو لیکن اس کا وہ کوئی فائدہ نہ محسوس کرتا ہو۔ اس صورت میں امام غزالی فرماتے ہیں کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض تو نہ ہوگا لیکن اس کا استحباب باقی رہے گا۔ کیونکہ جس شخص کی روش پر وہ احتساب کر رہا ہے وہ اپنی روش سے باز آئے یا نہ آئے لیکن اس کا یہ فائدہ تو بہرحال ہے کہ اس سے دین کا برملا اظہار ہوتا ہے اور دوسروں کو شریعت سے واقفیت بہم پہنچتی ہے۔ امام غزالی کے الفاظ یہ ہیں:

ان یعلم انہ لا یفید	احتساب کرنے والا اگر جانتا ہے کہ اس کا
انکارہ لکنہ لا یخاف	احتساب کرنا غیر مفید ہے لیکن اس کو کسی تکلیف کے
مکروھا فلا تجب علیہ الحسبۃ لعدم	پہنچنے کا ڈر نہیں ہے تو اس پر احتساب ضروری نہیں ہے
فائدتھا ولکن تستحب لاظہار	کیونکہ اس کی کوئی افادیت نہیں ہے۔ البتہ شعائر اسلام
شعائر الاسلام وتذکیر	کے اظہار اور لوگوں کو امور دین کی تذکیر کی غرض سے یہ مستحب
الناس بامر الدین[۲]	اور پسندیدہ ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ اوپر جو صورت بیان ہوئی ہے اس میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر جائز ہی نہیں بلکہ جب اور ضروری ہے۔[۳]

لیکن بالعموم علماء نے یہی لکھا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے نتیجے میں کسی غلط ردِّ عمل اور نقصان کا اندیشہ بھی ہو تو وہ ایک مسلمان پر اسی وقت فرض ہوگا جب کہ اس کی افادیت کا اسے یقین ہو۔ اگر وہ اس کو غیر مفید اور ۔۔۔ ۔۔۔شیخ خیال کرتا ہے تو اس کا وجوب بھی باقی نہیں رہے گا۔ چنانچہ علامہ عز الدین عبد الملک نے نہی عن المنکر کے ۔۔۔ب کی جو شرطیں بیان کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے:

[۱] احیاء علوم الدین ج ۲ ص۲۸۹ [۲] احیاء علوم الدین ج ۲ ص۲۸۲ [۳] التشریع الجنائی ص۴۹۲ حاشیہ ۳

ان یغلب علی ظنہ انہ مؤثر لا عبث[1]

اس کو اس بات کا ظن غالب حاصل ہو کہ اس کا منع کرنا موثر ہوگا عبث نہ ہوگا۔

علامہ سعد الدین تفتازانی کا بھی یہی خیال ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جس سلسلے میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض انجام دیا جارہا ہو اس میں اس کی عدم افادیت کے باوجود اس کو واجب قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ باقی رہا یہ دعویٰ کہ اس سے دین کا وقار بلند ہوتا ہے تو یہ اپنے عموم واطلاق کے ساتھ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ بسا اوقات اس سے دین کو نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

منہا ای من شرائط وجوب الامر بالمعروف والنھی عن المنکر تجویز التاثیر بان لا یعلم عدم التاثیر قطعا لئلا یکون عبثا واشتغالا بما لا یعنی فان قیل یجب وان لم یؤثر اعزازا للدین قلنا ربما تکون اذلالا[2]

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے وجوب کی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے مؤثر ہونے کا خیال ہو۔ اس طرح کہ اس کام کے کرنے والے کو اس کے غیر مؤثر ہونے کا قطعی یقین نہ ہو جائے۔ تاکہ وہ کار عبث اور بے فائدہ مشغولیت نہ ہو کر رہ جائے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ غیر مؤثر ہونے کے باوجود دین کے اعزاز کی خاطر ضروری ہے تو ہمارا جواب یہ ہے کہ بسا اوقات اس میں دین کی تذلیل بھی ہے۔

افادیت کا امکان مسلمانوں کے درمیان امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے رد عمل دو طرح کے متوقع ہیں۔ ایک تو وہ رد عمل ہے جو فوراً ہی ظاہر ہوتا ہے اور دوسرا وہ جس کے ظاہر ہونے میں کچھ مدت لگ سکتی ہے۔ فوری رد عمل ان مخصوص حالات کا نتیجہ ہوتا ہے جن میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام پاتا ہے۔ ان حالات میں افراد ہوں یا جماعتیں بالعموم نیکی سے دور ہوتی ہیں اور بدی کی طرف ان کا رجحان بڑھ جاتا ہے۔ ان میں منکر کو چھوڑنے اور معروف کو قبول کرنے کے لیے آمادگی نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات وہ منکر کے خلاف اور معروف کے حق میں کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ان حالات میں جہاں اس کا امکان ہے کہ معروف قائم ہو اور منکر مٹ جائے، وہاں اس کا بھی زبردست خطرہ ہے، کہ اس فرض کا انجام دینے والا اپنی جان دے دے لیکن کوئی معروف قائم ہو اور نہ کوئی منکر مٹے۔ دوسرا رد عمل ان حالات کے ختم ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس وقت اس فرد یا جماعت کو سنجیدگی سے سوچنے کے زیادہ مواقع حاصل ہوتے ہیں جنہیں معروف کی دعوت دی گئی تھی

[1] مبارق الازھار فی شرح مشارق الانوار ج ۱ ص ۵ [2] شرح المقاصد ج ۲ ص ۱۸۲

یا منکر سے منع کیا گیا تھا۔ یہ ردعمل بالعموم ایک مسلمان فرد یا گروہ پر بہت ہی صالح اور مفید ہوتا ہے۔ اگر کوئی فاسق مسلمان کسی مبلغ دین کی گردن اڑا بھی دے تو اس کا سینہ اس احساس سے خالی نہیں ہو سکتا کہ اس نے اپنے ایک خیر خواہ اور ناصح کے ساتھ وہ سلوک کیا جو کسی دشمن ہی کے ساتھ روا رکھا جا سکتا ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ یہی احساس اس کے دین کی طرف رغبت کا سبب بن جائے۔ اگر وہ خود دین کی طرف راغب نہ بھی ہو تو بہت ممکن ہے کہ تبلیغ دین سے بہت سے وہ لوگ فائدہ اٹھائے جائیں جو گو فسق و معصیت میں اس کے شریک ہیں لیکن ابھی ان میں قبول حق کی صلاحیت موجود ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا ہے کہ کسی دور اور کسی خطہ میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام پایا ہو اور پوری کی پوری قوم اس کے پاکیزہ ثمرات سے محروم رہ گئی ہو۔ امام محمد نے مسئلہ پر اسی پہلو سے غور کیا ہے اور اس کی خوبی یہی ہے کہ اس میں امت مسلمہ کی نفسیات کی پوری رعایت کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں:-

وفي الامر بالمعروف والنهي	امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے سلسلے میں ایک
عن المنكر يسعه الاقدام ان	مسلمان کو اس حال میں بھی اقدام کی گنجائش ہے جب کہ
كان يعلم ان القوم يقتلونه	وہ جانتا ہو کہ لوگ اس کو قتل کر دیں گے اور خود اس کی
وانه لا يتفرق جمعهم بسببه	وجہ سے ان کی جمعیت منتشر نہیں ہوگی۔ کیونکہ یہاں کے
لان القوم هناك مسلمون	مسلمان ہیں اور جن باتوں کا وہ ان کو حکم دے رہا ہے
معتقدون لما يامرهم به فلابد	وہ ان پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس لیے لازماً اس کا عمل
من ان فعله ينكئ في قلوبهم وان	ان کے دلوں پر اثر انداز ہوگا خواہ وہ اس کا اظہار
كانوا لا يظهرون ذالك[1]	نہ کرتے ہوں۔

احادیث سے بھی اسی نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے۔ کیونکہ دو طرح کی حدیثیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ایک طرف تو وہ حدیثیں ہیں جن میں اس بات کی اجازت ہے کہ بگڑے ہوئے حالات میں آدمی گوشہ گیر ہو جائے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو چھوڑ دے۔ دوسری طرف وہ حدیثیں ہیں جن میں ان لوگوں کی تعریف کی گئی ہے جو معاشرے کے بگاڑ سے گھبرا کر اس سے کٹ نہیں جاتے بلکہ اس میں رہ کر اصلاح کے فرائض انجام دیتے ہیں، تاکہ جن لوگوں میں قبول حق کی صلاحیت ہے وہ آج نہیں کل اس کو قبول کر لیں۔ ظاہر ہے اگر مستقبل میں بھی کسی قوم کے سدھرنے اور راہ یاب ہونے کی توقع ختم ہو جائے تو وہ خدا کے عذاب کی مستحق ہو جاتی ہے۔ اس کی اصلاح

[1] شرح السیر الکبیر ج ۲ صفحہ ۲۳۹

کا سلسلہ ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہاں بحث اس طرح کی کسی قوم سے نہیں ہے بلکہ ان لوگوں سے ہے جو فوراً اصلاح قبول کرنے کے لیے تو آمادہ نہیں ہیں لیکن آئندہ ان کی اصلاح کا امکان ہے۔ کیا ان کو معروف کا حکم دینا اور منکر سے منع کرنا فرض ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ فرض تو نہیں ہے لیکن اس کی اہمیت اور فضیلت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مخالف اور سخت حالات میں حق پر ثابت قدم رہنا اور اس کی طرف دعوت دینا اور مسلسل دعوت دینا ہر کس و ناکس کے لیے ممکن نہیں ہے۔ جب ماحول اس قدر ناساز گار ہو کہ لوگوں کو اپنے ایمان کی حفاظت بھی دشوار معلوم ہونے لگے تو عوام کے لیے یہی بہت ہے کہ وہ اپنے ایمان کو بچائے رکھیں لیکن اگر خواص بھی اس سے آگے نہ بڑھیں تو یہ ان کا اپنی صلاحیتوں کے ساتھ ظلم ہوگا۔ ہم یہاں پہلے ایسی تین حدیثیں پیش کرتے ہیں جن میں اس بات کی صراحت ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض اس وقت ساقط ہو جاتا ہے جب کہ اس کی کوئی افادیت نہ محسوس ہو۔

(۱) ائتمروا بالمعروف وتناھوا	تم ایک دوسرے کو معروف کا حکم دو اور منکر سے
عن المنکر حتی اذا رایت شحًّا	منع کرو لیکن جب تم دیکھو کہ بخل کی اطاعت کی جاتی ہے
مطاعا وھوی متبعا ودنیا مؤثرۃ	خواہش کی پیروی ہو رہی ہے، دنیا کو آخرت پر ترجیح
واعجاب کل ذی رای برایہ	حاصل ہو اور ہر صاحب رائے اپنی رائے میں مست ہے (قطع
فعلیک بخاصۃ نفسک و	نظر اس سے کہ شریعت کا اس کے بارے میں کیا حکم ہے)
دع العوام[1]	تو تم صرف اپنی ذات کی فکر کرو اور عوام کو چھوڑ دو۔

بعض روایات میں ان الفاظ کا اضافہ بھی موجود ہے۔ ورایت امرا لابد ان لک بہ[2] یعنی جب حالات ایسے ہو جائیں کہ ان کے مقابلے کی تم میں طاقت نہ رہے تو تم امر بالمعروف ونہی عن المنکر چھوڑ سکتے ہو۔

(۲) یوشک ان یاتی زمان	ایک ایسا زمانہ جلد ہی آنے والا ہے جس میں انسان
یغربل الناس فیہ غربلۃ تبقی	چھلنی میں چھان دیے جائیں گے اور رذیل اور کمینے
حثالۃ من الناس قد مرجت	لوگ رہ جائیں گے۔ ان کے عہد و پیمان بگڑ جائیں گے
عھودھم واماناتھم واختلفوا	اور امانتوں میں خیانت ہونے لگے گی (ان کے بیچ

---

[1] ترمذی، کتاب التفسیر (سورۃ المائدہ) ابوداؤد کتاب الملاحم باب الامر والنہی

[2] ابن ماجہ ابواب الفتن باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر۔

فصاروا هكذا وشبك بين أصابعه فقالوا كيف بنا يا رسول الله فقال تأخذون ما تعرفون وتذرون ما تنكرون وتقبلون على أمر خاصتكم وتذرون أمر عامتكم[1]

(اور جیسے) آپس میں اس طرح مل جائیں گے۔ آپ نے اپنی انگلیوں کو آپس میں ملا کے دکھایا۔ (یعنی ان کے درمیان تمیز کرنا دشوار ہو جائے گا) صحابہ نے کہا اس وقت ہم کیا کریں؟ آپ نے جواب دیا جس چیز کو تم معروف سمجھتے ہو اسے پکڑے رہو اور جس چیز کو منکر خیال کرتے ہو اسے چھوڑ دو۔ اپنے خواص کی روش اختیار کرو اور عوام کے معاملات سے نظر پھیر لو۔

(۳) عن أنس بن مالك قال قيل يا رسول الله متى ندع الائتمار بالمعروف والنهي عن المنكر قال إذا ظهر فيكم ما ظهر في بني إسرائيل إذا كانت الفاحشة في كباركم والملك في صغاركم والعلم في رذالكم[2]

انس بن مالک سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کن حالات میں ہم ایک دوسرے کو معروف کا حکم دینا اور منکر سے منع کرنا چھوڑ دیں۔ آپ نے جواب دیا اس وقت جب کہ تمہارے اندر بھی وہ خرابیاں ظاہر ہونے لگیں جو بنی اسرائیل میں ظاہر ہوئی تھیں یعنی زنا اور بے حیائی تمہارے بڑوں میں، سلطنت اور حکومت تمہارے چھوٹوں میں اور علم تمہارے فاسقوں اور فاجروں میں۔

یہ احادیث اپنے مفہوم میں بہت ہی واضح ہیں لیکن یہاں بھی اس حقیقت کو نہیں بھولنا چاہیے کہ ان میں جو حالات بیان ہوئے ہیں وہ یا اس نوعیت کے حالات جہاں کہیں بھی پیدا ہوں وہاں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام نہ دینا محض جواز کی حیثیت رکھتا ہے فرض یا مستحب کی نہیں چنانچہ پہلی حدیث کے سلسلے میں علامہ ابوبکر جصاص فرماتے ہیں

يعني والله أعلم إذا لم يقبلوا ذلك واتبعوا أهواءهم وآراءهم فأنت في سعة من تركهم[3]

یعنی جب وہ حق کو قبول نہ کریں اور اپنی خواہشات کے پیچھے چلنے لگیں تو تمہارے لیے گنجائش ہے کہ تم ان کو چھوڑ دو

[1] ابوداؤد کتاب الملاحم باب الامر والنہی۔ ابن ماجہ ابواب الفتن باب التثبت فی الفتنۃ۔ مسند احمد ج ۲ ص ۲۲۱ [2] مسند احمد ج ۳ ص ۱۸۷۔ ابن ماجہ ابواب الفتن باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر [3] احکام القرآن ج ۲ ص ۴۸۶

دوسری حدیث کے بارے میں ابو داؤد کے ہندوستانی شارح مولانا محمد اشرف عظیم آبادی فرماتے ہیں :-

هذا رخصة فی ترك الامر بالمعروف والنهی عن المنكر اذا كثر الاشرار وضعف الاخيار[1] | یہ رخصت ہے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو چھوڑ دینے کی جب کہ بروں کی تعداد بہت بڑھ جائے اور نیک لوگ کم زور ہو جائیں ۔

تیسری روایت کے ہم معنی ایک روایت نقل کرنے کے بعد علامہ سعد الدین تفتازانی نے لکھا ہے :-

الحديث فلا يدل الا على نفی الوجوب عند فوات الشرط بلزوم المفسدة وانتفاء الفائدة[2] | حدیث صرف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اس وقت واجب نہ ہوگا جب کہ اس کی شرط نہ پائی جائے یعنی اس سے بگاڑ لازم آئے اور کوئی فائدہ نہ رہے ۔

جب حالات اس قدر بگڑ جائیں کہ گوشہ گیر ہوئے بغیر آدمی کے لیے اپنے دین وایمان کی حفاظت دشوار ہو جائے تو اسے اس کی بھی اجازت ہے کہ تعلقات کو توڑ دے اور گوشہ گیر ہو جائے ۔ کیونکہ ایمان کو بچانا ہر چیز پر مقدم ہے۔ اس کے لیے دنیا کی ہر چیز چھوڑی جا سکتی ہے لیکن کسی بھی چیز کے لیے اسے نہیں چھوڑا جا سکتا ۔ یہی وہ وقت ہے جب کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض ساقط ہو جاتا ہے لیکن جو افراد قوموں کی اصلاح کے لیے پیدا ہوتے ہیں وہ صرف فرائض وواجبات ہی کی تکمیل پر قانع نہیں ہوتے بلکہ وہ ان سے آگے کے کام بھی انجام دیتے ہیں ۔ وہ اپنی فکر ہی نہیں کرتے، بلکہ دوسروں کو بھی بچانا چاہتے ہیں ۔ ان کے لیے گوشہ گیری اور عزلت کی اجازت ہوتی ہے لیکن وہ اس کو قبول نہیں کرتے ۔ کیونکہ اگر وہ بھی فساد سے گھبرا کر میدان چھوڑ دیں تو دنیا میں نہ کبھی معروف قائم ہوگا اور نہ منکر کے خلاف آواز بلند ہوگی ۔ دور فتن میں انسان اپنے دین کی حفاظت کے لیے معاشرے سے کٹ جائے تو اس میں شک نہیں کہ یہ اس کے لیے صحیح ہوگا ۔ کیونکہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ابھی سینہ میں ایمان کی محبت موجود ہے، لیکن احادیث میں اس سے اونچا مقام یہ بتایا گیا ہے کہ خدا کی راہ میں جہاد کیا جائے تاکہ باطل مٹے اور حق زندہ رہے ۔ ہم اس نوعیت کی بھی تین حدیثیں یہاں نقل کرتے ہیں :-

من خير معاش الناس رجل ممسك عنان فرسه | لوگوں کی بہترین حالت زندگی یہ ہے کہ آدمی خدا کے راستے میں اپنے گھوڑے کی لگام کو تھامے

[1] عون المعبود ج ۴ ص ۲۱۲ مطبوعہ دہلی ۱۳۲۳ھ [2] شرح المقاصد ج ۲ ص ۱۵۱

فی سبیل اللہ یطیر علی متنہ
کلما سمع ھیعۃ او فزعۃ
طار علیہ یبتغی القتل والموت
مظانہ او رجل فی غنیمۃ فی رأس
شعفۃ من ھذہ الشعف او
بطن واد من ھذہ الاودیۃ
یقیم الصلوٰۃ ویؤتی الزکوٰۃ
ویعبد ربہ حتی یاتیہ الیقین
لیس من الناس الا فی
خیر [1]

ہوئے ہے۔ اس پر سوار ہو کر اڑ جاتا ہے جب کبھی وہ دشمن
کی آمد کے وقت لوگوں کی آواز سنتا ہے یا ان میں
خوف اور گھبراہٹ محسوس کرتا ہے وہ اس پر اڑتا ہے
اور قتل اور موت کو اس کے خاص مواقع پر (یعنی
میدان جنگ کے بیچ میں) تلاش کرتا ہے یا وہ
شخص جو اپنی چند بکریوں کے ساتھ پہاڑ کی ان چوٹیوں
میں سے کسی ایک پر یا ان وادیوں میں سے کسی ایک
وادی میں جا بستا ہے۔ وہاں وہ نماز قائم کرتا ہے۔
زکوٰۃ دیتا ہے اور اپنے رب کی عبادت کرتا ہے
یہاں تک کہ اسی حالت میں اس کی موت آجاتی ہے۔ لوگوں
سے اس کے تعلقات بس بھلائی کے ساتھ ہیں۔

اس حدیث کے بارے میں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اس میں مجاہد فی سبیل اللہ اور دامن کوہ میں گوشہ گیر ہو جانے والے کو ایک حیثیت دی گئی ہے۔ ظاہر ہے یہ کھلی ہوئی ناانصافی ہے جو خدا اور اس کے رسول سے ممکن نہیں۔ چنانچہ اسی مضمون کی ایک اور حدیث ہے جو اس سے کچھ مختصر ہے لیکن اس میں صراحت ہے کہ افضل اور اعلیٰ مقام جہاد کا ہے اور اس کے بعد ایمان کی حفاظت کے لیے ترکِ دنیا اور گوشہ نشینی کا۔

عن ابی سعید الخدری
قال قیل یا رسول اللہ ای الناس
افضل فقال رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم مومن یجاھد فی سبیل
اللہ بنفسہ ومالہ قالوا ثم من
قال مومن فی شعب من الشعاب یتقی
اللہ ویدع الناس من

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے۔ انھوں
نے کہا رسول اللہؐ سے پوچھا گیا کہ لوگوں میں کون شخص سب سے
زیادہ فضیلت والا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ وہ مومن
جو خدا کی راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد کرتا ہے
لوگوں نے پوچھا۔ اس کے بعد کس کا مقام ہے؟ آپ نے فرمایا
وہ مومن جو پہاڑ کی گھاٹیوں میں سے کسی گھاٹی میں ہے
خدا سے ڈرتا ہے اور لوگوں کو اپنے شر سے دور

[1] مسلم کتاب الامارۃ، باب فضل الجہاد والرباط، ابن ماجہ، ابواب الفتن، باب العزلۃ۔

شره[1] رکھے ہوئے ہے۔

دوسری حدیث یہ ہے :-

المؤمن القوی خیر واحب الی اللہ من المومن الضعیف وفی کل خیر[2]

طاقت ور مومن زیادہ اچھا اور خدا کے نزدیک محبوب ہے اس مومن کے مقابلے میں جو کم زور ہے لیکن ہر ایک میں بھلائی ہے۔

اس حدیث کی شرح امام نووی نے ان الفاظ میں کی ہے :-

المراد بالقوة هنا عزيمة النفس والقريحة فى امور الآخرة فيكون صاحب هذا الوصف اكثر اقداما على العدو فى الجهاد واسرع خروجا اليه وذهابا فى طلبه واشد عزيمة فى الامر بالمعروف والنهى عن المنكر والصبر على الاذى فى كل ذالك واحتمال المشاق فى ذات الله تعالى وارغب فى الصلوة والصوم والاذكار وسائر العبادات وانشط طلبا لها ومحافظة عليها ونحو ذالك واما قوله صلى الله عليه وسلم وفى كل خير فمعناه فى كل من القوى والضعيف خير لاشتراكهما فى الايمان مع ما يأتى به الضعيف من العبادات[3]

قوت سے مراد یہاں آخرت کے معاملات میں عزم نفس اور طبیعت کی مضبوطی ہے جس کے اندر یہ خوبی ہوگی وہ جہاد میں دشمن پر زیادہ اقدام کرے گا اس کی طرف نکلنے اور اس کی تلاش میں زیادہ تیز ہوگا معروف کا حکم دینے اور منکر سے روکنے اور ان سب کے سلسلے میں جو تکلیف پہنچے اس پر صبر کرنے اور خدا کی راہ میں مشقت کو برداشت کرنے میں زیادہ مضبوط عزم والا ہوگا اسی طرح وہ نماز، روزہ، اذکار اور تمام عبادات کی طرف زیادہ راغب ہوگا۔ نشاطِ قلب کے ساتھ ان کو ادا کرے گا اور ان کی محافظت کرے گا وغیرہ رہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ ہر ایک میں بھلائی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مومن قوی اور مومن ضعیف دونوں میں بھلائی ہے کیونکہ دونوں میں ایمان مشترک ہے۔ اس کے ساتھ ضعیف عبادات بھی انجام دیتا ہے (گو وہ ادا کم کرتا ہے)

---

[1] بخاری، کتاب الجہاد، باب افضل الناس مومن مجاہد بنفسہ ومالہ فی سبیل اللہ ورواہ مسلم فی کتاب الامارۃ وابوداؤد والترمذی والنسائی فی ابواب الجہاد وابن ماجہ فی ابواب الفتن۔ [2] مسلم، کتاب القدر، باب الایمان بالقدر والاذعان لہ۔ ابن ماجہ، مقدمہ، باب فی القدر

[3] شرح مسلم ج ۲ ص ۳۳۳

اس سلسلے کی تیسری حدیث یہ ہے :-

المومن الذی یخالط الناس	وہ مومن جو لوگوں سے ملتا ہے اور ان کی ایذا رسانی
ویصبر علی اذاھم اعظم اجرا	پر صبر کرتا ہے اس کا اجر بہت بڑا ہے اس مومن کے اجر
من الذی لا یخالطھم ولا یصبر	سے جو نہ ان سے ملتا ہے اور نہ ان کی ایذا رسانی پر
علی اذاھم[1]	صبر کرتا ہے۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ محمد بن اسمٰعیل الصنعانی لکھتے ہیں :-

فیہ افضلیۃ من یخالط الناس	اس حدیث میں اس شخص کی فضیلت بیان ہوئی
مخالطۃ یامرھم فیھا بالمعروف	ہے جو لوگوں سے ملا جلا رہتا ہے ایسا ملنا کہ جس میں وہ ان
وینھاھم عن المنکر	کو معروف کا حکم دیتا اور منکر سے منع کرتا ہے اور ان کے
ویحسن معاملتھم فانہ افضل من	ساتھ بہتر سلوک کرتا ہے وہ افضل ہے اس شخص کے مقابلے
الذی یعتزلھم ولا یصبر علی	میں جو ان سے الگ رہتا ہے اور ان سے میل جول سے
المخالطۃ[2]	پہنچنے والی تکلیف پر صبر نہیں کرتا۔

[1] مسند احمد ج ۲ ص ۴۳ ابن ماجہ ابواب الفتن باب الصبر علی البلاء۔ ترمذی ابواب صفۃ القیامۃ
[2] سبل السلام شرح بلوغ المرام ج ۲ ص ۲۸۳ مطبوعہ مطبع فاروقی دہلی ۱۳۱۰ھ

رسالت

مولانا محمد یوسف اصلاحی

خدا نے بندوں تک اپنے احکام اور مرضیات کا علم پہنچانے کے لیے جو "نظام ہدایت" قائم فرمایا ہے — قرآن کی اصطلاح میں اس کا نام "رسالت" ہے اور رسول وہ پاک انسان ہے جس کو خود اللہ نے اپنا پیغام بندوں تک پہنچانے کے لیے منتخب فرما کر علم و حکمت اور بصیرت سے نوازا ہے۔

خدا کی ذات و صفات، اس کے احکام و مرضیات اور موت کے بعد کی یقینی حقیقتوں کو جاننے اور ابدی سعادت سے ہمکنار ہونے کا صرف ایک ہی مستند ذریعہ ہے کہ خدا کے رسولوں پر کامل اعتماد کیا جائے اور ان کی ہدایت و رہنمائی پر دل سے ایمان لا کر ان کی پیروی میں زندگی گزاری جائے۔

حقیقی علم و بصیرت

یٰاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ	اباجان! درحقیقت میرے پاس وہ علم آیا ہے
مَا لَمْ یَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِیْ	جو آپ کے پاس نہیں آیا۔ آپ میری پیروی کریں میں
اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِیًّا ۝ (مریم ۴۳)	آپ کو سیدھی راہ پر چلاؤں گا۔

حضرت ابراہیمؑ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ وحی الٰہی کے ذریعے حقیقت کا جو خاص علم میرے پاس آیا ہے وہ صرف انہی لوگوں کو دیا جاتا ہے جن کو خدا اپنی سفارت اور پیغامبری کے لیے منتخب فرماتا ہے۔ عام لوگ اس حقیقی علم و بصیرت سے محروم ہوتے ہیں — حقیقت کو پانے اور صراطِ مستقیم پر چلنے کی صرف یہی ایک شکل ہے کہ آپ اس ہدایت پر سچے دل سے ایمان لائیں اور میری پیروی کریں۔ میں وحی الٰہی کی روشنی میں آپ کو جس راہ پر چلاؤں گا وہی سیدھی، ہموار اور ابدی سعادتوں کی راہ ہے۔

رسول خدا کا ترجمان ہوتا ہے

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ	اور وہ خواہش نفس سے کوئی بات
الْهَوٰی ۝ اِنْ هُوَ	نہیں کہتے وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ تو صرف وہ وحی ہوتی
اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۝ (النجم: ۳، ۴)	ہے جو ان پر نازل کی جاتی ہے۔

یعنی رسول دین کے معاملے میں اپنے جی سے کوئی بات نہیں کہتے وہ براہ راست خدا کے ترجمان ہوتے ہیں اور وہی کہتے ہیں جو خدا کی جانب سے اُن پر وحی کی جاتی ہے۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ	اگر پیغمبر ہماری نسبت کوئی جھوٹ بنا لاتے تو
لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا	ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے پھر ان کی رگِ گردن کاٹ
مِنْهُ الْوَتِيْنَ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ (الحاقہ)	ڈالتے پھر تم میں سے کوئی بھی اس سے روکنے والا نہ تھا
وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ	اور موسیٰ نے کہا۔ اے فرعون! میں کائنات
رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ حَقِيْقٌ	کے مالک کی جانب سے بھیجا ہوا آیا ہوں میرا منصب
عَلٰۤى اَنْ لَّاۤ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ (الاعراف: ۱۰۴-۱۰۵)	یہی ہے کہ اللہ کا نام لے کر جو بات کہوں حق ہی کہوں

قیامت کے دن جب خدا عیسیٰؑ سے سوال کرے گا کہ کیا آپ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ مجھے اور میری والدہ دونوں کو خدا قرار دو۔ تو وہ جواب میں کہیں گے

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِيْ بِهٖۤ	میں نے ان سے اس کے سوا کچھ نہیں کہا
اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ	جس کا آپ نے حکم دیا تھا۔ یہ کہ اللہ کی بندگی کرو
(المائدہ: ۱۱۷)	جو رب ہے میرا بھی اور رب ہے تمہارا بھی

رسالت وہبی چیز ہے

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ	اللہ خود ہی اپنے پیغام رساں منتخب فرماتا
رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ (الحج)	ہے فرشتوں میں سے اور انسانوں میں سے

اصطفا کے معنی ہیں بہت سی چیزوں میں سے سب سے اچھی چیز کو منتخب کر لینا۔ یعنی اللہ تعالیٰ خود ہی انسانوں میں سے اس سب سے اچھے انسان کو اپنا پیغام پہنچانے کے لیے منتخب فرماتا ہے جو اس عظیم اور مقدس منصب کے لیے موزوں ترین صلاحیتوں سے بہرہ ور ہو۔ اس منصب کو پانے میں انسان کے اپنے ارادے اور کوشش کو دخل نہیں۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ	اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ منصب رسالت
(انعام: ۱۲۴)	کس کو بخشے۔

یعنی رسالت اللہ تعالیٰ کا ایک مخصوص عطیہ ہے۔ وہی بہتر جانتا ہے کہ یہ عظیم خدمت کس سے لے اور کس طرح لے۔

تمام رسول انسان تھے

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِمْ فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (النحل ۴۳)

اور ہم نے آپ سے پہلے بھی جب کبھی رسول بھیجے ہیں آدمی ہی بھیجے ہیں جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے اہل کتاب سے پوچھ لو اگر تم لوگ نہیں جانتے۔

اور مخالفین حق نے ہمیشہ حق سے سرتابی کے لیے اس بات کو بہانہ بنایا۔

مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ (المومنون: ۳۳)

یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر تم ہی جیسا ایک آدمی ہے جو کچھ تم کھاتے ہو وہی یہ کھاتا ہے اور جو کچھ تم پیتے ہو وہی یہ پیتا ہے۔

پیغمبروں نے خود بار بار اس کا اعلان کیا کہ ہم تم جیسے بشر ہی ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ ہمیں اللہ نے کار رسالت کے لیے منتخب فرما لیا ہے — ہمارے پاس وحی آتی ہے اور تمہارے پاس نہیں آتی

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِن نَّحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَمُنُّ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ (ابراہیم ۱۱)

رسولوں نے جواب دیا۔ واقعی ہم کچھ نہیں ہیں مگر تم ہی جیسے انسان لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے نوازتا ہے۔

یعنی یہ حقیقت ہے کہ ہم تم ہی جیسے انسان ہیں فرق صرف یہ ہے کہ ہمیں اللہ نے وحی کے ذریعہ علم و بصیرت سے نوازا ہے

رسول اپنی دعوت کا مکمل نمونہ ہوتے ہیں

وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ (ہود ۸۸)

اور میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ میں ان باتوں سے تم کو روکتا ہوں ان کا خود ارتکاب کروں۔

یعنی میری سچائی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ میں جو کچھ تم سے کہتا ہوں اسی پر خود بھی عمل کرتا ہوں —

اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ آدمی دوسرے کا خیرخواہ ہو یا نہ ہو اپنا ضرور سچا خیرخواہ ہوتا ہے۔

قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِن رَّبِّي (اعراف: ۲۰۳)

کہہ دیجیے میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب نے میری طرف بھیجی ہے۔

انسان کو رسول بنانے کی حکمت

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَ

اور ہم نے آپ کی طرف یہ ذکر نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کو وہ تعلیم کھول کھول کر سمجھا دیں جو ان کے لیے نازل کی

لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ٥ (النحل: ۴۴)
گئی ہے اور تاکہ وہ لوگ خود بھی سوچیں اور سمجھیں۔

آسمانی ہدایت رسول کے ذریعے بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ امت کے سامنے خدا کی ہدایت خوب کھل کر آجائے اور ان کے لیے عذر کا کوئی موقع نہ رہے۔ اسی لیے خدا نے انسان کو رسول منتخب فرمایا کہ وہ نہ صرف زبان سے اس ہدایت کی تشریح کرے بلکہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس ہدایت کو برت کر مکمل عملی نمونہ پیش کرے۔

رسول ہر اُمت میں آئے

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَسُولٌ (یونس: ۴۷)
اور ہر امت کے لیے رسول بھیجا گیا

وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (فاطر: ۲۴)
اور کوئی امت نہیں مگر اس میں ڈرانے والا گزر چکا ہے

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (رعد: ۷)
اور ہر قوم کے لیے ایک رہنما ہوا ہے۔

اللہ کی رحمت، انصاف اور آخرت کی باز پرس کا یہی تقاضا ہے کہ ہر قوم میں اللہ کے احکام پہنچانے والا آئے۔

تمام انبیاء ایک ہی گروہ کے لوگ ہیں

إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ (الانبیاء: ۹۲)
اور آپ کا یہ گروہ درحقیقت ایک ہی گروہ ہے۔ میں ہی تمہارا رب ہوں تو تم میری ہی بندگی کرو۔

کئی انبیاء کے مختصر واقعات بیان کرنے کے بعد آخری رسول سے کہا گیا کہ یہ سب آپ ہی کے گروہ کے لوگ تھے اور آپ سب ایک ہی گروہ ہیں۔

تمام انبیاء ایک ہی پیغام لائے

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (النحل: ۳۶)
اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا (یہ پیغام دے کر) کہ اللہ ہی کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔

یعنی ہر امت میں جو بھی رسول آیا توحید ہی کا پیغام لے کر آیا۔

تمام انبیاء پر ایمان لانا ضروری ہے

قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ
مسلمانو! کہو ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے، اور جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب

إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ (البقرۃ)

اور اولاد یعقوب کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے تمام پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی، ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مطیع فرمان ہیں۔

رسولوں کے درمیان تفریق کفر ہے

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا ۝

(النساء: ۱۵۰، ۱۵۱)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں، اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے۔ اور کفر و ایمان کے بیچ میں ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ سب پکے کافر ہیں اور ایسے کافروں کے لیے ہم نے ذلیل و خوار کر دینے والی سزا تیار کر رکھی ہے۔

ایک نبی کا انکار سب کا انکار ہے

وَقَوْمَ نُوحٍ لَمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ أَغْرَقْنَاهُمْ وَجَعَلْنَاهُمْ لِلنَّاسِ آيَةً (الفرقان ۳۷)

اور نوح کی قوم نے جب رسولوں کو جھٹلا دیا تو ہم نے ان کو غرق کر دیا اور سارے انسانوں کے لیے ایک نشان عبرت بنایا

قوم نوحؑ نے جب رسولوں کو جھٹلا دیا۔ قرآن کا یہ بیان دراصل نظام رسالت کے ایک اہم ترین نکتے کی وضاحت ہے۔ واقعہ کی رو سے تو قوم نوحؑ نے صرف حضرت نوحؑ ہی کو جھٹلایا تھا دوسرے رسولوں کے جھٹلانے کا ان کے لیے کوئی سوال ہی نہ تھا لیکن قرآن نے ایک رسول کی تکذیب کو رسولوں کی تکذیب قرار دیا۔ دراصل تمام انبیاء خدا ہی کی جانب سے منصب رسالت پر مامور ہیں اور سب ایک ہی دعوت و پیغام لے کر آئے کہ "خدا کی بندگی کرو اور طاغوت سے بچو۔" اس لیے ان میں سے کسی ایک کو بھی جھٹلانا دراصل اس دعوت توحید کو جھٹلانا ہے، جو انبیاء علیہم السلام لے کر آئے۔ اور ایک نبی کا انکار کرنا سب کا انکار ہے۔

انبیاء کی بعثت کا مقصد

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ (البقرہ ۲۱۳)

سارے انسان ایک ہی امت ہیں (جب ان میں باہم اختلافات رونما ہوئے) تو اللہ نے اپنے نبی بھیجے خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل فرمائی کہ لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہوئے ان کا فیصلہ کرے۔

تمام انسان اپنی اصل اور مقصد کے لحاظ سے ایک ہی امت ہیں۔ سب ایک ہی خدا کے بندے اور ایک ہی انسانی جوڑے کی اولاد ہیں۔ نوع انسانی کے اولین جوڑے کو زمین میں بساتے ہوئے خدا نے جس حق کی رہنمائی فرمائی تھی وہی حق بعد کے زمانوں میں انبیاء اور رسل لاتے رہے اسی لیے جب جب انسانوں نے اپنی اس حقیقت کو فراموش کیا اور جہالت و سرکشی کی بنا پر ان میں اختلافات رونما ہوئے تو خدا نے نبیوں کو بھیجا کہ حق کے بارے میں ان کے درمیان جو اختلافات پیدا ہو گئے ہیں ان کا فیصلہ کر دیں۔ اور ان میں ایک امت ہونے کا شعور پھر پیدا کریں۔

الٓرٰ كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَى صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ۝ (ابراہیم: ۱)

الرا ایک سورت ہے۔ یہ ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تاکہ آپ لوگوں کو مختلف تاریکیوں سے ایک نور کی طرف نکال لائیں۔ ان کے پروردگار کے حکم سے غالب اور لائق تعریف خدا کی راہ کی طرف

انبیاء کرام کی بعثت کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ہر قسم کی تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئیں خدا کی جانب سے آنے والی یہ روشنی ہمیشہ ایک رہی ہے۔ اسی لیے قرآن نے اس کو نور کے بجائے "النور" کہا ہے جب بھی انسان اس النور سے محروم ہوئے وہ گمراہی کی نوع بہ نوع تاریکیوں میں بھٹک گئے۔

نبی پر ایمان لانے کا مطلب

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ

اور ہم نے جس رسول کو بھی بھیجا اسی لیے بھیجا کہ حکم خداوندی کے تحت اس کی اطاعت کی جائے۔

یعنی رسول کو بھیجنے کی اس لیے ہیں کہ ان کے [illegible]

کہ محض زبان سے ان کی نبوت کا اعتراف کر لیا جائے بلکہ نبی پر ایمان لانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ زندگی کے ہر معاملے میں ان کی مکمل اطاعت کی جائے۔

نبی کی اطاعت اللہ ہی کی اطاعت مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ — جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

نبی چونکہ خدا ہی کے فرامین اور احکام پہنچاتے ہیں اس لیے ان کی اطاعت دراصل خدا ہی کی اطاعت ہے، اور ان کی اطاعت سے منہ موڑ کر آدمی کسی طرح بھی خدا کی اطاعت نہیں کر سکتا۔

ختمِ نبوت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "مجھ سے پہلے ہر نبی مخصوص طور پر اپنی ہی قوم کے پاس نبی بنا کر بھیجا جاتا تھا لیکن میں تمام ہی لوگوں کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں" نیز آپ نے یہ بھی فرمایا۔ "مجھ سے نبوت کی عمارت مکمل ہو گئی اور مجھ پر رسولوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔"[1]

آخری رسول مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (الاحزاب) — لوگو! محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔ اور اللہ ہر چیز کا خوب علم رکھنے والا ہے۔

یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلۂ رسالت ختم ہو گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے میری اور مجھ سے پہلے گذرے ہوئے انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی اور خوب حسین و جمیل بنائی مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوٹی ہوئی تھی، لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے، اور اس کی خوبی پر اظہار حیرت کرتے تھے۔ مگر کہتے تھے اس جگہ اینٹ کیوں نہیں رکھی گئی؟ ——— تو وہ اینٹ میں ہوں، اور میں خاتم النبیین ہوں" (یعنی میں آخری رسول ہوں، میری آمد پر نبوت کی عمارت مکمل ہو چکی ہے، اب کوئی جگہ باقی نہیں ہے جسے پُر کرنے کے لیے کوئی نبی آئے)

عیسیٰ کی بشارت وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ — اور جب مریم کے بیٹے عیسیٰ نے کہا — اے بنی اسرائیل! میں اللہ کی طرف سے تمہاری

[1] بخاری، مسلم

إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ مُصَدِّقًا
لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ
وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي
اسْمُهُ أَحْمَدُ (الصف: ۶)

طرف بھیجا ہوا آیا ہوں، میں اس کتاب یعنی
تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں جو مجھ سے
پہلے آئی تھی۔ اور ایک آنے والے رسول کی
خوش خبری دینے والا ہوں جن کا نام احمد ہوگا

تورات کی شہادت

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ
الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ
الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا
عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ
يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ
الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ
الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ
الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ
وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ
فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ
وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ أُولَٰئِكَ
هُمُ الْمُفْلِحُونَ (الاعراف: ۱۵۷)

(پس آج خدا کی رحمت کے حقدار وہ لوگ ہیں)
جو آخری رسول نبی امی کی پیروی کریں جن کا ذکر انہیں
اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے، وہ
انہیں نیکی کا حکم دیتے ہیں بدی سے روکتے ہیں
ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں
حرام کرتے ہیں اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتے ہیں
جو ان پر لدے ہوئے تھے اور ان پھندوں سے
چھڑاتے ہیں جن میں وہ پھنسے ہوئے تھے۔ تو جو لوگ
ان پر ایمان لائیں اور ان کی حمایت و مدد کریں اور
اس روشنی میں زندگی گزاریں جو ان کے ساتھ اتاری
گئی ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔

آخری رسول تمام عالم کے رسول ہیں

قُلْ يَا أَيُّهَا
النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا
الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ
لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ
فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ
الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ
وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ

اے رسول! کہیے کہ اے
انسانو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا بھیجا
ہوا آیا ہوں جو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی
کا مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے
وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔
پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی
امی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات پر ایمان رکھتے
ہیں اور انہی کی پیروی اختیار کرو، تاکہ تم ہدایت

وَّ يُهْتَدُوْنَ ٥ (الاعراف : ۱۵۸)

ہو جاؤ

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً
لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ
اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ٥
(السبا : ۲۸)

اور اے رسول! ہم نے آپ کو تمام انسانوں
کے لیے خوش خبری سنانے والا اور کجروی کے انجام
بد سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ
نہیں جانتے ۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہر ہر زمانے میں اپنی اپنی قوم کے لیے الگ الگ رسول بھیجے جاتے رہے، ______ ان کی تعلیم و ہدایت اپنی اپنی قوم کے لیے مخصوص اور ایک خاص زمانے تک کے لیے محدود ہوتی تھی۔ کچھ دن گزرنے کے بعد یا تو اس تعلیم میں ترمیم و اضافے کی ضرورت محسوس ہوتی یا مٹ جاتی اور اسے پھر پیش کرنے کی ضرورت ہوتی مگر آخری رسول کو خدا نے ایسا محفوظ، دائمی، عالمگیر اور مکمل دین دے کر بھیجا جس کے اصول قیامت تک پیش آنے والے تمام مسائل کا بہترین حل اور تمام نت نئے مسائل پر ٹھیک ٹھیک منطبق ہونے والے ہیں۔ اب انسانوں کی رہنمائی کے لیے کسی نئی تعلیم و ہدایت اور نئے رسول کی قطعاً ضرورت نہیں ۔

سراپا رحمت

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا
رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ٥ (انبیاء ۱۰۷)

اور ہم نے آپ کو تمام عالم کے لیے رحمت
ہی بنا کر بھیجا ہے

بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ
رَّحِيْمٌ ٥ (التوبہ ۱۲۸)

ایمان والوں کے لیے انتہائی شفیق اور
مہربان ۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ
لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ
لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۔
(آل عمران ۔ ۱۵۹)

(اے رسول!) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے
کہ آپ ان لوگوں کے لیے نہایت نرم مزاج واقع
ہوئے ہیں ورنہ اگر کہیں آپ سخت کلام اور سنگدل
ہوتے تو یہ سب آپ کے آس پاس سے چھٹ جاتے

خلق عظیم کے مالک

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ
عَظِيْمٍ ٥ (ن : ۴)

اور حقیقت یہ ہے کہ آپ اخلاق کے
انتہائی اونچے مرتبے پر ہیں ۔

امت کی سہولت کے خواہاں

لَقَدْ جَآءَكُمْ

تم لوگوں کے پاس ایک رسول آئے ہیں جو

رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ (توبہ : ۱۲۸)

خود تم ہی میں سے ہیں۔ تمہارا (کسی قسم کے دینی یا دنیوی) نقصان اور تکلیف میں پڑنا ان پر انتہائی شاق ہے۔

ایمان کے حریص

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا (الکہف : ۶)

(اے رسول!) شاید آپ تو ان کے پیچھے اس غم میں اپنی جان ہی ہلاک کر دیں گے اگر یہ ایمان نہ لائے۔

رسول کو شب و روز جو غم گھلاتا رہتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ خدا سے بھٹکے ہوئے اس کی ہدایت پر ایمان لاکر رحمت الٰہی کے آغوش میں آجائیں۔ (باقی)

چند اہم کتابیں

تنقیحات مولانا مودودی کے ان مضامین کا مجموعہ جس میں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ سائز $\frac{20 \times 26}{8}$ دیدہ زیب ٹائٹل۔ قیمت تین روپے

تفہیمات یہ کتاب مولانا مودودی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے اہم مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ قیمت حصہ اول :۔ پانچ روپیہ آٹھ آنے۔
" حصہ دوم :۔ چھ روپیہ آٹھ آنے

اسلام ایک نظر میں مولانا صدرالدین اصلاحی کی وہ کتاب جو تھوڑے وقت میں پورے دین اسلام سے واقفیت بہم پہنچاتی ہے۔ شستہ عبارت، وزنی دلائل۔ سائز $\frac{20 \times 26}{16}$
صفحات ۲۰۳۔ قیمت مجلد مع گرد پوش : دو روپیہ آٹھ آنے۔

اس کے علاوہ مکتبہ جماعت اسلامی۔ مکتبۃ الحسنات۔ دارالمصنفین اور تحقیقات و نشریات لکھنؤ کی کتابیں بھی ہم سے طلب کریں۔

منیجر :۔ مکتبہ زندگی و کائنات' رام پور۔ یوپی

آخرت اور اُس کے حریف عقائد

(۲)

جناب سلطان مبین صاحب ایم-اے (سنسکرت)

تناسخ کی غیر معقولیت

۱- مذہب ہمارے اندر شکر و احسان مندی کا جذبہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ہماری عبادتیں بہت کچھ ہونے کے ساتھ ساتھ اظہارِ احسان مندی اور شکر کی تصویریں ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کے احسان مند ہیں کہ اس نے ہم کو عقل و تمیز بخشا ہے۔ کھانے کو روٹی اور پینے کو پانی دیا ہے۔ پس ہمارے نزدیک زندگی اور زندگی کی آسائشیں اللہ کی عنایت، فضل و کرم ہیں۔ ملحد کے نزدیک زندگی اور زندگی کی مسرتیں اتفاق محض ہیں۔ مگر صاحب تناسخ کے لیے زندگی، آرام و آسائشیں استحقاق ہیں۔ پہلے جنم کی مزدوری ہیں۔ کیا شکر و احسان مندی کے ساتھ حق و استحقاق کو جمع کر سکتے ہیں صاحبِ تناسخ کے پندار کا یہ عالم ہے کہ اگر اس کو مالک کل اور علامۂ دہر بنا دیا جائے تو وہ فقط یہی سمجھے گا کہ یہ اس کا کسب نفسی اور وصف ذاتی ہے اور کہے گا کہ:-

اِنَّمَا اُوْتِیْتُہٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ — یہ مال تو مجھے ملا ہے میرے علم کی وجہ سے

کیا غرور و پندار کے ساتھ بندگی و عبادت جمع ہو سکتی ہے۔ پس تناسخ صراحۃً و بداہۃً کفر، ناشکری اور احسان فراموشی کا عقیدہ ہے۔

۲- ہم مذہبی لوگ جب زیردست و مسکین کو دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارے نصر و رزق کے باعث و سبب ہیں اور بالعموم جنتی ہیں۔ جب مریض کو دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ یہ برگزیدہ اور مظہرِ مغفرت ہے۔ اس کی عیادت گویا اللہ کی معیت ہے۔ اندھا یا معذور ہماری نظروں میں جنتی اور نجات یافتہ فرد ہے۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام و سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے غیر شعوری طور پر متاثر ہمارے زمانے کے ملحدین

حضرات بھی غریبوں، بیماروں اور معذورین پر ہمدردی وغم گساری کے سلوک کو روا رکھتے ہیں۔ مگر اصحاب تناسخ کہتے ہیں کہ غریب ومفلس تخلیقاً وفطرتاً خدمت گزاری کی غرض کے لیے پیدا کیے گئے ہیں ان کو مفلس ونادار رکھنا خدا کی مرضی ورضا کے مطابق ہے

قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا — کہتے ہیں منکر ایمان والوں سے ہم کیوں کھلائیں

اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ (یٰسٓ) — ایسے کو کہ اللہ چاہتا تو اس کو کھلا دیتا

بیماروں کی عیادت کے لفظ سے ان کے گوش وزبان ناآشنا ہیں۔ کچھ مریضوں کو یہ لوگ پاپ روگی کہہ کر ان کو ذلیل ومورد الزام گردانتے تھے۔ اندھوں اور معذورین کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ پاپ چنہ "علامت گناہ" ہیں۔ انھوں نے پہلے جنم میں کتاب یا چراغ کی چوری کی ہے یا شکار کرتے وقت انھوں نے جانوروں کو اندھا لنگڑا کیا ہے۔ ہمدردی وتوجہ کے لیے ترسنے والے مسکینوں، مریضوں، اندھوں، لنگڑوں کو "پاپ روگی" اور "پاپ چنہ" کا طعنہ دینا اور اتہام لگانا کتنی بڑی درندگی ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر انسانیت کی توہین کی کوئی اور صورت ہوسکتی ہے۔ پس تناسخ انسانی تکریم وشرافت کا دشمن ہے۔

۳۔ مالدار آدمی کے بارے میں انجیل کہتی ہے: اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزر جانا اس سے آسان ہے کہ دولتمند خدا کی بادشاہی میں داخل ہو۔ مرقس: ۱۰: ۲۵۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے مالدار اگر بخیل ہے اور روپیہ گن گن کر جمع کرنے کا ذوق رکھتا ہے تو اس کو روپیہ سے داغا جائے گا اور اس کا خزانہ سانپ ہو کر اس کو ڈستا رہے گا۔ اگر وہ بخیل نہیں ہے اور سال بسال اپنی دولت میں سے غریبوں کا حق نکالتا جاتا ہے تو بھی وہ نسبتاً تاخیر سے جنت میں داخل ہوگا۔ اشتراکی کہتے ہیں کہ مالدار آدمی جونک ہے جو غریبوں کا خون چوس چوس کر پیٹ بھرتا ہے اور گردن زدنی ہے۔ اسلام کی نظر میں دولت انسان کے منظورِ نظر ومقرب بارگاہ اور خدا کے چہیتے ہونے کی ہرگز ہرگز علامت نہیں ہے بلکہ یہ ایک ابتلاء وآزمائش ہے۔ ہاں زمانہ جاہلیت کے مفکرین کفر وشرک اموال واولاد کو خدا کی خوشنودی کی علامت سمجھتے تھے[1] تناسخ تو بالاعلان کہتا ہے کہ دولت پہلے جنم کا حق محنت ہے آج کا مالدار پہلے جنم کا بڑا نیکوکار شخص ہے۔ دولت امتحان وآزمائش نہیں ہے بلکہ یہ تو انعام ونیک بختی

[1] وقالوا نحن اکثر اموالا واولادا وما نحن بمعذبین۝ قل ان ربی یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر ولکن اکثر الناس لا یعلمون۝ وما اموالکم ولا اولادکم بالتی تقربکم عندنا زلفیٰ الا من آمن وعمل صالحا فاولئک لهم جزاء الضعف بما عملوا وهم فی الغرفات آمنون۝ سبا

کی علامت ہے۔ کیا تناسخ کے فلسفے کو مالداروں نے اپنے حقوق کی پشت پناہی اور غریبوں کو بے وقوف بنانے کے لیے وضع کیا ہے؟ مالداروں کو معزز اور غریبوں کو ذلیل سمجھنا کیا خدا ترسی اور مذہبیت ہے یا بے دینی، کفر اور الحاد؟

۴۔ گناہ بہت مزیدار ہوتا ہے۔ اس میں لذت اور فوری نفع ہوتا ہے۔ اس لیے انسان اس کی طرف بڑی آسانی سے مائل ہو جاتا ہے۔ نیکی ناگوار ہوتی ہے اس لیے انسان کا دل اس کی طرف بڑی مصیبت اور مشکل سے مائل ہوتا ہے۔ گناہ کی اساس خود غرضی ہے اور ثواب تمام تر ایثار و قربانی کی بنیادوں پر قائم ہے۔ پس انسان کو لذت، نفع اور خود غرضی سے روکنے کے لیے کسی مضبوط ترین بریک کی ضرورت ہے۔ دوزخ کا ہولناک عذاب ہی بریک بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بے مزہ، بے سود ایثار پر ابھارنے کے لیے بہت بڑے انعام کی امید کی ضرورت ہے۔ جنت کی امید پر انسان سبھی تلخیوں اور سختیوں کو ہنسی خوشی سے جھیل جاتا ہے مگر تناسخ کے ماننے والے افراد کشمکش و پیچ میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر وہ کسی سے ایک ہزار قرض لیتے ہیں تو قرض کی ادائی کے بارے میں سوچتے ہیں کہ بہت ممکن ہے کہ مہاجن نے ہم کو جو ہزار دیا ہے وہ پہلے جنم کا ہمارا بقیہ قرض رہا ہو۔ اس طرح عقیدہ تناسخ کی وجہ سے خود بخود اس کے دل سے آدھی ایمان داری ختم ہو جاتی ہے۔ اب باقی ماندہ نصف ایمان داری کا دیوالہ نکالنے کے لیے وہ یوں سوچتا ہے کہ میں مقروض ہوں تنگ دست ہوں لیتا مرے کہ دیتا مرے۔ دوسرے جنم میں جب میں مہاجن ہوں گا (یا مہاجن بنایا جاؤں گا) کشادہ دست ہوں گا تب یہ قرض ادا کر دیا جائے گا۔ اس طرح سے بے ایمانی پوری طرح اس کے دل میں گھر کر لیتی ہے اور وہ قرض کی ادائگی کی بات بھی نہیں سوچتا۔ ہمارے ملک کے دیولے خیانتیں اور رشوتیں اسی عقیدۂ تناسخ سے شہ پا کر بڑھتی رہتی ہیں۔ تناسخ کا حلقہ فقط قرض، خیانت اور رشوت تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ صاحب تناسخ ہر جور و ظلم میں یہی سوچتا ہے کہ یہ پہلے کا حساب بھگتایا جا رہا ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ دوسرے جنم میں اس کی پاداش معمولی دنیاوی پاداش ہے تو اسی طرح برداشت کر لوں گا جس طرح آج کا مظلوم کر رہا ہے اور پھر نو نقد نہ تیرہ ادھار کے اصول کے مطابق وہ نقد فائدہ کے لیے ظلم و زیادتی کر گزرتا ہے پس تناسخ پہلے قدم پر انسان کو پس و پیش میں ڈالتا ہے اور پھر اس کی آسانیاں دوسرے قدم پر انسان کو گناہ پر ابھار کر دم لیتی ہیں۔

دو لڑکے ہیں۔ ایک نئی جماعت میں نو بہ نو داخل ہوا ہے۔ دوسرا کئی سال کا فیل شدہ ہے۔ پہلا نہایت امنگ و اشتیاق سے پڑھے گا۔ دوسرا بے امنگ رہے گا۔ اس کے لیے پڑھنا بے مزہ اور بوجھ بن جائے گا۔ پہلا سواری کے گھوڑے کی طرح تیز گام ہوگا۔ وہ اپنی منزل کی طرف سرپٹ دوڑے گا۔ دوسرا کولھو کا بیل ہوگا۔ وہ باذل ناخواستہ

چکر پر چکر لگائے گا۔ قیامت پر ایمان لانے والا پہلے لڑکے کی طرح ہے اور تناسخ کا ماننے والا دوسرے لڑکے کی طرح ہے۔ تناسخ جس رفتار سے گناہ پر ابھارتا ہے اسی رفتار سے نیکیوں سے باز رکھتا ہے۔ گناہ پر آمادہ کرنے کی تازہ مثالیں آج کے ہندستان کی رشوتیں اور خیانتیں ہیں نیکیوں سے باز رکھنے کی مثالیں اگر آج کل نہ مل سکیں تو اس کو ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ میں دیکھیے مسلمان سپاہی شوق شہادت میں جی توڑ کر لڑتے تھے۔ بالعکس ہندو سپاہی بددلی سے لڑتے تھے۔ آخر یہ سپاہی پاگل تو نہیں تھے۔ وہ تناسخ کے قائل تھے۔ وہ دوسروں کا سر کاٹتے تو دو صورتیں ہوتیں۔ پہلی یہ کہ پہلے جنم میں ان کا سر انھوں نے کاٹا تھا۔ دوسری صورت یہ کہ آئندہ بیسوں جنم میں اس کا سر دوسرے لوگ کاٹیں۔ اگر اس کا سر کاٹا جائے تو بھی دو صورتیں تھیں پہلی یہ کہ اس کے پہلے جنم کے کئے کا بدلہ پورا ہو گیا۔ دوسری صورت میں وہ دوسرے جنم میں دشمنوں کی گردن کاٹے گا۔ جب لڑائی لڑنے کا محض یہ ٹھیرا کہ آج اور آئندہ سر کاٹنا اور کٹوایا جائے تو کیوں نہ سپاہی کا دل اندر سے یہ کہے کہ نہ کاٹو نہ کٹواؤ۔ ایک مسکین کسی مالدار سے پچاس روپیہ کی مدد مانگتا ہے۔ مالدار تناسخ پر ایمان رکھتا ہے۔ اور یہ بھی فرض کرلیا جائے کہ وہ پچھلے جنم کے بدلے کو خاطر میں نہ لاکر بہرصورت نیکی کرنے کو تیار ہے۔ مگر وہ پچاس روپیہ دے کر دوسرے جنم میں پچاس روپیہ کیوں لے وہ اسی جنم میں پچاس روپیہ کو سود پر کیوں نہ چلائے۔ نو نقد نہ تیرہ ادھار پر کیوں نہ عمل کیا جائے۔ جب پچاس کا پچاس ہی ملتا ہے تو اس کو دوسرے جنم کے لیے ادھار کیوں کیا جائے۔ تناسخ کی یہ انصاف پروری تو "من جاءَ بالحسنۃِ فلہٗ عشرُ امثالِھا ومَن جاءَ بالسیئۃِ فلا یُجزیٰ الّا مثلہا وھم لا یظلمون ٥ جو شخص نیکی لائے گا تو اس کا دس گنا اجر ملے گا اور جو بدی لائے گا تو اس کو اس بدی کے برابر سزا ملے گی قیامت میں ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا" کہتے ہوئے شرماتی ہے۔

۵۔ اصحاب تناسخ بزعم خود حقیقی انصاف کے قائل ہیں۔ آدمی جس عمر میں جس جسم سے جس فعل کا ارتکاب کرتا ہے۔ اسی جسم اور اسی حالت و عمر میں اس کا بدلہ پائے گا۔ اگر بوڑھے زید نے بچے عمرو کو قتل کیا تو دوسرے جنم میں بوڑھا عمرو بچے زید کو قتل کرے گا۔ اگر قصاب نے گائے کو ذبح کیا ہے تو دوسرے جنم میں گائے قصاب بنے گی اور قصاب گائے بنایا جائے گا۔ اور پھر وہ قصاب کو ذبح کرے گی۔ اسی طرح اگر کوئی غنڈہ بچی کے ساتھ زنا بالجبر کرتا ہے تو دوسرے جنم میں بچی کو غنڈہ اور غنڈے کو بچی بنا کر زنا بالجبر کو دہرایا جائے گا علیٰ ہذا القیاس اس جنم میں گالی دینے والے کو دوسرے جنم میں گالی کھاتے ہوئے شخص سے گالی دلوانے کا موقع فراہم کیا جائے گا۔ آج کے رشوت لینے اور دینے والے کو کل بالعکس رشوت دینے اور لینے والا بنایا

ہر منکر ایک مرتبہ قتل، گئو ہتیا، زنا، گالی، رشوت ستانی انسان کے ارادے سے وجود پذیر ہوئی تو دوبارہ اس کو اقتضا کی خاطر پیدا ہونا چاہیے یعنی تناسخ جرم برائے جرم، بدی برائے بدی، برائی کے لیے برائی کے اصول پر قائم ہے۔ اس اصول کو تو کوئی بھلا مانس اپنے لیے بھی پسند نہیں کرے گا پھر اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا کتنی عظیم غلط فہمی ہے۔

تناسخ کی ہلاکت آفرینی اور قائلین وحدتِ ادیان کے لیے لمحۂ فکریہ

جب تناسخ نے سماج کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ غریب و مزدور سزا بھگتنے کے لیے اور مالدار سکھ بھوگنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، تب مزدور، خدمتگار اور شودروں کی زندگی خود اپنی نظروں میں ذلیل ہو گئی اور حکیم و حاکم، دولتمند اور مہاجن غرور و پندار کے نشے میں سرشار ہو گئے، محنت کش مزدور احساس کمتری اور شرفا احساس برتری میں مبتلا ہو کر ذات پات کی لعنت کا شکار ہوتے چلے گئے۔ ایک طرف تو اصول اہنسا نے یہ بتایا تھا کہ گھاس کاٹنے والے، درخت چیرنے والے، پانی بھرنے والے، زمین کھودنے والے، غلہ پیسنے والے، تیل نکالنے والے، گنا پیرنے والے، بھیڑ بکری پالنے والے صراحۃً و بداہۃً گنہگار رہیں۔ اور بھیک مانگ کر کھانے والے سادھو بھکشو اور بیٹھ کر کھانے والے، سود خوار تاجر، گھاس پات کیڑے مکوڑوں اور جانوروں کو قتل نہ کرنے کے سبب سے حتماً و قطعاً پاک کردار ہیں اور دوسری طرف آواگون نے یہ بتایا کہ غریب مزدور لوگ ذلت کی سزا، اور شرفا عزت کے انعام کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ پس کیا تھا مزدوروں کو ذلت کے اور شرفا کو عزت کے دو دو سرٹیفکٹ مل گئے۔ ڈبل ڈگری مل جانے پر بھلا ذات پات کی لعنت کو کون دور کر سکتا تھا۔ بھارت کے حکیموں اور عارفوں نے ہزاروں سال کی کد و کاوش کے بعد اہنسا، تناسخ اور وحدت الوجود کے خوشنما و درخشاں اصول وضع کیے تھے مگر انھیں اصول نے بالترتیب احترام بنی آدم، انسانی ہمدردی اور خدا پرستی کو دفنا کر دم لیا۔ آج کا چھوا چھوت اہنسا پر، رشوت خیانت، دیوالے اور جور و ظلم تناسخ پر، شجر و حجر، مار و گاؤ کی پرستش وحدۃ الوجود پر لعنت بھیج رہے ہیں۔ مگر کون ہے جو حرمتِ انسانیت، قیامت اور توحید کے وسیلے سے ان کا مداوا کرے۔ بھارت نے حرمت نباتات و حیوانات (اہنسا) تناسخ و وحدۃ الوجود کے درختوں کی دل کھول کر آبیاری کی ہے اور آج بھی بھارتی سماج کو ان کے کڑوے پھلوں کو منہ بگاڑ بگاڑ کر کھانا پڑ رہا ہے۔ وحدتِ ادیان کے نمائشی وکلاء آخر کب تک حرمت نباتات و حیوانات اور حرمتِ انسانیت، تناسخ اور قیامت، وحدۃ الوجود اور توحید کو ایک کہتے رہیں گے اور ان ذہین انسانوں کا فکر بلند کب تک

ان کے تضاد سے آنکھیں چراتا رہے گا۔ آج کا بھارتی سماج چلا چلا کر پکار رہا ہے کہ آہنسا آواگون اور سرم دم برہم محض ڈھکوسلے ہیں اور بالعکس حرمت انسانیت، قیامت اور توحید پیام ربانی ہیں۔ ہندوستان کی تین ہزار سال کی تاریخ گواہ ہے کہ حرمت حیوانات اور وحدۃ الوجود نے انسانیت کی کوئی خدمت نہیں کی ہے بلکہ الٹے اس نے انسان کو اس ذلت کے گڈھے میں ڈھکیلا ہے جس سے آج بیسویں صدی تک انسان نہیں نکل پا رہا ہے۔ بیسویں صدی کا نام اس لیے لیا جا رہا ہے کہ اس صدی میں ہندی چینی بھائی بھائی کی باتیں کی جاتی ہیں جب کہ ہندوستانی ہندوستانی بھائی نہیں بن سکے ہیں۔ باوجود ہزار جتن کے چھوت چھات کی حد تک بھی خود ہندو ہندو بھی بھائی نہیں بن سکا ہے۔ یہ ہے تناسخ اور اہنسا کی اخوت دشمنی اور سماجی تخریب پس تناسخ انسان کو (۱) احسان فراموش، ناشکرا، مغرور و متکبر، کافر و ناسپاس بناتا ہے۔ (۲) مرغیوں اندھوں اور معذوروں سے نفرت کرنے کا سبق پڑھاتا ہے۔ (۳) تناسخ کے چکر میں پڑ کر انسان گناہ کرنے میں جری ہو جاتا ہے۔ اس کی زندگی اقدامی نہ ہو کر بھنور میں پھنس کر چکرانے لگتی ہے۔ (۴) تناسخ غریبوں کو فاقہ کا مستحق اور (۵) مال داروں کو خدا کا مقبول و مقرب سمجھتا ہے۔ (۶) تناسخ کے ماننے والے متکلمین ہند کائنات کی ازلیت کے قائل ہیں۔ مزید برآں تناسخ کے قائلین بودھ، سکھا وغیرہم سرے سے وجود باری کے منکر ہیں۔ متانت اور سنجیدگی سے تناسخ کو ماننے والے ایک ہندو مجدد دیانند سرسوتی پرماتما کو ___ خالق کائنات بالخصوص خالق ارواح ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جنم سے پہلے کرم کا اصول و عقیدہ اپنے ماننے والے کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اس محسوس کائنات کو ابدی و لازماً ابدی مانے۔ پس کیا کبر و پندار، تذلیل انسانیت زندگی کو بے قدر، بیگار اور قید بے جا سمجھنا، خدا کا انکار اور قدم عالم کے عقائد خدا پرستی اور مذہبیت کے عقیدے ہیں؟ اسی لیے میں تناسخ کو بے دینی کہنے کے لیے مجبور ہوں۔ یہ کتنا بڑا فریب ہے کہ بے دینی ہی کو مذہب سمجھا جاتا ہے۔

ہندوستان کی مذہبی تاریخ اور اس کے آئینہ ہندوستانی سماج کو دست مشیت نے اس لیے محفوظ و معروف غیر منقلب و غیر متبدل ذکر چھوڑا ہے کہ وہ اس بات کی شہادت دے کہ انسانی عقل سوچی سے بے نیاز ہو کر مسلسل ٹھوکریں کھاتی رہتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا پیغام مجذوبوں اور دیوانوں کی بڑ اور رکھواس یا فلسفیوں کا خیالی پلاؤ نہیں ہے، بلکہ خدائی آواز ہے اور انبیاء کرام کی دعوت سے سرمو انحراف سراسر خسران، نامرادی اور ہلاکت ہے۔

ہندو مذہب کا مابعد الطبیعات

ہندو مذہب کے مقدس ادب کو زبان و اسلوب کی بنا پر مورخین چار ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ (۱) منتر (رگ) سام یجُربیں کا زمانہ (۲) برہمن کا زمانہ (۳) سوتروں کا زمانہ۔ (۴) پرانوں کا زمانہ۔ اور کم و بیش ہر زمانہ "مابعد الموت" کے بارے میں ایک مخصوص رجحان رکھتا ہے۔ رگ، سام یجس کے دور میں پتری لوک پر یقین کیا جاتا تھا۔ بزرگ لوگ یم کی نیابت میں عیش کی ابدی زندگی گزارتے تھے۔ اجداد (پتر) کو نذر چڑھانے کا لازمی دستور تھا حتیٰ کہ اجداد کو اولاد کی نیاز کا مشتاق و بھوکا بتایا گیا ہے اور پھر واضح طور پران بزرگوں کی الوہیت کا تصور بھی کارفرما نظر آتا ہے — یگیوں۔ سومتی قربانیوں میں دیوتاؤں کے ساتھ پتروں کو بھی مدعو کیا جاتا تھا' بلایا جاتا تھا۔ پتر دیوتاؤں کے ہم نشین مانے جاتے تھے۔ پتری لوگ عالم اجداد کا عقیدہ تناسخ کو پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں دیتا تھا۔ چنانچہ ویدمنتروں میں اشارۃً و کنایۃً بھی تناسخ کا ذکر نہیں۔

۲۔ برہمن ادب۔ ویدمنتروں کے محل استعمال' حل لغات' تفصیل حکایات کے لیے مدون ہوا تھا۔ یہ مقدس سلسلہ بھی پتری لوک ہی کا مؤید و معاون ہے۔ البتہ برہمنوں گرنتھوں نے اس رجحان کو ترقی دی کہ انسان اگنی کی اپاسنا سے اگنی کا ہم ذات و ہم صفات و ہم سایہ ہو جاتا ہے۔ جو جس خداوندکی اوپاسنا کرتا ہے وہ اس خداوند کا ہم ذات و ہم صفات و ہم نشین ہو جاتا ہے۔ مہاتما بودھ نے جابجا اسی عبد و معبود کی وحدت ذات وحدت صفات اور وحدت جہات کی تردید کی ہے۔

(۳) سوتروں کے زمانہ میں پتری لوک کے علاوہ تناسخ کا شاذ و نادر تذکرہ بھی مل جاتا ہے۔

(۴) پورانوں کے عہد میں پتری لوک (جنت و جہنم) اور تناسخ کا عقیدہ متوازی طور پر ملتا ہے۔ یہاں ہندو متکلمین نے پتری لوک اور تناسخ کے تضاد کو نہ سمجھ کر ان دونوں عقیدوں کو رسی کی طرح بٹ دیا ہے۔

(باقی)

رسائل و مسائل

جماعت اسلامی ہند کی تعریف و تحسین

مکتوب

جناب ایڈیٹر صاحب السلام علیکم

مجھ سے آپ واقف نہیں ہیں لیکن میں زندگی پڑھتا رہتا ہوں اور اس طرح آپ سے غائبانہ واقف ہوں دنیا میں اسلام کو سربلند کرنے کے لیے جو تحریکیں چل رہی ہیں مجھے ان سب سے دلچسپی ہے۔ میں "دعوت" دہلی اور دوسرے اخبارات و رسائل کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔ میں نے جماعت اسلامی ہند اور جماعت اسلامی پاکستان کے دستور بھی پڑھے ہیں۔ اس سال یہاں کی جماعت نے پالیسی اور پروگرام کا جو پمفلٹ شائع کیا ہے میں نے اسے بھی پڑھا ہے۔ میں لٹریچر بھی پڑھتا رہتا ہوں مجھے آپ لوگوں کی ایک حرکت سے حیرت ہوتی ہے اس لیے یہ خط لکھ رہا ہوں۔ صدق جدید میں کئی دفعہ جماعت اسلامی پاکستان کے مقابلے میں یہاں کی جماعت کی ایسی تعریف پڑھ چکا ہوں جس سے وہاں کی جماعت کی مذمت ہوتی ہے لیکن نہ دعوت میں نہ زندگی میں اس کے خلاف میں نے کوئی تحریر پڑھی۔ یہ کیا بات ہے۔ میری واقفیت تو یہ ہے کہ دونوں جماعتوں کا نصب العین ایک ہے۔ نظریات بھی ایک ہیں پھر ایک کی تعریف اور ایک کی مذمت کیوں۔ ۱۱ر دسمبر ۶۴ء کے صدق جدید میں پھر دونوں کا ذکر آیا ہے اور ایسے موقع اور ایسے انداز سے آیا ہے کہ غور کیا مگر مناسبت سمجھ میں نہ آئی۔ جین صاحب کی ایک تقریر کا اقتباس دیتے ہوئے لکھا ہے:

"اور پھر فرمایا (یعنی جین صاحب نے) راشٹریہ سیوک سنگھ جن سنگھ جماعت اسلامی اور مسلم لیگ جیسی فرقہ پرست جماعتوں کو دیر تک ملک میں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔"

یہ اقتباس دینے کے بعد مولانا دریا بادی صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"اس حسن انصاف کو کیا کہیے جس نے ذو پہلی جماعتوں کو دو پچھلی جماعتوں کے ساتھ ایک صف میں لا کھڑا کیا ہے ــــ اور اتنی موٹی سی بات اب جین صاحب کو کون بتلائے کہ نام کے اشتراک سے دھوکا نہ کھائیے اور ہندوستان کی جماعت اسلامی کو پاکستان کی جماعت اسلامی پر قیاس کسی طرح نہ فرمائیے مسلم لیگ تو خیر پھر ایک سیاسی جماعت ہے لیکن ہند کی جماعت اسلامی اصلاً ایک دینی جماعت ہے اور بڑی تن دہی سے رفاہی اور تعمیری کاموں میں مصروف ہے۔"

صدق جدید ۱۱ر دسمبر ۱۹۶۶ء

کیا جین صاحب نے یا مراجی نے یہاں کی جماعت اسلامی کو فرقہ پرست وہاں کی جماعت کے قیاس پر کہا ہے ؟ پھر مولانا دریا بادی کا یہ کہنا کہ یہاں کی جماعت کو وہاں کی جماعت پر قیاس نہ کیا جائے کیا معنی رکھتا ہے اور اگر وہ لوگ قیاس کریں تو غلط کیوں ہے جبکہ دونوں کا نصب العین اور مقصد ایک ہے۔ دو جماعتوں میں مشابہت نصب العین اور مقصد سے نہ ہوگی تو پھر کس چیز سے ہوگی ؟ اگر جین صاحب کہیں کہ میرا قیاس صحیح ہے تو کیا جواب ہوگا، کیا وہاں کی جماعت عملی سیاست میں حصہ لینے کی وجہ سے فرقہ پرست ہے ؟ کیا اب فرقہ پرستی کی یہ تعریف ہوگی کہ جو جماعت عملی سیاست میں حصہ لے وہ فرقہ پرست اور جو نہ لے وہ غیر فرقہ پرست

یہاں کی جماعت کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ وہ تعمیری اور رفاہی کام کر رہی ہے جس سیاق میں یہ کہا گیا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ وہاں کی جماعت تخریبی کام کر رہی ہے۔ کیا واقعی آپ لوگ وہاں کی جماعت کی تخریب و مذمت کی قیمت پر اپنی تعریف پڑھ کر خوش ہوتے ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ دریا بادی صاحب دونوں جماعتوں میں اختلاف اور غلط فہمی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اس خط کا جواب دینا ہو تو زندگی میں دیں، مجھے ذاتی جواب کی ضرورت نہیں ہے ۔

جواب

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ دنیا کی ہر ایسی جماعت سے دل چسپی رکھتے ہیں جو اسلام کو سربلند کرنے کی جد و جہد کر رہی ہے۔ خدا کرے یہ دل چسپی ترقی کرے اور آپ عملاً بھی اس جد و جہد میں حصہ لینے لگیں ۔

آپ کا یہ مطالعہ صحیح ہے کہ جماعت اسلامی ہند و پاکستان تنظیمی حیثیت سے اب دو الگ اور مستقل جماعتیں ہیں لیکن دونوں کا نصب العین اور مقصد بالکل ایک ہے اور دونوں ایک ہی مقصد کے لیے سرگرم عمل ہیں اور وہ ہے دینِ حق کی اقامت ــــ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اقامتِ دین تو پوری امتِ مسلمہ کا

نصب العین اور مقصد حیات ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس امت کی بہت بڑی تعداد اس کا شعور نہیں رکھتی۔ جب حقیقت یہ ہے تو دنیا میں جتنی جماعتیں بھی خلوص کے ساتھ اس نصب العین کے حصول کے لیے کام کر رہی ہیں ان کے درمیان رشتہ، خیرخواہی، ہمدردی اور تعاون ہی کا ہو سکتا ہے۔

صدق جدید میں صراحتہً یا جماعت اسلامی ہند کی تعریف کے پردے میں جماعت اسلامی پاکستان کی جو مذمت ہوتی رہتی ہے اس پر ہماری خاموشی کی وجہ وہ نہیں ہے جو آپ نے سمجھی۔ آپ نے ہم لوگوں کو اتنا کم ظرف اور احمق کیوں سمجھ لیا کہ ہم جماعت اسلامی پاکستان کی تخریب و تنقیص کی قیمت پر جماعت اسلامی کی تعریف پسند کر سکتے ہیں۔ ہماری خاموشی کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم مولانا عبدالماجد دریابادی کے مزاج سے واقف ہیں اور ان کے جواب میں کچھ کہنا لاحاصل سمجھتے ہیں۔

باقی رہی یہ بات کہ اس طرح وہ دونوں جماعتوں میں غلط فہمی اور اختلاف پیدا کرنے کی خدمت انجام دے رہے ہیں تو میں آپ کے اس خیال کی نہ تصدیق کر سکتا ہوں نہ تکذیب۔ کبھی کبھی یہ خیال ہمارے ذہن میں بھی پیدا ہوتا ہے لیکن ہم یہ سوچ کر اس کو جھٹک دیتے ہیں کہ مولانا کی ذات گرامی اتنی پست بات سے بہت بلند ہو گی۔

خاص جزیئے کا مطالبہ

خط

زندگی کا جنوری کا شمارہ نظر سے گزرا۔ رسائل و مسائل میں آپ نے عورت کی صدارت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کو بغور پڑھا۔ دو باتیں لکھ رہا ہوں، زندگی میں توضیح کیجیے۔ پہلی بات یہ ہے کہ دسمبر ۶۴ء کے برہان میں لکھا گیا ہے کہ عورت کی سربراہی کو جائز کہنے والے اب کہہ رہے ہیں کہ خاص حالات میں عورت صدر ہو سکتی ہے ورنہ اس کی سربراہی جائز نہیں ہے اور آپ نے لکھا ہے کہ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں جماعت اسلامی پاکستان کی مجلس شوریٰ نے مخصوص حالات میں حمایت کا اعلان کیا تھا تو آپ کے پاس برہان کے "اب کہہ رہے ہیں" کا جواب کیا ہے؟

دوسری بات یہ کہ آپ نے بچے کی حکومت پر قیاس کر کے عورت کی حکومت کا جواز نکالا ہے لیکن قیاس

کرنا مجتہد کا کام ہے اور آپ مجتہد نہیں ہیں اس لیے خاص عورت کے بارے میں فقہ کا کوئی جزئیہ پیش کیجیے۔ امید ہے کہ آپ برا نہ مانیں گے۔

جواب

ماہنامہ برہان کے "اب کہہ رہے ہیں" کا جواب میں کیا دے سکتا ہوں۔ یہ بات تو آپ کو انہیں سے پوچھنی چاہیے۔ برہان میں فاضل مدیر کا سفرنامہ شائع ہو رہا ہے۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ دسمبر کے اسی شمارے میں انھوں نے اپنے بارے میں لکھا ہے کہ وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے اور ہر دساور کا نمک چکھے ہوئے ہیں، جن صاحب کی یہ خصوصیت اور یہ صفت ہو ان کے لیے اکتوبر کو دسمبر بنا دینا کیا مشکل ہے۔ اتنی چھوٹی بات تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

آپ نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ میں مجتہد نہیں ہوں لیکن یہ بات کہ جو مجتہد نہ ہو وہ کوئی شرعی قیاس بھی نہ کر سکے صحیح نہیں ہے۔ اجتہاد اور قیاس دونوں ایک چیز نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے جو قیاس کیا ہے وہ اتنا جلی اور واضح ہے کہ نور الانوار پڑھنے والا طالب العلم بھی کر سکتا ہے۔ جس علت کی بنا پر فقہاء نے نابالغ اور غیر مکلف بچے کی حکومت کو جائز قرار دیا ہے اس علت کی بنا پر بالغ اور مکلف عورت کی سربراہی بدرجۂ اولیٰ جائز ہونی چاہیے۔

آپ نے خاص عورت کے بارے میں مجھ سے فقہی جزئیے کا مطالبہ کیا ہے اگرچہ آپ نے اس قیاس میں کسی غلطی کی نشان دہی نہیں کی ہے لیکن اس کے باوجود میں فقہی جزئیہ پیش کر رہا ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ عورت کی حکومت کو مخصوص حالات میں جائز کہنے والوں پر تحریف دین کا جو اتہام لگایا جا رہا ہے اس کی زد کہاں کہاں پڑ رہی ہے۔

شریعت اسلامیہ نے عورت کو جو درجہ عطا کیا ہے فقہ حنفی اس کی بہت اچھی تعبیر و تشریح کرتی ہے۔ ائمۂ احناف نے عورت کے قاضی اور حاکم ہونے کے مسئلے سے بھی صرف نظر نہیں کیا ہے۔ وہ اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں کہ عورت کا قاضی (جج) ہونا جائز ہے۔ وہ حدود و قصاص کے علاوہ دوسرے امور و معاملات میں قاضی ہو سکتی ہے۔

علامہ کاسانی نے اہلیت قضا کی سات شرطیں بیان کی ہیں:-

(۱) عقل یعنی پاگل نہ ہونا (۲) بلوغ یعنی بالغ ہونا (۳) اسلام یعنی مسلمان ہونا (۴) حریت یعنی آزاد ہونا (۵) بصر یعنی اندھا نہ ہونا (۶) نطق یعنی گونگا نہ ہونا (۷) حد قذف سے محفوظ ہونا۔

ان شرائط ہی سے معلوم ہو گیا کہ مرد ہونا منصب قضا کے شرائط میں نہیں ہے لیکن علامہ کاسانی کی صراحت بھی پڑھ لیجیے، وہ لکھتے ہیں :-

فلا یجوز تقلید المجنون والصبی والکافر والعبد والاعمی والاخرس والمحدود فی القذف لان القضاء من باب الولایة بل هو اعظم الولایات وهؤلاء لیست لهم اهلیة ادنی الولایات وهی الشهادة فلان لا یکون لهم اهلیة اعلاها اولی واما الذکورة فلیست من شرط جواز التقلید فی الجملة لان المرأة من اهل الشهادات فی الجملة الا انها لا تقضی فی الحدود والقصاص لانه لا شهادة لها فی ذلک واهلیة القضاء تدور مع اهلیة الشهادة (بدائع الصنائع جلد ۷ صفحہ ۳)

لہذا پاگل، بچے، غلام، اندھے، گونگے کو قاضی بنانا جائز نہیں ہے اور اس شخص کو قاضی بنانا جائز نہیں جس پر قذف کے جرم میں حد لگ چکی ہو اس لیے کہ قضا حکومت کے باب سے ہے بلکہ اس کا سب سے بڑا شعبہ ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جن میں حکومت و تولیت کے سب سے کم درجہ یعنی گواہی دینے کی اہلیت بھی نہیں ہے تو ان میں حکومت کے سب سے اعلیٰ درجہ یعنی قضا کی اہلیت بدرجۂ اولیٰ نہ ہوگی۔ باقی رہی ذکورت یعنی مرد ہونا تو فی الجملہ یہ کسی کو قاضی بنانے کے جواز کی شرط نہیں ہے اس لیے کہ عورت فی الجملہ گواہیاں دینے والوں کے گروہ میں داخل ہے الا یہ کہ عورت حدود و قصاص کے معاملات کا فیصلہ نہیں کرے گی اس لیے کہ حدود و قصاص میں اس کی گواہی معتبر نہیں ہے اور قاضی بننے کی اہلیت کا دارومدار گواہ بننے کی اہلیت پر ہے۔

اس عبارت سے دو باتیں واضح ہوئیں۔ ایک یہ کہ منصب قضا حکومت کا سب سے بڑا منصب ہے دوسری یہ کہ مرد ہونا تقلید قضا (یعنی قاضی بنانے) کے جواز کی شرط نہیں ہے اس لیے عورت کو قاضی بنانا جائز ہے۔ متنِ ہدایہ کی عبارت یہ ہے :-

ویجوز قضاء المرأة فی کل شیء الا فی الحدود والقصاص (ہدایہ کتاب ادب القاضی)

حدود و قصاص کے سوا ہر معاملے میں عورت کا قاضی بننا جائز ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب منصب قضا حکومت کا سب سے بڑا منصب ہو اور یہ منصب عورت کو سپرد کیا جا سکتا ہے تو پھر اس کو حکومت کی سربراہی کا منصب کیوں نہیں دیا جا سکتا جو شخص کسی حکومت کا جج بن سکتا ہے آخر وہ

اس حکومت کا صدر کیوں نہیں بن سکتا۔ آپ کہیں گے کہ میں نے پھر قیاس شروع کر دیا اس لیے آخر میں وہ خاص جزئیہ لکھ رہا ہوں، درج ذیل جزئیہ درحقیقت اس بحث کا نتیجہ ہے جو ابھی عورت کی اہلیت قضا کے بارے میں کی گئی ہے کنز الدقائق کی عبارت یہ ہے :۔

وتقضی المرأة فی غیر حد وقود — عورت حد اور قصاص کے علاوہ دوسرے معاملات میں فیصلہ کرے گی

اس متن کی شرح میں علامہ ابن نجیم نے حدیث نبوی لن یفلح قوم ولوا امرھم امراۃ کا بھی ذکر کیا ہے صاحب فتح القدیر کی رائے بھی پیش کی ہے اور اس کی بنیاد پر اپنے ایک فتوے کا بھی ذکر کیا ہے اور آخر میں اپنا جو فتویٰ دیا ہے وہ یہ ہے :

واما سلطنتها فصحیحة وقد ولی مصر امرأة تسمی شجرة الدر جاریة الملک الصالح بن ایوب (بحر الرائق جلد ۷ ص۵) — اور رہی اس کی سلطنت تو وہ صحیح ہے اور مصر کی بادشاہ ایک عورت بنائی گئی جس کا نام شجرۃ الدر تھا اور جو الملک الصالح بن ایوب کی لونڈی تھی۔

عورت کی سربراہی کے جواز میں یہ ہے علامہ ابن نجیم (متوفی ۹۷۰ھ) کا صریح فتویٰ جس کی تائید میں انھوں نے شجرۃ الدر کی حکومت کا ذکر کیا ہے۔ اب دیکھیے کہ جو لوگ جماعت اسلامی پاکستان اور مولانا مودودی پر صرف اس لیے تحریف دین کا الزام لگا رہے ہیں کہ انھوں نے مخصوص حالات میں بطور استثنا عورت کی صدارت کو جائز قرار دیا ہے۔ ان کے اس الزام کی زد کس شان سے فقہ حنفی اور ائمۂ احناف پر پڑ رہی ہے۔ اس لیے کہ صاحب بحرالرائق نے یہاں نہ اضطرار کا ذکر کیا ہے اور نہ استثنا کا۔ جب استثنا کی صورت میں جواز کا قائل نعوذ باللہ محرف دین ہے تو اضطرار و استثنا کے بغیر جواز کا فتویٰ دینے والا کیا ہوگا؟

اس مسئلے کو ایک اور پہلو سے دیکھیے۔ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جمہوری حکومت میں عورت کی صدارت حکومت کے جواز کا فتویٰ دیں تو وہ برحق۔ مفتی محمد شفیع صاحب جائز کہیں تو کوئی بات نہیں۔ مفتی مہدی حسن صاحب اور مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب گنجائش نکالیں تو کوئی حرج نہیں ـــ لیکن مولانا مودودی جائز کہہ دیں تو وہ محرف دین، ہادم شریعت، ابن الوقت اور معلوم نہیں کیا کیا۔ اور مولانا مودودی پر یہ تمام الزامات دین کی حمایت کے نام پر لگائے جا رہے ہیں۔ اگر اس تمام شور و شغب کا محرک جماعت اسلامی پاکستان (باقی صفحہ ۵۸ پر ملاحظہ ہو)

تنقید و تبصرہ

حجۃ السالکین

دفتر بین الاقوامی روحانی کانفرنس۔ نزد پولیس پوسٹ راجہ باغ۔ سری نگر کشمیر سے ۲۰۳ صفحے کی ایک عجیب و غریب کتاب تبصرے کے لیے آئی تھی۔ قیمت درج نہیں ہے۔ کتاب بھیجنے والوں کا اصرار ہے کہ تبصرہ ضرور شائع کیا جائے۔ متعدد لمبے لمبے خطوط آچکے ہیں ان خطوط کی آمد اور اس مصیبت کو ختم کرنے کے لیے یہ چند سطریں لکھی جا رہی ہیں۔ اس کتاب اور اس کے مصنف کا پورا نام بلفظہ نقل کر رہا ہوں اسی سے کتاب اور مصنف دونوں کا اندازہ ہو جائے گا۔ "حجۃ السالکین (مجموعہ کشوف و الہامات مع پس منظر) مع زینۃ الکشوف جلد اول از سید الاقطاب۔ خاتم المعراج علامہ ڈاکٹر عزیز احمد قریشی قادری امام الزمان صد چہاردہم

یہ ہے اس کتاب کا نام اور یہ ہیں اس کے مصنف۔ یہ حضرت مرزا غلام احمد قادیانی کو مجدد وقت اور امام الزمان تسلیم کرتے ہیں، امام الزماں خود بھی ہیں لیکن ان کا درجہ مرزا صاحب سے اونچا ہے۔ اس کتاب کا کوئی خواب، یا کشف، یا الہام یہاں نقل کرنا قلم اور کاغذ کا صحیح مصرف نہ ہوگا۔ راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ اس کتاب کو پڑھنے سے پہلے پوری توجہ کے ساتھ کسی مستند طبی کتاب میں مالیخولیا کا باب ضرور پڑھ لینا چاہیے اس لیے کہ اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر بھی ہیں تب اس کتاب کو سمجھنا شاید کچھ آسان ہو جائے۔

THE ETHICAL PHILOSOPHY OF MISKAWAIH
مسکویہ کا فلسفۂ اخلاق

از:۔ ایم عبدالحق انصاری ایم اے۔ پی ایچ ڈی (علیگ)
دو سو صفحات — قیمت درج نہیں
شائع کردہ:۔ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڈھ

یہ کتاب فاضل مصنف کا وہ محققانہ شاہکار ہے جس پر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نے ان کو "ڈاکٹریٹ ان فلاسفی" کی ڈگری عطا فرمائی ہے۔ کتاب کا آغاز جناب ایم عمر الدین پروفیسر اینڈ ہیڈ شعبہ فلسفہ و نفسیات علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے ایک مختصر مقدمے سے ہوتا ہے جس میں ڈاکٹر انصاری صاحب کی اس کتاب کو مسکویہ کے فلسفۂ اخلاقیات پر

ہریزی میں پہلی کامیاب تحقیقی کاوش کا درجہ دیتے ہوئے اس کی عظمت، انفرادیت اور افادیت کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے اس کے بعد فاضل محقق کے قلم سے ایک جامع پیش لفظ ہے جس میں موصوف فرماتے ہیں کہ :۔

" مسکویہ وہ پہلا شخص تھا جس نے اخلاقیات کو سیاسیات سے علیحدہ کر کے پیش کیا ہے ......

...... اس لیے وہ بجا طور پر اس کا مستحق ہے کہ اسے مسلم اخلاقیات کا باوا آدم کہا جائے "

اس لحاظ سے محقق اور محقَق دونوں ہی اپنے اپنے کام کے لحاظ سے سرخیل اور شیخ الطائفہ کے درجہ کو پہنچ جاتے ہیں۔

پیش لفظ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر انصاری صاحب نے مسلم فلسفۂ اخلاق کے بانی کا مطالعہ کرتے ہوئے شرق و غرب پر نظر ڈالی ہے اور مسلم علماء کے علاوہ مغربی مستشرقین اور علمائے اخلاقیات کو بھی سامنے رکھا ہے۔ کتاب کی ترتیب حسب ذیل ہے :۔

• پہلے باب میں مسکویہ کے عہد، زندگی اور تصانیف کا سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور کی مادی زندگی کس طرح اخلاقی زندگی کو ہڑپ کیے لے رہی تھی اور یونانی، اشراقی فلسفوں میں اپنا جواز تلاش کر رہی تھی اور یہ کہ وہ کیا عوامل تھے جو صالح ذہنوں کو اس فکری جہاد کی طرف دھکیل رہے تھے کہ اسلامی اخلاقیات کو ایک باقاعدہ فنی ضابطے کی شکل دے کر اس کا تحفظ کیا جائے، نیز یونانی اور اشراقی فلسفوں سے مرعوب ذہنوں اور خیرہ نگاہوں کے سامنے کتاب و سنت کا اخلاقی آب حیات فلسفہ کے پیمانوں میں پیش کر کے ثابت کیا جائے کہ اسلامی اخلاقیات کی بنیادوں میں وہ سب کچھ ہے جس کو آدمی کا دل ڈھونڈھتا ہے اور انسانی دماغ تلاش کرتا ہے۔ گویا اس طرح ایمان اور عقل کی سرحدیں ملانے کی نازک و دشوار مہم شروع ہوئی مسکویہ کی انفرادی زندگی حالات اور جذبات کے دھاروں میں بہتی ہوئی، عمل اور ردعمل کے پیچ و خم سے گزرتی ہوئی کس طرح مذکورہ بالا مہم میں شامل ہوئی؟ یہ بات بھی تاریخی اور نفسیاتی مطالعہ کے طور پر اس باب میں بیان ہوئی ہے۔

• دوسرے باب میں بتایا گیا ہے کہ مسکویہ سے پہلے اسلامی اخلاقیات کے بارے میں فنی کام کس حد تک ہو چکا تھا۔ یہ تمام کام اس سوال کے ڈگر پر گھوم رہا تھا کہ اسلامی اخلاقیات کا ماخذ شریعت ہے یا عقل، لا اینحل کس طرح جبریہ و قدریہ فرقے اٹھے ـــــ کس طرح معتزلہ کی تعقل زدگی اور اشعری تقلید کیشی نے مسئلے کو افراط و تفریط تک پہنچایا ـــــ کس طرح فلسفے اور تصوف نے دماغ اور دل کے مختلف زاویوں سے اس مسئلے کا جائزہ

لیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اسی دور کے نظریات پر یہ محاکمہ دیا ہے کہ یہ نظریات کتاب و سنت کے مطلوبہ توازن سے محروم تھے۔ صوفیانہ نصب العین نے کتاب و سنت سے بنیادی فیضان حاصل کیا مگر بقول فاضل محقق وہ بھی "تفصیلات میں مختلف ہو گئے۔"

● تیسرے باب میں خدا، عقل، روح، دنیا اور انسان کے متعلق مابعد الطبیعاتی بنیادوں کو سمجھایا گیا ہے۔

● چوتھے، پانچویں اور چھٹے باب میں مسکویہ کے فلسفۂ اخلاق کی تشریح ہے اور ساتویں اور آٹھویں باب میں عملی اخلاقیات اور معاشرہ و سیاست کے زیر عنوان مسکویہ کا فکر سامنے لایا گیا ہے۔ آخری باب میں فیصلہ کن تحقیقی نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔

● ان ابواب کے بعد حوالوں، حاشیوں، کتابیات اور انڈکس کا وافر ساز و سامان موجود ہے۔

اس طرح یہ کتاب ایک عہد کا خلاصہ اور ایک موضوع پر لائبریریوں کا معلومات افزا نچوڑ بھی ہے اور ایک فکر انگیز تحقیقی جائزہ بھی۔ مسلم فلسفۂ اخلاق کے خزانے میں بجا طور پر یہ ایک گراں قدر اضافہ ہے اس علمی و دینی خدمت پر ہم فاضل محقق کو دعائے خیر کا ہدیہ پیش کریں گے۔

تحسین و ستائش اور قدر شناسی کا پہلو "شاعرانہ" ہو کر رہ جائے گا اگر ان چند تنقیدی معروضات کو پیش کرنے میں کوتاہی کی جائے جو اس کتاب کے مطالعہ کے دوران ذہن میں آگئی ہیں۔

● آپ کے دوسرے باب کا ایک ذیلی عنوان "قرآن و سنت کا اخلاقی آئیڈیل" ہے۔ اس میں آپ نے دنیا و آخرت کی زندگی کی اخلاقی قدروں پر گفتگو کی ہے۔ یہ بات برحق ہے کہ اسلام زندگی میں جسم و جان دونوں ہی کی اپنی اپنی اہمیت تسلیم کرتا ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ روح اور بدن کی جداگانہ تقسیم کے بجائے وہ پوری زندگی کو ایک "اکائی" تسلیم کرتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس دنیا کے "مزے" فی نفسہٖ شر نہیں ہیں اور یہ بھی سہی کہ یہ دنیا اپنے طور پر نہ خیر ہے اور نہ شر بلکہ اس کے اچھے یا برے ہونے کا دارومدار اس بات پر ہے کہ ہم کس طرح اس کو استعمال کرتے ہیں لیکن اس حقیقت کا اظہار کرتے کرتے صفحہ ۴۶ پر آپ کے قلم سے نکلے ہوئے حسب ذیل جملے نے ہمیں چونکا دیا کہ:-

"قیمتاً یہاں کی زندگی کے متعلق یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ وہ محض آنے والی زندگی کی بھلائیاں کمانے کا ایک ذریعہ ہی ہے۔ اس دنیا کا "خیر" قرآنی خیر کا جزو لاینفک ہے۔"

کاش اس موقع پر آپ تجزیاتی طور سے کوئی مثال پیش کر پاتے کہ لذات دنیا کا وہ کون سا گوشہ ہے جو

ایک مومن کے نقطۂ نظر سے آخرت کے مقصد کا ذریعہ نہیں بلکہ خود ہی اپنے آپ ایک مقصد کا درجہ رکھتا ہے۔ مومن جو اس دنیا کی تمام زندگی میں جو کچھ کرتا ہے وہ حقوق اللہ، حقوق العباد اور حقوق نفس کی ادائیگی کے طور پر کرتا ہے اس کی تو ساری کی ساری زندگی مقصد آخرت کے ایک ذریعہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ وہ نہ اس دنیا کی لذتوں" ۔ جائز لذتوں کو حرام کرکے دنیا سے بھاگتا ہے اور نہ لذتوں کو لذت کے لیے استعمال کرتا ہے بس یہی چیز ہے جو رہبانیت اور لذتیت کے درمیان خط امتیاز کھینچتی ہے ۔

● صـ۲۹ پر آپ کے یہ الفاظ مذکورہ بالا خلش میں مزید وحشت ناکی سی پیدا کر دیتے ہیں کہ :-

"صرف وہی اعمال اخلاقی قدر و قیمت رکھتے ہیں جو خدا کو راضی کرنے کے لیے کیے گئے ہوں مگر اس کا مفہوم یہ نہیں کہ عواقب کے بارے میں مکمل بے نیازی کے ساتھ اس کے احکام کا اتباع کیا جائے"

آئندہ سطور اور گزشتہ سلسلۂ گفتگو کی روشنی میں یہ شبہہ تو نہیں ہوتا کہ آپ یہ کہہ رہے ہوں کہ "اللہ کے احکام پر چلنے سے پہلے بھی عقل و خرد سے مشورہ کر لینا ضروری ہے" آپ کا مقصد غالباً یہی ہو سکتا ہے کہ خدا کے کسی ایک حکم پر اس طرح آنکھیں بند کرکے چلنا صحیح نہیں کہ دوسرے احکامات کی روح کو صدمہ پہنچ جائے لیکن اس کی توضیح ضروری تھی ۔

● تصوف میں لذات دنیا سے غیر معمولی پرہیز کے خلاف تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے لذات دنیا کی افادیت و اہمیت پر غیر معمولی زور دیا ہے۔ موقع اور محل کے لحاظ سے بھی اور اسلامی تعلیمات کے لحاظ سے بھی بات ٹھیک ہے لیکن بحث ادھوری رہ گئی جب اسلام جائز جسمانی لذتوں سے نہیں روکتا۔ جب جسم کی لذتوں میں بھی بقول آپ کے بے ضرر روحانی خوشی کے سوا اور کچھ نہیں تو یہ کیا بات ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب رسول خصوصاً شیخین رض کی زندگی میں روکھی سوکھی کھانے اور موٹا جھوٹا پہننے کا "معمول" محبوب معمول" کی حد تک کیوں ملتا ہے ؟ کاش آپ بتا سکتے کہ لذات دنیا کے سلسلے میں خدا کی حدوں کو پھلانگنے کے بجائے ان حدوں میں سمٹنے کا درجہ کیا ہے ؟ اس مسئلے کو اگر فیصل کر سکتے تو تصوف کی ایک بڑی دیرینہ اور گہری بحث کا خاتمہ ہو جاتا۔

● جیسا کہ آپ نے صفحہ ۲۸ پر فرمایا ہے کہ :-

"اول اول خدا سے قرب حاصل کرنا اخلاقی فریضہ ہوتا ہے۔ آئندہ مرحلوں میں یہ سپردگی اور عشق بن جاتا ہے۔ اس طرح اخلاقیات اپنی بلند سطح پر جا کر مذہب ہو جاتی ہے"

اس لحاظ سے اخلاقیات کی فلسفیانہ تدوین و ترتیب کو یقیناً اس وقت "فکری جہاد" کا درجہ دیا جانا چاہیے۔

جبکہ غیر اسلامی فلسفے مسلم اخلاقیات کے بیخ و بن پتاخت وتاراج کر رہے ہیں۔ مگر جی چاہتا ہے کہ اس مجاہدانہ فکر و نظر کا اثر عملی زندگی میں قرب خداوندی کے حصول اور سپردگی و عشق کی کیا کچھ تحریک پیدا کرتا ہے، یہ بات بھی آپ بتاتے۔

آخر میں ہم ایک بار پھر آپ کی جگر کاوی اور محنت شاقہ پر خراج تحسین پیش کرتے ہیں حق یہ ہے کہ آپ نے اس کتاب کی ترتیب میں سیکڑوں شب و روز صرف فرمائے ہیں اس لیے چند گھنٹوں اور چند دنوں میں سوچی ہوئی ہماری تنقیدی باتوں کا درجہ محض معروضات کا ہے۔   (ش۔ ا۔ عثمانی)

نزہت دل مہر مسلائی صفحات ۲۰۴ کاغذ، کتابت، طباعت بہتر مجلد قیمت: چار روپیہ۔ ملنے کا پتہ ایس۔ آئی۔ قادری فاطمہ منزل ۵۲ جیل روڈ بمبئی ۔

مہسلہ ضلع قلابہ خطۂ کوکن کا ایک مشہور مقام ہے۔ یہی مقام جناب مہر مہسلائی کا وطن ہے۔ شاعر کا پورا نام سید محمد صدیق سید ابراہیم قادری ہے۔ نزہت دل جناب مہر مہسلائی کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نے پیش لفظ لکھا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"وہ ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے پہلے تو مغربی تھے مگر اب ماشاء اللہ مشرقی ہی نہیں بلکہ سراسر اسلامی ہیں، دل کے اعتبار سے پہلے ہی سے مومن ہیں، دماغ کے اعتبار سے بہت رنگین ہیں اور عمل و کردار کے اعتبار سے بہترین انسان ہیں"

اس کتاب میں شاعر کی تصویر بھی ہے اور تصویر میں وہ پورے مولوی نظر آتے ہیں حالانکہ وہ بی اے (آنرز) اور گزیٹیڈ افیسر ہیں۔

مولانا اطہر لکھتے ہیں

"اس مجموعہ میں حمد و نعت سے لے کر قطعات، غزلوں اور نظموں تک ہر صنف سخن میں "ادب برائے زندگی" کا ثبوت ملے گا۔ کہیں بھی وہ ابتذال، رکاکت اور سطحیت نظر نہیں آئے گی جو آج کل بعض طبقے میں فن سمجھی جاتی ہے .... "نزہت دل" صحت مند ادب کا بہترین ترجمان ہے اور اس میں متانت، سنجیدگی، وقار اور عزت نفس کی بڑی قدریں ہیں اس میں صرف زبان ہی کا ادب نہیں ہے بلکہ روح کا ادب بھی ساتھ ساتھ ہے" ص۱۰

میں نے سرسری نظر سے اس مجموعے کو پڑھا ہے اور میں مولانا اطہر کی رائے سے متفق ہوں۔ مہر صاحب کا یہ پہلا مجموعۂ کلام قدر کے لائق ہے اور امید ہے کہ ان کا دوسرا مجموعہ اس سے بہتر ہوگا۔

(ع ۔ ق)

مدرسۂ ابتدائی کی کہانی حصہ اول

عبدالغفار مدھولی، صفحات ۱۶۰ رنگین اور مصور گرد پوش۔ قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

جناب عبدالغفار مدھولی سلم ٹیچرس کالج جامعہ ملیہ کو چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت کا خاص سلیقہ ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں اپنے تجربات کی دلچسپ کہانی سنائی ہے۔ انھوں نے جامعہ کے مدرسۂ ابتدائی میں تقریباً تیس سال تک کام کیا ہے اور یہ کہانی دس برسوں کی ہے لیکن فی الحال حصہ اول میں پہلے چار سال کی کہانی پیش کی گئی ہے۔ یہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۴ء تک کے تجربات پر مشتمل ہے۔ جو لوگ چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت کا کام کر رہے ہوں انھیں اس کتاب میں بہت سی مفید باتیں ملیں گی اور یہ کتاب ان کے لیے مفید ہوگی۔

(ع ۔ ق)

تھوڑی دیر اہل حق کے ساتھ حصہ اول و دوم

مرتبہ محمد یونس نگرامی ندوی حصہ اول ۴۸ صفحات قیمت ۱۲ر حصہ دوم ۸۰ صفحات قیمت ۸۰ ر شائع کردہ: مکتبہ طیبہ سی ۲۸/۲۰۷ ڈیوڑھی آغا میر لکھنؤ۔ یوپی

یہ دونوں مختصر کتابیں مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی شیخ التفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے صاحبزادے محمد یونس نگرامی ندوی نے مرتب کی ہیں۔ ان کتابوں کے تمام مضامین تعمیر حیات لکھنؤ، ندائے ملت لکھنؤ اور رضوان لکھنؤ میں شائع ہو چکے ہیں اور عام طور سے پسند کیے گئے ہیں۔ حصہ اول کا پیش لفظ خود مولانا اویس صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔ مؤلف کو جو انھوں نے دعا دی ہے اس کے الفاظ میں یہاں نقل کرتا ہوں۔ اور آمین بھی کہتا ہوں

"اس کوشش کو اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں اور نوعمر مولف کے موجودہ ذوق و شوق اور دینی حمیت میں مزید ترقی عطا فرمائے اور خود ان کو اللہ والوں سے صحیح ربط پیدا کرنے کی توفیق سے سرفراز فرمائے۔ ان کے لیے میری یہی بہترین دعا اور تمنا ہے۔"

نوجوان مولف علمی ماحول میں نشو و نما پا رہے ہیں۔ اس لیے امید ہے کہ خود ان کے اندر تنقیدی نظر پیدا

ہوتی جائے گی - مزید یہ کہ ان کے والد محترم ان کی علمی تربیت کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے - نوجوان مولف کی یہ دونوں کتابیں لائق مطالعہ ہیں - نظری اور عملی دونوں حیثیتوں سے انکار آخرت کے اس ماحول میں ہر وہ چیز جو آخرت کی طرف متوجہ کرنے والی ہو قدر کے لائق ہے - (ح - ق)

(بقیہ رسائل و مسائل) اور مولانا مودودی سے بغض ونفرت کے بجائے دین کا درد ہوتا تو پھر دلائل دے کر ان تمام لوگوں کی نام بنام تردید کی جاتی جنھوں نے مخصوص حالات میں عورت کی سربراہی کو جائز قرار دیا ہے لیکن جہاں تک مجھے علم ہے مولانا مودودی کے سوا کسی کو ہدف تنقید و نشانہ ملامت نہیں بنایا گیا - ایسے لوگوں نے بھی انصاف نہیں کیا جو بزرگوں کے صحبت یافتہ ہونے پر فخر کے مارے پھولے نہیں سماتے - راقم الحروف کا خیال ہے کہ کم سے کم مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی روح اپنے معتقدوں کی اس زیادتی اور بے انصافی سے ضرور بے قرار ہوگی اور زیادتی بھی ایسی جس کی زد براہ راست مولانا تھانویؒ پر بھی پڑ رہی ہے -

سید احمد قادری

(بقیہ اشارات)

وَالصّٰلِحِينَ وَحَسُنَ أُولٰئِكَ رَفِيقًا — اچھے رفیق ہیں

اس آیت میں شہداء سے کون لوگ مراد ہیں؟ اس کا جواب امام رازی کی زبان سے سنیے -

نقول الشهيد فعيل بمعنى الفاعل	ہم کہتے ہیں کہ شہید فعیل کا صیغہ ہے فاعل کے
وهو الذی يشهد بصحة دين الله تارة	معنی میں اور شہید وہ ہے جو دین اللہ کے حق ہونے
بالحجة والبيان واخرى بالسيف والسنان	کی گواہی دیتا ہے کبھی دلیل و بیان سے اور کبھی
فالشهداء هم القائمون بالقسط وهم	سیف و سنان سے - تو شہداء وہ لوگ ہیں جو عدل و
الذين ذكرهم الله في قوله شهد الله	انصاف پر قائم ہیں اور وہ لوگ ہیں جن کا ذکر اللہ
انه لا اله الا هو والملئكة واولوالعلم	نے اپنے اس قول میں کیا ہے "اللہ گواہ ہے کہ اس
قائما بالقسط ويقال للمقتول في	کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے" اور اللہ کے راستے میں قتل
سبيل الله شهيد من حيث انه بذل	ہونے والے کو شہید اس حیثیت سے کہتے ہیں کہ اس نے

نفسه في نصرة دين الله وشهادته له بانه هو الحق وما سواه هو الباطل واذا كان من شهداء الله بهذا المعنى كان من شهداء الله في الآخرة كما قال وكذلك جعلناكم امة وسطا لتكونوا شهداء على الناس (تفسیر کبیر جلد ۳ ص ۲۶)

اپنی جان اللہ کے دین کی مدد میں صرف کی اور اس نے گواہی دی کہ وہی حق ہے اور اس کے سوا ہر دین باطل ہے اور جب وہ دنیا میں بایں معنی شہداء اللہ میں تھا تو پھر وہ آخرت میں بھی شہداء اللہ میں ہوگا جیسا کہ اللہ نے کہا ہے اسی طرح ہم نے تم کو امت وسط بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو۔

امام رازی نے امتِ مسلمہ کے شہداء کی ایک جامع تشریح کی ہے اس سے چند باتیں بوضاحت معلوم ہوتی ہیں ایک یہ کہ آیت البقرہ کے شہداء علی الناس اور آیت النساء کے الشہداء میں فرق نہیں ہے۔ دونوں سے ایک ہی گروہ مراد ہے اور اس گروہ میں آیت آل عمران کے اولوالعلم بھی داخل ہیں۔ دوسری یہ کہ شہید اس شخص کو کہتے ہیں جو قول و عمل دونوں ہی سے اللہ کے دین کی حقانیت و صداقت کی گواہی دیتا ہے تیسری یہ کہ مقتول فی سبیل اللہ کو بھی شہید اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ دین اللہ کی حمایت میں جان دے کر اس کے حق اور دوسرے ادیان کے باطل ہونے کی عملی شہادت دیتا ہے۔ اور چوتھی یہ کہ آخرت میں شہداء علی الناس کے مقام پر وہی لوگ کھڑے کیے جائیں گے جنھوں نے دنیا میں خود شہادت حق کا فریضہ انجام دیا ہوگا۔

سورۂ النساء کی اسی آیت کے تحت سید رشید رضا لکھتے ہیں:-

واقول ان الشهادة التي تقوم بها حجة اهل الحق على اهل الباطل تكون بالقول والعمل والاخلاق والاحوال فالشهداء هم حجة الله تعالى على المبطلين في الدنيا والآخرة بحسن سيرتهم تقدم القول في ذلك في تفسير لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (المنار ج ۵ ص ۱۸۲)

اور میں کہتا ہوں کہ وہ شہادت جس سے اہل حق کی اہل باطل پر حجت قائم ہوتی ہے وہ قول، عمل اور اخلاق و احوال سبھی سے ہوتی ہے پس شہداء باطل پرستوں پر اللہ کی حجت ہیں، دنیا اور آخرت میں، اپنے حسن سیرت کی وجہ سے اور یہ بات پہلے لتکونوا شہداء علی الناس کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

یہ عبارت اتنی واضح ہے کہ اس پر مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ آیت لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ میں صرف یہ کہ عملی شہادت مراد ہے بلکہ اس کے بغیر قولی شہادت معتبر نہیں، نیز یہ کہ عملی

شہادت کا قول کوئی ایسا فلسفہ نہیں ہے جو اب ایجاد کر لیا گیا ہو۔ اس کے برعکس عملی شہادت کا انکار ایک ایسا قول ہے جو عقل و نقل دونوں کی شہادت سے محروم ہے۔

مفسرین کی صراحتوں سے قطع نظر خود آیت زیر بحث میں کئی دلیلیں ایسی موجود ہیں جن سے بلا اشتباہ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شہادت سے مراد قولی و عملی دونوں شہادتیں ہیں۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ امت مسلمہ کو امت وسط اس لیے بنایا گیا ہے کہ وہ شہادت علی الناس کا فریضہ انجام دے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صرف قولی شہادت کی بنیاد پر کیا کوئی امت، امت وسط بن سکتی ہے؟ اور کیا لفظ وسط میں صرف قول کا توسط و اعتدال مراد ہے؟ ان دونوں سوالوں کا جواب نفی میں ہے یعنی نہ کوئی امت محض قولی شہادت کی وجہ سے امت وسط بن سکتی ہے اور نہ لفظ وسط میں صرف قولی توسط و اعتدال مراد لیا جا سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ امت مسلمہ جب تک قولی و عملی دونوں ہی شہادتیں نہ دے امت وسط کے لقب سے ملقب نہیں ہو سکتی۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں امت مسلمہ کو لوگوں پر گواہ قرار دیا گیا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو امت مسلمہ پر۔ اس سے واضح طور پر یہ بات نکلتی ہے کہ جس شہادت کے آپ مکلف تھے اسی شہادت کی امت مسلمہ بھی مکلف ہوگی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر امت مسلمہ کے لیے صرف قولی شہادت فرض تھی؟ اس کا جواب کتاب و سنت سے واقف کوئی شخص اثبات میں نہیں دے سکتا۔ جب آپ کے لیے ضروری تھا کہ اس دین حق کا عملی نمونہ بھی پیش فرمائیں جو آپ پر اتارا گیا تھا تو آپ کی نیابت میں امت مسلمہ پر بھی ٹھیک وہی فرض عائد ہوتا ہے جو آپ پر عائد ہوا تھا۔ تیسری دلیل علیٰ کے صلے میں پوشیدہ ہے۔ لفظ شہید جب علیٰ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنی "رقیب" کے بھی آتے ہیں اور رقیب کہتے ہیں محافظ و نگراں کو۔ اس کی واضح نظیر سورۂ مائدہ کے آخری رکوع میں موجود ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنا بیان دے رہے ہیں۔

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ — اور میں ان کا نگراں تھا جب تک ان میں موجود رہا۔

اس ٹکڑے کی تفسیر صاحب روح المعانی نے یہ کی ہے:۔

ای رقیبا اراعی احوالهم احملهم علی العمل بموجب امرك من غیر واسطة و مشاهدا لاحوالهم من — یعنی میں ان کا محافظ تھا ان کے احوال کی نگرانی کرتا اور خود بنفس نفیس انہیں تیرے احکام پر عمل کے لیے ابھارتا اور ان کے حالات کا مشاہدہ

ایمان و کفر (روح المعانی) کرتا - ایمان کی حالت ہو یا کفر کی۔

حراست، حفاظت اور نگرانی کا تعلق عمل سے ہے، قول سے نہیں۔ اس آیت میں شہید کا لفظ عملی گواہ کے لیے استعمال ہوا ہے اور اگر صرف عملی شہادت مراد نہ ہو جب بھی عملی شہادت کا پہلو قولی شہادت سے زیادہ ابھرا ہوا اور نمایاں ہے۔ ما دمت فیہم (جب تک میں ان کے درمیان موجود رہا) کے ٹکڑے نے یہ بات بھی صاف کر دی کہ انبیاء کرام علیہم السلام اس دنیا میں اپنی امت کے لیے قولی و عملی گواہ بنا کر بھیجے جاتے تھے ان کا کام صرف تبلیغ کرنا نہ تھا اور نہ شہادت کے معنی صرف زبانی تبلیغ کے ہیں۔ اگر کوئی شخص عملی شہادت کو اس زمانے کا ایجاد کردہ فلسفہ سمجھتا ہے تو وہ کتاب و سنت سے واقف نہیں ہے۔

بخاری کی کتاب التفسیر میں اس آیت کے تحت ایک حدیث ہے جس میں حضرت ابن عباس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خطبے کا ذکر کیا ہے اس خطبے میں حضور اکرمؐ نے کئی باتیں بیان فرمائی ہیں۔ آخری بات یہ ہے کہ امت مسلمہ کے کچھ لوگ جب جہنم کی طرف لے جائے جا رہے ہوں گے تو حضورؐ کو تعجب ہوگا لیکن فرشتے کہیں گے کہ آپ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ انھوں نے آپ کی وفات کے بعد دین میں کیا نئی بات پیدا کی تھی اور کس طرح اپنا دین بدل دیا تھا۔ یہ سن کر حضورؐ جو کچھ فرمائیں گے اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

فاقول کما قال العبد الصالح و	تو میں کہوں گا جس طرح اللہ کے نیک بندے
کنت علیہم شہیدا ما دمت فیہم	نے کہا اور میں ان پر نگراں تھا جب تک ان کے درمیان
فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیہم (بخاری جلد ۲)	رہا پھر جب تو نے مجھے واپس بلا لیا تو ان کا نگراں تو ہی تھا

اس حدیث نے واضح کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی امت پر ٹھیک اسی طرح گواہ رہے جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی امت پر رہے تھے اور یہ پہلے معلوم ہو چکا کہ سورہ مائدہ کی اس آیت میں شہادت کا عملی پہلو، قولی سے زیادہ نمایاں ہے۔

مقالات سیرت ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ایم اے پی۔ ایچ ڈی نے مقالات سیرت کے نام سے یہ کتاب تعلیم یافتہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لیے لکھی ہے جس میں سیرت محمدی کا خلاصہ اور عطر پیش کیا گیا ہے۔ طرز بیان سادہ اور موثر۔ کتابت طباعت دیدہ زیب، سائز ۲۲x۱۸، صفحات ۲۸۰۔ قیمت مجلد مع گرد پوش چار روپیہ پچاس پیسے۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ زندگی نو کانتی۔ رامپور

Monthly 'ZINDGI' Rampur, Feb. 1965 Regd. No L-688

❁ تفہیم القرآن ❁

از مولانا سید ابوالاعلی مودودی

- ★ دور حاضر کے استدلالی ذہن کو زیادہ سے زیادہ مطمئن کرنے
- ★ مغربی افکار سے مرعوبیت کو دور کرنے
- ★ قرآن کی مرکزی دعوت اور تمام اہم مسائل حیات سے اس کے تعلق کی بوجہ احسن واضح کرنے
- ★ اسلام کے جامع نظام حیات کی طرف بصیرت افروز رہنمائی کرنے
- ★ قرآن کی انقلابی دعوت کو دلنشین انداز میں پیش کرنے کیلئے

تفہیم القرآن جیسی معرکۃ الآرا تفسیر کا مطالعہ نہایت ضروری ہے -

جلد اول

الفاتحہ .... الانعام

ہدیہ مع پلاسٹک کور Rs. 12/-

جلد دوم

اعراف .... بنی اسرائیل

ہدیہ مع پلاسٹک کور Rs. 15/-

جلد سوم

کہف .... روم

ہدیہ مع پلاسٹک کور Rs. 17/-

— ملنے کا پتہ —

منیجر:- مکتبہ زندگی و کانتی ۔ رامپور (یو ۔ پی)

Only Title printed at Shanker Press, Rampur

ماہنامہ

زندگی

رام پور، یوپی

سالانہ چھ روپئے

فی پرچہ ۶۰ پیسے

ماہنامہ

زندگی رامپور

جلد : ۳۴
شمارہ : ۳

ذیقعدہ ۱۳۸۴ھ
مارچ ۱۹۶۵ء

مدیر :- سید احمد قادری

● خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ — منیجر رسالہ "زندگی" رام پور یو پی

● زر سالانہ :- چھ روپیہ — ششماہی :- تین روپیہ — فی پرچہ :- ۶۰ پیسے

● ممالک غیر سے :- بارہ شلنگ مثل پوسٹل آرڈر

مالک :- جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر :- سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر : احمد حسن۔ مطبع :- دہلی پرنٹنگ ورکس محلہ آرا دخان رامپور

مقام اشاعت :- دفتر زندگی رامپور یو پی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیمؕ

اشارات

سید احمد قادری

تیسرے سوال کا جواب

دوسرے سوال کے جواب میں جو کچھ لکھا گیا اسی سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ شہادت صرف قولی نہیں ہوتی بلکہ عملی بھی ہوتی ہے اور کَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا کی آیت میں عملی شہادت بھی مراد ہے لیکن بہت سے مسلمات میں بھی شک انگیزی کی رسم عرصہ دراز سے جاری ہے اس لیے بعض بالکل تسلیم شدہ چیزوں کو بھی از سر نو مدلل کرنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ اسی لیے ایک مستقل سوال کے تحت یہ دکھایا جا رہا ہے کہ شہادت صرف قولی نہیں ہوتی بلکہ عملی بھی ہوتی ہے۔ پہلے "لسان العرب" کا ایک قول یہاں نقل کر رہا ہوں:۔

قال ابن الاعرابی:۔ انشد نی	ابن الاعرابی نے کہا کہ ایک اعرابی نے ایک
اعرابی فی صفة فرس	گھوڑے کی تعریف میں مجھے یہ مصرع سنایا۔ لہ غائب
لہ غائب لم یبتذل لہ وشاھد	لم یبتذل لہ وشاھد
قال الشاھد من جریہ مایشھد	اس نے کہا۔ گھوڑے کی دوڑ کا شاہد وہ ہو
لہ علی سبقہ وجود تہ	جو اس کی سبقت وجودت پر گواہی دیتا ہے۔

اس مصرع میں گھوڑے کی عمدگی اور اس کی سابقت پر اس کی رفتار کو گواہ قرار دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ رفتار کی شہادت فعلی و عملی شہادت ہی ہو سکتی ہے۔ معلوم ہوا کہ کلام عرب میں شہادت کا لفظ صرف عملی شہادت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے فعلی و عملی شہادت کوئی فلسفہ نہیں بلکہ لغوی استعمال ہے۔ بدوی عرب کے کلام کے بعد اب کلام اللہ کی دو آتیں ملاحظہ کیجیے۔

(۱) مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا — مشرکوں کا کام نہیں کہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں

مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ﴿﴾ دیتے ہوئے اللہ کی مسجدیں آباد کریں۔

جب کوئی کافر اپنے کو کافر نہیں کہتا تو پھر کفار قریش کے بارے میں یہ کہنا کس لحاظ سے صحیح ہوگا کہ وہ اپنے کفر کے خود گواہ ہیں؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ شہادت صرف قولی نہیں ہوتی بلکہ عملی بھی ہوتی ہے کفار کے کافرانہ اعمال واحوال ان کے کفر پر گواہ ہوتے ہیں اور اسی لحاظ سے انہیں اپنے کفر پر گواہ قرار دیا گیا ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس فرماتے ہیں:۔

قال ابن عباس شهادتهم على	ابن عباس رضؓ نے کہا اپنے نفوس پر ان کی شہادت
انفسهم بالكفر سجودهم للاصنام و	کفر یہ تھی کہ وہ اپنے بتوں کو سجدے کرتے تھے
ذالك ان كفار قريش قد نصبوا	اس طرح کہ کفار قریش نے بیت الحرام سے باہر اس
اصنامهم خارج البيت عند	کے گوشوں کے پاس اپنے بت نصب کر رکھے تھے
القواعد وكانوا يطوفون بالبيت	اور وہ برہنہ ہو کر کعبہ کا طواف کرتے جب ایک طواف
عراة كلما طافوا طوفة سجدوا	پورا کرتے تو اپنے ان بتوں کو سجدہ کرتے پس وہ
للاصنام فلم يزدادوا بذالك	اپنے اس عمل کی وجہ سے خدا سے دور ہی ہوتے
من الله الا بعدا (خازن)	چلے گئے۔

فعلی و عملی شہادت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا۔ کعبہ جو توحید کا مرکز اور ایک خدا کا گھر ہے، اس کو بتوں سے سجانا، اس کا عریاں طواف کرنا اور ان بتوں کو سجدے کرنا کفر و شرک پر ایسی عملی شہادت ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے قولی شہادت نہ ہو جب بھی ان کے خود اپنے کفر پر گواہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ آیت کی تفسیر میں تمام اقوال کو پیش کرنا مقصود نہیں۔ مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ حضرت ابن عباس جیسے اہل زبان اور مفسر قرآن نے کفار قریش کے عمل کو "شہادت" قرار دیا۔

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں:۔

(شاهدين على انفسهم بالكفر)	انھوں نے کفر کی گواہی دی ایسی باتوں کے اظہار
باظهارهم ما يدل عليه وان لم يقولوا	سے جو کفر پر دلالت کرتی ہیں اگرچہ انھوں نے یہ نہیں کہا
نحن كفار (روح المعانی)	کہ ہم کافر ہیں۔

اس عبارت سے بھی معلوم ہوا کہ قولی شہادت نہ ہونے کے باوجود ان کو عملی شہادت کی وجہ سے اپنے کفر پر

خود گواہ کہا گیا :-

مولانا شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں :-

الغرض کفار و مشرکین جو اپنے حال و قال سے اپنے کفر و شرک پر گواہی دیتے رہتے ہیں اس لائق نہیں کہ ان سے مساجد اللہ خصوصاً مسجد حرام کی حقیقی تعمیر (آبادی) ہو سکے۔

(۲) اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۝ (العادیات) — بلاشبہ انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے اور وہ خود اس پر گواہ ہے۔

یہاں بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان نے اپنی زبان سے ناشکری کا اقرار کب کیا اور اس نے یہ کب کہا کہ میں اپنے رب کا ناشکرا ہوں۔ اس سوال کا جواب بھی یہ ہے کہ اس نے کفرانِ نعمت کی عملی شہادت دی اور اسی شہادت کی بنا پر اس کو ناشکری پر شہید (گواہ) قرار دیا گیا۔

(وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ) ای کنودہ — اور وہ اپنے ناشکرا ہونے پر گواہ ہے۔ وہ

(لشھید) یشھد علی نفسہ بصنعہ اعلانیۃ — اپنے عمل سے اپنے آپ پر اس کی شہادت دیتا ہے

مدارک التنزیل میں ہے :-

(وَاِنَّهٗ) وان الانسان (عَلٰى ذٰلِكَ) علی کنودہ (لَشَهِيْدٌ) یشھد علی نفسہ — اور بلاشبہ انسان اپنی ناشکری پر گواہ ہے۔

یشھد علی نفسہ کے تحت صاحب آلوسی لکھتے ہیں :-

لیس المراد بشھادۃ الانسان علی نفسہ بالکنود الشھادۃ بلسان المقال بل المراد الشھادۃ بلسان الحال — انسان کی اپنے آپ پر ناشکری کی شہادت سے مراد قولی شہادت نہیں بلکہ یہ شہادت بزبانِ حال ہے۔

یہی بات صاحبِ روح المعانی نے لکھی ہے :-

(لشھید) لظھور اثرہ علیہ فالشھادۃ بلسان الحال الذی ھو افصح من لسان المقال — وہ گواہ ہے اس سبب سے کہ اس پر ناشکری کا اثر ظاہر ہے تو یہاں مراد زبانِ حال کی شہادت ہے جو زبانِ قال سے زیادہ فصیح ہے۔

اس عبارت سے واضح ہوا کہ عملی و حالی شہادت، قولی شہادت سے زیادہ فصیح ہوتی ہے یعنی عملی شہادت

سے انسان کی قلبی کیفیت زیادہ کھل کر سامنے آتی ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے:۔

وان الانسان علی ذٰلک لشہید	اور انسان اپنے ناشکرا ہونے پر گواہ ہے یعنی
لشہید ای بلسان حالہ ای ظاہر ذٰلک	بزبانِ حال یعنی اس کا ظاہر اسی پر ہے اس کے اقوال میں
علیہ فی اقوالہ وافعالہ کما قال تعالیٰ	اور افعال میں جیسا کہ اللہ نے کہا (مشرکین کا کام نہیں
(ما کان للمشرکین ان یعمروا مساجد	کہ وہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں۔ بایں حال کہ وہ اپنے
اللّٰہ شاہدین علی انفسہم بالکفر)	کفر کے خود گواہ ہیں)

انسان اگرچہ اپنی ناشکری کا زبانی اعتراف نہیں کرتا لیکن اس کے دوسرے اقوال اس کی ناشکری کی دلیل بنتے ہیں اسی طرح اس کے افعال اس کے ناشکرا ہونے پر گواہ ہوتے ہیں اور اسی جہت سے اس کو اپنی ناشکری پر گواہ قرار دیا گیا ہے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی تحریر فرماتے ہیں:۔

اکثر مفسرین اس جملے کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ انسان خود اپنی ناشکری پر زبانِ حال سے گواہ ہے ذرا اپنے ضمیر کی آواز کی طرف متوجہ ہو تو سن لے کہ اندر سے خود اس کا دل کہہ رہا ہے کہ تو بڑا ناشکرا ہے۔

شہید کو شہید کیوں کہتے ہیں؟

اللہ کی راہ میں جو شخص قتل کر دیا جاتا ہے اس کو شہید کیوں کہتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان کی ایسی عملی شہادت پیش کرتا ہے جسے سب سے آخری اور بلند درجے کی شہادت کہنا چاہیے کیونکہ جب کسی انسان نے اپنی جان بھی قربان کر دی تو اب اس کے پاس قربان کرنے کی کوئی اور چیز باقی نہیں رہی۔۔۔ اوپر سورۂ نساء کی آیت ۶۹ کے تحت امام رازی کی تفسیر میں اس کا ذکر گزر چکا ہے لیکن وہاں یہ چیز ضمناً آئی تھی۔ یہاں ہم خاص اس سوال سے متعلق چند اقوال پیش کرتے ہیں:۔

والشہداء جمع شہید وھو	شہداء شہید کی جمع ہے اور شہید وہ ہے جو اللہ
المقتول فی سبیل اللّٰہ سمی بذٰلک	کے راستے میں قتل کر دیا گیا ہو اس کا نام شہید اس لیے رکھا
لقیامہ بشہادۃ الحق فی جنب اللّٰہ	گیا کہ وہ اللہ کے معاملے میں شہادتِ حق پر قائم رہا۔
حتی قتل (ابن جریر طبری)	یہاں تک کہ قتل کر دیا گیا۔
ثم الشہداء الذین ادی بہم	پھر شہداء ہیں وہ لوگ جنہیں طاعت کی رغبت اور
الحرص علی الطاعۃ والجد فی اظہار	اظہارِ حق کی سرگرمی نے اس حد تک پہنچایا کہ انھوں نے

الحق حتی بذلوا مھجھم فی اعلاء کلمۃ اللہ سبحانہ (بیضاوی)

اللہ پاک کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے اپنا خون بہا یا اور اپنی جانیں قربان کر دیں۔

مولانا ابوالکلام لکھتے ہیں:۔

"شہید کے معنی گواہی دینے والا یعنی ایسا انسان جو اپنے قول و عمل سے سچائی کا اعلان کرنے والا ہو اور دنیا میں اس کے لیے شہادت و حجت قائم کرے" (ترجمان القرآن جلد ا)

ان چند اقوال سے بھی یہ معلوم ہوگیا کہ شہید کو شہید کہنے میں اس کی عملی شہادت کا وزن زیادہ ہے۔ "عملی شہادت" کے اثبات کے لیے اتنی تفصیل اس لیے پیش کرنی پڑی کہ جو لوگ قرآن و حدیث اور عربی لغت کا براہ راست علم نہیں رکھتے وہ یہ جان لیں کہ عملی شہادت کوئی فلسفہ نہیں ہے جسے جماعت اسلامی کے کسی شخص نے ایجاد کر لیا ہو بلکہ اس کا انکار ایک ایسا دعویٰ ہے جسے سن کر حیرت طاری ہوتی ہے۔

شہادت حق کے جس عظیم منصب پر امت مسلمہ سرفراز کی گئی ہے اس کے متعلق دوسری آیت سورۂ حج کے اخیر میں ہے اور جس سیاق و سباق میں ہے اس نے شہادت کے مفہوم کو پوری طرح متعین کر دیا ہے۔ ہم یہاں وہ آیتیں نقل کرتے ہیں:۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ (الحج)

اے ایمان والو! رکوع اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی بندگی کرو اور نیکی کرو شاید کہ تم فلاح پاؤ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے اس نے تمہیں اپنے کام کے لیے چن لیا ہے اور دین میں آپ نے تم پر کوئی سخت مشکل نہیں ڈالی۔ دین تمہارے باپ ابراہیم کا۔ اس نے تمہارا نام مسلم رکھا پہلے بھی اور اس قرآن میں بھی تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ بنو پس نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ وہ تمہارا آقا ہے بہترین آقا اور بہترین مددگار۔

سورۂ حج کی دو آیتیں اس شہادت کا مفہوم — امت مسلمہ جس کی ذمہ دار قرار دی گئی ہے — اس طرح

متعین کردیتی ہیں کہ پوری طرح انشراحِ صدر حاصل ہو جاتا ہے لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ سے پہلے جو کچھ کہا گیا ہے اور اس کے بعد جو کچھ ارشاد ہوا ہے اس کے درمیان یہ ٹکڑا اس طرح آیا ہے کہ خود پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ امت مسلمہ کو شہادت حق کا جو منصب سپرد کیا گیا ہے وہ پورے دین کی اقامت کا فریضہ ہے۔ راہ خدا میں جہاد کا فریضہ ہے۔ ایسا جہاد جس کا حق ادا کر دیا گیا ہو۔ یہی وہ خدمت ہے جس کے لیے یہ امت منتخب کی گئی ہے اور "مسلم" کا معزز لقب اس کو اس لیے عطا کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے حق کی شہادت پیش کرے ــــــ پہلی آیت میں رکوع و سجود، بندگی رب اور عمل خیر کا حکم دیا گیا۔ اور خاص سے عام کی طرف اور عام سے اعم (سب سے زیادہ عام) کی طرف کلام کو اس طرح ترقی دی گئی کہ پورا دین اس کے دائرے میں آگیا۔ اور پورے دین پر عمل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک دین باطل کا زور توڑ نہ دیا جائے اس لیے دوسری آیت کی ابتدا ہی میں جہاد کا حکم دیا گیا۔ ہمہ جہتی جہاد بہر حال ایک کٹھن چیز ہے اس لیے چند باتیں ایسی فرمائی گئیں جو بندۂ مومن کے لیے اس کڑوی چیز کو شیریں اور لذیذ بنا دیتی ہیں۔ پہلی بات هُوَ اجْتَبَاكُمْ کے ٹکڑے میں کہی گئی ہے یعنی کسی اور نے نہیں بلکہ خود تمہارے آقائے ولی نعمت نے تمام نوع انسانی میں سے تم لوگوں کو اس خدمت کے لیے منتخب فرمایا ہے۔ یہ سنتے ہی اطاعت گزار اور آقا سے محبت کرنے والا غلام مسرت و انبساط کے سرمدی کیفیت سے جھوم اٹھتا ہے اور اس کیفیت میں ہمالیہ کو اپنی جگہ سے ہٹا دینے کی خدمت بھی اسے کٹھن نظر نہیں آتی۔ لیکن مہربان آقا کی طرف سے شفقت سے بھری ہوئی آواز آتی ہے۔ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ۔ دین میں اس نے تم پر ایسی مشکل نہیں ڈالی جو "حرج" کی حد تک پہنچے۔ یہ دوسری بات ہے جس نے راہ خدا میں جہاد اور فرائض کی تعمیل کو آسان بنایا۔ تیسری بات یہ کہی گئی کہ یہ تمہارے باپ ابراہیم کا کیش و مذہب اور دین و آئین ہے۔ ذرا دیکھو تو کہ تمہارے باپ ابراہیم راہ خدا میں جہاد کے کس درجے پر پہنچے اور حق کے لیے کون سی قربانی ہے جو انھوں نے نہیں دی۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر سعادت مند بیٹوں پر باپ کی وراثت اور ان کی روش کیوں گراں گزرے۔ پھر مزید تاکید کے لیے فرمایا کہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں مسلم کے معزز لقب سے ملقب کیا ہے تاکہ رسول تم پر گواہ ہوں اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔ گویا اس امت کا نام مسلم رکھنے کی غرض یہی شہادت علی الناس ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ نماز قائم کرو۔ زکوٰۃ دو اور اللہ پر بھروسہ کرو۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ قرآن میں جگہ جگہ اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ کو پورے دین کے اجمالی عنوان کے طور پر بھی استعمال کیا گیا ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ فریضۂ شہادت حق کی تکمیل اسی وقت ہو سکتی ہے جب پورا دین قائم ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اقامت صلوٰۃ اور

ایتاءِ زکوٰۃ کے حکم کے بعد اعتصام باللہ کا حکم دیا گیا اور بات اس پر ختم کی گئی کہ اللہ ہی تمہارا آقا مولیٰ ہے اور وہ بہترین آقا اور بہترین مددگار ہے۔ یعنی جب تک تمہارا تعلق اللہ سے قوی نہ ہو، تم اس پر بھروسہ نہ کرو، اس سے مدد طلب نہ کرو اور وہ جب تک تمہاری مدد نہ کرے تم شہادت حق اور اقامت دین کا فریضہ انجام نہیں دے سکتے۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا ان آیتوں کی صاف اور سامنے کی تشریح ہے جس کے لیے مقدمات قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب مزید اطمینان کے لیے ان آیتوں کے متعدد ٹکڑوں کی وہ تفسیریں نقل کرتا ہوں جو مفسرین کرام نے اپنی کتابوں میں لکھی ہیں۔ میں عام طور سے وہی قول نقل کروں گا جسے مفسرین نے خود اختیار کیا ہے۔

مفسر ابن جریر وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

يقول وذلوا لربكم واخضعوا	کہتا ہے کہ اپنے رب کے فرماں بردار ہو جاؤ
له بالطاعة وافعلوا الخير الذي	اور اس کے سامنے اطاعت کے ساتھ جھک جاؤ اور
امركم ربكم بفعله	وہ نیکی کرو جس کے کرنے کا حکم تمہارے رب نے دیا ہے۔

تفسیر کبیر میں ہے:۔

اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ فِيْ سَائِرِ الْمَامُوْرَاتِ وَالْمَنْهِيَّاتِ	تمام اوامر و نواہی میں اپنے رب کی بندگی کرو

وَجَاهِدُوْا حَقَّ جِهَادِهٖ کے تحت مفسر ابن جریر لکھتے ہیں:۔

والصواب من القول في ذلك	اس میں صحیح قول ان لوگوں کا ہے جو یہ کہتے ہیں
قول من قال عنى به الجهاد في سبيل	کہ اس سے مراد اللہ کی راہ میں جہاد ہے اس لیے کہ
الله لان المعروف من الجهاد ذلك	لفظ جہاد کا معروف معنی یہی ہے جب کوئی شخص
وهو الاغلب على قول القائل	جاھدت فی اللہ کا جملہ استعمال کرتا ہے تو اغلباً اس
جاهدت في الله وحق الجهاد هو	سے مراد راہِ خدا میں جہاد ہوتا ہے اور حق جہاد کا
استفراغ الطاقة فيه	مطلب یہ ہے کہ اس میں اپنی پوری طاقت صرف کی جائے

جلالین میں ہے:۔

(وجاهدوا في الله) لاقامة دينه	یعنی اقامت دین کے لیے جہاد کرو۔

ابن کثیر لکھتے ہیں:۔

(باقی صفحہ ... پر دیکھیے)

اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

جناب ابوبکر اصلاحی

(۱) عَنْ اِبْنِ اَبِیْ مُلَیْکَةَ قَالَ قَالَتْ
اَسْمَاءُ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم
قَالَ اَنَا عَلٰی حَوْضِیْ اَنْتَظِرُ مَنْ یَّرِدُ
عَلَیَّ فَیُؤْخَذُ بِنَاسٍ مِّنْ دُوْنِیْ فَاَقُوْلُ
اُمَّتِیْ فَیَقُوْلُ لَا تَدْرِیْ مَشَوْا
عَلَی الْقَهْقَرٰی قَالَ ابن ابی مُلَیْکَةَ
اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِكَ اَنْ نَّرْجِعَ
عَلٰی اَعْقَابِنَا اَوْ نُفْتَنَ

(بخاری)

ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ اسماء نے نبی صلی اللہ
علیہ وسلم سے روایت کی۔ آپ نے فرمایا۔ میں حوض کوثر پہ
اپنے پاس آنے والوں کا انتظار کروں گا۔ تو میرے
سامنے سے کچھ لوگ پکڑ لیے جائیں گے۔ میں کہوں گا۔
میری امت کے لوگ ہیں تو جواب ملے گا آپ کو نہیں
معلوم ہے یہ لوگ ایڑیوں کے بل لوٹ گئے تھے۔
ابن ابی ملیکہ کا مقولہ ہے: اے اللہ! ہم اس بات
سے تیری پناہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنی ایڑیوں پر پلٹ
جائیں، یا فتنے میں پڑ جائیں۔

آپ حوضِ کوثر پر اپنی امت کے لوگوں کا انتظار فرمائیں گے، لیکن اتباعِ رسول سے انحراف حوضِ کوثر پہ پہنچنے سے محرومی کا سبب بنے گا۔ بلکہ اطاعتِ رسول سے منحرف کچھ لوگ اگر قریب بھی پہنچ جائیں، تو بھی محرومی ہی ان کے حصے میں آئے گی اور وہ پکڑ کر واپس کر دیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو انحراف سے اپنی پناہ میں رکھے۔

(۲) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ
رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللہِ
صلی اللہ علیہ وسلم قَامَ عَامَ تَبُوْكَ

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے
ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ تبوک کے
سال ایک کھجور سے ٹیک لگا کر خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے

خَطَبَ النَّاسَ وَهُوَ مُضِيفٌ ظَهْرَهُ إِلَى نَخْلَةٍ فَقَالَ أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِخَيْرِ النَّاسِ وَشَرِّ النَّاسِ إِنَّ مِنْ خَيْرِ النَّاسِ رَجُلٌ عَمِلَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ عَلَى ظَهْرِ فَرَسِهِ أَوْ عَلَى ظَهْرِ بَعِيرِهِ أَوْ عَلَى قَدَمَيْهِ حَتَّى يَأْتِيَهُ الْمَوْتُ وَإِنَّ مِنْ شَرِّ النَّاسِ رَجُلٌ فَاجِرٌ جَرِيٌّ يَقْرَأُ كِتَابَ اللّٰهِ لَا يَرْعَوِي إِلَى شَيْءٍ مِنْهُ (نسائی)

اور فرمایا۔ لوگو! کیا میں تمہیں عمدہ ترین و بدترین آدمی کی خبردار نہ کردوں؟ بہترین شخص وہ آدمی ہے جو گھوڑے یا اونٹ پر سوار ہو کر یا پیدل چل کر اللہ کی راہ میں کام کرے، یہاں تک کہ اسے موت آجائے، اور بدترین شخص وہ بدکار (گناہوں پر) جری آدمی ہے جو اللہ کی کتاب پڑھتا ہو لیکن اس میں سے کسی چیز کا لحاظ نہ کرے (اور نہ کسی چیز پر عمل ہو)

اپنے محبوب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اگر بہترین انسان کہلائے جانے کی آرزو اور تمنا ہے تو اس کی ایک ہی راہ ہے کہ اقامت دین کو اپنا نصب العین بنالیا جائے اور اپنی پوری زندگی کو اپنے جملہ وسائل و ذرائع کے ساتھ اس کے حصول میں لگا دیا جائے اور موت تک یہ جدوجہد جاری رکھی جائے۔

یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

اپنے محبوب کی زبانِ مبارک سے اگر بدترین انسان کا فیصلہ سننا گوارا نہیں ہے تو ضروری ہے کہ اپنی پوری زندگی کو کتاب اللہ کی زندہ تصویر بنا دیا جائے۔

(۳) عَنْ عَدِيِّ بْنِ حَاتِمٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُؤْمَرُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِنَاسٍ مِنَ النَّارِ إِلَى الْجَنَّةِ حَتَّى إِذَا دَنَوْا مِنْهَا وَاسْتَنْشَقُوا رِيحَهَا وَنَظَرُوا إِلَى قُصُورِهَا وَمَا أَعَدَّ اللّٰهُ لِأَهْلِهَا فِيهَا نُودُوا أَنِ اصْرِفُوهُمْ عَنْهَا لَا نَصِيبَ لَهُمْ فِيهَا فَيَرْجِعُونَ بِحَسْرَةٍ مَا رَجَعَ الْأَوَّلُونَ بِمِثْلِهَا

عدی بن حاتم روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن کچھ لوگوں کے بارے میں حکم ہوگا کہ جہنم سے جنت کی طرف لے جائے جائیں تو جب وہ اس سے قریب ہوں گے اس کی خوشبو سونگھیں گے، اس کے محلات کو اور ان میں جو کچھ اللہ نے ان کے لیے تیار کیا ہوگا اسے دیکھ لیں گے، تو پکار کر کہا جائے گا کہ انھیں اس کے پاس سے لوٹا لاؤ، اس میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے تو وہ اسی طرح لوٹ جائیں گے جیسے انھیں کی

يَقُولُونَ رَبَّنَا لَوْ أَدْخَلْتَنَا النَّارَ قَبْلَ
أَنْ تُرِيَنَا الْجَنَّةَ وَفِي رِوَايَةٍ قَبْلَ أَنْ
تُرِيَنَا مَا أَرَيْتَنَا مِنْ ثَوَابِكَ وَمَا أَعْدَدْتَ
فِيهَا لِأَوْلِيَائِكَ كَانَ أَهْوَنَ
عَلَيْنَا قَالَ ذَاكَ أَرَدْتُ بِكُمْ كُنْتُمْ إِذَا
خَلَوْتُمْ بَارَزْتُمُونِي بِالْعَظَائِمِ وَ
إِذَا لَقِيتُمُ النَّاسَ لَقِيتُمُوهُمْ مُخْبِتِينَ
تُرَاءُونَ النَّاسَ بِخِلَافِ مَا تُعْطُونِي
مِنْ قُلُوبِكُمْ هِبْتُمُ النَّاسَ وَلَمْ
تَهَابُونِي وَأَجْلَلْتُمُ النَّاسَ وَلَمْ
تُجِلُّونِي تَرَكْتُمْ لِلنَّاسِ
وَلَمْ تَتْرُكُوا لِي الْيَوْمَ
أُذِيقُكُمْ أَلِيمَ الْعَذَابِ
مَعَ مَا حُرِمْتُمْ مِنَ
الثَّوَابِ -

(طبرانی، بیہقی)

طرح پہلے لوٹ چکے ہوں گے، تو وہ کہیں گے۔
"پروردگار! اگر تو نے ہمیں جنت دکھانے سے پہلے
جہنم میں داخل کر دیا ہوتا" اور ایک روایت میں
ہے کہ اپنے اس اچھے اجر اور جو کچھ تو نے اس (جنت)
میں اپنے دوستوں کے لیے تیار کر رکھا ہے اسے
دکھانے سے پہلے تو ہم پر آسان ہوتا، مالک فرمائے گا
یہ تو میں نے بالقصد کیا ہے تمہارا حال یہ تھا کہ
جب تم تنہائی میں ہوتے تو بڑے بڑے گناہ کر کے
مجھے چیلنج کرتے اور جب لوگوں سے ملتے تو متقیانہ
صورت میں ملتے، تم اپنے دلوں سے جو معاملہ مجھ سے
کرتے لوگوں کو اس کے برخلاف دکھاتے، لوگوں
سے ڈرتے لیکن مجھ سے نہ ڈرتے۔ لوگوں کا احترام
کرتے لیکن میرا احترام نہ کیا، لوگوں کے لیے تو باز
رہے لیکن میرے لیے نہیں۔ آج میں تمہیں دردناک
عذاب کا مزہ چکھاؤں گا۔ مزید برآں ثواب سے
محروم ہوگے۔

جو زندگی اللہ تعالیٰ کے ساتھ اخلاص پر مبنی نہیں ہوتی اس کی سچی تصویر اس روایت میں پیش کر دی گئی ہے۔ ہم سب اس معیار پر اپنے کو تولیں، اگر اس کے خلاف اخلاص پر مبنی پائیں تو اللہ کا شکر ادا کریں اور اگر اس کی ادنیٰ مشابہت بھی محسوس ہو تو اس کے رسوا کن بھیانک انجام سے کانپتے ہوئے فوری اصلاح میں لگ جائیں۔

عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ
رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
إِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى يَقُولُ أَنَا اللّٰهُ لَا إِلٰهَ

ابو درداء روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ
اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں میں بادشاہوں

إِلَّا أَنَا مَالِكُ الْمُلُوكِ وَمَلِكُ
الْمُلُوكِ، قُلُوبُ الْمُلُوكِ فِي يَدِي
وَإِنَّ الْعِبَادَ إِذَا أَطَاعُونِي حَوَّلْتُ
قُلُوبَ مُلُوكِهِمْ عَلَيْهِمْ بِالرَّحْمَةِ وَ
الرَّأْفَةِ وَإِنَّ الْعِبَادَ إِذَا عَصَوْنِي حَوَّلْتُ
قُلُوبَهُمْ بِالسَّخْطَةِ وَالنِّقْمَةِ فَسَامُوهُمْ
سُوءَ الْعَذَابِ فَلَا تَشْغَلُوا أَنْفُسَكُمْ
بِالدُّعَاءِ عَلَى الْمُلُوكِ وَلَكِنِ اشْغَلُوا
أَنْفُسَكُمْ بِالذِّكْرِ وَالتَّضَرُّعِ كَيْ
أَكْفِيَكُمْ مُلُوكَكُمْ (رواه ابو نعیم فی الحلیۃ)

کا مالک ہوں اور بادشاہوں کا بادشاہ ہوں۔
بادشاہوں کے دل میرے ہاتھ میں ہیں جب بندے
میری اطاعت کرتے ہیں تو میں ان کے بادشاہوں
کے دلوں کو بدل کر ان کے لیے مہربان و شفیق بنا دیتا
ہوں اور جب بندے میری نافرمانی کرتے ہیں تو
میں ان کے دلوں کو غصہ اور انتقام سے بدل دیتا
ہوں، تو تم بادشاہوں کے خلاف بددعا کرنے کے
بجائے اپنے آپ کو ذکر و گریہ زاری میں لگاؤ تاکہ
میں تمہارے بادشاہوں کے بالمقابل تمہارا کفیل
بن جاؤں۔

گناہ گارانہ زندگی کا وبال صرف آخرت ہی میں نہیں ملتا، بلکہ اس دنیا میں بھی ذلت و رسوائی، جان و مال اور عزت و آبرو کے زیاں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اگر آج ہم ایسے حالات سے دوچار ہیں تو ہمیں ذکر اور گریہ و زاری کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع ہونا چاہیے۔ اور معصیت سے تائب ہو کر اطاعت کیشانہ اور وفادارانہ زندگی گزارنے کا عزم بالجزم کرنا چاہیے۔

(۵) (عَبْدُ اللهِ بْنُ جَابِرٍ) لَمَّا
تُوُفِّيَ أَبُو طَالِبٍ خَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَاشِيًا عَلَى قَدَمَيْهِ
إِلَى الطَّائِفِ يَدْعُوهُمْ إِلَى الْإِسْلَامِ
فَلَمْ يُجِيبُوهُ فَانْصَرَفَ فَأَتَى ظِلَّ
شَجَرَةٍ فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ قَالَ اللَّهُمَّ
أَشْكُو إِلَيْكَ ضَعْفَ قُوَّتِي وَهَوَانِي
عَلَى النَّاسِ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ أَنْتَ
أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ إِلَى مَنْ تَكِلُنِي
إِلَى عَدُوٍّ يَتَجَهَّمُنِي أَمْ إِلَى قَرِيبٍ

عبداللہ بن جابر روایت کرتے ہیں کہ) جب
ابو طالب انتقال کر گئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پیدل
طائف تشریف لے گئے، تاکہ اسلام کی دعوت دیں
لیکن انھوں نے قبول نہ کیا، تو آپ لوٹ کر ایک
درخت کے سایے تلے تشریف لائے۔ دو رکعت نماز
پڑھی پھر فرمایا۔ اے اللہ! میں تجھ ہی سے اپنی کمزوری
اور لوگوں پر اپنی بے حیثیتی کی شکایت کرتا ہوں۔
اے مہربان آقا! تو سب سے بڑا مہربان ہے تو
مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ ایسے دشمن کے جو مجھ
سے ترش روئی سے پیش آتا ہو؟ یا کسی قریبی کے حوالے

مَلَّكْتَهُ أَمْرِي إِنْ لَمْ تَكُنْ غَضْبَانَ	میرا معاملہ کر دیا ہے؟ اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے
عَلَيَّ فَلَا أُبَالِي غَيْرَ أَنَّ عَافِيَتَكَ	تو مجھے کسی کی پروا نہیں، البتہ تیری عافیت میرے
أَوْسَعُ لِي أَعُوذُ بِنُورِ وَجْهِكَ	لیے زیادہ وسیع ہے، میں تیرے رُخ کے انور کی پناہ چاہتا
الَّذِي أَشْرَقَتْ بِهِ الظُّلُمَاتُ	ہوں جس نے تاریکیوں کو چمکا دیا ہے اور اسی سے
وَصَلُحَ عَلَيْهِ أَمْرُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ	دنیا و آخرت کا معاملہ درست ہوگا۔ اگر تو غصہ ور
إِنْ تَنْزِلَ بِي غَضَبُكَ أَوْ تُحِلَّ بِي	اور ناراض ہوا تو تجھی سے معافی چاہیں گے یہاں
سُخْطُكَ لَكَ الْعُتْبَى حَتَّى تَرْضَى	تک کہ تو راضی ہو جائے، سوائے اللہ کے کوئی
وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ (الکبیر)	قوت و طاقت والا نہیں۔

اس روایت میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہونے کا بہترین اسوہ پایا جاتا ہے اس کی پیروی کرتے ہوئے جلد از جلد ہم سب کو اللہ تعالیٰ سے اپنا معاملہ درست کر لینا چاہیے۔

(بقیہ رسائل و مسائل)

سند آپ نے پوچھی ہے۔ جزم و قطع، بڑے وزنی الفاظ ہیں۔ کسی مسئلے میں قطعیت یا تو قرآن کریم سے ثابت ہوتی ہے یا متواتر و مشہور احادیث سے۔ خبر واحد سے ظن غالب ہی پیدا ہوتا ہے۔

(۲) مال مستفاد کو اصل کے ساتھ ضم کرنے کا مسئلہ بعض صورتوں میں اجماعی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص قابل زکوٰۃ جانوروں میں سے کسی ایک صنف کے نصاب کا مالک ہوا اور سال گزرنے سے پہلے بچے پیدا ہوئے تو ان بچوں کو اصل کے ساتھ ضم کر کے زکوٰۃ ادا کرنا تمام فقہاء کے نزدیک واجب ہے۔ اسی طرح مال زکوٰۃ کے نفع کو اصل کے ساتھ ضم کرنا سب کے نزدیک ضروری ہے۔ ہاں میں نے اپنے جواب میں مال مستفاد کی جس صورت کا ذکر کیا ہے وہ مختلف فیہ ہے۔ کیونکہ کتاب و سنت میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ یہ مسئلہ اجتہادی استنباطی ہے۔ ائمہ ثلاثہ کے مسلک کی پشت پر بھی نہ قرآن کی کوئی آیت ہے اور نہ کوئی سنت صحیحہ۔ ایسے اجتہادی مسائل میں جس کو جس مسلک پر اعتماد ہو اس پر عمل کرنا چاہیے۔ حنفیہ چونکہ مسلک حنفی پر اعتماد کرتے ہیں اس لیے اسی کے مطابق جواب دیا جاتا ہے۔ آپ نے جو صورت تجویز کی ہے اس کا تعلق بھی اجتہاد ہی سے ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے بھی کتاب و سنت کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

اسلام کا نظامِ عدل

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ

جمہوری نظام اور اُس کی ناکامی

شخصی حکومتوں ملوکانہ جبر و استبداد، حاکمانہ خود غرضیوں اور شہوت پرستیوں کی وجہ سے عالم انسانی پر جو بربادی اور ہلاکت کے پہاڑ ٹوٹا کرتے تھے، ان سے تنگ آکر انسانی دنیا نے انقلابات کے دروازے کھولے اور جگہ جگہ جمہوری نظام جاری کیا گیا۔ اگرچہ بعض ممالک میں شاہی خاندانوں کو بھی باقی رکھا گیا، مگر ان کو اس قدر بے دست و پا کر دیا گیا تھا کہ نظم و نسق اور عام رعایا کے متعلق کسی قسم کے تصرف کا اختیار باقی نہیں رکھا گیا تھا۔ یہ جمہوری نظام اگرچہ ظاہری نظر میں عام انسانوں کے لیے خوش کن تھا، اور ممکن ہے کہ ابتدائی مراحل میں اس میں پوری طرح ہر عام و خاص، امیر و غریب کا لحاظ بھی رکھا گیا ہو مگر اقتدار قائم ہوتے ہی بوالہوسی اور سرمایہ پرستی کا غلبہ ہو گیا، غرباء اور مزدوروں کے خون پسینے سے ہولی کھیلی جانے لگی، نظام میں اس قدر سرمایہ پرستی، خود غرضی اور یورپین قومیت کی لعنت گھس گئی کہ عام انسانی دنیا شخصی حکومتوں سے اس قدر ہلاکت اور بربادی کا شکار نہیں ہوئی تھی، جتنی کہ اس فریبانہ جمہوریت اور نام نہاد خدمت خلق سے ہونے لگی۔ بالآخر عالم انسانی میں دوبارہ انقلاب کا نشو و نما ہوا۔ اس غلط اور برباد کن جمہوریت کے نظام کو توڑنے اور اس کو مٹا دینے کے ولولے ظہور پذیر ہوتے، اور بزعم خود اصلاح خلق اور ان کی عام پرورش کا بیڑا اٹھایا گیا۔ کہیں سے بالشویزم کی صدا اٹھی، کہیں سوشلزم کی آواز بلند ہوئی، کہیں سے نازی ازم کا ڈنکا بجا، کہیں سے فاشزم ازم کا صور پھونکا گیا، کہیں سے ڈکٹیٹر شپ کی آوازیں اٹھیں، کہیں سے یورپین ازم اور جاپانی ازم کا راگ گایا گیا۔ مگر واضح رہے کہ یہ تمام نظام کسی طرح بھی امن و امانِ عام اور حقیقی خدمتِ خلق کے متکفل نہیں ہیں اور ان کا ملعون اثر آفتاب سے زیادہ ظہور پذیر ہو چکا اور دنیا میں روشن تر ہے۔ ان نظاموں کی بدولت، آج انسانی دنیا جس ہلاکت و بربادی میں مبتلا ہے اس کی نظیر ابتدائے عالم سے

لے کر آج تک نہیں ملتی۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ — کھل پڑا اور پھیل گیا ہے فساد جنگلوں
بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ — اور سمندروں میں لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی سے
لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا — تاکہ چکھایا جائے ان کو کچھ مزہ ان کے کاموں کا
لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (قرآن) — کہ وہ شاید لوٹ آئیں

ہم اس وقت صحیح اور کامل نظام تمام دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے اور ضروری سمجھتے ہیں کہ ساڑھے تیرہ سال کی آواز سے دنیا کو پھر بیدار کریں۔

خدا تعالیٰ سب کا خالق اور حاکم

خداوند کریم جس طرح چھوٹوں، بڑوں، انسانوں، حیوانوں، فلکیات اور عنصریات، نباتات اور جمادات، ملائکہ، جنات، روح اور مادہ غرض ہر شے کا خالق اور بنانے والا ہے۔ اسی طرح وہ سب کا پرورش کرنے والا اور مربی بھی ہے، اور جس طرح وہ عرش سے لے کر فرش تک سب کا شہنشاہ اور مالک ہے، اسی طرح وہی سبھوں پر حاکم اور ہر چیز کا جاننے والا بھی ہے، وہ جس قدر ان کی ضرورتوں اور منافع و مضار کو جانتا ہے کوئی دوسرا نہیں جان سکتا ہے اور وہ جس قدر ان کا خیر خواہ اور شفیق ہے، کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا ہے۔ اسی نے انسان کو اشرف المخلوقات اور تمام کائنات کا مخدوم بنایا ہے اور اسی نے تمام روئے زمین کے انسانوں کو ایک انسان حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا کیا ہے۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ ۔

جب کہ فطری قاعدہ ہے کہ ہر بنانے والے کو اپنی بنائی ہوئی چیز سے محبت ہوتی ہے جیسے کہ ہر پالنے والے کو اپنی پالی ہوئی چیز سے ہوتی ہے۔ بالخصوص جبکہ کسی چیز کے بنانے اور پالنے میں زیادہ تر کاوش اور توجہ کی گئی ہو اس لیے خدا کو تمام انسانی دنیا سے انتہائی محبت اور خیر خواہانہ شفقت ہوگی۔

اگر پہلی گذارش کی شہادت لما خلقت بیدی سے ملتی ہے تو دوسری عرض کی گواہی تمام انسانوں کے باپ کی مسجودیت اور ان کی خلافت اور اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ جیسی آیات سے ملتی ہے۔ اس کی نظر میں کالے اور گورے، ایشیائی اور یوروپین، افریقی اور امریکی، عرب اور عجم، سپید اور سرخ، زرد سیاہ نسلوں کا کوئی فرق و امتیاز نہیں ہے جس طرح ایک باپ کی متعدد اولاد سب کی سب اس کے مراحم اور الطاف کی مستحق ہوتی ہے وہ سب کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے اور سب کی بہبودی اور بھلائی کا خیال رکھتا ہے۔

خدا تمام انسانوں کا خیال رکھنے والا اور سب کی انتہائی بہبودی کا چاہنے والا ہے' اس لیے اس خالق الکل رب العلمین کا بنایا ہوا انسانی نظام ہی ہر خاص و عام اور ہر فرد و جماعت کے لیے مفید اور کارآمد اور انتہائی منفعت کا کفیل ہو سکتا ہے نہ کہ انسانوں کا خود ساختہ نظام ——

خدائی نظام کی خوبیاں وہ خدائی نظام یقیناً ہر قسم کے غل و غش اور تمام آلائشوں سے پاک ہوگا' اس میں اغراض پرستی اور دوسروں کی اہانت و تذلیل وغیرہ کا شائبہ بھی نہ ہوگا۔ اور اسی کے نظام میں حقیقی جمہوریت و شورائیت پائی جاوے گی۔ اس میں ہر ہر فرد انسانی سے وہ محبت و الفت بھری ہوگی جو ان کے ماں باپ اور عزیز و اقارب میں بھی نہیں پائی جاتی' اس میں کسی سے دشمنی' رقابت وغیرہ نہ ہوگی۔ اس میں اچھوت' برہمن اور شودر' سید اور شیخ' بڑی ذات' چھوٹی ذات وغیرہ کا کوئی تمیز نہ ہوگا۔ ہاں فرق صرف اس قدر ضرور ہوگا کہ نظام میں داخل ہونے والے مطیع و فرماں بردار مستحق اعزاز و اکرام اور نظام سے گریز کرنے والے باغی و نافرمان اور مستحق اہانت و تذلیل قرار دیے جائیں گے خواہ وہ کسی نسل اور قوم سے تعلق رکھنے والے ہوں اور کسی ملک کے باشندے اور کسی رنگت کے آدمی ہوں' اس میں کسی شخص یا جماعت یا قوم پر ظلم و تعدی کو گوارا نہ کیا جائے۔ ان اللہ لا یحب الظّٰلمین و من یظلم منکم نذقہ عذابا کبیرا۔ اس کے تمام قوانین اور اصول رحمت و شفقت سے پُر ہوں گے اور حقیقی عروج و ترقی کی روح اس میں کارفرما ہوگی' اس میں عام امن و امان' عدل حقوق' فضل و احسان کوٹ کوٹ کر بھرا ہوگا' اس میں ہر حاکم و راعی کو تمام رعایا کی پوری رعایت اور خبرگیری اور خیر خواہی کا حکم ہوگا' اور سب کا وہی طرفدار اور پرسان حال ہوگا۔ کُلُّکُمْ رَاعٍ وَّ کُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ' الحدیث۔ اس میں روحانی تربیت' اخلاقی ترقیات خالق و مخلوق کے تعلقات' مخلوقات میں آپس کے تعلقات' سب کے مراتب کا لحاظ وغیرہ کامل درجہ کا ہوگا۔

انسانی نظام انسانوں کا بنایا ہوا نظام خواہ شخصی ہو یا جماعتی' خواہ فوجی ہو یا سیاسی' اقتصادی ہو یا تجارتی' خواہ حکما اور فلاسفہ کا بنایا ہوا ہو یا ارباب سیاست و حکومت کا۔ اگر خداوندی نظام کے زیرسایہ نہ ہوگا اور اس کی روشنی سے اس میں استفادہ نہ کیا ہوگا تو یقیناً اس میں ہر جگہ خود غرضی اور ایسی خامیاں ہوں گی جس میں ہر قسم کے فتنہ و فساد' ظلم و عناد' ہلاکت اور بربادی کا نشوونما ہوگا' خواہ وہ نازی ازم ہو یا کوئی اور ازم ——

نظامِ حق میں عدل آج اسلام ازم ہی وہ خداوندی نظام ہے کہ جس میں حقیقی جمہوریت اور سچی آمریت

کو باحسن وجوہ جمع کر دیا گیا ہے اور جس میں ہر ہر فرد بشر کے ساتھ انصاف و عدالت کی تاکید کی گئی ہے۔

وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ ۔۔۔ اور جب فیصلہ کرنے لگو لوگوں میں تو

تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (سورۂ نساء) فیصلہ کرو انصاف سے۔

اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

"اے ایمان والو! کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے واسطے، گواہی دینے کو انصاف کی اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز ہرگز نہ چھوڑو، عدل کرو یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے۔" (رکوع ۲ سورۂ مائدہ)

اس کا عادلانہ اور مساویانہ قانون ہے۔

آیت اولیٰ میں عدل و انصاف کا ارشاد تمام انسانوں کے لیے کیا گیا ہے خصوصیت مسلم یا مومن کی نہیں ہے۔ اسی طرح سورۂ مائدہ میں نہایت زور سے حکم کیا گیا ہے کہ کسی قوم کی دشمنی کی حالت میں بھی عدل و انصاف کو نہ چھوڑنا چاہیے اور اسی طرح گواہی بھی محض اللہ کے لیے ہونی چاہیے اور حق بات کو ہرگز نہ چھپانا چاہیے اور اغراض کا بندہ نہ ہونا چاہیے۔

دوسری جگہ فرمایا:-

"اے ایمان والو! قائم رہو انصاف پر گواہی دو اللہ کی طرف کی اگرچہ نقصان ہو تمہارا یا ماں باپ کا، قرابت داروں کا۔ اگر کوئی مال دار ہے یا محتاج تو اللہ ان کا خیر خواہ تم سے زیادہ ہے۔ سو تم پیروی نہ کرو دل کی خواہش کی انصاف کرنے میں؟ اور اگر تم زبان ملو گے یا بچا جاؤ گے تو اللہ تمہارے سب کاموں سے واقف ہے۔"

(زبان ملنا یہ کہ بچی بات تو کہے مگر زبان دبا کر اور پیچ سے کہ سننے والے کو شبہ پڑ جائے یعنی صاف صاف سچ نہ بولے اور بچا جانا یہ کہ پوری بات نہ کہی بلکہ کچھ بات کام کی رکھ لی۔ سو ان دونوں صورتوں میں گو جھوٹ تو نہیں بولا مگر بوجہ عدم اظہار حق گنہگار ہوگا۔ گواہی سچی اور صاف پوری دینی چاہیے۔ (سورۂ نساء، رکوع ۲۰)

ان آیات سے وہ اصول و قوانین معلوم ہوتے ہیں جن سے تمام عالم انسانی آنجہانی امن و امان اور خوشحالی فارغ البالی کی زندگی بسر کر سکے۔ پس اسی انضباط و انتظام کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے منعہ قبل عہد لیا اور تمام دنیا کو یہ طریقہ بتایا۔

ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی کہ ہر حالت میں سنیں گے اور اطاعت کریں گے خواہ

تنگی ہو یا فراخی، خوشی ہو یا ناخوشی، یا ہم پر ترجیح دی جائے اور اس بات پر کہ اولی الامر سے امارت میں کش مکش نہ کریں گے ...... اور جہاں کہیں بھی حق کی بات کہیں گے، خدا لگتی بات کہیں گے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ (متفق علیہ)

نظامِ حق میں آزادیٔ رائے

یہ وہ تعلیم ہے کہ آزادیٔ رائے کے ساتھ ساتھ حقیقی نظامِ حکومت کامل طریقہ پر اسی طرح چل سکتا ہے۔ جبر واستبداد اور خود رائی کی جڑ کھونے کے لیے ارشاد فرمایا گیا :-

"اللہ ہی کی رحمت ہے جو تو نرم دل مل گیا ان کو اور اگر تو ہوتا تند خو سخت دل تو متفرق ہو جاتے تیرے پاس سے، سو تو ان کو معاف کر اور ان کے واسطے بخشش مانگ اور ان سے مشورہ لے کام میں۔ پھر جب قصد کر چکا تو اس کام کا تو پھر بھروسہ کر اللہ پر، اللہ کو محبت ہے توکل کرنے والوں سے۔"

(سورۂ آل عمران ع ۱۷)

اور مستحقین انعام خداوندی کو ذکر کرتے ہوئے فرمایا :-

"اور جنھوں نے کہ حکم مانا اپنے پالنے والے (رب) کا، اور قائم کیا نماز کو، اور کام کرتے ہیں مشورے سے آپس کے، اور ہمارا دیا کچھ خرچ کرتے ہیں۔" (سورۂ شوریٰ ع ۴)

ان دونوں آیتوں میں استبداد اور خود رائی سے کنارہ کشی، مشورے سے تمام کاموں کے انجام دینے اور نرم خوئی اور لوگوں کی بھول چوک سے چشم پوشی اور حقوق رب العلمین کے ادا کرنے کی تعلیم دی گئی ہے جس سے اجتماعی طاقت کا پورا تحفظ ہو سکتا ہے اور سب کے حقوق کی مکمل نگرانی ہوتی ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کو خواہ وہ حکام ہوں یا رعایا، خطاب فرماتے ہیں :-

خبردار ہو جاؤ تم سب کے سب راعی اور والی ہو (چونکہ ہر حاکم پر اپنے محکوم اور رعایا کی خبر گیری اور خیر خواہی اسی طرح لازم کی گئی ہے جس طرح جانور چرانے والے پر جانوروں کے مالک کی طرف سے کی جاتی ہے اگر چرواہا جانوروں کی خیر خواہی اور خدمات مفیدہ کے انجام دینے میں کوتاہی کرتا ہے، تو مالک کے سامنے مسئول قرار دیا جاتا ہے، اس لیے حکام کو راعی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے) بادشاہ جو کہ لوگوں پر مقرر کیا گیا ہو راعی ہے اور اپنی رعیت سے مسئول ہے، اور مرد اپنے گھرانے کے لوگوں کا راعی ہے اور اپنی رعیت سے مسئول ہے، اور عورت اپنے خاوند کے گھر اور اس کے بچوں کی راعی ہے اور اپنی رعیت سے مسئول ہے اور آدمی کا

خادم اپنے مالک کے مال کا راعی ہے اور اپنی رعیت سے مسئول ہو۔ خبردار ہو جاؤ۔ تم سب راعی ہو اور اپنی رعیت سے مسئول ہو۔ (حدیث متفق علیہ)

نظام حق میں جوابدہی کا احساس یہ وہ صحیح نظام حکومت کے اصول ہیں جن کے ہوتے ہوئے کسی حاکم کو رعایا کی خیر خواہی سے بے پرواہ ہونا یا ان کے حقوق اور مصالح کو پامال کرنا، یا ان کی بہبودی سے غافل ہونا درست نہ ہوگا۔ ان میں بتلا دیا گیا ہے کہ مالک حقیقی کے سامنے تم سب مسئول اور ذمہ دار ہو، خبردار رہو اور اس کے سوال سے ڈرو:۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

"کوئی شخص اگر مسلمان رعایا کا والی اور حاکم بنایا گیا اور وہ اس حالت میں مرا کہ وہ ان کے حقوق میں خیانت کرنے والا ظالم تھا، تو جنت اس پر حرام ہوگی" (حدیث متفق علیہ)

"کوئی بندۂ خدا ایسا نہیں ہے کہ اگر اس کو اللہ تعالیٰ نے کسی رعیت کا راعی اور حاکم بنایا اور اس نے ان کی نگہبانی اور حفاظت، ان کی خیر خواہی کے ساتھ نہ کی تو اس کو جنت کی خوشبو بھی ملے گی۔

(حدیث متفق علیہ)

نظام حق میں غیر مسلموں کا درجہ یہ وہ نظام ہے جس میں ہر والی اور حاکم کو تمام رعایا خواہ اس کی قوم سے ہو یا دوسری قوم کی ہو، خواہ وہ نظام اسلامی میں داخل ہو یا نہ ہو سب کی خیر خواہی اور ہمدردی کا شدید ترین حکم دیا گیا ہے۔

ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

إِنَّ الْمُقْسِطِيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ عَلٰى	انصاف اور عدل کرنے والے اللہ تعالیٰ
مَنَابِرَ مِنْ نُّوْرٍ عَنْ يَمِيْنِ الرَّحْمٰنِ	کے داہنی طرف نور کے منبروں پر ہوں گے اور وہ
وَكِلْتَا يَدَيْهِ يَمِيْنٌ ـ الَّذِيْنَ يَعْدِلُوْنَ	لوگ ہیں جو کہ اپنے حکم میں اور اہل و عیال اور اپنی
فِيْ حُكْمِهِمْ وَاَهْلِيْهِمْ وَمَا وَلُوْا (متفق علیہ)	رعایا میں عدل و انصاف کرتے ہیں۔

ایک جگہ فرماتے ہیں

إِنَّ أَشَرَّ	یعنی سب سے برے راعی اور والی وہ بادشاہ
الرِّعَاءِ	اور حکام ہیں جو لوگوں کو توڑتے ہیں یعنی رعیت پر ظلم کرتے

الخطمة | ہیں اور ان پر رحم نہیں کرتے، لوگوں کے مال بے تحاشا کھا کر اپنے نفسانی ارادوں کو پورا کرتے رہتے ہیں۔

(رواہ مسلم)

ایک جگہ ارشاد ہے:۔

الا من ظلم معاهدا او انتقصه او كلفه فوق طاقته او اخذ منه شيئا بغير طيب نفسه فانا حجيجه يوم القيمة (ابو)	کسی غیر مسلم رعیت پر کسی نے ظلم کیا یا اس کی توہین کی، یا اس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف دی یا اس سے کچھ بغیر اس کی خوشی کے لے لیا تو میں قیامت کے دن اس کی طرف سے جھگڑا کروں گا۔

ارشاد فرمایا جاتا ہے:۔

من قتل معاهدا لم يرح رائحة الجنة وان ريحها توجد من مسيرة اربعين خريفا (البخاری)	جس نے کسی غیر مسلم رعیت کو قتل کر دیا تو اس کو جنت کی خوشبو بھی نہ ملے گی حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس برس کی دوری تک جاتی ہے یعنی جنت کے قریب بھی نہ جاسکے گا (داخل ہونا تو درکنار)

یہ نظام اور اصول رعایا پروری اور ان میں عدل و انصاف کے ہیں جن میں مسلم، غیر مسلم، چھوٹے بڑے مرد، عورت، ہم قوم، غیر قوم، دیسی، پردیسی وغیرہ وغیرہ سب کے ساتھ مساوات و عدالت کا ارشاد کیا گیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

ان الله يعذب الذين يعذبون فی الدنيا (مسلم)	جو لوگ دنیا میں آدمیوں کو عذاب دیتے اور ستاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو عذاب دے گا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

الراحمون يرحمهم الرحمن ارحموا من فی الارض يرحمكم من فی السماء (ترمذی و ابو داؤد)	جو لوگ رحم کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان پر رحمت کرتا ہے، تم زمین کے بسنے والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

ایک جگہ ارشاد ہے:۔

الخلق عيال الله فاحب الخلق	مخلوق خداوند کریم کا بمنزلہ عیال ہے، تو جو شخص

الی اللہ من احسن الی عیالہ (البیہقی)

اللہ تعالیٰ کے عیال پر احسان کرے گا، وہ خدا کے یہاں سب سے زیادہ محبوب ہوگا۔

ان روایات صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے کہ خداوند کریم کی تمام مخلوق اور بالخصوص تمام انسانوں کے ساتھ بھلائی اور ان پر رحمت و شفقت اور ان کی بہبودی اور خیر خواہی کرنا ضروری ہے۔

قرآن شریف میں فرمایا جاتا ہے :۔

لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ
صَدُّوْکُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ
تَعْتَدُوْا وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی
وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ
وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ (مائدہ)

اس قوم سے دشمنی جو کہ تم کو مسجد الحرام سے روکتی تھی اس کی باعث نہ ہو کہ تم ان پر زیادتی کرنے لگو اور آپس میں ایک دوسرے کے نیک کام اور پرہیزگاری پر مدد کرو اور گناہ اور ظلم پر مدد نہ کرو۔ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔

دوسری آیت میں فرماتے ہیں

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ
قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا
مِّنْھُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ
عَسٰی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْھُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْا
اَنْفُسَکُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الْاِسْمُ
الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ

(الحجرات)

اے ایمان والو! ٹھٹھا اور استہزاء نہ کرو دوسری قوم سے شاید وہ بہتر ہوں ان سے اور نہ عورتیں دوسری عورتوں سے شاید وہ بہتر ہوں ان سے، اور عیب نہ لگاؤ ایک دوسرے کو اور نام نہ ڈالو چڑانے کو ایک دوسرے کے، برا نام ہے گنہگاری ایمان کے بعد۔ اور جو کوئی توبہ نہ کرے تو وہی ہے بے انصاف۔

اگلی آیت میں ارشاد ہے :۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا
کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ
وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا
اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ
مَیْتًا فَکَرِھْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰہَ
اِنَّ اللّٰہَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ (الحجرات)

اے ایمان والو! بچتے رہو بہت تہمت کرنے سے۔ یقیناً بعض تہمت گناہ ہے۔ اور بھید نہ ٹٹولو کسی کا اور برا نہ کہو پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو۔ بھلا چاہتا ہے کسی کو کہ کھاوے گوشت اپنے مردہ بھائی کا؟ سو گھن آتی ہے تم کو اس سے۔ اور ڈرتے رہو اللہ سے، بے شک اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے۔

ان اصول اور قوانین بین الاقوامی میں بہت سے وہ اصول ذکر کیے گئے ہیں جن سے حقیقی امن اور رفاہ عام قائم ہوتا ہے اور ان جھوٹے پروپگنڈوں اور ناشائستہ کارروائیوں کی جڑ کٹتی ہے جنھوں نے انسانی دنیا کو ہلاکت کے گھاٹ تک پہنچایا ہے۔ ہم نے اسلام کے اصول اور قوانین میں سے بطور مشتے نمونہ از خروارے چند اصول اس مختصر میں پیش کیے ہیں۔ اگر ہم جملہ امور کو پیش کریں، تو بہت ضخیم کتاب ہو جائے۔ قرآن اور حدیث اور فقہ ان سے بھرا ہوا ہے ہم کو ان کا استیعاب بیان منظور نہیں ہے اس لیے کہ اس مختصر وقت میں ہم کو اور بھی دوسرے اہم امور پیش کرنے ہیں۔

نظامِ حق میں حاکم کی حیثیت

ان اصولوں نے صاف طور پر یہ بھی روشن کر دیا ہے کہ کوئی امیر اور سلطان نہ مطلق العنان ہے اور نہ صرف اپنے خاندان یا کسی پارٹی کا نمائندہ ہے، اور نہ کسی استبدادی آمریت کا مالک ہے، بلکہ وہ خداوند کریم کا نائب ہے، اور خدائی قانون کو نافذ کرنے والا حاکم ہے اور اسی کے قانون کے تحت جواب دہ اور مسئول ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي	تو کہہ اے اللہ مالک سلطنت کا، تو سلطنت دیتا
الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ	ہے جس کو چاہتا ہے اور سلطنت چھین لیتا ہے جس سے
تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ	چاہتا ہے اور عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور
تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ	ذلیل کرتا ہے جس کو چاہتا ہے، تیرے ہاتھ میں سب
شَيْءٍ قَدِيرٌ (القرآن الکریم)	خوبی ہے، تو ہر چیز پر قادر ہے۔

اور اس پر فرض اور لازم ہے کہ تمام رعایا کی خبرگیری اور بہبودی کا خیال رکھے۔ اگر کسی قسم کی کوتاہی اس میں کرے گا تو وہ اور اس کے معاونین سب کے سب مالکِ حقیقی کے سامنے جواب دہ اور مستحق سزا ہوں گے۔ سب کے ساتھ انصاف کرے، اور سب پر رحم اور شفقت کرے۔ سب کا خیال رکھے، کسی کی توہین اور تذلیل نہ کرے، ہاں جو شخص نظام خداوندی سے بغاوت اور سرتابی کرے، اس کو بغیر تعدی اور بغیر نفسانیت کے جرم کے موافق سزا دے کر اس کی اور دوسروں کی اصلاح کرے۔ یہی وہ حقیقی اور کارآمد نظام ہے جو دنیائے انسانی کو تمام ذلتوں کے گڑھے سے نکالنے والا اور ہر قسم کی عزت کی چوٹیوں پر پہنچانے والا ہے۔ اور تمام جمہور افرادِ انسانی کی سچی پرورش کا کفیل بھی ہے۔ اسی نظام خداوندی کو لے کر تمام انبیاء علیہم السلام اور پیغمبر علیہ السلام آئے۔

شرع لكم من الدين ما وصى به — مشروع کیا تمہارے واسطے دین کو جو کہہ

نُوحًا وَّالَّذِیْ اَوْحَیْنَا اِلَیْكَ وَمَا وَصَّیْنَا	تھا نوحؑ کو اور جو حکم بھیجا ہم نے تیری طرف اور وہ
بِهٖ اِبْرَاهِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰی الخ (القرآن)	جو کہہ دیا ہم نے ابراہیمؑ کو اور موسےؑ اور عیسیٰؑ کو الخ

مگر جب لوگوں نے اس میں اپنی نفسانی خواہشوں، اغراض اور مظالم و تعدی کو داخل کر کے بدل ڈالا اور دنیائے انسانی کو بربادی اور ہلاکت کے گڑھوں میں دھکیل دیا تو دوسرے انبیاء بھیجے گئے۔ خود سر اور باغی قوموں کو برباد کیا گیا اور اطاعت شعار اور ماننے والوں کو عزت اور حکومت بخشی گئی۔ عیسائیوں کے پاس بھی ایسا ہی نظام تھا انھوں نے جب تک اس کو مضبوطی سے پکڑے رکھا ان کا بول بالا رہا اور ان کے مخالف ذلیل و خوار رہے۔

وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِیْنَ	اور رکھوں گا تیرے تابعداروں کو منکروں
كَفَرُوْٓا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ (آل عمران ع ۷)	کے اوپر قیامت کے دن تک۔

مگر جب انھوں نے اس کو چھوڑ دیا تو ان سے امن و امان، عزت و رفاہیت کا فور ہو کر مسلمانوں کے پاس آگئی جو کہ حقیقتاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور تمام گزشتہ پیغمبروں کے تابعدار تھے۔

وَمِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰی	اور وہ جو کہتے ہیں اپنے آپ کو نصاریٰ
اَخَذْنَا مِیْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا	ان سے بھی لیا تھا ہم نے ان کا عہد، پھر بھول گئے وہ
بِهٖ فَاَغْرَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ	ایک فائدہ لینا اس نصیحت سے جو ان کو کی گئی، پھر ہم
اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ وَسَوْفَ یُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ	نے لگا دی آپس میں دشمنی اور کینہ قیامت کے دن
بِمَا كَانُوْا یَصْنَعُوْنَ (المائدہ ع ۳)	تک اور آخر جتا دے گا اللہ ان کو جو کچھ کرتے تھے۔

كانت بنو اسرائيل تسوسهم	بنی اسرائیل میں تمام سیاسی نظام انبیاء کے
الانبياء كلما هلك نبي خلفه	ہاتھ میں تھا جب ایک پیغمبر وفات پا جاتا تھا، دوسرا
نبي وانه لا نبي بعدي وسيكون	پیغمبر اس کی جگہ قائم مقام ہو جاتا تھا مگر میرے بعد کوئی
خلفاء فيكثرون قالوا فما تامرنا	نبی نہیں ہے۔ میرے بعد میرے خلفاء ہوں گے اور
قال فوا ببيعة الاول اعطوهم	بہت سے ہوں گے۔ لوگوں نے پوچھا۔ پھر ہم کو آپ
حقهم فان الله سائلهم عما	کیا حکم کرتے ہیں۔ فرمایا ترتیب وار ہر ایک کے عہد کو پورا کرو
استرعاهم	تم ان کے حق کو ادا کرو ان سے اللہ تعالیٰ رعیت کے
(متفق علیہ)	حقوق کے سوال کرے گا۔

پس سب سے آخر میں اسی نظام خداوندی کو مکمل طور پر لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آئے جو کہ نہایت صحیح اور صاف طور پر موجود ہے، اور وہی عالم انسانی کے لیے ہر قسم کی بہبودی کا (خواہ روحانی ہو یا مادی، اخروی ہو یا دنیاوی، شخصی ہو یا جماعتی، سیاسی ہو یا اقتصادی، بین الاقوامی ہو یا ایک ہی قوم کا) کفیل اور ضامن ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ	آج میں پورا دے چکا تم کو دین تمہارا اور
اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ	پورا کیا میں نے تم پر احسان اپنا اور پسند کیا میں نے
الْاِسْلَامَ دِيْنًا (سورۂ مائدہ ع ۱)	تمہارے واسطے دین مسلمانی۔

دوسرے مذاہب اگرچہ آسمانی ہونے کے دعوے دار ہیں مگر ان میں اس قدر تحریف اور تبدیل اور خود غرضی کے قوانین اور نفسانی چیزیں داخل ہو گئی ہیں کہ ان میں اصلی احکام کا پتہ چلانا بھی مشکل ہو گیا ہے، بہت سی چیزیں ضائع کر دی گئی ہیں اور بہت سی ان میں داخل کر دی گئی ہیں۔

نظام حق کی دعوت

بہر حال آج تمام دنیائے انسانی کو ہم دعوت دیتے ہیں کہ اگر وہ امن عام اور کامل ترقی اور حقیقی رفاہیت اور خوش حالی چاہتے ہیں تو صرف اسلامی نظام میں ہی پا سکتے ہیں۔ بالشویزم اور نازی ازم یا یورپ کا نیشنلزم، ڈیموکریسی یا اور کوئی نظام جو کہ انسانی عقل و دماغ کا اختراع کیا ہوا ہے ہرگز اس کی کفالت نہیں کر سکتا۔ نہ اس میں رب العلمین کے حقوق کی کفالت ہے نہ مخلوقات اور اقوام و افراد انسانی کے حقوق کی۔

کوئی نظام کیسا ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو جب تک اس پر مضبوطی سے عمل نہ کیا جائے اس وقت تک اس کے ثمرات و فوائد حاصل نہیں ہو سکتے۔ متقدمین امت محمدیہ نے اس نظام کو نہایت مضبوطی سے پکڑا تو اعلیٰ درجہ کے کامیاب ہوئے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ	وعدہ کیا اللہ تعالیٰ نے کہ جو لوگ تم میں سے
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ	ایمان لائے اور نیک کام کیے ضرور ان کو حاکم کریگا
فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ	ملک میں جیسا کہ ان سے اگلوں کو حاکم کیا تھا اور
وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ	جما دے گا ان کے لیے دین کو جس کو پسند کیا ہے اور
وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا	ان کو ان کے ڈر کے بدلے امن دے گا۔ میری بندگی
يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا (سورۂ نور ع ۷)	کریں گے۔ میرا شریک کسی کو نہ کریں گے۔

حسب وعدہ ان کو وہ کامیابی حاصل ہوئی جس کی نظیر دکھلانے سے تاریخ کے صفحات عاجز ہیں۔ مگر افسوس کہ

قرونِ اخیرہ میں ہم اس مکمل نظام پر عمل کرنے سے قاصر رہے۔ اسی کی وجہ سے امتِ محمدیہ فلاکتوں میں مبتلا ہوگئی۔

ذَالِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ	یہ اس وجہ سے ہوا کہ اللہ تعالیٰ بدلنے والا
مُغَيِّرًا نِعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى	نہیں ہے اس نعمت کو، جو دی تھی اس نے کسی قوم کو جب
قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا	تک وہ نہ بدل دیں اپنے دلوں کی بات کو یعنی جب
بِاَنْفُسِهِمْ	تک وہ اپنے اعتقاد اور نیت نہ بدلیں اس وقت تک
(سورۂ انفال ع ۸)	اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمت نہیں چھینی جاتی۔

اس لیے نہایت ضروری ہے کہ اس نظامِ خداوندی کو مضبوطی سے قائم کیا جائے اور اس پر عمل درآمد ہونے کی پوری جدوجہد کی جائے۔ ہر فرد و بشر کو اس کی طرف بلایا جائے اور ہر مسلمان اس کا حامل ہو۔

(بشکریہ "دارالعلوم" دیوبند)

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

(مولانا سید جلال الدین عمری)

گزشتہ صفحات میں ہم نے یہ بحث کی تھی کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اسی وقت فرض ہوتا ہے جب کہ انسان
س پر قادر ہو۔ اگر کسی میں اس کے ادا کرنے کی قدرت نہیں ہے تو یہ اس سے ساقط ہو جاتا ہے۔ علماء نے لکھا ہے
ہ عدم قدرت اور عجز کی ایک شکل عدم علم بھی ہے۔ جو شخص معروف ومنکر سے ناواقف ہے اس پر امر بالمعروف
ہی عن المنکر کی ذمہ داری بھی عائد نہیں ہوتی۔ علامہ عبدالقادر عودہ شہید فرماتے ہیں۔

ویلحق بالعجز الحسی العجز العلمی[1]	عجز حسی ہی کے حکم میں عجز علمی بھی داخل ہے۔

معروف ومنکر کے حدود بہت وسیع ہیں۔ اس میں دین کی ایسی تعلیمات بھی شامل ہیں جن کا جاننا ہر مسلمان کے لیے
ضروری ہے اور ایسے احکام بھی اس میں آتے ہیں جن کے سمجھنے کے لیے مجتہدانہ علم وبصیرت کی ضرورت ہے۔ جو
شخص جس حد تک معروف اور منکر سے واقف ہے اسی حد تک اس پر ان کا حکم دینا یا منع کرنا ضروری ہے۔ اگر وہ
پنی حد سے آگے بڑھ کر تبلیغ اور نقد واحتساب کرے گا تو ہو سکتا ہے کہ دین کی خدمت کے ارادے کے باوجود
س کو نقصان پہنچا جائے۔ اس لیے علماء نے صراحت کی ہے کہ جن چیزوں کا معروف یا منکر ہونا واضح ہے عوام کو
ان ہی کے بارے میں امر ونہی کرنا چاہیے۔ اجتہادی امور پر گفتگو کرنا اہل علم کا کام ہے۔ امام الحرمین فرماتے ہیں:

ان الحکم الشرعی اذا استوی	ایسا حکم شرعی جسے ہر خاص وعام جان سکتا
فی ادراکہ الخاص والعام ففیہ	ہے اس کے بارے میں عالم اور غیر عالم دونوں ہی امر
للعالم وغیر العالم الامر بالمعروف	بالمعروف ونہی عن المنکر کر سکتے ہیں لیکن اگر حکم کی
والنہی عن المنکر واذا اختص	نوعیت ایسی ہے کہ اس کا معلوم کرنا اجتہاد ہی سے ممکن

---

[1] التشریع الجنائی ص۴۹

من ترکہ بالاجتہاد فلیس للعوام فیہ امرونہی بل الامر فیہ موکول الی اھل الاجتہاد[1]

تو عوام کو اس کے بارے میں حکم دینے یا منع کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس میں معاملہ اہل اجتہاد کے سپرد ہے (وہ اپنے اجتہاد کے مطابق اس سلسلے میں اقدام کریں گے)

اسی بات کو امام نووی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

انما یامر وینھی من کان عالما بما یامر بہ وینھی عنہ وذالک یختلف باختلاف الشیئ فان کان من الواجبات الظاھرۃ والمحرمات المشھورۃ کالصلوۃ والصیام والزنا والخمر ونحوھا فکل المسلمین علماء بھا وان کان من دقائق الافعال والاقوال ومما یتعلق بالاجتہاد لم یکن للعوام مدخل فیہ ولا لھم انکارہ بل ذالک للعلماء[2]

امر بالمعروف ونہی عن المنکر وہی شخص کرے گا جو اس چیز کو جانتا ہو جس کا وہ حکم دے رہا ہو یا جس سے منع کر رہا ہے اور چیز کے اختلاف کے ساتھ یہ امر و نہی بھی مختلف ہوتا ہے۔ اگر وہ چیز کھلے ہوئے فرائض اور مشہور محرمات میں ہے جیسے نماز، روزہ، زنا، شراب وغیرہ تو تمام ہی مسلمان اس کو جانتے ہیں۔ لیکن اگر وہ اعمال و اقوال کی کوئی بارکی ہے اور اس کا تعلق اجتہاد سے ہے تو عوام کو اس میں دخل دینے کا حق نہیں ہے اور نہ ان کو اس پر نکیر کرنا چاہیے بلکہ یہ اہل علم کا کام ہے۔

امام غزالی نے صراحت کی ہے

العامی ینبغی لہ ان لا یحتسب الا فی الجلیات المعلومۃ[3]

عام آدمی کو صرف ان امور میں احتساب کرنا چاہیے جو بہت ہی واضح اور معلوم ہیں۔

پچھلے صفحات میں یہ بحث گزر چکی ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے نتیجے میں خوف ضرر موجود ہو تو اس کا وجوب باقی نہیں رہتا۔ امام غزالی نے اپنی کتاب احیاء علوم الدین میں ضرر کے مختلف پہلوؤں پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے۔ ہم یہاں ان کی بحث کا خلاصہ اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

"انسان اپنے لیے بھی اور اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے لیے بھی چار چیزیں چاہتا ہے۔ علم، صحت، دولت، ثروت اور جاہ و حیثیت۔ ان کے بارے میں اس کو دو باتیں ناگوار گزرتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان میں سے جو چیز حاصل

---

[1] شرح المقاصد ج ۲ ص ۲۸۱ [2] شرح مسلم جلد ۱ ص ۵ [3] احیاء علوم الدین جلد ۲ ص ۲۸۱

ہے وہ ختم ہو جائے۔ دوسری یہ کہ ان میں سے جس چیز کے مستقبل میں ملنے کی توقع ہے وہ ملنے سے رہ جائے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:۔

فرجع المکروہ الی قسمین	پس کروہ کی دو قسمیں ہوئیں۔ ان میں سے
احدھما خوف امتناع المنتظر وھذا	ایک یہ ہے کہ جس چیز کا انتظار ہے اس کے رک جانے
لا ینبغی ان یکون مرخصا فی ترک	کا خوف ہو لیکن اس کی وجہ سے امر بالمعروف و
الامر بالمعروف والنھی عن المنکر[1]	نہی عن المنکر کو چھوڑنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔

مثال کے طور پر ایک شاگرد اپنے استاذ پر اس لیے تنقید نہ کرے کہ وہ اس سے ناخوش ہوگا اور تعلیم نہ دے گا، یا کوئی مریض ڈاکٹر پر احتساب سے اس لیے گریز کرے کہ وہ اس کا علاج نہ کرے گا اور اس طرح جس صحت کا اسے انتظار ہے وہ حاصل نہ ہو سکے گی، یا آدمی حاکم وقت یا اپنے کسی محسن پر تنقید سے اس لیے خاموش رہے کہ وہ اس کی مالی اعانت بند کر دے گا۔ اسی طرح آدمی کو کسی سے اچھے مرتبہ و حیثیت کے ملنے کی توقع ہو اور وہ اس لیے اس پر احتساب نہ کرے کہ وہ حیثیت اسے حاصل نہ ہو سکے گی۔ ان مثالوں کے دینے کے بعد امام موصوف فرماتے ہیں:

ھذا کلہ لا یسقط وجوب	یہ سب چیزیں احتساب کے وجوب کو ختم نہیں
الحسبۃ لان ھذہ زیادات امتنعت	کرتیں۔ کیونکہ یہ اصل پر زائد چیزیں ہیں جو حاصل نہیں ہو سکی
وتسمیتنا امتناع حصول الزیادات	ہیں اور زائد چیزوں کے حاصل نہ ہونے کو ضرر کا نام
ضررا مجاز وانما الضرر الحقیقی	دینا مجاز ہے حقیقی ضرر تو یہ ہے کہ حاصل شدہ چیز فوت
فوات حاصل ولا یستثنی من ھذا	ہو جائے۔ اس قاعدے سے کوئی صورت مستثنیٰ نہیں
شیء الا ما تدعو الیہ الحاجۃ و	ہوگی۔ الا یہ کہ کوئی ضرورت اس کی داعی ہو اور اس
یکون فی فواتہ محذور یزید علی	کے فوت ہونے میں ایسا خوف ہو جو منکر پر سکوت کے
محذور السکوت علی المنکر[2]	خوف سے بڑا ہو۔

اس استثنائی شکل کی وضاحت بھی امام موصوف نے اوپر ہی کے مثالوں کے ذریعہ کی ہے۔ فرماتے ہیں:
"فرض کیجیے! ایک شخص دین کی بنیادی باتوں سے ناواقف ہے اور اس کے حدود میں صرف ایک عالم ہے جس سے وہ دین سیکھ سکتا ہے۔ ایسا شخص کسی کو منکر کا ارتکاب کرتے دیکھتا ہے اگر وہ اس پر احتساب کرے

[1] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۲۸۲ [2] ایضاً ص ۲۸۳، ۲۸۴

تو اسے یقین ہے کہ جس عالمِ دین سے وہ علم حاصل کر رہا ہے اسے وہ تعلیم دینے سے منع کر دے گا۔ اور اس کے حالات بھی ایسے نہیں ہیں کہ کسی دوسرے سے تعلیم پا سکے۔ اب ایک طرف دین کی بنیادی باتوں سے واقفیت بھی ضروری ہے اور دوسری طرف انکارِ منکر بھی ضروری ہے۔ اس حالت میں احتساب کا فرض انجام دینے والا منکر کی نوعیت اور علم کی ضرورت دونوں کو سامنے رکھ کر خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ اسے کون سی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ اگر منکر ایسا ہو کہ اس پر تنقید و احتساب کو علمِ دین پر مقدم ہونا چاہیے تو وہ اسے مقدم رکھے گا ورنہ علمِ دین کو ترجیح دے گا اور منکر پر سکوت اختیار کرے گا۔ یا ایک شخص بیمار ہے اور مرض کی نوعیت ایسی ہے کہ علاج میں ناخیر سے صحت کے زیادہ خراب ہونے بلکہ جان کے جانے کا خطرہ ہے اور اس وقت جو حکیم فراہم ہو سکتا ہے وہ کسی منکر کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اگر اس پر تنقید کی جائے تو اس بات کا یقین ہے کہ وہ علاج کے لیے آمادہ نہ ہوگا۔ ایسی صورت میں مریض کو حق ہے کہ اس پر نکیر نہ کرے۔ یا ایک شخص اس قدر کمزور ہے کہ نہ کما سکتا ہے اور نہ کسی سے مانگ کر زندگی گزار سکتا ہے اور نہ اس کے اندر خدا پر بہت زیادہ توکل ہے۔ اگر وہ کسی ایسے شخص کی غلط روش پر تنقید کرے جو اس کا خرچ برداشت کر رہا ہے تو اس کو یقین ہے کہ وہ خرچ دینا بند کر دے گا اور وہ یا تو حرام کھانے پر مجبور ہوگا یا مر جائے گا۔ ایسی صورت میں اسے اجازت ہے کہ اس کی غلط روش پر سکوت اختیار کرے۔ اسی طرح فرض کیجیے کوئی غنڈہ کسی کے پیچھے لگا ہوا ہے اور اس سے نجات پانے کی سوائے اس کے کوئی صورت نہیں ہے کہ کسی صاحبِ حیثیت آدمی کے ذریعے حاکمِ وقت سے شکایت کی جائے۔ لیکن صاحبِ حیثیت آدمی منکر میں مبتلا ہے۔ مثال کے طور پر وہ ریشم کا استعمال کرتا ہے۔ اگر اس کے اس استعمال پر تنقید کی جائے تو معلوم ہے کہ حاکم تک رسائی نہیں ہو سکے گی اور یہ غنڈہ جان لے لے گا۔ ایسی صورت میں انسان کو اجازت ہے کہ اس پر تنقید نہ کرے اور اپنی جان بچانے کی فکر کرے۔ ان مثالوں کے ذکر کے بعد امام غزالی فرماتے ہیں:۔

فهذه الامور كلها اذا ظهرت	پس یہ تمام امور جب بالکل ظاہر اور قوی ہوں تو
وقويت لم يبعد استثناؤها ولكن الامر	ان کا استثنا ہو سکتا ہے لیکن اس میں معاملہ احتساب
فيها منوط باجتهاد المحتسب حتى يستفتي	کرنے والے کے اجتہاد سے متعلق ہے۔ وہ اپنے دل
فيها قلبه ويزن احد المحذورين بالآخر	سے اس میں فتویٰ طلب کرے اور دونوں نقصانات کا
ويرجح بنظر الدين لا بموجب الهوى	ایک دوسرے سے موازنہ کرے اور حکمِ اسلام کی وجہ سے

والطبع فان رجح بموجب الدين سمي سكوته مداراة وان رجح بموجب الهوى سمي سكوته مداهنة وهذا امر باطن لا يطلع عليه الا بنظر دقيق ولكن الناقد بصير فحق على كل متدين فيه ان يراقب قلبه ويعلم ان الله تعالى مطلع على باعثه وصارفه انه الدين او الهوى وستجد كل نفس ما عملت من سوء او خير محضرا عند الله ولو في فلتة خاطر او لفتة ناظر من غير ظلم وجور فما الله بظلام للعبيد[1]

نقطۂ نظر سے ترجیح دے نہ کہ خواہش اور رجحانِ طبع۔ اگر وہ دین کے نقطۂ نظر سے سکوت کو ترجیح دے گا تو اس کو مدارات کہا جائے گا اور اگر خواہش کے مطابق اس کو ترجیح دے گا تو یہ مداہنت ہوگی۔ یہ باطن کا معاملہ ہے اس پر وہ گہری نظر ہی سے واقف ہو سکتا ہے لیکن جانچ بین کرنے والا بخوبی جانتا ہے۔ پس ہر دین دار کو چاہیے کہ اپنے دل کو دیکھے اور یہ سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے واقف ہے کہ اس کے اقدام کا باعث اور انکارِ منکر سے پھرنے والا سبب دین ہے یا خواہشِ نفس۔ جو کچھ بھی کرے خواہ وہ برائی ہو یا بھلائی اس کا بدلہ بغیر کسی ظلم و جور کے خدا کے نزدیک پائے گا۔ خواہ وہ دل کے اندر پیدا ہونے والی کھٹک ہو یا کسی دیکھنے والے کی نگاہ اس سے چوک گئی ہو۔ اللہ اپنے بندوں پر بالکل ظلم نہیں کرتا۔

اس کے بعد امام موصوف نے ضرر کی دوسری قسم سے بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

اما القسم الثاني وهو فوات الحاصل فهو مكروه ومعتبر في جواز السكوت في الامور الاربعة الا العلم[2]

دوسری قسم ہے حاصل شدہ چیز کا فوت ہو جانا پس یہ (ہر ایک کے لیے) ناپسندیدہ ہے۔ اور اوپر کی چاروں چیزوں میں اس کے اعتبار کیا جائے گا، سوائے علم کے۔

اس قاعدے سے علم کو مستثنیٰ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی شخص کسی سے اس کے علم کو نہیں چھین سکتا۔ انسان کے علم کو اگر نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے تو اس کی اپنی کوتاہی اور غفلت سے ہے کسی دوسرے میں اس کو نقصان پہنچانے کی طاقت نہیں ہے۔ اس لیے علم کے بارے میں یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ کوئی اسے ختم کر دے گا۔

[1] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۲۸۲ [2] ایضاً ص ۲۸۳

ہاں آدمی کی صحت کو کوئی چاہے تو نقصان پہنچا سکتا ہے بلکہ اسے قتل بھی کر سکتا ہے۔ اگر احتساب کے سلسلے میں اس کا خطرہ ہو تو احتساب کا فرض ساقط ہو جاتا ہے لیکن اس کا استحباب باقی رہتا ہے۔ اسی طرح احتساب سے انسان کے مال کو خطرہ لاحق ہو تو بھی اس کو اجازت ہے کہ احتساب کا فرض انجام نہ دے اور سکوت اختیار کرے لیکن اس صورت میں بھی اس کے لیے یہی پسندیدہ ہے کہ وہ اپنی دنیا کو قربان کر کے دین کی خدمت انجام دے۔ اس سلسلے میں امام غزالی ایک قاعدہ کلیہ یہ بیان فرماتے ہیں :۔

ولکل واحد من الضرب	مار پیٹ اور لوٹ مار ان میں سے ہر ایک میں
والنهب حد فی القلة لا یکترث به	ایک تو کمی کی حد ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاتا جیسے
کالحبة فی المال واللطمة الخفیفة	کہ مال میں ایک دانہ کی کمی آجائے یا ایسی تھپڑ لگ جائے
المها فی الضرب وحد فی الکثرة	جس کی تکلیف بہت ہی معمولی ہو۔ اور ایک حد کثرت
یتعین اعتباره ووسط یقع فی محل	کی ہوتی ہے جس کا اعتبار کرنا ضروری ہے اور ایک
الاشتباه والاجتهاد وعلی المتدین	درمیانی حالت ہے جو شبہ میں ڈالتی ہے اور جہاں
ان یجتهد فی ذالک	اجتہاد کی ضرورت پڑتی ہے۔ تو دین دار آدمی کے لیے
ویرجح جانب الدین ما	ضروری ہے کہ اس میں اجتہاد کرے اور امکان کی حد
امکن[1]	تک دین کے پہلو کو ترجیح دے۔

مرتبہ وحیثیت کے سلسلے میں دو باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ ایک یہ کہ احتساب سے اگر آدمی کی مروت ہی کے ختم ہونے کا خطرہ ہے تو ضرور اس کو اس بات کی اجازت ہو گی کہ وہ اس فرض کو انجام دے۔ مثلاً یہ کہ اس کا چہرہ کالا کر کے بازار میں گھمایا جائے۔ لیکن اگر اس سے آدمی کے محض اونچے مقام کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے تو اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص موٹر نشین ہے اور بغیر سواری کے گھر سے نکلنے کا عادی نہیں ہے۔ اگر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے نتیجے میں اس کو یہ اندیشہ ہے کہ اسے بغیر سواری کے باہر نکلنے اور پیدل چلنے پر مجبور ہونا پڑے گا تو یہ ایسی مجبوری نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض ساقط ہو جائے۔ اس صورت میں لازماً احتساب کرنا چاہیے۔ ان تفصیلات کے بیان کرنے کے بعد امام غزالیؒ فرماتے ہیں :۔

قد دلت العمومات علی تاکد	قرآن و حدیث کے الفاظ کا عموم بتاتا ہے کہ احتساب

[1] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۲۸۶

وجوب الحسبة وعظم الخطر فی السکوت عنها فلا یقابله الا ما عظم فی الدین خطره والمال والنفس والمروة فقد ظهر فی الشرع خطرها فاما مزایا الجاه والحشمة ودرجات التجمل وطلب ثناء الخلق فکل ذالک لا خطر له[1]	کا وجوب مؤکد ہو اور اس سے سکوت اختیار کرنے میں بڑا خطرہ ہے۔ بس اس کا مقابلہ وہی چیز کر سکتی ہو جس کا نقصان بھی دین کی نظر میں بڑا ہو۔ جہاں تک مال، جان اور مروت کا تعلق ہے اس کا مرتبہ شریعت میں واضح ہو باقی جاہ وحشمت کے فضائل اور زیب و زینت کے درجات اور مخلوق سے تعریف کا چاہنا تو ان سب چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے سلسلے میں دوسروں کی تنقید، ناگواری اور ملامت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس لیے ان سب سے بے نیاز ہوکر انسان کو یہ فرض ادا کرنا چاہیے۔ جو لوگ خدا سے محبت کرتے ہیں اور جن سے خدا محبت کرتا ہے۔ قرآن نے ان کے بارے میں کہا ہے :۔

یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ (المائدہ: ۵۴)	وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔

حافظ ابن کثیرؒ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں :۔

ای لا یردهم عما هم فیه من طاعة الله واقامة الحدود وقتال اعدائه والامر بالمعروف والنهی عن المنکر لا یردهم عن ذالک راد ولا یصدهم عنه صاد ولا یحیك فیهم لوم لائم ولا عذل عاذل[2]	یعنی ان کی حالت یہ ہے کہ وہ خدا کی اطاعت کرتے ہیں، اس کے حدود قائم کرتے ہیں، اس کے دشمنوں سے جنگ کرتے ہیں، معروف کا حکم دیتے اور منکر سے روکتے ہیں۔ اس حالت سے ان کو نہ کوئی پھیرنے والا پھیر سکتا ہے اور نہ کوئی روکنے والا روک سکتا ہے۔ نہ ان پر کسی ملامت گر کی ملامت اثر انداز ہوتی ہے اور نہ کسی غصہ کرنے والے کا غصہ۔

حضرت عبادہ بن صامتؓ کی روایت ہے :۔

بایعنا رسول الله صلی الله علیه وسلم	ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی

[1] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۳۰۲ [2] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۷۱

......علی ان نقول بالحق اینما کنا لا نخاف فی اللہ لومۃ لائم[1]

تھی ......کہ ہم جہاں کہیں بھی ہوں گے حق کہیں گے اور اللہ کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔

اس روایت کی تائید ایک دوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے حضرت ابو ذرؓ فرماتے ہیں:۔

اوصانی خلیلی صلی اللہ علیہ وسلم بخصال من الخیر اوصانی ان لا اخاف فی اللہ لومۃ لائم واوصانی ان اقول الحق وان کان مرًّا[2]

میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے چند امورِ خیر کی وصیت کی ہے مجھے نصیحت کی کہ خدا کے بارے میں (کہتے ہوئے) کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈروں اور مجھے نصیحت کی کہ حق بات کہوں خواہ وہ کڑوی ہی کیوں نہ لگے۔

علامہ قرطبیؒ نے لکھا ہے:۔

اجمع المسلمون فی ماذکر ابن عبد البران المنکر واجب تغییرہ علی کل من قدر علیہ وانہ اذا لم یلحقہ بتغییرہ الا اللوم الذی لا یتعدی الی الاذی فان ذالک لا ینبغی ان یمنعہ من تغییرہ[3]

ابن عبد البر کے بیان کے مطابق مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ تغییر منکر ہر اس شخص پر واجب ہے جو اس کی قدرت رکھتا ہو جبکہ منکر کی تغییر سے اس کو صرف ملامت لاحق ہو جو تکلیف کی حد تک نہ پہنچ جائے۔ کیونکہ اتنی سی چیز کو تغییر منکر کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں:۔

ولو ترکت الحسبۃ بلوم لائم او باغتیاب فاسق او شتمہ او تعنیفہ او سقوط المنزلۃ عن قلبہ

اگر کسی ملامت گر کی ملامت، یا کسی فاسق کی غیبت یا سب و شتم یا درشت کلامی یا اس کے دل سے یا اس جیسے دوسرے افراد کے دل سے اپنے مرتبے کا

[1] بخاری کتاب الاحکام۔ باب کیف یبایع الامام الناس۔ مسلم کتاب الامارۃ، باب وجوب طاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ و تحریمہا فی المعصیۃ۔ [2] رواہ ابن حبان فی صحیحہ (الترغیب والترہیب جلد ۳ صفحہ ...)

[3] الجامع لاحکام القرآن ج ۴ ص ۴۸

او قلب امثالہ لم یکن للحسبۃ وجوب اصلا اذ لا تنفك الحسبۃ عنہ ۱؎	گرجانا یہ سب ایسی چیزیں ہیں کہ ان کی وجہ سے احتساب کو چھوڑ دیا جائے تو کبھی احتساب واجب ہی نہ ہوگا کیونکہ احتساب ان سے جدا نہیں ہوتا ہے۔

ضرر کی ایک شکل یہ ہے کہ جو شخص احتساب کا فرض انجام دے رہا ہے اس کو تو کسی نقصان کا خطرہ نہیں ہے، بلکہ احتساب کی وجہ سے اس کے عزیز واقارب اور دوست واحباب کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ یہ اندیشہ جانی یا مالی ہے تو اسے احتساب نہیں کرنا چاہیے کیونکہ جس طرح منکر پر خاموش رہنا ممنوع ہے۔ اسی طرح کسی مسلمان کو تکلیف دینا بھی ممنوع ہے۔ لیکن اگر اس سے ان کی جان ومال کو تو خطرہ نہ ہو البتہ ان کے بارے میں بدزبانی اور بدکلامی ہو سکتی ہو تو دیکھا جائے گا کہ منکر کس درجہ کا ہے اور بدکلامی سے پہنچنے والی تکلیف کی مقدار کیا ہے۔ پھر اسی کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۲؎

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض ان تمام حالات میں ساقط ہو جاتا ہے جبکہ انسان اس کے ادا کرنے سے عاجز ہو، خواہ یہ عجز، عجز حسی ہو یا عجز علمی۔ یہ خوف ضرر کے تحت پیدا ہو یا عدم افادیت کے احساس کے تحت لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ عجز کے ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کس بنیاد پر کیا جائے۔ اس کے لیے محض ظن غالب کافی ہے یا اس کا قطعی اور یقینی علم ہونا ضروری ہے۔ امام غزالیؒ نے خوف ضرر پر گفتگو کرتے ہوئے اس سوال سے بھی بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں:-

ان غلب على الظن انہ يصاب لم يجب وان غلب انہ لا يصاب وجب ومجرد التجويز لا يسقط الوجوب فان ذالك ممكن في كل حسبة ۳؎	اگر کسی کو اس بات کا ظن غالب حاصل ہو کہ احتساب کی وجہ سے اس کو تکلیف پہنچائی جائے گی تو اس کے لیے احتساب کرنا ضروری نہیں ہوا اور اس کو یہ گمان غالب ہو کہ تکلیف نہیں پہنچائی جائے گی تو احتساب ضروری ہوگا محض تجویز یا خیال وجوب کو ساقط نہیں کرتا کیونکہ اس کا امکان تو ہر احتساب میں موجود ہے

اسی بحث میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ احتساب کا وجوب اسی وقت ساقط ہوگا جب کہ آدمی کو ضرر کا 'علم' ہو اور پھر علم کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:-

۱؎ احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۲۸۰ ۲؎ ایضاً ۳؎ ایضاً ص ۲۸۲-۲۸۱

اعنی بالعلم الظن الذی یجوز بمثلہ ترک استعمال الماء والعدول الی التیمم فاذا انتہی الی ھذا الحد لم یبعد ان یرخص فی ترک الحسبۃ[1]

علم سے مراد میرے نزدیک ایسا ظن اور گمان ہے کہ اس جیسے قیاس پر پانی کے استعمال کو چھوڑ کر تیمم کرنا جائز ہوتا ہے۔ جب قیاس اس حد کو پہنچ جائے تو بعید نہیں کہ ترک احتساب کی اجازت دی جائے

یہاں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض آدمی قوت کے ذریعہ ادا کرنا چاہے یا زبان کے ذریعے دونوں حالتوں میں عدم قدرت کا امکان پایا جاتا ہے۔ اس لیے یہ فرض بھی دونوں ہی حالتوں میں ساقط ہو جاتا ہے۔

چنانچہ علامہ ابوبکر جصاص کہتے ہیں:۔

وھی علی منازل اولھا تغییرہ بالید اذا اَمکنَ فانْ لم یُمکِن وکان فی نفیہ خائفا علی نفسہ اذا انکرہ بیدہ فعلیہ انکارہ بلسانہ فان تعذر ذالک لما وصفنا فعلیہ انکارہ بقلبہ[2]

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے چند درجات ہیں۔ ان میں سے پہلا درجہ ہے تغییر بالید بشرطیکہ اس کا امکان ہو لیکن اگر وہ ممکن نہ ہو اور ہاتھ سے منکر کے مٹانے میں اپنی جان کا اس کو خوف ہو تو اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ زبان سے اس پر نکیر کرے۔ لیکن اگر اسی خوف کی وجہ سے یہ بھی اس کے لیے دشوار ہو تو اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ اپنے دل ہی سے اس پر نکیر کرے۔

قاضی عیاض نے اس سے زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ لکھا ہے:۔

ان غلب علی ظنہ ان تغییرہ بیدہ یسبب منکرا اشد من قتلہ او قتل غیرہ بسبب کف یدہ واقتصر علی القول باللسان والوعظ والتخویف فان خاف

اگر آدمی کو اس بات کا ظن غالب ہو کہ ہاتھ سے اس کا منکر کو مٹانا کسی اس سے بڑے منکر کا سبب بن جائے گا مثلاً خود اسی کا قتل یا اس کے بجائے اس کی وجہ سے کسی دوسرے کا قتل تو اپنا ہاتھ روک لے گا اور زبان سے وعظ و تخویف پر اکتفا کرے گا۔

[1] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۳۰۹ [2] احکام القرآن ج ۲ ص ۳۵

ان یسبب قولہ مثل ذالک فبقلبہ وجاز فی سعة[1]	لیکن اگر خوف ہو کہ اس کا قول بھی اسی طرح منکر کا سبب بنے گا تو اپنے دل سے منکر کو جانے گا اور اس کو اسی کی اجازت ہوگی۔

علامہ مناوی تغییر منکر سے متعلق ایک حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:۔

فان لم یستطع الانکار بیدہ بان ظن لحوق ضرر بہ فبلسانہ ای بالقول کاستغاثة او توبیخ او اغلاظ بشرطہ فان لم یستطع ذالک لوجود مانع کخوف فتنة او خوف علی نفس او عضو او مال فبقلبہ[2]	اگر آدمی کو اپنے ہاتھ سے انکار منکر کی استطاعت نہ ہو مثلاً اسے یہ خیال ہو کہ اس سے اس کو ضرر لاحق ہوگا تو اپنی زبان یعنی قول سے منکر پر نکیر کرے مثلاً منکر کے خلاف مدد طلب کرے یا دھمکی دے یا سختی کرے اس کے شرائط کے ساتھ۔ اگر اس کی بھی کسی کاوٹ کی وجہ سے استطاعت نہ ہو جیسے فتنہ کا خوف ہو یا کسی عضو جسم یا مال کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو تو اپنے دل سے منکر پر نکیر کرے۔

جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، حدیث میں تغییر منکر کی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ تغییر بالید، تغییر باللسان اور تغییر بالقلب۔ پہلی دو صورتوں پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ تغییر بالقلب کے معنی ہیں دل سے منکر کو منکر سمجھنا اور اس سے نفرت کرنا۔ یہ صورت آدمی اسی وقت اختیار کر سکتا ہے جب کہ پہلی دونوں صورتیں اس کے امکان میں نہ ہوں۔ لیکن اگر وہ ہاتھ یا زبان سے منکر کے مٹانے کی طاقت رکھتا ہے تو محض دل سے منکر کو منکر سمجھ کر تغییر منکر کے فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ علامہ قرطبی نے ابن عبدالبر کے حوالے سے اس معاملے میں مسلمانوں کا اجماع نقل کیا ہے کہ

اذا انکر بقلبہ فقد ادی ما علیہ اذا لم یستطع علیہ سوی ذالک[3]	جب کوئی شخص اپنے دل سے انکار منکر کر دے تو اس نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی بشرطیکہ وہ اس سلسلے میں اس کے علاوہ کسی دوسری صورت کی طاقت نہ رکھتا ہو۔

ایک مومن ایسے حالات سے دوچار ہو سکتا ہے جن میں وہ نہ تو عملاً منکر کو مٹا سکے اور نہ اس کے خلاف اپنی زبان استعمال کر سکے لیکن منکر سے نفرت تو ہر حال میں اس کے اندر ہونی چاہیے۔ تغییر منکر کا یہ بالکل آخری درجہ ہے۔

---

[1] شرح مسلم للنووی ص ۱ [2] التیسیر شرح الجامع الصغیر ج ۲ ص ۱۸ [3] الجامع لاحکام القرآن ج ۴ ص ۴

اس کے بعد کوئی درجہ نہیں ہے۔ اگر کسی دل میں برائی سے نفرت اور بیزاری بھی نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سے ایمان کی حرارت ختم ہوگئی۔ اسی وجہ سے ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے

ولیس وراء ذالک من الایمان حبۃ خردل[1] (تغییر بالقلب بھی نہیں ہے تو) اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں رہتا۔

جو شخص بدی اور معصیت سے نفرت کرے گا اور یہ نفرت رسمی نہیں بلکہ حقیقی ہوگی تو وہ ان لوگوں سے دور بھی رہے گا جو اس میں آلودہ ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آدمی کے دل میں کسی کی روش کے خلاف شدید جذبات موجود ہوں اور اس کا اظہار تعلقات میں نہ ہونے پائے۔ اس لیے تغییر بالقلب کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ صحبت بد سے دوری اختیار کی جائے۔ علامہ ابوبکر جصاص لکھتے ہیں۔

وسعہ السکوت عنہم بعد ان یجانبہم ویظہر ہجرانہم[2] (اگر وہ تغییر منکر پر قادر نہیں ہے تو) غلط کاروں سے دور رہنے اور اپنی دوری کا اظہار کرنے کے بعد اس کے لیے سکوت کی گنجائش ہے۔

یہی نہیں بلکہ مومن کے ایمان کا تقاضا ہے کہ اگر وہ کسی منکر کے مٹانے پر قادر نہیں ہے تو اپنی اس بے بسی پر مطمئن نہ ہو جائے بلکہ اس کے دل میں یہ تمنا اور آرزو پرورش پاتی رہے کہ کاش مجھے طاقت حاصل ہوتی اور یہ منکر میرے ہاتھوں ختم ہوتا۔ مجبور ہو کر منکر کو برداشت کرنے کا جذبہ اس کے اندر نہ ابھرے بلکہ اس کے سینے میں یہ عزم اور ارادہ جاگتا رہے کہ جب بھی اسے اس منکر کو مٹانے کی طاقت حاصل ہوگی وہ اس کو مٹا کے رہے گا۔ تغییر بالقلب کے بارے میں علامہ مناوی کہتے ہیں۔

یکرہہ بہ ویعزم انہ لو قدر فعل[3] منکر کو اپنے دل سے ناپسند کرے گا اور یہ عزم کرے گا کہ اگر وہ تغییر منکر پر قادر ہوگا تو فوراً اس کو مٹائے گا۔

---

[1] مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون النہی عن المنکر من الایمان الخ [2] احکام القرآن ج ۲ ص ۳۰
[3] التیسیر شرح الجامع الصغیر ج ۲ ص ۔۔۔

رسالت

(۲)

(مولانا محمد یوسف اصلاحی)

دین میں رسول کا مقام

وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا

اور خدا کے رسول تمہیں جو حکم دیں اس کو قبول کرو اور جس چیز سے روکیں اس سے رک جاؤ۔

دین میں رسول کا حکم ہی فیصلہ کن ہے۔ مومن کا کام یہ ہے کہ رسول جس بات کا حکم دیں دل وجان سے اسے بجالائے اور جس بات سے روکیں اس سے باز آجائے۔

اسوۂ حسنہ

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (الاحزاب ۲۱)

بلاشبہ رسول اللہ کی زندگی میں تمہارے لیے پیروی کا بہترین نمونہ ہے

اطاعت رسول

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (الحجرات ۱)

مومنو! اللہ اور اس کے رسول سے پیش قدمی نہ کرو۔ اور اللہ کا خوف رکھو۔ بلاشبہ وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔

اللہ اور رسول سے پیش قدمی نہ کرو۔ یعنی اپنی خواہش، عقل اور رائے کو خدا اور رسول کے احکام پر مقدم نہ رکھو۔ رسول کے پیچھے پیچھے چلو۔ اور رسول جو حکم دیں خوش دلی کے ساتھ اس کی پوری پوری اطاعت کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ۔ "تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کی خواہشات اس تعلیم و ہدایت کے تابع نہ ہوجائے جو میں لے کر آیا ہوں۔"

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْہُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (الانفال ۲۰)

ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور حکم سننے کے بعد اس سے سرتابی نہ کرو۔

احکامِ رسول سے سرتابی نفاق ہے

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا

اور جب ان (منافقوں) سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ نے نازل کیا ہے اور آؤ رسول کی طرف تو تم دیکھتے ہو کہ منافقین کترا جاتے ہیں۔

اطاعتِ رسول معیارِ ایمان

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝

آپ کے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ یہ اپنے باہمی اختلافات میں آپ کو فیصلہ کن نہ مان لیں، پھر آپ جو فیصلہ کریں اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ خوش دلی سے تسلیم کر لیں۔

اتباعِ رسول

قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

(آل عمران: ۳۱)

اے رسول! لوگوں سے کہہ دیجیے اگر تم واقعی خدا سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اللہ تمہیں اپنا پیارا بنائے گا۔ تمہاری خطائیں معاف فرما دے گا۔ وہ بہت ہی معاف فرمانے والا اور بڑا ہی مہربان ہے۔

ادب و عظمتِ رسول

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِندَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ لَهُم مَّغْفِرَةٌ

مسلمانو! تم اپنی آوازیں رسولِ خدا کی آواز سے اونچی نہ کرو۔ اور نہ ان سے بہت زور سے بات چیت کرو جیسا کہ تم آپس میں کرتے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ اس گستاخی کی وجہ سے تمہارے کیے کرائے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ رسولِ خدا کے حضور دبی آواز سے بولتے ہیں ان کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ (کی تخم ریزی) کے لیے پرکھ لیا ہے ان کے لیے بخشش اور اجرِ عظیم ہے ـــــ بلاشبہ جو لوگ

وَاَجْرٌ عَظِیْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَیْهِمْ لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ (الحجرات: ۲-۵)

آپ کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جن کو ذرا عقل و تمیز نہیں۔ اور اگر وہ صبر کرتے رہتے یہاں تک کہ آپ خود نکل کر ان کے پاس آتے تو یہ ان کے حق میں بہت بہتر ہوتا اور اللہ بہت ہی معاف کرنے والا اور انتہائی رحیم ہے۔

محبتِ رسول

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (الاحزاب ۶)

نبی مسلمانوں کے لیے ان کی اپنی جانوں سے مقدم ہیں۔

نبی کی بے مثل شفقت و رحمت اور بے پایاں احسان کا تقاضا یہی ہے کہ مومنین خدا کے رسول کو نہ صرف اپنے ماں باپ، اولاد اور عزیز و اقارب سے زیادہ عزیز رکھیں بلکہ خود اپنی جانوں سے بھی زیادہ عزیز رکھیں۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا: "کوئی شخص تم میں سے مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے لیے اس کے ماں باپ، اولاد اور دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں"[1]

درود و سلام

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِیِّ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۝ (الاحزاب: ۵۶)

اللہ اور اس کے فرشتے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر درود بھیجتے ہیں۔ مومنو! تم بھی ان پر درود و سلام بھیجو۔

خدا کے درود بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ کی تعریف فرماتا ہے اور آپ پر رحمتوں کی بارش کرتا ہے۔ فرشتوں کے درود بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ سے گہری محبت رکھتے ہیں اور آپ کے درجات بلند کرنے کی دعا کرتے رہتے ہیں۔ مومنوں کے درود و سلام بھیجنے کے معنی یہ ہیں کہ مومن نبی سے والہانہ محبت رکھو، ان کی مدح و ثنا کرو اور ان کے لیے سلامتی کی دعائیں کرو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "جو مجھ پر ایک بار درود بھیجتا ہے خدا اس پر دس بار درود بھیجتا ہے"۔ ایک موقع پر آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "قیامت کے روز میرے ساتھ رہنے کا سب سے زیادہ مستحق وہ ہوگا جو مجھ پر سب سے زیادہ درود بھیجے گا۔"

نصرتِ رسول

فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ

پس جو لوگ اس پر ایمان لائیں اس کی نصرت و حمایت کریں اور اس روشنی کی پیروی کریں جو اس کے

[1] بخاری، مسلم

الَّذِیْ اُنْزِلَ مَعَہٗ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (اعراف ۱۵۷)

ساتھ اتاری گئی ہے، وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

رسول سے مراد آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُعَزِّرُوْہُ وَ تُوَقِّرُوْہُ (الفتح)

ہم نے آپ کو بھیجا شہادت دینے والا بنا کر راست روی پر بشارت دینے والا، کجروی پر انجام بد سے ڈرانے والا بنا کر تاکہ لوگو! تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کی مدد وحمایت کرو اور اس کی عزت توقیر کرو۔

رسول کی نصرت وحمایت یہ ہے کہ رسول کے لائے ہوئے دین کو عام کیا جائے۔ افراد اور سوسائٹی کی عملی زندگی میں اسے نافذ کیا جائے۔

وَاُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ وَمَنْ بَلَغَ

اور یہ قرآن وحی کے ذریعے میری طرف بھیجا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعے تمہیں (بے دینی اور بد دینی کے انجام بد سے) ڈراؤں اور وہ لوگ بھی جن تک یہ قرآن پہنچے۔

یعنی جن لوگوں تک قرآن پہنچے وہ بھی اسی فریضے کو انجام دیں جو میں انجام دے رہا ہوں۔

رسول پر ایمان لانے والوں کا کردار

اَفَمَنْ یَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ الْحَقُّ کَمَنْ ھُوَ اَعْمٰی اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ اَلَّذِیْنَ یُوْفُوْنَ بِعَھْدِ اللّٰہِ وَلَا یَنْقُضُوْنَ الْمِیْثَاقَ وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَیَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ وَیَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ وَالَّذِیْنَ

تو کیا وہ شخص جو یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ کتاب حق ہے جو آپ کی رب کی طرف سے آپ کے پاس آئی ہے اور وہ شخص جو اس حقیقت کی طرف سے اندھا ہے — دونوں یکساں ہو جائیں۔ نصیحت تو وہی قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ سے کیے ہوئے عہد ازل کو پورا کرتے ہیں۔ اسے مضبوط باندھنے کے بعد توڑ نہیں ڈالتے۔ اور اللہ نے جن رشتوں کو جوڑنے کا حکم دیا ہے انہیں جوڑے رکھتے ہیں۔ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے

صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ
وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْفَقُوا مِمَّا
رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُونَ
بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ
عُقْبَى الدَّارِ ۝ (الرعد: ۱۹-۲۲)

بری طرح حساب لیا جائے۔ اور وہ خدا کی رضا کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔ آخرت کا گھر ان ہی لوگوں کے لیے ہے۔

رسول کی تعلیم وہدایت کے حق ہونے کی ایک بصیرت افروز دلیل ان لوگوں کا پاکیزہ کردار ہے جو رسول پر ایمان لائے۔ کیا یہ پاکیزہ کردار کسی جھوٹے دین سے بھی بن سکتا ہے۔ پھر جب دنیا میں مومن اور منکر کا کردار یکساں نہیں ہے تو بھلا یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ آخرت میں دونوں کا انجام یکساں ہو جائے۔

آخری رسول پر ایمان شرطِ نجات

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ
أُوتُوا الْكِتٰبَ
اٰمِنُوا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ
مِّنْ قَبْلِ أَنْ نَّطْمِسَ وُجُوهًا
فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى أَدْبَارِهَا أَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا
لَعَنَّا أَصْحٰبَ السَّبْتِ (النساء: ۴۷)

اے وہ لوگو! جنہیں آسمانی کتاب دی گئی تھی، ایمان لاؤ اس کتاب پر جو ہم نے اب نازل کی ہے اور جو اس کتاب کی تصدیق وتائید کرتی ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود تھی ـــــ اس سے پہلے کہ ہم چہرے بگاڑ کر پیچھے پھیر دیں یا ان پر اسی طرح لعنت کریں جس طرح ہم نے سبت والوں پر لعنت کی تھی۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ آخری رسول پر ایمان لائے بغیر نہ کسی کا ایمان معتبر ہے اور نہ نجات کی توقع ہے۔ اسی لیے اہل کتاب سے یہ نہیں کہا گیا کہ تورات کی تعلیم پر مضبوطی سے جمے رہو بلکہ کہا گیا کہ آخری رسول کی لائی ہوئی آسمانی کتاب پر ایمان لاؤ، ورنہ ہدایت سے محروم رہو گے اور سخت ترین سزا پاؤ گے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے۔ اس امت میں جس کسی شخص تک خواہ وہ یہودی ہو یا نصرانی (یا کچھ اور) میری نبوت کا پیغام پہنچا اور اس کے باوجود وہ میرے دین پر ایمان لائے بغیر مر گیا وہ دوزخی ہوگا۔" (مسلم)

منکرینِ رسالت کا بدترین انجام

إِنَّ الَّذِينَ
كَفَرُوا بِاٰيٰتِنَا
سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا كُلَّمَا نَضِجَتْ

بلاشبہ جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کر دیا ہے انہیں یقیناً ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال

جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ (النساء: ۵۶)

گل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے تاکہ وہ خوب خوب عذاب کا مزہ چکھ لیں۔ یہ حقیقت ہے، اللہ اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کے لیے بڑی قدرت اور حکمت رکھتا ہے۔

اطاعتِ رسول کا انعام

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰۗىِٕكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰۗىِٕكَ رَفِيْقًا ۝ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ۝ (النساء: ۶۹-۷۰)

اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء، صدیقین، اور شہداء اور صالحین اور کیا ہی خوب ہے ان لوگوں کی رفاقت۔ یہ ہے حقیقی فضل جو اللہ کی طرف سے ملتا ہے۔ اور حقیقت حال جاننے کے لیے اللہ ہی کا علم کافی ہے۔

صدیق وہ مومن ہے جس کے قول و عمل اور سیرت و کردار میں کامل اخلاص اور سچائی ہو۔ رسول کی اطاعت میں زندگی گزارنے والے کی اس سے بڑی خوش نصیبی اور سعادت اور کیا ہوگی کہ اسے ایسے لوگوں کی رفاقت اور معیت نصیب ہوگی۔

آخرت اور اُس کے حریف عقائد

(۳)

(جناب سلطان مبین صاحب ایم اے)

سلسلۂ منتر اور مابعد الطبیعیات

اس بات کو ماننے کے لیے دلیل موجود ہے کہ اہل وید اپنے مُردوں کو زمین میں دفن کرتے تھے۔ مگر چونکہ ان کا مذہب تمام تر یگیہ (آتشیں قربانیوں) پر مشتمل تھا سوختنی قربانیوں کا اصل اصول یہ ہے کہ آگ نذر کو دیوتاؤں تک پہنچاتی ہے۔ نذر کو جلا کر خاکستر نہیں کرتی۔ آگ دیوتاؤں کو بلاتی ہے اور دیوتاؤں کو نذرگاہ تک لاتی ہے۔ فی الجملہ آگ نذر کی دیوتاؤں تک باربردار ہے۔ آگ میں ڈالا ہوا گھی اور کلیجہ جل کر راکھ نہیں ہوتا۔ بلکہ سارے دیوتاؤں کی غذا بن جاتا ہے۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ آگ میں جلا ہوا مردہ جل کر راکھ ہو جائے۔ آخر اس مردے کو دیوتاؤں تک پہنچنے میں کون سی چیز مانع ہے۔ جب اگنی نہایت واضح طور پر ان صفات سے متصف تھا تو دفن کی جگہ حرق اس لیے مقبول ہو گیا کہ اس طرح مردہ عالم بالا میں بے چون و چرا پہنچ جاتا ہے۔ عورتیں اپنے شوہر کے ساتھ جلائی جاتی تھیں اس کا فقط یہی سبب تھا کہ اس دنیا میں بھی جوڑا بنا رہے اور شوہر کو وہاں تنہائی کی وحشت نہ رہے۔ ہر چند کہ یہ سیدھا سادھا عقیدہ ابتدائی (Primative) عقیدہ ہے اور رصد در رصد ویدوں سے اسی عقیدے کی تائید ہوتی ہے مگر تلبیس و اخفا کی وجہ سے آج یہ دعویٰ ہی سرے سے اجنبی معلوم ہوگا۔ ذیل میں تلقین و تدفین و تحریق کے منتر دیے جاتے ہیں جن سے واضح ہوگا کہ ویدک رشی تناسخ کے عقیدے سے بہر صورت ناواقف تھے وہ بس اتنی بات جانتے تھے کہ مرے ہوئے انسان 'پتری لوک' 'عالم اجداد' کو جاتے ہیں اور 'پتری راج' ملک الاموات کے یہاں گھی اور شہد کی نہروں سے سیراب ہوتے ہیں' یا ان کو اسفل السافلین کی تاریکیوں میں گرفتار رہنا پڑتا ہے۔

تلقین موتی کے منتر (۱) کچھ (پتروں) کے لیے سوم چھانا جاتا ہے کچھ گھی کے پاس بیٹھتے ہیں جن کے لیے شہد

بہتا ہے۔ ان کے پاس تو (مرض الموت) بھی چلا جا۔ (۲) جو ریاضت (تپ) کے سبب لازوال ہیں، جو تپ کے باعث بہشت کو چلے گئے ہیں۔ جنھوں نے بڑا تپ کیا ہے۔ ان کے پاس تو بھی چلا جا۔ (۳) جو سورما لڑائیوں میں لڑتے ہیں یا جو مارے جاتے ہیں یا جو ہزاروں (دینار) نذرانہ دے ڈالتے ہیں ان کے پاس تو بھی چلا جا۔ (۴) جو اولین حق پرست، اہلِ حق، حق افزا، ریاضت والے پتر (اجداد) ہیں۔ یم (فرشتہ مرگ) تو بھی ان کے پاس چلا جا۔

(رگ وید:- ۱۰:۱۵۴:۱—۵ (پوراسوکت)

تدفین کے منتر شارحین وید ذیل کے منتروں کو جلی ہوئی ہڈیوں کے گاڑے جانے سے متعلق بتلاتے ہیں۔ مگر ان منتروں کا لفظ لفظ بول رہا ہے کہ یہ تدفین میت کے وقت پڑھے جاتے تھے۔ یہاں جب تحریق میت مقبول نظریہ ہوگیا تو ان منتروں کو ثانوی طور پر ہڈیوں کی راکھ کو گاڑنے کے وقت پڑھا جانے لگا۔

۱۰۔ (اے مردہ) اس مہربان، وسیع، عریض، مادرگیتی کے دامن میں چلا جا۔ دوشیزہ (پرتھوی) نذرانہ گزارنے والے کے لیے اون کی طرح ملائم ہے۔ یہ تم (مردہ) کو ہلاکت سے محفوظ رکھے۔

۱۱۔ پرتھوی! اوپر ابھری رہ، نیچے مت دب۔ اس (میت) کے لیے تو خوب قربت و خوب رسائی بخش۔ زمین اس کو دامن میں ڈھک لے جس طرح ماں بچے کو (ڈھک لیتی ہے)

۱۲۔ ابھری ہوئی زمین اچھی طرح جمی رہے۔ ہزاروں ڈھیلے ٹھہرے رہیں۔ یہ (ڈھیلے) روغن بیز ہو جائیں۔ ہمیشہ کے لیے یہاں میت کی پناہ گاہیں ہو جائیں۔

۱۳۔ میں تمہارے اوپر زمین کو اٹھائے دیتا ہوں۔ تمہارے اوپر اس ڈھیلے کو رکھے دیتا ہوں۔ میں کلیفت نہیں پہنچاتا ہوں۔ اس ستون (قبہ) کو بزرگ (پتر) لوگ قائم رکھیں۔ یم تمہارے لیے یہاں اقامت گاہ تعمیر کرے۔

(رگ وید: ۱۰:۱۸:۱۰—۱۳)

ماں کے نرم و نازک آنچل کے زیر سایہ ہونا۔ گھی برسانے والے گھر ہمیشہ کی اقامت گاہ عالم برزخ کی باتیں ہیں یا تناسخ کی طرف اشارہ و کنایہ ہیں۔

تحریق کے منتر میت کو آگ سے اس لیے جلاتے تھے کہ وہ آگ کی وساطت و وکالت سے عالم بالا کو پہنچ سکے۔ گلنے سڑنے سے محفوظ رکھنے کے لیے ہرگز ہرگز لاش کو جلایا نہیں جاتا تھا۔ بظاہر جلانے کا رواج تناسخ کا موید معلوم ہے کہ جب روح دوسرے جسم میں داخل ہوگئی تو یہ جسم بیکار محض ہے۔ اس کو جلد از جلد نیست و نابود کر دینا اچھا ہے اور فوری نیستی جلانے ہی سے ممکن ہے۔ مگر جلانے کے وقت استعمال ہونے والے منتر اس نکتہ لطیف کی

تردید کرتے ہیں۔

رگ وید: ۱۰: ۱۴: ۷ – ۱۱ (۷) (اے میت!) قدیم راستوں سے جاؤ، جاؤ جن پر ہمارے قدیم بزرگ گزرے ہیں۔ تم — دونوں راجاؤں یم (　　　) اور ورن (　　　) کو — نذر سے خوش حال دیکھوگے —
(۸) نذر نیاز سے فرزندوں سے برتر بزرگوں اور یم (خداوند مردگان) سے مل جا۔ فرو تر (　　　) کو چھوڑ کر (بزرگوں) کے گھر واپس چلا جا۔ نورانی جسم سے مل جا۔ (۹) اے بدروحو! یہاں سے چلی جاؤ (پتروں) نے اس کے لیے اس جگہ کو تیار کیا ہے۔ یم (خداوندگان) اس کو دنوں، راتوں اور پانیوں سے مختص مسکن بخش دیتا ہے۔ (۱۰) اے میت! چار آنکھ والے چت کبرے۔ سرما (　　　) کتی کے بچے۔ دونوں کتوں کو۔ اچھے راستے سے پار کر جا اور ان کرم فرما بزرگوں (پتروں) کے پاس چلا جا۔ جو یم کے ساتھ جلسہ میں خوشی مناتے ہیں۔ (۱۱) یم! تیرے پاس۔ چار آنکھ والے رکھوالے، راہ بان، آدمیوں کے نگراں جو دو کتے ہیں۔ اس (مردہ) کو ان دونوں (کتوں) کی رہنمائی میں دے دے اور اس (میت) کے لیے خیریت اور صحت بخش دے۔ رگ وید: ۱۰: ۱۴: ۷ – ۱۱

رگ وید: ۱۰: ۱۶: (۱ — ۶، ۱۳، ۱۴) (۱) اے اگنی! اس (میت) کو نہ جلا نہ بھسم کر، نہ اس کے چمڑے کو نہ جسم کو پراگندہ کر۔ اے جات وید (آگ) جب تو (اس کو) پختہ کر دے تو اس کو پتروں کے لیے بھیج دے —
(۲) جات وید (اگنی)! جب تو پکا رہے تو اس کو پتروں (بزرگوں) کے حوالے کر دے۔ جب یہ اس زندگی کو پاتا ہے تو خداوندوں (دیوتاؤں) کا مطیع ہو جاتا ہے۔ (۳) بینائی سورج کو چلی جائے۔ پران (سانس) ہوا کو چلا جائے۔ نیکوکاری سے آسمان اور زمین کو چلا جائے۔ اگر تیرا جزو ہے تو وہ پانیوں میں چلا جائے۔ سبزیوں (لکڑیوں) میں اعضا سمیت اقامت گزیں ہو (۴) مکرا[1] (اے آگ) (تیرا) حصہ ہے تپش سے اس کو جلا ڈال۔ تیرے شعلے تیری لپٹیں اس کو — ہاں اس کو — بھسم کر ڈالیں۔ اے اگنی! جو تیرے خوبصورت اجسام ہیں ان کے ذریعہ اس (مردہ) کو نیکوکاروں کی دنیا میں اٹھا لے جا (۵) جو تیرے اندر نذر ہو کر۔ نیازوں کے ساتھ جا رہا ہے (اس کو) پتروں کے حوالے کر دے۔ (یہ مردہ) حیات کی چادر اوڑھ کر (ہمارے) پاس آتا رہے[2]۔ اے جات وید اگنی! باقی ماندہ (جسم) پورے (جسم) کے ساتھ مل جائے (۶) کوے، چیونٹی، سانپ اور گیدڑ نے تیرا جو کچھ نوچ لیا ہے ہمہ خور اگنی اس کو بھلا چنگا کر دے۔ سوم بھی۔ جو کہ برہمنوں میں داخل ہو چکا ہے۔ (بھلا چنگا کر دے) (۱۳) اگنی جس کو تو نے جلایا ہے اس کو پھر زندہ کر۔

[1] میت کے ساتھ سوختنی قربانی کے طور پر ایک بکرے کا لحم و شحم بھی جلایا جاتا تھا تاکہ بکری جلے اور میت بچ جائے۔
[2] آئندہ جب کبھی نذر و نیاز میں مردے کو مدعو کیا جائے۔

یہاں سوسن گیاہ اور سبزہ تازہ اگ جائے۔ (۴) اے گیاہ مردا! اے گیاہ مردوالی سرزمین! اے گیاہ شادمانی اے گیاہ وشادمانی کی سرزمین! مینڈکی سے مل جا۔ اس آگ کو اچھی طرح خوش کردے[1]

تلقین کے منتروں میں مردے کو شہیدوں، دانیوں اور تپسیوں کے پاس کوچ کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ تدفین کے منتروں میں دھرتی ماتا کے آنچل تلے سایہ ملنے کی درخواست کی گئی ہے۔ اور تحریق میں آگ سے استدعا کی گئی ہے کہ وہ مردے کے کٹے پھٹے اعضاء کو پورا کر کے پتروں کے حوالے کردے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ویدوں کی تدوین کے معًا بعد بھی وید کے شارحین، مفسرین و ملخصین اس یقین پر پہنچ گئے تھے کہ مردہ کے جلانے سے وہ بلے کم وکاست سورگ لوک کو پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ آشولائن گرہ سوتر کے مولف نے مردے کو جلانے کے بعد یوں فرمایا ہے۔ (۱) تینوں[2] آگوں کو ایک ہی ساتھ روشن کرنے کا حکم دیا جائے۔ (۲) اگر آہونی

[1] آگ سے مردے کو جلانے کے بعد اس کو بجھانے کے لیے پانی چھڑکا جاتا ہے۔ بعدہٗ آبی نباتات اس کے اوپر رکھے جاتے ہیں۔ مزید برآں مینڈک ــ یہاں پر مینڈکی ــ جلانے کی جگہ پر رکھ دی جاتی ہے۔ پانی کی زندگیوں کی یہ نمائش شگون و خوش حالی کے لیے کی جاتی ہے (تفصیل)

[2] ایک معیاری یگیہ میں تین آگ۔ آتش خداوندان، آتش خانہ اور آتش مردگان۔ تین وید کی مناسبت سے ہوتی ہے۔ قربان گاہ (ویدی) سے پورب آہونی آگ (دیوتاؤں کی آگ۔ رگ وید) پچھم گارہ پتہ آگ (انسان کی آگ۔ یجروید) اور دکھن دکشنی آگ (مردوں کی آگ۔ سام وید) ہوتی ہیں۔ مردہ کے ساتھ اس کے آتشکدہ کی آگ، یگیہ کے ظروف وآلات بھی جلا کر ختم کر دیے جاتے ہیں۔ پچھم کی آگ پر نذر کا کھانا پکایا جاتا ہے۔ پورب کی آگ میں دیوتاؤں کے لیے نذر جلائی جاتی ہے۔ دکھن کی آگ میں مردوں کے لیے ــ نذر ــ جلائی جاتی ہے۔ اس طرح سے دکھن کی آگ پاکیزہ، پچھم کی آگ پاکیزہ تر اور پورب کی آگ پاکیزہ ترین ہے۔ اسی لیے پورب کی آگ سے لاش جلنے سے مردہ فردوس بریں میں (دیوتاؤں میں) پچھم کی آگ سے جلنے سے مردہ انترکش لوک (گندھروں میں) اور دکھن کی آگ سے لاش جلنے سے مردہ "پتری لوک" میں جاتا ہے۔ تناسخ کے معتقد شخص کو ــ عالم انسانی ــ ہماری یہ دنیا سمجھ میں آسکتا ہے۔ مگر وہاں وہاں کی تکرار سے مبرا تناسخ کا غیر معتقد ذہن ــ عالم انسانی ــ کو ــ پتری لوک کا ــ مترادف سمجھتا ہے۔ اور یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ویدک لٹریچر میں ارضی (　　) فضائی (　　) سماوی کلا (　　) تین طبقوں پر دیوتاؤں کو تقسیم کیا گیا ہے۔ ارض، فضا، سماء کے ان طبقات کا ذکر ہزار ہا بار کیا گیا ہوگا۔ بلاشبہ سباق وسیاق سے نظر بند کر لینے کے بعد عالم انسانی سے تناسخ مراد ہو سکتا ہے۔ مگر احقر کی یہ تاویل، تناسخ کی تاویل سے کسی درجہ بھی مرجوح نہیں ہے بلکہ بدرجہا راجح ہے ــ بہرحال یہ تفصیل اس لیے قلمبند کی جارہی ہے کہ مذہبی لوگوں پر بددیانتی خیانت تلبیس و فریب کا الزام نہ عائد ہو۔ ورنہ ہندستان کے لوگ علمی خیانت اور بے ایمانی میں یورپین مستشرقین سے ہزار درجہ آگے ہیں۔ ناظرین یہ بھی یاد فرمالیں کہ یہی وہ ابہام ہے جن سے تناسخ کے اثبات کی کوشش کی جا سکتی ہے اور یہی وہ تناسخ کے شاذونادر تذکروں میں ایک تذکرہ ہے جس کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے۔

(   ) اگنی (آتش خداوندان) پہلے مُردے کے جسم کو چھو کر جلا دے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ آگ نے
سورگ لوک (فردوس بریں، عالم ملکوت) میں پہنچا دیا۔ مردہ وہاں خوش حال ہوگا اور لڑکا اس دنیا میں (خ
ہوگا۔ (۳) اگر گارہ پیہ (   ) اگنی (آتش خانہ) پہلے مردہ کے جسم کو چھو کر جلا دے تو یہ سمجھنا چا
آگ نے اس کو انترکس لوک (فضائے وسطی یا فردوس اوسط) میں پہنچا دیا۔ مردہ وہاں خوش حال ہوگا اور لڑ
دنیا میں خوش حال) ہوگا۔ (۴) اگر دکھنی اگنی (   ) (آتش مردگاں) پہلے مردہ کے جسم کو چھو کر جلا د
تو یہ سمجھنا چاہیے کہ آگ نے اس کو عالم انس میں پہنچا دیا۔ مردہ وہاں خوش حال ہوگا اور لڑکا اس دنیا
(خوشحال) ہوگا۔ (۵) اگر تینوں آگ) ساتھ ساتھ مردہ کو جلا دیں تو فوز عظیم سمجھنا چاہیے۔ (۶) جب وہ جا
قدیم راستوں سے (رگ وید ۱۰: ۱۴: ۸) وغیرہ پڑھنا چاہیے۔ (۷) یہ واضح ہو کہ اس طرح جاننے وا
کے ذریعہ جلایا ہوا شخص دھوئیں کے ساتھ سورگ لوک کو چلا جاتا ہے۔ (۸) آہونی (مشرقی) آگ کے ات
گھٹنا برابر گڈھا کھود کر جلنے سے بچے ہوئے جسم کو ڈھک دے۔ یہ واضح ہے کہ وہ "ذات" مردے
دھوئیں کے ساتھ سورگ لوک کو چلی جاتی ہے۔ کم شولاین گرہ سوتر: ۴: ۴: ۱ — ۸

دیگر

(۱) شخص (پرش) تین بار جنم لیتا ہے پہلے وہ ماں اور باپ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور جب وہ یگیہ[1] کے
معتکف ہوتا ہے اور یگیہ کرتا ہے تب دوسری بار پیدا ہوتا ہے۔ اور جب وہ مر جاتا ہے اور جب اس کو
میں رکھنے پر اور جب وہ اس سے پیدا ہوتا ہے تب تیسری بار پیدا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے کہتے ہیں شخص
تین بار پیدا ہوتا ہے۔ شت پتھ: ۱۱: ۲: ۱: ۱

دیگر

جب آدمی مر جاتا ہے تب اس کو آگ پر رکھتے ہیں۔ تب وہ آگ سے پیدا ہوتا ہے۔ جب کہ آگ اس کو
جلاتی ہے۔ جیسے ماں باپ سے انسان پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح سے انسان آگ سے پیدا ہوتا ہے جو اگنی
(صبح و شام آگ میں گھی، لکڑی چڑھانا) نہیں کرتا وہ دوبارہ نہیں پیدا ہوتا اسی لیے اگنی ہوتر کرنا چاہیے شت پتھ
ان تشریحات کی وجہ سے۔ آگ کے وسیلے سے سورگ بھیجنے کا عقیدہ اتنا پختہ ہو گیا تھا کہ اگر ور
لاش نہ ملتی تھی تو وہ متوفی کا پتلا جلا کر پھونکتے تھے۔ تاکہ بے چارہ متوفی ادھر ادھر نہ بھٹکے اور دیر سویر منزل
سورگ لوک کو پہنچ جائے۔

---

[1] یگیہ میں زنار پوش دیوتا دایاں گھٹنا موڑ کر بیٹھتے ہیں جب کہ پرتلہ پوش بزرگ بایاں گھٹنا موڑ کر بیٹھتے ہیں۔

مذہب

کمیونسٹ پارٹی کے دل میں کھٹکتا ہوا ایک کانٹا

(۳)

دانئی میرن ——— ترجمہ ش عثمانی

اعترافِ حقیقت

پارٹی کے نظریہ ساز اس اعترافِ حقیقت پر مجبور ہو چکے ہیں کہ مذہب دشمن مہم میں یہ بات خاص طور سے روڑے اٹکا رہی ہے کہ پارٹی اور کاموسول کے بہت سے اراکین مذہب کی طرف ہمدردانہ میلان رکھتے ہیں۔ اسی لیے یہ شکایت کی جاتی ہے کہ کمیونسٹ "مذہبی نظام فکر کے مظاہر کی سمت میں دل لبھانے کی روش پر چل رہے ہیں"[1] اور یہ کہ ہنوز "ایسی متعدد مثالیں ملتی ہیں جن میں ایک بچے کی ابتدائی مسیحی تقریب اس کے اشتراکی باپ کی خاموش تائید سے منائی جاتی ہے؛ جبکہ یسوع مسیح کی مقدس شبیہیں اشتراکیوں کے گھروں میں پائی جاتی ہیں"[2]

یہ طریق کار دیہات میں خوب پھیل رہا ہے۔ مثلاً نظریاتی کمیشن کے اجلاس میں یہ اعلان کیا گیا کہ:-

> اوڈیسہ کے علاقہ میں دو کلخوزوں (KOLKOZES) کے سربراہوں نے لوگوں کو کلیسا لے جانے کے لیے موٹر گاڑیوں کا اہتمام کیا۔ ادھر ادھر جگہ جگہ اتواروں سے لے کر مذہبی تیوہاروں تک مقدس مریم کے دن منائے جاتے ہیں[3]

بہت سے سوخوز (SOUKHOZES) اور کلخوز مذہبی تعطیلات کے دن کام نہیں کرتے اور ان تقریبات میں حصہ لیتے ہیں۔ اخبار "مولوڈو کمیونسٹ" ایک ایسے ہی "سوخوز" کا تذکرہ کرتا ہے کہ جہاں اگرچہ کاموسول سرگرمیوں پر مثالی انداز میں عمل ہوتا ہے مگر نومولود بچوں میں نصف سے زیادہ تعداد کی ابتدائی مسیحی تقریب منائی جاتی ہے۔ کاموسول ممبروں کی شادی کلیسا میں منعقد ہوتی ہے اور جہاں گزشتہ موسم گرما میں ہی تین ہزار

[1] NAUKA-I-RELIGIYA ۱۹۶۴ نمبر ۱ صفحہ [2] ایضاً صفحہ [3] ایضاً

"انسان کے دن" بزرگوں اور ولیوں کے دن منائے جانے کی بنا پر ضائع کر دیے گئے[1] نظریاتی کمیشن کی میٹنگ میں شرکت کرنے والوں میں بہت سے لوگوں نے اس حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرائی کہ کلیسا کی متانت آمیز تعلیم لوگوں پر سرکاری کلبوں سے کہیں زیادہ عظیم تر اثر ڈالتی ہے۔ موخرالذکر کی بات چھیڑتے ہوئے آل یونین کامسومول سنٹرل کمیٹی کے سکریٹری اول سرجی پاولو نے اقرار کیا۔

"ہمارے کلبوں میں بے کیفی اور ایک گھٹی گھٹی فضا پائی جاتی ہے۔ وہاں کا ماحول "از دل خیزد بر دل ریزد" قسم کی بات چیت تک رہنمائی کرنے میں ممد و معاون ثابت نہیں ہوتا۔ اس کا تو کوئی داعیہ ہی نہیں ہوتا کہ کوئی شخص ادھر آ نکلے۔ دوستوں سے ملے جلے اور تفریحی وقت گزارے"[2]

کلیسا کی صورت حال اور ہی کچھ ہے۔ جیسا کہ آر ایس ایف ایس آر کی تعلیماتی علوم کی اکیڈمی کے ممبر آئی کیروف نے بیان کیا ہے۔

"......... مذہبی منتظمین جانتے ہیں کہ لوگوں کے جذبات سے کس طرح کھیلا جاتا ہے اور اس مقصد کے لیے وہ فنکارانہ زبان — خطیبوں اور مبلغوں کے کمالات، نغمہ و سرود، کلیسائی طرز تعمیر اور نقش و نگار سازی کا استعمال کرتے ہیں"[3]

پادریوں کا جدید انداز فکر

ادھر چند برسوں میں سوویت روس کے روسی آرتھوڈکس چرچ نے بہت سے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنے انداز فکر کو قابل لحاظ حد تک جدید بنا دیا ہے۔ رسالہ "جرنل آف ماسکو پیٹری آرکیٹ" نے برائے ظاہر کی کہ بیسویں صدی میں "مذہبی دماغ" دین و مذہب سے متعدد سوالات کا جواب چاہتا ہے[4] کمیونسٹ نظریہ سازی کے ماہر وائی۔ فرانسٹوف نے دعویٰ کیا۔

"کلیسا کے ارباب حل و عقد میں نظام فکر کے خوب مسلح ماہرین کلیسا کی سرگرمیوں میں نت نئے انداز پیدا کر رہے ہیں۔ جو مقصد وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ محنت کش لوگ سچائی، نیکی وغیرہ جیسے فلسفیانہ سوالات کے بارے میں سب سے پہلے مذہبی لوگوں کی زبان سے سن لیں۔"[5]

---

[1] MOLODOI - KOMMUNIST ۱۹۶۳ء نمبر ۱۲ صفحہ ۲۱-۲۰

[2] NAUKA-I-RELIGIYA ۱۹۶۴ء نمبر ۱ صفحہ ۴۲ — [3] ایضاً

[4] ZHURNAL-MOSKOVSKOI-PATRIARKHII ۱۹۶۴ء نمبر ۹ صفحہ ۲۶

[5] NAUKA-I-RELIGIYA ۱۹۶۴ء نمبر ۱ صفحہ ۴۲

تطبیق و ہم آہنگ سازی کی کلیسائی صلاحیت پر ایسچیف نے مزید روشنی ڈالی ہے۔

"انجیلی اقوال وغیرہ کے سلسلے میں ارباب کلیسا ایک تنقیدی انداز فکر کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ کوئی بھی شے جو موجودہ عقل عامہ کی تردید کرتی ہو یا آج کے مذہبی آدمی کو خندہ زیر لب پر مجبور کر تی ہو۔ وہ لوگ کہتے ہیں اس کا ذکر وعظ میں نہیں آنا چاہیے"۔ سیاسی دائرے میں کلیسا بطور خاص تطابق و ہم آہنگی پیدا کرنے کی بڑی صلاحیت کا مظاہرہ کر رہا ہے "ضابطے میں کلیسا سوویت حکومت کا وفادار ہے اور کچھ اشخاص تو مذہب اور سوویت ریاست کے اغراض و مقاصد میں بھائی چارے کی "مدلل تشریحات" پیدا کرنے کے لیے میدان میں آتے ہیں[1]

عیسائیت اور اشتراکیت کی یکسانیت کا دعویٰ

ایک شخص کی ذاتی زندگی میں اشتراکی اور مذہبی نظریات میں مصالحت پیدا کرنے کی جو کوششیں سوویت روس میں ہو رہی ہیں وہ کسی طرح بھی شاذ و نادر کہلانے کی مستحق نہیں ہیں۔ ادھر چند سال سے مذہبی طبقہ اصرار کر رہا ہے کہ مسیحی اور اشتراکی افکار و نظریات ہم آہنگ ہیں۔ ایسچیف نے جو مثالیں دی ہیں ان میں علاقہ لوگنسک کا ایک پادری بھی ہے جس نے ایک وعظ میں کہا:۔

"مسیح نے آدمی کو زمین پر اس طرح تعمیر حیات کا طریقہ سکھایا کہ دنیا میں نہ کوئی غریب رہے اور نہ امیر تاکہ تمام انسان اخوت کے بندھن میں ایک دوسرے سے بندھ جائیں اور چین کی زندگی گزاریں۔ سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کا پروگرام اس تعلیم کی روح سے پوری پوری مطابقت رکھتا ہے"[2]

دلینس کلیسائے اعظم کے کلیسائی سربراہ نے اعلان کیا:۔

"وہ حضرات غلط فہمی میں مبتلا ہیں جو بڑے زور شور سے یہ بات کہتے ہیں کہ مذہب اور اشتراکیت میں اشتراک و تعاون ممکن نہیں۔ معمار اشتراکیت کے ضابطۂ اخلاق پر جوش و خروش سے عمل درآمد ہونا چاہیے۔ اس کی اصل تو صحائف آسمانی سے لی گئی ہے"[3]

یہ جزوی طور سے درست دعویٰ ان قابل لحاظ دشواریوں کو ظاہر کرتا ہے جن کا سامنا پارٹی کے نظریہ سازوں اور مختلف طبقوں میں الحادی پرچار کرنے والوں کو اس وقت کرنا پڑتا ہے جب حامیان مذہب کے ساتھ وہ تبادلۂ خیال کرتے ہوتے ہیں۔ اس بات سے ان کی پوزیشن اور زیادہ نازک اور خطرناک ہو جاتی ہے کہ تعلیم یافتہ

[1] KOMMUNIST ۱۹۶۲ نمبر ۱ صفحہ ۶۲ [2] ایضاً صفحہ ۶۵ [3] ایضاً صفحہ ۶۵

ارباب کلیسا بڑی چابک دستی کے ساتھ ان بے شمار سوالات کے وجود سے "استحصال بے جا" کر رہے ہیں جن کا کوئی جواب ابھی تک سائنس نے نہیں دیا۔ ایپیکیٹ شکوہ سرا ہے۔

اور اگرچہ ایسے سوالات کم سے کم تر ہوتے جا رہے ہیں مگر یہ ماہرین مذہب وہی پرانی چال چلے جا رہے ہیں۔ وہ تو سائنس میں تجریدیت کی طاقت — ریاضیاتی قاعدوں اور سائنٹفک اشاریت کی بڑھتی ہوئی اہمیت سے بھی فائدہ اٹھانے کا قصد کر رہے ہیں۔[1]

مذہب، فطرت انسانی کا تقاضا ہے آگے چل کر وہ کہتا ہے :-

اہل مذہب آدمی کی اس فطری ضرورت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں جیسا کہ ماضی میں کرتے رہے ہیں۔ کہ یہ کھوج لگائی جائے کہ اس دنیا میں اس کی غرض و غایت کیا ہے۔ اپنے مطبوعہ اور زبانی خطبات میں وہ ایسے مسائل پر بولنے میں زیادہ سرگرمی دکھا رہے ہیں جیسے زندگی کی غرض و غایت۔ ضمیر اور دوسرے اخلاقی اصول — آدمی کی اخلاقی ذمہ داری۔ اس کی آزادی اور سماج پر اس کا انحصار[2]

مباحثے میں اشتراکیت کی شکست الحادی پرچار کے کارکنوں اور خدا کو ماننے والوں کے مابین سرکاری نیم سرکاری بحث و مباحثہ کی مجلسیں جو سوویت روس کے طول و عرض میں اکثر منعقد ہوتی رہتی ہیں وہ مقدم الذکر کی ہار پر ختم ہوتی ہیں۔ اس کا ایک خاص الخاص نمونہ اس مقالے میں دیکھا جا سکتا ہے جس کا عنوان "ہیروازم اور درجہ شہادت" ہے اور جو مولوڈ وکمیونسٹ میں شائع ہوا۔ اس مقالے میں بتایا گیا ہے :- کہ کس طرح چند جواں سال معتقدین مذہب اس جلسے میں جا پہنچے جو کسی علاقائی مرکز میں مقامی کا مسومول اہل الرائے طبقہ نے منعقد کیا تھا تاکہ "سوویت کے اشتراکی ہیرو اور مقدس شہداء" کے موضوع پر مقابلہ کیا جائے۔ معتقدین مذہب نے اس آئے دن کے الزام کی تردید کی کہ مسیحیت نے عدم مقاومت کا پرچار کیا اور مثال کے طور پر مسیحی بزرگوں کو پیش کیا۔

کیا کوئی شخص سچے دل سے بے شمار شہیدوں خصوصاً ابتدائی مسیحی زمانے کے شہیدوں کے متعلق اس حقیقت کو جھٹلا سکتا ہے کہ اصول و نظریات کے نام پر وہ لوگ بے لوثی اور جاں نثاری کے چلتے پھرتے نمونے تھے؟ — کیا کوئی شخص واقعتاً کہہ سکتا ہے کہ اسے ان چیزوں میں اشتراکیت اور عیسائیت کے درمیان ایک زبردست اخوت دکھائی نہیں دیتی؟ بہرکیف یونانی کمیونسٹ نکوس بیلویانس نے یہ بات عدالت کے

---

[1] KOMMUNIST - ۱۹۶۴ء نمبر ا صفحہ [2] ایضاً صفحہ

سامنے آچکی ہے[1]

اس کے بعد معتقدین مذہب نے جنگ عظیم دوئم کے دوران میں مسیحی شہیدوں اور نوجوان دفاعی کارکنوں میں سے ان شہید ہونے والوں کے کاموں میں مماثلت کو بیان کیا جو فسطائیوں کے ہاتھوں ایک شہید کی موت مرے۔ اور جب کامسومول کے اراکین نے اعتراض کیا کہ کارکنان دفاع و مقاومت تو حقیقی انسان تھے جبکہ مسیحی بزرگ مقدس افسانوی ہستیاں تھے۔ تو جواب دیا گیا:۔

"مان لیجیے اگر ایسا ہی ہو تو آپ کسی بات کی نہ تردید کریں گے اور نہ اس کو ثابت کریں گے۔ کچھ بھی سہی ۔۔ کیا مشہور اووڈ (VOINICN) کے ایک اسی نام کے ناول کا ہیرو) ایک حقیقی شخصیت ہو؟ ۔۔ نہیں! ۔۔ وہ تو ایک ادبی ہیرو ہے ۔۔ وہ ایک ادیب کی قوت تخیل کی پیداوار ہے لیکن اس کی بنیاد پر عوام کی روحانی اور اخلاقی تعلیم کے لیے کون شخص اس کی اہمیت کا انکار کرے گا"[2]

اس بات کے خلاف کامسومول ممبر کوئی معقول جوابی دلیل نہ پیش کر سکے۔

اب تشدد بھی آسان ہے

اپنی نئی مذہب دشمن مہم میں اب کمیونسٹ وسیع پیمانے پر تادیبی "انتظامیہ" اقدامات نہیں کر سکتے۔ اس لیے مجبور ہیں کہ محض سائنسی الحادی پروپیگنڈہ پر تکیہ کریں لیکن جس کی طرف سے افسوسناک حد تک غفلت کی جا رہی ہے۔ ایلچیت رقم طراز ہے:۔

"کلیسا کے موقف کی تبدیلی کو کچھ لوگ اس بات کی بنیاد قرار دے رہے ہیں کہ مذہبی نظام فکر کے متعلق اپنی روش کی تجدید کریں۔ بہرحال یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ جب مابعد جنگ عہد میں کلیسا نے کئی شعبوں پہلوؤں سے اپنے طریق کار پر نظر ثانی کی تو سائنسی الحادی کام فی الواقع رک گیا"[3]

نظریاتی بے بسی

سوویت پریس میں یہ شکایت سنی جاتی ہے کہ بسا اوقات بڑی بوڑھی عورتیں ہی ہل چل ڈالنے والی ثابت ہوتی ہیں اور یہ کہ بہت سے مواقع پر سائنسی الحادی لیکچروں میں محض منکرین خدا ہی شریک ہوتے ہیں جبکہ معتقدین مذہب یا تو گھر پر بیٹھے رہتے ہیں اور عبادت کرتے ہیں یا کسی کلیسا یا کسی دوسری عبادت گاہ میں چلے جاتے ہیں[4]

اس الحادی پروپیگنڈے پر تنقید کرتے ہوئے جن میں ارباب کلیسا کی تصویر کشی عیاشوں کلیسائی فنڈ کے

---

[1] MOLODOI KOMMUNIST ۱۹۶۳ء نمبر ۱ صفحہ [2] ایضاً صفحہ ۹۸

[3] KOMMUNIST ۱۹۶۳ء نمبر ۱ صفحہ [4] ایضاً ۱۹۶۳ء نمبر ۱ صفحہ ۹۸ [5] ایضاً نمبر ۱ صفحہ

خاموش یا محض جاہل مرکب کے ماروں کی حیثیت سے کی گئی ہے۔ نوکائے ریلیجیا (NAUKA-I-RELIGIYA) اشتباہ کرتا ہے کہ :۔

اگر نظریاتی دشمن کو اس پرلے سرے کے سادہ لوح اور احمقانہ ڈھنگ سے پیش کیا جاتا ہے تو مذہب کے خلاف لڑنے والی جنگ اپنا کمپین خود ہار دینے کی یادگار ہو کر رہ جائے گی۔[1]

نظریاتی کمیشن کے اجلاس میں آئی۔ کیروتف نے "الحادی سوالات اور ان کے جوابات کی میٹنگ" کے متعلق جو لینن گراڈ کے ایک اسکول میں منعقد ہوئی تھی یہ کہا کہ وہ میٹنگ الحادی کام کے بہت بڑے حصے کی کیفیت کا بس ایک مخصوص نمونہ تھی۔ اگرچہ "طلبا" سے کہا گیا تھا کہ ان کے تمام سوالات کا جواب دیا جائے گا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ پیش کردہ ۲۳ میں سے ۷ سوالات کو "محروم جواب" رہ جانا پڑا کیونکہ اساتذہ اور پروپیگنڈہ ساز لوگ کافی وشافی تیاری کر کے نہ آئے تھے۔[1]

جریدہ واپروسی فلاسوفی (VOPROSI-FILOSOFI) نے الحادی پروپیگنڈے کے سلسلے میں تاریک امکانات کو حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"مذہبی نظریات — تعصبات اور اوہام پرستیاں جو بہت سے سماجی گروہوں کو متاثر کرتی ہیں، ایک اٹل توانائی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ مذہب کے وجود و بقا کے خلاف جنگ میں قابل لحاظ حد تک معتقدین مذہب کے مخصوص سماجی اور نفسیاتی خصوصیات سے لاعلمی کی بنا پر موانع پیش آ رہے ہیں اگر الحادی پرچار کو ترقی دینا ہے تو ان خصوصیات کا مطالعہ کرنا ہی چاہیے۔ ہمارے ملحدین ہمیشہ اس حقیقت کا جائزہ لینے میں چوک جاتے ہیں کہ ذات الٰہی کی پرستش کرنے اور مروج پرستش کا جذباتی یا نفسیاتی پہلو معتقدین مذہب پر زبردست اثر ڈالتا ہے۔ اس نفسیاتی اثر کی طاقت مذہبی لوگوں میں دانشورانہ استدلالات کی طرف سے بے نیازی و بے اعتنائی پیدا کرتی ہے اور عملی الحادی کام، مخالفت و عمل کی ایک بہری دیوار کی زد میں ٹکرا رہ جاتا ہے۔"[2]

نظریاتی کمیشن کے اجلاس میں یہ بات طے پائی کہ مذہب کی طاقت اور اس الحادی پروپیگنڈے کی کمزوری کا راز جو پارٹی، کامسومول اور ٹریڈ یونین کی تنظیمیں چلا رہی ہیں بطور خاص اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ یہ تنظیمیں

---

[1] NAUKA-I-RELIGIYA ۱۹۶۳ء نمبر ۷۔ صفحہ ۹ [1] ایضاً۔ ۱۹۶۳ء نمبر ۱ صفحہ ۳
[2] VOPROSI-FILOSOFI ۱۹۶۳ء نمبر ۱۲ صفحات ۲۳-۲۲

دکھیاروں اور مصیبت کے ماروں کے لیے ایک دوستانہ انسانیت نواز طرز عمل اپنانے میں ناکام ہوگئیں اور ان کو بروقت روحانی اور مادی سہارے بہم پہنچانے سے معذور رہیں۔

پاؤلوف فرسٹ سکریٹری کامسومول سنٹرل کمیٹی نے بیان کیا کہ عموماً صرف وہی نوجوان مرد و زن مذہب کے زیر اثر آئے ہیں جن کو کوئی جذباتی چوٹ لگ چکی تھی یا یہ نہیں تو وہ کسی انداز میں زندگی میں اپنے قدم نہ جما سکے تھے اور اپنے اشتراکی ساتھیوں سے ان کا کوئی رابطہ قائم نہ تھا یا وہ کسی مشکل صورت حال سے دوچار تھے۔

یہ نئی مہم بھی ناکام ہوگی

سوویت روس میں چلنے والی موجودہ مذہب دشمن مہم بھی ٹھیک اسی طرح ناکام ہوگی جس طرح اس سے پہلے تمام کوششیں ناکام ہوچکی ہیں — یہ اس لیے کہ اس مہم کو محض الحادی پروپیگنڈے پر تکیہ کرنا ہوتا ہے جو مواد کے لحاظ سے مبتدیانہ ہے اور اس مذہب کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی حد تک دل پذیر نہیں جو نظریاتی اور معاشرتی سطح پر بڑی حد تک اس سے زیادہ اونچا ہے۔ آرتھوڈوکس کلیسا اور دیگر مذہبی طبقے بدیہی طور پر زیادہ طاقتور ہوتے جا رہے ہیں اور آبادی کے بڑے حصے کی ہمدردیاں اور احترام انھیں حاصل ہے۔ سوویت روس میں مذہب کا نئے سرے سے سر اٹھانا سوویت سماج کے اس فکری ارتقا کا ایک اہم حال ہے جو روحانی حریت و آزادی کی طرف زیادہ سے زیادہ مائل ہوتا جا رہا ہے۔

اعلان ملکیت ماہنامہ زندگی رام پور

و دیگر تفصیلات فارم IV رول نمبر ۸

(۱) مقام اشاعت	دفتر زندگی، رام پور۔ یو۔ پی
(۲) مدت اشاعت	ماہانہ۔
(۳) طابع	احمد حسن
وطنیت	ہندوستانی
پتہ	بازار کلاں، رام پور۔ یوپی
(۴) ناشر	احمد حسن
وطنیت	ہندوستانی
پتہ	بازار کلاں، رام پور۔ یوپی
(۵) ایڈیٹر	سید احمد عروج قادری
وطنیت	ہندوستانی
پتہ	گھیر سیف الدین خاں، رام پور۔ یوپی
(۶) مالک کا نام و پتہ	جماعت اسلامی ہند، رام پور۔ یوپی

میں تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے بہترین علم و یقین کی حد تک صحیح ہیں۔

احمد حسن

رسائل و مسائل

دو مسئلوں کی توضیح مزید

سوال

رسالہ زندگی ستمبر ۶۴ء میں "مقدارِ زکوٰۃ اور حولانِ حول" کی بحث پڑھی۔ آپ نے لکھا ہے کہ ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس سے دو سال کی زکوٰۃ ایک ساتھ وصول کر لی تھی۔ یہ جزم بتاتا ہے کہ یہ واقعہ آپ کے علم میں کسی صحیح حدیث سے ثابت ہے تو وہ کون سی ہے؟ کس کتاب میں ہے؟

(۲) مال مستفاد کو اصل کے ساتھ ضم کرنے کا ثبوت کیا ہے؟ حساب کتاب کی دشواری کا جو آپ نے ذکر فرمایا ہے تو کیا اس میں یوں سہولت نہیں کہ مستفاد درمیان سال میں اگر حد نصاب کو پہنچ جائے تو اسے الگ شمار کیا جائے۔ لکھ لینے سے یہ دشواری حل ہو جائے گی اور اگر حد نصاب سے کم رہے تو اسے عفو قرار دے کر سال دوم میں اصل کے ساتھ ضم کر دیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حنفیہ کے حکم کو جس سے ائمۂ ثلثہ اختلاف کرتے ہیں شرعی حکم اسی صورت میں قرار دیا جا سکتا ہے کہ کتاب یا سنت صحیحہ کی کوئی دلیل اس کی پشت پر ہو تو کیا کوئی ایسی دلیل موجود ہے؟ اگر ہے تو کہاں؟ امید ہے کہ آنجناب کچھ وقت صرف فرما کر تسلی بخش جواب سے نوازیں گے۔

جواب

(۱) امام مسلم نے کتاب الزکوٰۃ میں ایک حدیث روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے بھیجا اس کے بعد آپ کو خبر دی گئی کہ ابن جمیل اور حضرت خالدؓ اور حضرت عباس نے زکوٰۃ ادا نہیں کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تینوں کے زکوٰۃ نہ دینے کی تین وجہیں بیان فرمائیں حضرت عباس کے زکوٰۃ نہ دینے کی جو وجہ آپ نے بیان فرمائی وہ یہ تھی:-

أَمَّا الْعَبَّاسُ فَهِيَ عَلَيَّ وَمِثْلُهَا — رہے عباس تو ان کی زکوٰۃ مجھ پر ہے اور

مَعَهَا۔ — اور اسی کے مثل اس کے ساتھ

حضورؐ کے ان جملوں کا معنی امام نووی نے یہ لکھا ہے :۔

معناہ انی تسلفت منہ زکوٰۃ عامین۔

اس جملے کا معنی یہ ہے کہ میں نے (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے) ان سے دو سال کی زکوٰۃ پیشگی وصول کر لی۔

امام نووی نے اس کے بعد دو معنی اور نقل کیے ہیں جو دوسرے لوگ بیان کرتے ہیں۔ پھر ان معنوں کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

والصواب ان معناہ تعجلتھا منہ وقد جاء فی حدیث اٰخر فی غیر مسلم انا تعجلنا منہ صدقۃ عامین

(شرح مسلم)

اس کا صحیح معنی یہ ہے کہ میں نے عباس سے زکوٰۃ سال گزرنے سے پہلے وصول کر لی ہے! امام مسلم کے علاوہ ایک دوسری حدیث میں تصریح ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "میں نے عباس سے قبل از وقت دو سال کی زکوٰۃ وصول کر لی ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ امام نووی دو سال کی زکوٰۃ وصول کر لینے والی حدیث کو قابل احتجاج و استدلال سمجھتے تھے۔ اور اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ اس سے امام مسلم کی حدیث کے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے جو امام نووی نے بیان کیا ہے۔

علامہ ابن حجر نے فتح الباری میں صراحت والی حدیثیں نقل کی ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ دارقطنی میں یہ حدیث موسیٰ بن طلحہ کی سند سے بایں الفاظ مروی ہے :۔

اِنَّا كُنَّا احْتَجْنَا فَتَعَجَّلْنَا مِنَ الْعَبَّاسِ صَدَقَةَ مَالِهِ سَنَتَيْنِ۔

ہمیں ضرورت پیش آ گئی تھی اس لیے ہم نے عباس کے مال کی دو سال کی زکوٰۃ پہلے ہی لے لی

دارقطنی میں یہ حدیث موصولاً و مرسلاً دونوں طرح روایت کی گئی ہے۔ ابن حجر لکھتے ہیں کہ مرسل کی اسناد زیادہ صحیح ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ موصول حدیث کی سند بھی قابل رد نہیں ہے۔ اس کے علاوہ صحیح مرسل جس کی تائید دوسری روایتوں سے ہو رہی ہو سب کے نزدیک قابل احتجاج ہے۔ نیز یہ کہ دارقطنی میں یہ حدیث عبداللہ بن عباس اور ابو رافع سے بھی مروی ہے لیکن اس کی اسناد میں ضعف ہے۔ طبرانی میں یہ حدیث ابو رافعؓ اور عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے اور اس کی اسناد میں بھی ضعف ہے۔ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں :۔

تُعَجِّلَ مِنَ الْعَبَّاسِ صَدَقَةَ سَنَتَيْنِ ۔	حضورؐ نے عباسؓ سے دو سال کی زکوٰۃ قبل از وقت لے لی ۔

یہ حدیثیں بجائے خود بھی بالکل قابل رد نہیں ہیں اور جہاں تک اس مفہوم کی صحت کا تعلق ہے جو نووی نے امام مسلم کی حدیث کا بیان کیا ہے تو یہ حدیثیں اس کی پوری تائید کرتی ہیں ۔ امام ترمذی نے اس مسئلے میں دو روایتیں اپنی جامع صحیح میں درج کی ہیں ۔ ایک کے الفاظ یہ ہیں :۔

عن علي اَنَّ العبّاس سَاَلَ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي تَعْجِيلِ صَدَقَتِهِ قَبْلَ اَنْ تَحِلَّ فَرَخَّصَ لَهُ فِي ذَالِكَ ۔	حضرت علی سے مروی ہو کہ حضرت عباس نے سال گزرنے سے پہلے اپنی زکوٰۃ ادا کرنے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو آپ نے ان کو اس کی رخصت دے دی ۔

یہ حدیث ترمذی کے علاوہ ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارمی میں بھی ہے ۔ امام ترمذی کی دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں :۔

عن علي عن النبي صلى الله عليه وسلم قال لعمرؓ انا اخذنا زكوٰة العباس عام الاول للعام	حضرت علی سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر سے فرمایا کہ ہم نے عباس سے زکوٰۃ دو سال کی لے لی ہے ۔

ان دو حدیثوں میں پہلی حدیث کو امام ترمذی نے اسناد کے اعتبار سے اصح قرار دیا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسری حدیث بھی ان کے نزدیک قابل رد نہیں ہے ۔ پہلی حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ سال گزرنے سے پہلے ادائے زکوٰۃ جائز ہے اور دوسری حدیث میں اس واقعہ کا اظہار ہے کہ حضورؐ نے حضرت عباسؓ سے دو سال کی زکوٰۃ قبل از وقت وصول کرلی تھی ۔ پھر جہاں تک ائمۂ فقہ کے مسلک کا تعلق ہے تو ائمہ ثلثہ اور اکثر اہل علم تعجیل زکوٰۃ کو جائز قرار دیتے ہیں اور مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری صاحب تحفۃ الاحوذی نے بھی اسی کو حق کہا ہے ۔ ائمہ اربعہ میں صرف امام مالک تعجیل زکوٰۃ کو جائز قرار نہیں دیتے ۔ امام شوکانی نے بھی نیل الاوطار میں تعجیل زکوٰۃ کی حدیثیں پیش کر کے اس کو جائز قرار دیا ہے اور دو سال کی زکوٰۃ بھی اگر کوئی ادا کر دے تو اس کو بھی جائز کہا ہے ۔ ان تمام احادیث کو پڑھ کر راقم الحروف بظن غالب یہ سمجھتا ہے کہ حضرت عباسؓ سے دو سال کی زکوٰۃ قبل از وقت وصول کرنے کا واقعہ ثابت ہے اور ظن غالب ہی کی بنا پر [illegible] عبارت بھی صحیح تھی جس کی

(بقیہ صفحہ ۱۳ پر دیکھیے)

تنقید و تبصرہ

Islam in Africa
(اسلام ــــ افریقہ میں)

از پروفیسر محمود بریلوی - بڑا کتابی سائز - صفحات ۶۵۷ - مجلد مع گرد پوش قیمت 22.50 - شائع کردہ - انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر - کلب روڈ - لاہور

یہ ضخیم اور وقیع کتاب بر اعظم افریقہ میں اسلام کی آمد کا تاریخی منظر اور پس منظر پیش کرتی ہے - اس موضوع پر پہلی کتاب تو نہیں کیونکہ اس سے پہلے بھی اس موضوع پر مختلف زاویوں سے کام ہو چکا ہے - لیکن ایک مسلمان کے قلم سے اتنے شرح و بسط، تحقیق و کنج کاوی کے ساتھ یقیناً یہ پہلی انگلش کتاب ہے جس کو ایک تاریخی دستاویز اور علمی کارنامے کا درجہ دیا جانا ہی چاہیے -

اس عظیم پیشکش کو مصنف نے محض کتابیات کے بل بوتے اور غائبانہ مطالعہ کے سہارے سپرد قلم نہیں کیا بلکہ اس کا بڑا حصہ ذاتی مشاہدے کی پیداوار ہے - تقریباً بارہ ملین مربع میل کے اس پُر اسرار بر اعظم کی خاک چھاننے اور معلومات بٹورنے میں پروفیسر محمود صاحب نے زندگی کے لگ بھگ چار برس کھپا دیے ہیں - علاوہ ازیں اسلام کی تاریخ کے موضوع پر موصوف نے تقریباً تیس سال کی ایک پوری عمر صرف فرمائی ہے - اس پہلو سے دیکھیے تو یہ کتاب علمی و فکری وزن کے لحاظ سے لائبریریوں پر بھاری ہے - مواد کے جمع کرنے کے ساتھ ساتھ اس مواد کو انگریزی جیسی وسیع غیر زبان میں ڈھال دینا مصنف موصوف کا ایک دوسرا کارنمایاں ہے - اس لسانی کاوش کی برکت سے یہ کتاب مشرق و مغرب کے حق میں ایک "نعمت غیر مترقبہ" بن گئی ہے -

خدا ان کے اس تحفے کو شرف قبول عطا فرمائے -

پیش لفظ ــــ تعارف اور دیباچے کے بعد یہ کتاب اپنے ۱۴ ابواب میں اسلام اور افریقہ کا خط وار اور علاقہ وار نقشے بھی اس کتاب کے مختلف ضمیموں کے ذریعے نت نئے گوشوں پر اچھی روشنی ڈالی گئی ہے - مختلف افریقی خطوں کے نقشے بھی دیے گئے ہیں - آخر میں ایک قیمتی انڈکس کے اندر اس طولانی تحقیقی سفر کے نشانات

راہ کو سمیٹا گیا ہے ۔

پروفیسر ایم ایم شریف نے جو انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر لاہور کے نگران کار ہیں اپنے چند سطری پیش لفظ میں مصنف کی محنت شاقہ کا اندازہ کرانے کی سعی مشکور کی ہے اور تھوڑی سی دیر میں مصنف کا کافی اچھا تعارف کرا دیا ہے ۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی نے "تعارف" میں افریقہ میں اسلام اور عیسائیت کی مشنری اور سیاسی سرگرمیوں کی طرف متوجہ کرکے ناظرین کو اس کتاب کے موضوع کے نشیب و فراز سمجھائے ہیں انھوں نے کہا ہے کہ اسلام افریقہ میں عیسائیت سے پہلے داخل ہوا ۔ (صفحہ vii) لیکن بقول ان کے سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں مسلم جمود و خمود کے نتیجے میں اس کا پھیلاؤ ڈھیلا اور سست پڑ گیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام سیاسی طور پر کمزور اور معاشی طور پر دیوالیہ تھا ۔"

جہاں تک افریقہ میں عیسائیت کے داخلے کا تعلق ہے وہ تو وہاں اسلام سے پہلے ہی موجود تھی چنانچہ مہاجرین مکہ پہلے اور دوسرے دستے کا حبشہ کے نصرانی بادشاہ کے یہاں پناہ گزیں ہونا ایک معلوم و معروف تاریخی واقعہ ہے ۔ البتہ عیسائیوں کی باقاعدہ مشنری سرگرمیوں کے مقابلے میں اسلام یقیناً افریقہ میں پہلے داخل ہو چکا تھا ۔ تعارف نگار کا مقصود یہی ہو سکتا ہے ۔ رہا مسلمانوں کے جمود کا مسئلہ تو اس کو لفظاً بھی اسلام نہیں مسلمانوں کے سیاسی ضعف اور معاشی دیوالیہ پن سے منسوب کیا جانا چاہیے ۔ بلکہ سچ پوچھیے تو اس کو سیاسیات و معاشیات سے منسوب کرنے کے بجائے یہ کہنا چاہیے کہ افریقہ میں اسلام کا صحیح تصور حیات نظروں سے اوجھل ہو جانے کے باعث یہ زوال پیدا ہوا ——— سیاسی نقاہت اور معاشی دیوالیہ پن خود کوئی سبب نہیں بلکہ نتیجہ ہے ۔

اس کتاب کے کثیر صفحات میں مصنف نے افریقی مسلمانوں کے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے ۔ مگر ان کی زندگی کے متعلق جو کچھ بتایا گیا ہے ان احوال میں کون سی چیز اسلامی ہے اور کون سی غیر اسلامی ؟ ——— ان مسلمانوں کے فکر و نظر اور ماحول پر کہاں کہاں حق کی چھاپ ہے اور کہاں کہاں باطل کا تسلط ؟ ——— ان کی زندگی کے کون سے عناصر اسلام کے دیے ہوئے ہیں اور کون سے غیر اسلامی دنیا سے درآمد کیے گئے ہیں ؟ یہ اہم سوالات ہیں جو اپنا جواب چاہتے ہیں اور ان سوالات و جوابات کی موجودگی ہی میں افریقی مسلمانوں کے متعلق حاصل شدہ معلومات پاکر ایک دردمند مبلغ یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ کہاں کسی قسم کی خدمت اور توجہ کی ضرورت ہے ۔

محسوس ہوتا ہے کہ ضرورت کا یہ پہلو مصنف کے سامنے رہا ضرور ہے لیکن ہر جگہ اور ہر مقام پر نہیں رہ سکا ۔ جہاں جہاں یہ زاویہ نگاہ ابھر آیا ہے مزا دے گیا ہے ۔ مثلاً "افریقہ میں اسلام" والے باب میں صفحہ ۳ پر مصنف نے

شیعوں کے تصور خلافت میں خلیفہ کے مامور من اللہ ہونے کے عقیدے کا تاریخی و سیاسی تجزیہ خوب کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس عقیدے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ شیعہ ذہن پر ایران کے ان غیر اسلامی عقائد کا اثر چلا آ رہا تھا، جن کی رو سے ایران میں بادشاہ کو الوہیت نژاد تسلیم کیا جاتا تھا۔

لیکن تحقیق کا یہی انداز افریقہ میں اس عرب قوم پرستی اور نیشنلزم کے باب میں بھی اسی طرح پیش نظر رہنا چاہیے تھا جو آج افریقہ میں اسلام اور مسلمانوں کی تقدیر کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک زبردست سیاسی ابال کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اس سیاسی ابال کے نتیجے میں افریقہ کے مسلمان غیر مسلموں کے پنجہ اقتدار سے ضرور نکل رہے ہیں مگر اسلام غیر اسلامی نظریات کے جنگل میں کچھ اور پھنستا جا رہا ہے۔

"اسلام ـــ افریقہ میں" نامی پہلے باب میں وہ مسلم دنیا اور اس کی جدید مذہبی اصلاحات و تحریکات کا جائزہ لیتے ہوئے وہابی، بابی اور احمدیہ فرقوں کا تذکرہ کرتے ہیں اور خاص طور سے غلام احمد قادیانی اور اس کے دعاوی کو نقل کرتے ہیں تو ان دعووں کی کوئی تردید نہیں کی جاتی۔ ہاں کئی سو صفحات کے بعد آخری باب "خاتمہ کلام" میں صفحہ ۹، ۵ پر قادیانیوں کے "ترجمہ و تفسیر" میں کے ذیل میں اتنا فرماتے ہیں

"لیکن مسلمانوں کی اکثریت اس ترجمہ کو قبول نہیں کرتی اور قادیانیوں کو امت اسلامیہ کی اصل جماعت میں شامل نہیں کیا جاتا۔"

یہ بجا کہ ایک تاریخ نگار کی حیثیت سے مصنف نے خارجی و مفعولی (Objective) انداز اختیار کیا ہے لیکن جس طرح صفحہ ۹، ۵ پر قادیانی ترجمہ و تفسیر قرآن اور قادیانیت کے متعلق جمہور امت کی رائے بیان کی جا سکتی ہے تو صفحہ ۶ پر غلام احمد قادیانی کے ان خیالات کے متعلق بھی امت کا ریمارک دیا جا سکتا تھا جن کی ضرب براہ راست ختم نبوت جیسے دور رس عقیدے پر پڑ رہی ہوتی ہے۔

عام مسلم دنیا کے دینی افکار و نظریات کی نئی لہروں کا جائزہ لیتے ہوئے صفحہ ۶ پر کہا گیا ہے کہ:-

ان (وہابی، بابی اور احمدیہ فرقوں کی) منظم تحریکوں کے علاوہ حالیہ برسوں میں مسلم دنیا کے اندر ایک قابل لحاظ دینی حرکت و عمل پیدا ہوئی ہے۔ اس نے خود کو معذرت آمیزانہ لٹریچر کی شکل میں پیش کیا ہے جو اسلام کو نئی نسل کے سامنے ایک قابل پذیرائی شکل میں پیش کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اس قبیل کے جدید لٹریچر کی ایک قابل لحاظ پیداوار خاص طور سے ـــ اور ہند و پاک کے ذیلی براعظم میں ہوئی ہے۔ لیکن اس فکر جدید نے خود کو منظم کرنے کی کاوش نہیں کی اور اس طرح بڑی حد تک انفرادی رائے کا ایک معاملہ

بھی بتا رہا ہے "
کیا فکر جدید کی تاریخ بیان کرتے ہوئے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا فکر و اجتہاد اور اس کے لیے جماعت اسلامی کی ٹھوس تنظیمی کوشش مصنف کے ذہن کے کسی گوشے میں بھی بار پا سکی ہے؟ ــــ مصنف نے اس کا کوئی ثبوت ہیں دیا۔ اس لیے نتیجہ یہی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شخصیت اور اس جماعت کی جگہ کا ذی تاریخی واقعہ ہونے کے وجود ان کے نزدیک نوٹس لینے کے قابل ہی نہیں ہے ــــ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک غیر مسلم مستشرق پرسی۔ اسمتھ جب اسلامی دنیا کی جدید فکری تبدیلیوں کا جائزہ لینے بیٹھتا ہے تو اپنی کتاب "اسلام ان ماڈرن ہسٹری" کے صفحات ۲۳۶، ۲۳۴ پر مودودی صاحب کے بارے میں یہاں تک کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ :-

"بعض مصنفوں کی رائے میں وہ اسلام جدید کے سب سے زیادہ منظم مفکر ہیں ــــ وہ اسلام کو ایک ایجابی نظام کی صورت بخشنا چاہتے ہیں اور اس امر پر زور دیتے ہیں کہ اسلام اپنے اندر تمام انسانی مسائل کا حل رکھتا ہے "

مگر پروفیسر محمود بریلوی صاحب نے نہ جانے کیوں اس ہستی کے فکر اور اس جماعت کی تنظیم کو نئی مسلم دنیا کا ہی قابل ذکر واقعہ ہی نہیں سمجھا! ــــ اور نہ صرف یہ بلکہ اس دور کے تمام مذہبی لٹریچر کو بلا استثنائے واحد مذرت جویانہ لٹریچر کی صف میں شمار کرا گئے۔

بڑی قدر ناشناسی ہو گی اگر ہم مصنف موصوف کو ان کی اس کاوش طلبی پر خراج تحسین و تہنیت دینے یا اپنی روشنائی کے چند قطرے مزید صرف نہ کرسکیں جس پر خود مصنف نے سالہا سال تک اپنا خون پسینہ دیا ہے۔ خدا ان کو جزائے خیر دے۔ اور ان کی محنت شاقہ کی برکت سے ان کے سیئات کو بھی حسنات میں بدل فرمائے۔ آمین!

(ش ن عثمانی)

(بقیہ اشارات)

ای باموالکم و انفسکم — یعنی اپنے مال اپنی زبان اور اپنے جسم و جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔

امام رازی نے اس سلسلے میں چار اقوال نقل کیے ہیں اور خود جس بات کو ترجیح دی ہے وہ یہ ہے :-

والاولی ان یحمل ذالک علی — اور بہتر یہ ہے کہ اس کو ہر قسم پر محمول

کل التکالیف فکل ما امر به ونهی عنه	کیا جائے پس ہر مامور بہ اور ہر منہی عنہ پر محافظت
فالمحافظة علیه جهاد (تفسیر کبیر)	جہاد ہے ۔

صاحب روح المعانی نے پہلے جہاد کی تین قسموں کا ذکر کیا ہے ۔ کفار کے ساتھ جہاد، شیطان کے ساتھ جہاد اور نفس کے ساتھ جہاد ۔ اس کے بعد لکھتے ہیں :۔

والاولی ان یکون المراد به	اور اولیٰ یہ ہے کہ یہاں جہاد سے مراد
ضروبه الثلثة ولیس ذالک من الجمع	اس کی تینوں قسمیں ہوں اور اس سے حقیقت و مجاز
بین الحقیقة والمجاز فی شیی والی	کو جمع کرنا بالکل لازم نہیں آتا اور اسی طرف اشارہ
هذا یشیر ما روی جماعة عن	کرتی ہے وہ روایت جو ایک جماعت نے حسن بصری
الحسن انه قرء الآیة وقال ان	سے کی ہے کہ انھوں نے یہ آیت پڑھی اور کہا کہ کوئی
الرجل لیجاهد فی الله وما ضرب	شخص راہِ خدا میں جہاد کرتا رہتا ہے حالانکہ اس
بسیف ویشمل ذالک جهاد	نے ایک بار بھی تلوار نہیں چلائی اور اس جہاد میں مبتدعین
المبتدعة والفسقة فانهم	اور فاسقوں سے جہاد بھی شامل ہے اس لیے کہ وہ بھی
اعداء ایضا ویکون بزجرهم عن	دین کے دشمن ہیں اور ان سے جہاد یہ ہے کہ ان کو
الابتداع والفسق (روح المعانی)	ڈانٹ ڈپٹ کر بدعت اور فسق سے روکا جائے ۔

صاحب تفہیم القرآن نے اس کی تفسیر یہ کی ہے :۔

جہاد سے مراد محض قتال (جنگ) نہیں ہے بلکہ یہ لفظ جد وجہد اور کشمکش اور انتہائی سعی و کوشش کے معنی میں استعمال ہوتا ہے پھر جہاد اور مجاہدے میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ مزاحمت کرنے والی کچھ طاقتیں ہیں جن کے مقابلے میں جد وجہد مطلوب ہے اور اس کے ساتھ فی اللہ کی یہ قید یہ متعین کر دیتی ہے کہ مزاحمت کرنے والی طاقتیں وہ ہیں جو اللہ کی بندگی اور اس کی رضا جوئی میں اور اس کی راہ پر چلنے میں مانع ہیں اور جد وجہد کا مقصود یہ ہے کہ ان کی مزاحمت کو شکست دے کر آدمی خود بھی اللہ کی ٹھیک ٹھیک بندگی کرے اور دنیا میں بھی اس کا کلمہ بلند اور کفر و الحاد کے کلمے پست کر دینے کے لیے جان لڑائے ۔ اس مجاہدے کا اولین ہدف آدمی کا اپنا نفس امارہ ہے جو ہر وقت خدا سے بغاوت کرنے کے لیے زور لگاتا رہتا ہے اور آدمی کو ایمان و طاعت کی راہ سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے جب تک اس کو مسخر نہ کر لیا جائے باہر کسی مجاہدے کا امکان نہیں ہے ۔

(تفہیم القرآن ج ۳)

ھُوَ اجتَبٰکُم کی تفسیر میں ابن جریر نے لکھا ہے :-

یَقُوْلُ ھُوَ اختارکم لدینہٖ و اصطفاکم لحرب اعدائہ والجہاد فی سبیلہ

اللہ فرماتا ہے کہ اس نے تمہیں اپنے دین کے لیے منتخب کیا ہے اور اپنے دشمنوں سے لڑنے اور اس کے راستے میں جہاد کو

آلوسی لکھتے ہیں :-

(ھُوَ اجتَبٰکُم) ای ھو جل شانہ اختارکم لا غیرہ سبحانہ والجملۃ مستانفۃ لبیان علۃ الامر بالجہاد فان المختار انما یختار من یقوم بخدمتہ ومن قرب العظیم یلزمہ دفع اعدائہ ومجاھدۃ نفسہ بترک ما لا یرضاہ ففیہا تنبیہ علی المقتضی للجہاد

یعنی اس جلیل الشان نے تمہیں منتخب کیا ہے کسی اور نے نہیں۔ حکم جہاد کی علت بیان کرنے کے لیے یہ مستقل جملہ استعمال ہوا ہے اس لیے کہ صاحب اختیار جسے چاہتا ہے اپنی خدمت کے لیے منتخب کرتا ہے اور اس کی بارگاہ میں تقرب کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ منتخب غلام اپنے آقا کے دشمنوں کو دفع کرے اور اس کی نامرضیات کو ترک کرکے اپنے نفس سے جہاد کرے۔ لہٰذا اس جملہ میں علت جہاد پر تنبیہ کی گئی ہے

ھو سماکم المسلمین کے بارے میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ یہ نام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رکھا ہے۔ دوسرا یہ کہ خود اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے۔ دوسرے قول کو ترجیح دیتے ہوئے امام رازی لکھتے ہیں :-

والثانی ان الکنایۃ راجعۃ الی اللہ تعالی فروی عن عطاء عن ابن عباس رضی اللہ عنہما انہ قال ان اللہ سماکم المسلمین من قبل ای فی کل الکتب وفی ھذا ای فی القرآن وھذا الوجہ اقرب لانہ تعالی قال لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَھِیْدًا عَلَیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ فبین انہ سماھم بذلک

اور دوسرا قول یہ ہے کہ ھُوَ کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ عطاء ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ اللہ نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے پہلی تمام کتابوں اور قرآن میں۔ یہ قول زیادہ صحیح ہے اس لیے کہ اللہ نے اس کے بعد کہا تاکہ رسول تم پر گواہ ہوں اور تم لوگوں پر گواہ ہو تو اللہ نے فرمادیا کہ اس نے ان کا یہ نام اسی غرض کے لیے رکھا ہے اور یہ بات صرف خدا کے لائق ہے۔

واما الکلام فی انہ کیف یکون الرسول شھیدا علینا وکیف تکون امتہ شھداء علی الناس فقد تقدم فی سورۃ البقرۃ

باقی رہی یہ بات کہ رسول ہم پر کیسے گواہ ہوں گے اور آپ کی امت لوگوں پر کیسے گواہ ہوگی تو یہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا

اس عبارت سے تین باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ راجح قول یہ ہے کہ اللہ نے اس امت کا نام مسلم رکھا ہے دوسری یہ کہ مسلم کا لقب اس غرض سے دیا گیا ہے کہ رسول اس امت پر گواہ ہوں اور یہ امت لوگوں پر گواہ ہو تیسری یہ کہ اس آیت میں شہادت کا مفہوم وہی ہے جو سورۂ بقرہ کی آیت میں ہے اور پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ امام رازی کے نزدیک امت مسلمہ کو یہ شہادت دنیا اور آخرت دونوں جگہ دینی ہوگی۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ شہادت کے منصب اور اس کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے سورۂ حج کی یہ آیتیں کس قدر اہم ہیں۔

(باقی)

Monthly 'ZINDGI' Rampur, March 1965 Regd. No L-688

Only Title printed at Shanker Press, Rampur

ماہنامہ

زندگی

رام پور یوپی

سالانہ چھ روپئے　　فی پرچہ ۶۰ پیسے

ماہنامہ

زندگی

ذی الحجہ ۱۳۸۴ھ
اپریل ۱۹۶۵ء

جلد :- ۳۴
شمارہ :- ۴

مدیر :- سید احمد قادری

• خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ — منیجر ماہنامہ "زندگی" رامپور یوپی

• زر سالانہ : چھ روپیے —— شش ماہی :- تین روپیے —— فی پرچہ ۶۰ پیسے

• —— ممالک غیر سے :- دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقوم بھیجیں اور رسید ہمیں ارسال فرمائیں

مالک : جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر :- سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر :- ساجد حسن۔ مطبع :- دہلی پرنٹنگ ورکس محلہ [illegible]
مقام اشاعت :- دفتر زندگی رامپور یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

مولانا ابو اللیث، ندوی، اصلاحی، امیر جماعت اسلامی ہند

کچھ دن ہوئے جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب نے اپنے ایک خط کے ذریعہ مجھ سے یہ خواہش کی تھی کہ سیکولرزم اور دستور ہند کے سلسلے میں میں جماعت اسلامی کے موقف کی وضاحت بذریعہ اخبار کر دوں۔ ان کی یہ خواہش اس بنا پر تو مجھے بہت عجیب معلوم ہوئی تھی کہ جو لوگ جماعت اسلامی سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں وہ ان مسائل کے بارے میں ہمارے موقف سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ اور ڈاکٹر صاحب سے تو ان دونوں مسئلوں پر میری متعدد بار بات چیت بھی ہو چکی تھی، لیکن خیال یہ ہوا کہ جن حلقوں سے ان کا قریبی تعلق ہے جماعت سے ان کی واقفیت بہت سطحی ہے اور عام طور سے وہ ان دو خاص مسئلوں کے بارے میں سخت غلط فہمیوں کا شکار ہیں اس لیے غالباً ان کو جماعت کے موقف سے واقف کرانے کے لیے انھوں نے مجھ سے یہ فرمائش کی ہے۔ بنابریں ان کے سوال کا مختصر جواب دے دینا مناسب معلوم ہوا۔ البتہ طبیعت اس پر آمادہ نہ ہو سکی کہ ان کی خواہش کے مطابق میں اخبار کے ذریعہ ان کے سوالات کا جواب دوں اس لیے اپنا جواب ان کی خدمت میں بھیج دیا اور لکھ دیا کہ میں خود تو اس کی اشاعت کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا لیکن اگر وہ ضرورت سمجھیں تو اپنے طور سے شائع فرما سکتے ہیں، چنانچہ وہ سوال و جواب ان کی طرف سے ایک مختصر نوٹ کے ساتھ اسی زمانے میں کچھ اخبارات میں شائع ہو گیا۔

حامیان سیکولرزم کی نوازشیں

میرا جواب اس خاص پس منظر کی بنا پر جس کی طرف میں نے اشارہ کیا بہت مختصر تھا۔ مزید برآں ڈاکٹر صاحب نے غالباً مذکورہ حلقوں کے ذوق یا ضرورت کی رعایت کی بنا پر اسے زیادہ سے زیادہ مختصر رکھنے کی تاکید بھی فرمائی تھی۔ لیکن اس کے باوجود جواب لکھتے وقت مجھے اپنی جگہ یہ پورا اطمینان تھا کہ اگر ڈاکٹر صاحب نے اس سوال و جواب کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا تو

عام ناظرین کو بھی جو خالی الذہن ہو کر یا کسی خاص بدگمانی کے بغیر اس کا مطالعہ کریں گے مجملاً جماعت کا موقف سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ زیادہ سے زیادہ بعض گوشوں کے سمجھنے کے لیے انہیں کچھ اور تفصیل کی ضرورت محسوس ہو سکتی ہے جسے پورا کرنے کے لیے ہمارا لٹریچر موجود ہے یا مزید سوال و جواب کے ذریعہ وہ پوری کی جا سکتی ہے لیکن ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہو رہا ہے کہ بعض حضرات نے اس سوال و جواب پر غور کیے بغیر اپنے طور سے ان کو کچھ معنی پہنائے ہیں اور ان کی بنیاد پر الٹے سیدھے اعتراضات اور اتہامات جماعت پر لگانا شروع کر دیے ہیں۔ ایسے ہی ہمارے ایک خاص کرم فرما جو ایک مشہور اخبار کے ایڈیٹر بھی ہیں اس سوال و جواب کی آڑ لے کر آج کل اپنے ناظرین کو یہ باور کرانے کی سعی میں مصروف ہیں کہ جماعت اسلامی پہلے تو سیکولرزم کی مخالفت کرتی رہی ہے لیکن اب وہ راہِ راست پر آ گئی ہے اور اس نے بھی انہی کی طرح سیکولرزم کا کلمہ پڑھنا شروع کر دیا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہی وہ یہ کوشش بھی فرما رہے ہیں کہ میں نے سیکولرزم کے بارے میں جماعت کا جو موقف واضح کیا ہے وہ خلافِ واقعہ ہے اور اس سے درحقیقت میرا منشا یہ تھا کہ لکھنؤ کے مسلم مشاورتی اجتماع میں شرکت کی اجازت حاصل کر سکوں۔ اب کون ان صاحب کو یہ بتائے کہ لکھنؤ کا اجتماع دہلی کا وہ کنونشن نہیں تھا جس کے وہ ایک سرگرم داعی تھے اور جس میں شرکت کے لیے سیکولرزم کا کلمہ پڑھنا شرطِ اول قرار دیا گیا تھا۔ اس قسم کی کسی شرط کا شاید تصور بھی لکھنؤ کے اجتماع کے ذمہ داروں کے ذہن میں نہ رہا ہوگا اور مجھے تو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہی بزرگ اپنے اس انکشاف سے پہلے مختلف طریقوں سے اپنے ناظرین کو یہ تاثر دینے کی بھی سعی فرما چکے ہیں کہ لکھنؤ کے اجتماع کی اصل کرتا دھرتا جماعت اسلامی ہی تھی۔ پھر کیا اسے اپنے داخلہ کے لیے بھی کسی کی اجازت کی ضرورت تھی۔

اور خیر کرتا دھرتا ہونے کی بات تو ان کی ایک خود ساختہ بات ہے جس سے ان کا مقصد اس اجتماع کو غلط شکل میں پیش کرنا رہا ہوگا۔ اور واقعہ کے خلاف ہونے کی بنا پر ہم پوری شدت سے اس کی تردید کرتے ہیں لیکن اتنی بات کسی انکسار کے بغیر ہمیں بھی تسلیم ہے اور جب وہ اپنی مہربانی سے جماعت کو اتنا اونچا مقام دینے پر راضی تھے تو اس کے لیے اس سے یہ کمتر درجہ تسلیم کرنے سے غالباً ان کو بھی انکار نہ ہوگا کہ اس اجتماع کے محرکین میں ہم بھی شروع سے شامل رہے ہیں اس لیے اس واقعی صورتِ حال میں بھی ہمیں اپنے لیے کسی کی اجازت کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہو سکتا تھا بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ اس کی وجہ سے ہمارے ان بزرگ کو نہ سہی ان کے کچھ دوستوں کو اس کی شکایت پیدا ہوئی جس کا اظہار خود ان کے اپنے اخبار کے ذریعہ بھی ہوا کہ لکھنؤ کے اجتماع میں وہ صاحب محض جماعت اسلامی کے رکن کی وجہ سے شریک نہیں کیے گئے حالانکہ ہمارا کہنا یہ ہے کہ اگر یہی ایسی بات ہوتی تو کوئی مذکور نہیں رکھتا اور وہ غالباً اپنی عدم شرکت کا جو سبب خود اچھی طرح واقف ہیں

ناظم جمعیۃ علماء کا سرکلر

مذکورہ سوال وجواب کو کس طرح استعمال کیا جا رہا ہے اس کا کچھ اندازہ مادہ پر کی سطروں سے ہوا ہوگا لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ جن بزرگ کی باتیں ہیں ان سے ہم اس سے مختلف کسی بات کی توقع کسی حال میں کر ہی نہیں سکتے۔ وہ اپنے افکار و خیالات اور شاید اپنے فرائض منصبی کی بنا پر بھی اس کے لیے مجبور ہیں کہ وہ اس طرح کے بہانے تلاش کر کے ہمارے اور ہر اس شخص یا جماعت کے خلاف کچھ نہ کچھ لکھتے رہیں جو ہندستان میں اسلام کے لیے اسلام کے نام پر کوئی خدمت پوری تندہی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں لیکن ہمیں سخت افسوس اور حیرت ہے کہ ایک دینی جماعت کے ایک ذمہ دار فرد نے بھی اس سوال وجواب کے ساتھ تقریباً ایسا ہی وطیرہ اختیار فرمایا ہے اور اسی انداز کی باتیں اپنے ایک جماعتی سرکلر میں بھی جو جماعت کی تمام شاخوں اور اس کے ارکان اور کارکنوں کے پاس بھیجا گیا ہے اور جو اس جماعت کے ترجمان میں بھی شائع ہوا ہے۔ تحریر فرمائی ہیں۔ آپ بھی اسے ملاحظہ فرمائیں۔

جمعیۃ علماء ہند کے رہنماؤں کی مسلسل جد وجہد کے بعد ہی ملک میں ایسے حالات پیدا ہو سکے کہ دوسرے حضرات بھی مسلمانوں کی خدمت کا نعرہ لگا کر میدان میں کھڑے ہونے کی ہمت کر سکیں۔ اس سے پہلے عملی میدان میں سامنے آنے کی وہ جرات نہ کر سکے۔ کیونکہ ان کا ماضی داغدار ہے اور فکر و عمل کے لحاظ سے وہ متحدہ قومیت کے اور سیکولرزم کے مخالف ہیں۔ آج اگر وہ اپنا مستقبل سنوارنے کی فکر میں متحدہ قومیت اور سیکولرزم کا دم بھرنے لگیں اور دستور ہند سے وفاداری کا اعلان کرنے لگیں تو یہ بھی جمعیۃ علماء ہند کی بہت بڑی کامیابی ہے کہ اس نے جو راستہ مسلمانان ہند کے واسطے تجویز کیا تھا وہی صحیح ہے اور آج دوسرے حضرات اپنے اپنے خوش نما نعروں کو چھوڑ کر اسی راستے پر آ رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے مسلم قیادت کے فقدان کا اعلان کرنے والے اور حکومت الٰہیہ و اقامت دین کا نعرہ لگانے والے لوگ اس ملک میں مسلمانوں کی خدمت کرنی چاہتے ہیں تو ان کو یہی راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔

یہ جمعیۃ علماء کے ناظم عمومی مولانا اسعد صاحب کے سرکلر کا ایک اقتباس ہے۔ اس میں جماعت اسلامی کا نام صراحت سے تو نہیں لیا گیا ہے لیکن متعدد ایسے اشارات اس میں موجود ہیں جن سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ مولانا کے طعن و تشنیع کے ہدف کون لوگ ہیں۔ حکومت الٰہیہ اور اقامت دین کے الفاظ اب ہمارے سوا کون استعمال کر رہا ہے؟ ہاں کچھ لفظوں سے یہ شبہہ ہو سکتا ہے کہ شاید مسلم لیگ بھی مولانا کے پیش نظر ہو۔ خصوصاً داغدار ماضی یا متحدہ قومیت کے الفاظ سے لیکن سب کو معلوم ہے کہ مسلم لیگ کا نصب العین حکومت الٰہیہ یا اقامت دین نہیں ہے اور اس کے برخلاف ہمیں یہ فخر بہر حال حاصل ہے کہ

جماعت دین ہمارا نصب العین بھی ہے اور مولانا کی نگاہ میں ہمارا ماضی یقیناً داغدار بھی ہوگا اور وہ اپنے نقطۂ نظر سے ہمیں متحدہ قومیت کا مخالف بھی سمجھ ہی سکتے ہیں۔

اس طرح یہ بات بھی واضح ہے کہ اس عبارت میں ہم پر جو طعن و تشنیع فرمائی گئی ہے اس کی اصل بنیاد میرا وہ جواب ہی ہے جس میں میں نے ڈاکٹر صاحب کے سوال پر سیکولرزم اور دستور کی وفاداری کے سلسلے میں جماعت کا موقف واضح کیا تھا کیونکہ اس کے سوا ادھر ہماری طرف سے اور کوئی ایسی بات نہیں کہی گئی ہے جس کا ان مسائل سے کوئی تعلق ہو یا جس سے ہمارے رویہ میں کسی تبدیلی پر استدلال کیا جاسکے۔

ان باتوں کو ذہن میں رکھ کر غور فرمائیں کیا مولانا کی باتیں اپنی روح منشا کے لحاظ سے ہمارے مذکورالصدر بزرگ کی باتوں سے بہت کچھ ملتی جلتی نہیں ہیں؟ مقام و موضوع کے لحاظ سے الفاظ اور ان کے سانچے ضرور مختلف ہیں اور اس لحاظ سے بھی دونوں میں فرق ہے کہ پہلے بزرگ نے جو کچھ کہا ہے جماعت اسلامی کا نام لے کر کہا ہے اور ان بزرگ نے نام لینے کی ضرورت نہیں سمجھی ہے لیکن ان بزرگ کی طرح آپ نے بھی بہت واضح اشارات کے ساتھ جماعت اسلامی کے بارے میں اپنے مخاطبین کے ذہن و دماغ پر یہ نقش مرتسم کرنا چاہا ہے کہ وہ پہلے تو سیکولرزم اور دستور کی وفاداری کی مخالفت کرتی رہی ہے لیکن اب اس نے بھی اس کا کلمہ پڑھنا شروع کر دیا ہے پھر انہی کی طرح آپ نے بھی ہماری اس ہبینہ تبدیلی کا ایک خاص خود غرضانہ محرک بھی تلاش کر لیا ہے' یہ اور بات ہے کہ وہ محرک اتنا گھٹیا نہیں ہے' جتنا ان بزرگ کا بیان کردہ محرک 'اجتماع لکھنؤ' میں شرکت کی اجازت حاصل کرنے کے مقابلے میں مستقبل کو سنوارنے کی فکر جس کے دائرے میں جان و مال کے تحفظ کے علاوہ پارلیمنٹ کی ممبری' وزارت و صدارت وغیرہ سب ہی چیزیں آسکتی ہیں؛ بہرحال ایک اونچا درجہ رکھتی ہے اور اس لحاظ سے وہ اپنی اس کرم فرمائی پر شکریہ کے مستحق سمجھے جاسکتے ہیں لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ہماری نگاہ میں یہ اونچا محرک بھی گھناؤنے پن کے لحاظ سے اس سے کم تر نہیں؛ بلکہ اس پر فائق ہی ہے کیونکہ یہ دین ہی نہیں' انسانی عزو شرف کی توہین ہے اور اس سے ہم اللہ کی پناہ چاہتے ہیں کہ دنیا کی کسی بڑی سے بڑی نعمت کے لیے انسان ضمیر فروشی پر آمادہ ہو اس لیے مولانا کی یہ مہربانی بھی شکریہ کے ساتھ واپس کی جاتی ہے لیکن سچ ہے کہ اس عبارت کی ان باتوں میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جسے ہم اپنے لیے قابل اعتنا یا لائق بحث سمجھیں۔ جب ایسی باتیں ایک مدیر شہیر عرصے سے ہمارے خلاف لکھتے رہے ہیں اور ہم نے ان کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا تو مولانا موصوف کی اس طرح کی باتیں بھی آسانی کے ساتھ نظر انداز کی جاسکتی تھیں لیکن جس بات نے ہمیں اس موضوع پر گفتگو کرنے پر مجبور کیا ہے وہ درحقیقت اس عبارت کا یہ پہلو ہے کہ میرے

جواب کے خودساختہ مفہوم کو صرف ہمارے خلاف طعن وطنز کے لیے استعمال نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس سے کچھ غلط باتوں کی تائید کا بھی کام لینے کی کوشش کی گئی ہے اور اس سے بھی بڑی بات یہ کہ اس میں اقامتِ دین جیسی شرعی اصطلاح کا بھی جس پر خود ان کے والد بزرگوار مرحوم نے بھی جماعت کی مخالفت کرتے ہوئے کبھی کوئی حرف گیری نہیں کی تھی اور جس کا مسلمانوں کا نصب العین ہونا خود جمعیۃ علماء کے بہت سے علماء کو اب بھی تسلیم ہے ایک طرح سے مذاق اڑایا گیا ہے۔ عبارت کی آخری سطر میں آپ خود ملاحظہ فرمائیں اس سے کس فکر و ذہن کی غمازی ہو رہی ہے اور مولانا کا مدعیانہ اندازِ کلام جرأت وجسارت کا کیسا نادر نمونہ پیش کر رہا ہے۔

بہرحال یہ صورتِ حال ہمارے لیے بہت مجبور کن ہے ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو اس وقت جو نازک حالات ومسائل درپیش ہیں ان میں ہمارے اندر کسی طرح کا بھی کوئی مناقشہ پیدا ہو اسے ہم اسلام اور مسلمانوں کی بہت بڑی بدقسمتی سمجھتے ہیں لیکن جب مولانا نے اپنی ذاتی حیثیت میں نہیں بلکہ جمعیۃ علماء ہند کے ایک ذمہ دار فرد ہونے کی حیثیت میں ہمارے خلاف غلط فہمیاں پھیلانی چاہی ہیں جن سے دین اور دینی تصورات کو بھی بہت کچھ نقصان پہنچ سکتا ہے تو چار و ناچار ہمیں ان کے تدارک کی کچھ فکر کرنی پڑے گی۔ لیکن حتی الوسع میں کوشش کروں گا کہ صرف اپنے موقف کی وضاحت یا اس کے سلسلے میں جو غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں ان کا ازالہ کر دینے پر اکتفا کروں اور مولانا نے ہم سے ہٹ کر اپنے سلسلے میں جو کچھ فرمایا ہے ان سے کوئی تعرض نہ کروں۔ ہم اپنی طرف سے خواہ مخواہ شکایت کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتے۔

سیکولرزم کا سوال وجواب

بہتر ہوگا کہ سب سے پہلے مذکورہ سوال وجواب پر ایک نگاہ ڈال لی جائے۔ ڈاکٹر صاحب کے سوال کے دو جز تھے ایک کا تعلق سیکولرزم سے تھا اور دوسرے کا دستورِ ہند سے پہلے ہم سیکولرزم ہی کے مسئلے پر گفتگو کرنی چاہتے ہیں اس لیے سیکولرزم کے سلسلے میں ان کا سوال پہلے ملاحظہ فرمائیں:۔

> کیا جناب والا اور جماعتِ اسلامی سیکولرزم کو مانتے ہیں یا نہیں۔ ہندوستان کے سیکولرزم کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ لادینیت کو فروغ دیا جائے بلکہ صاف مطلب یہ ہے کہ گورنمنٹ کا کوئی مذہب نہیں ہے جیسا کہ انگلستان میں وہاں کا بادشاہ عیسائی مذہب کا محافظ اور مددگار رکھا جاتا ہے۔

اس سوال کا میں نے جو جواب دیا تھا وہ کل ڈیڑھ دو سطروں پر مشتمل ہے اور وہ بعینہٖ یہ ہے۔

> سیکولرزم کی جو تعبیر آپ نے پیش فرمائی ہے اس کے ہم ہرگز مخالف نہیں ہیں لیکن اگر اس کے معنی الحاد کے ہوں

تو یقیناً ہم اس کے خلاف ہیں۔

میرے اس جواب کو اچھی طرح ذہن نشین کرکے آپ خود فرمائیں کیا اس میں کہیں یہ جملہ موجود ہے کہ جماعت اسلامی ہمیشہ سے سیکولرزم کو مانتی آرہی ہے۔ یا جو کچھ میں نے کہا ہے کم از کم اس کے معنی ہی یہ ہوسکتے ہوں۔ لیکن آپ ملاحظہ فرمائیں کہ ہمارے بھلے کرم فرمانے پہلے بعینہٖ یہی جملہ میری طرف منسوب فرمایا ہے اور پھر اسے غلط اور خلاف واقعہ ظاہر کرتے ہوئے مجھ پہ کذب بیانی کا الزام عائد فرمایا ہے حالانکہ اس بات کو میری طرف منسوب کرنا بجائے خود کذب بیانی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے اور جب وہ بات سرے سے غلط ہے تو پھر اس کے خلاف یا مطابق واقعہ ہونے کا سوال کھڑا کرنا ڈھٹائی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔ لیکن انھیں ان دونوں باتوں کے لیے معذور ہی سمجھنا چاہیے کیونکہ وہ کذب بیانی کے بغیر ہم پر کذب بیانی کا الزام عائد نہیں کرسکتے تھے اور اس طرح کے الزامات سے ہمیں نوازنا بہرحال ان کے لیے ضروری ہے اور اس بات کو خلاف واقعہ ظاہر کیے بغیر وہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو سچ بولنے اور جھوٹ سے نفرت کرنے کی وہ بزرگانہ نصیحت بھی نہیں فرما سکتے تھے جو انھوں نے اس ضمن میں فرمائی ہے جب کہ معلّمِ اخلاق کے روپ میں اپنے کو جلوہ گر کرنا بھی ان کے لیے ضروری ہی تھا ہے آخر کذب بیانی کے لیے کچھ پردہ پوشی تو ہونا ہی چاہیے

اب دوبارہ پھر ایک نظر میرے جواب پر ڈال لیں۔ کیا اس میں جو بات کہی گئی ہے ان بزرگ اور مولانا صاحب کے خیال کے مطابق اس کے معنی یہی ہوسکتے ہیں کہ ہم نے اب سیکولرزم کا دم بھرنا شروع کردیا ہے۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے اس جواب کے دو جز ہیں، پہلے جز میں ڈاکٹر صاحب کی پیش کردہ تعبیر کے بارے میں یہ بات کہی گئی ہے کہ ہم اس کے مخالف نہیں ہیں لیکن اس کے بعد ہی دوسرے جز میں صاف طور سے کہا گیا ہے کہ

"لیکن اگر اس کے معنی الحاد کے ہوں تو یقیناً ہم اس کے خلاف ہیں"

جس کے صاف معنی یہی ہوسکتے ہیں کہ اس جواب میں اگرچہ مذکورہ تعبیر سے اپنے مخالف نہ ہونے کا اظہار کیا گیا ہے لیکن اس تعبیر کو سیکولرزم کی قطعی و آخری تعبیر تسلیم نہیں کیا گیا ہے بلکہ دوسرے جز کے الفاظ سے اس کی دوسری تعبیر کی طرف بھی اشارہ کرتے ہوئے اس سے قطعیت کے ساتھ اپنے اختلاف کا اظہار کیا گیا ہے اب اگر کوئی شخص جو جواب کے دو حصوں میں موجود دو الگ الگ باتیں کہی گئی ہیں ان کو ملا کر ایک کردے اور اس کے معنی یہ قرار دے کہ ہم نے سیکولرزم کو چاہے وہ جس معنی میں بھی ہو قبول کرلیا ہے یا اب اس کے مخالف نہیں رہے ہیں تو اس کے بارے میں اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ یا تو بات سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا یا جان بوجھ کر اس کو غلط معنی

پھیلانا چاہتا ہے۔

پھر سخن فہمی یا تحریف کلام کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ میرے جواب میں مذکورہ تعبیر کے بارے میں بھی صرف یہ کہا گیا ہے کہ ہم اس کے مخالف نہیں ہیں لیکن یہ حضرات مخالف نہ ہونے کا مفہوم صحیح مان لینا قرار دے رہے ہیں گویا ان کے نزدیک دونوں مترادف الفاظ ہیں۔ بہر حال میرا جواب دو شقوں پر مشتمل ہے۔ ایک شق میں ڈاکٹر محمود صاحب کی پیش کردہ تعبیر کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ ہم اس کے مخالف نہیں ہیں اور دوسری شق میں اس سے مختلف ایک دوسرے مفہوم کے بارے میں اپنے قطعی اختلاف کا اظہار کیا گیا ہے اور اس سے کوئی غرض نہیں رکھی گئی ہے کہ سیکولرزم کا واقعی مفہوم ان میں سے کیا ہے۔ لیکن اگر یہ بات متعین ہو جائے کہ سیکولرزم کے معنی وہی ہیں جو ڈاکٹر محمود صاحب نے اپنے سوال میں پیش فرمایا ہے تو میں آج اس کا پھر اعادہ کرتا ہوں کہ ہم اس کے ہرگز مخالف نہیں ہیں مگر اس کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اگر سیکولرزم کے یہ معنی متعین نہ ہو سکیں بلکہ اس کے معنی الحاد کے ہوں تو میرے جواب سے یہ بھی واضح ہی ہے کہ ہم اس کے قطعی مخالف ہیں اور میں زور دے کر یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ ان شاء اللہ ہمیشہ اس کے مخالف ہی رہیں گے اور غالباً یہ بات ہمارے معترض صاحب بھی سمجھتے ہی ہوں گے کہ الحاد کے معنی صرف خدا کے انکار کے نہیں ہیں بلکہ اجتماعی معاملات میں خدائی احکام سے اپنے کو بے نیاز سمجھ لینا بھی الحاد ہی کی ایک قسم ہے اس لیے اس اعلان میں اس کی مخالفت کو بھی شامل سمجھنا چاہیے۔

ان دونوں بزرگوں نے جماعت اسلامی پر کھلے بندوں یا اشاروں میں مفاد پرستی، ابن الوقتی یا مستقبل سنوارنے کی فکر وغیرہ کا جو طعن کیا ہے اس کی بنیاد اس مفروضہ پر قائم ہے کہ میرے جواب میں سیکولرزم کے بارے میں کوئی نئی بات کہی گئی ہے جو پہلے نہیں کہی گئی تھی۔ بلکہ پہلے بزرگ نے تو بہت صاف طریقے سے اس کا اظہار کیا ہے یہ اور بات ہے کہ انھوں نے بعینہٖ میری بات کو کوئی نئی بات ثابت کرنے میں غالباً زحمت محسوس کی اس لیے انھوں نے جھوٹ کا سہارا لے کر میری اصل بات کو چھوڑ کر میری طرف جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔ یہ غلط بات منسوب کی کہ "جماعت اسلامی ہمیشہ سے سیکولرزم کو مانتی آ رہی ہے"۔ اور پھر یہ افسانے کر بیٹھ گئے کہ یہ بات خلاف واقعہ ہے کیونکہ "جماعت اسلامی برابر سیکولرزم کی مخالفت رہی ہے۔ بہر حال ان کی اس کاوش کا حاصل دراصل بھی میری بات کا نیاپن ہی ثابت کرنا ہے۔ اس لیے میرے اوپر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس کی تردید کرتے ہوئے یہ واضح کروں کہ میں نے واقعۃً کوئی نئی بات نہیں کہی ہے اس لیے مفاد پرستی وغیرہ کا طعن بھی کسی وقتی (باقی صفحہ ۲۰ پر)

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

(سید جلال الدین عمری)

وسائل و ذرائع امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے سلسلے میں ذرائع و وسائل کا سوال بہت اہم ہے یعنی یہ کہ معروف کے قائم کرنے اور منکر کے مٹانے کے لیے آدمی کن ذرائع کو اختیار کرسکتا ہے اور کن ذرائع کے اختیار کرنے کی اس کو اجازت نہیں ہے۔ امام غزالی نے اس سوال سے بڑی تفصیلی بحث کی ہے لیکن وہ ان ذرائع کو احتساب کے مختلف درجات سے تعبیر کرتے ہیں اور علامہ عبدالقادر عودہ نے ان کو دفع منکر کے وسائل کا نام دیا ہے[۱]۔ ہم یہاں امام غزالی کی بحث کو بہت ہی اختصار کے ساتھ پیش کریں گے۔ فرماتے ہیں احتساب کے حسب ذیل آٹھ درجات ہیں:-

پہلا درجہ۔ احتساب کرنے والے کو اس بات کا علم ہو کہ فلاں شخص منکر کا ارتکاب کررہا ہے لیکن اس کے لیے تجسس کرنا اور کسی کی ٹوہ میں لگے رہنا صحیح نہیں ہے۔ ہاں اگر کسی کو از خود اس کا علم ہو جائے تو وہ اس کے سلسلے میں اقدام کرسکتا ہے۔

دوسرا درجہ:- بعض اوقات انسان منکر کو منکر نہیں تصور کرتا بلکہ معروف سمجھنے لگتا ہے اور اپنی اسی ناواقفیت کی وجہ سے اس کا ارتکاب بھی کر گزرتا ہے۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ جو کام وہ کررہا ہے وہ خدا کے نزدیک ناپسندیدہ اور اس کے عقاب کا مستوجب ہے تو وہ یقیناً اس سے دستکش ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں اس کو یہ بتانا کافی ہے کہ اس کا عمل غلط ہے اور اسے اس سے باز رہنا چاہیے۔

تیسرا درجہ:- اگر کوئی شخص منکر کو منکر سمجھنے کے باوجود اس کا ارتکاب کررہا ہے یا معروف کو معروف سمجھنے کے باوجود اس کی مخالفت کررہا ہے تو اسے خدا کا خوف دلایا جائے۔ آخرت کی باز پرس سے ڈرایا جائے اور ترہیب و ترغیب میں اس کے سامنے سلف صالحین کی سیرت پیش کی جائے تاکہ وہ ان چیزوں کا اثر

---

[۱] التشریع الجنائی [illegible]

قبول کرے اور معصیت کا ارادہ ترک کر دے۔

چوتھا درجہ:۔ اگر لطف و محبت سے سمجھانے اور نصیحت کے باوجود کوئی شخص منکر سے باز نہ آئے تو اسے سخت سست کہا جائے اور اس کی ملامت کی جائے۔ لیکن اس میں اس بات کی احتیاط ہونی چاہیے کہ بدزبانی اور گالم گلوج نہ ہونے پائے۔

پانچواں درجہ:۔ وعظ و نصیحت اور سخت کلامی کارگر نہ ہو تو منکر کو قوت سے مٹایا جائے۔ مثال کے طور پر گانے بجانے کا سامان توڑ دیا جائے یا کوئی مرد ریشم کا کپڑا پہنے ہوئے ہو تو اسے پھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ لیکن اس پر عمل ہر منکر کے سلسلے میں ممکن نہیں ہے۔ جن منکرات کا ابھی ذکر ہوا ہے وہ یا اس نوعیت کے دوسرے منکرات کو تو قوت سے مٹایا جا سکتا ہے لیکن جن منکرات کا تعلق محض زبان یا دل سے ہے یا جو منکر کا ارتکاب کرنے والے کی ذات تک محدود ہوتے ہیں ان کے سلسلے میں اس پر عمل ممکن نہیں ہے۔

چھٹا درجہ:۔ منکر کا ارتکاب کرنے والے کو ڈرایا اور دھمکایا جائے۔ لیکن اس میں یہ بات ملحوظ رہے کہ دھمکی ایسی نہ دی جائے جس پر عمل کرنا شرعاً حرام ہو۔ مثال کے طور پر یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ منکر سے باز آؤ ورنہ تمہارا سر توڑ دوں گا لیکن یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ منکر سے باز آؤ ورنہ میں تمہارا گھر لوٹ لوں گا' یا تمہارے بچے کو قتل کر دوں گا۔

ساتواں درجہ:۔ منکر کا ارتکاب کرنے والے کو مارا پیٹا جائے اور اس کے خلاف ہتھیار نہ استعمال کیے جائیں لیکن اگر ہتھیار اٹھائے بغیر منکر کے مٹانے کی کوئی صورت نہ ہو تو ہتھیار اٹھائے جائیں اور ضرورت کی حد تک ان کو استعمال کیا جائے۔

آٹھواں درجہ:۔ کوئی شخص تنہا منکر کے مٹانے پر قادر نہ ہو اور اس کے لیے دوسروں سے تعاون حاصل کرے۔[1]

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ان مختلف ذرائع کو ہم دو عنوانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک اصلاح بذریعہ نصیحت اور دوسرا اصلاح بذریعہ قوت۔ ان دونوں قسم کے ذرائع پر عمل بھی مذکورہ ترتیب ہی سے ہوگا یعنی پہلے وعظ و نصیحت اور لطف و محبت سے اصلاح کی کوشش کی جائے گی، اگر یہ کوشش بے سود ہو جائے تو قوت اور زور سے اصلاح کا نفاذ ہوگا۔ بہرحال جب تک پہلے ذریعہ کی عدم افادیت کا یقین نہ ہو جائے

---

[1] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۲۹۲ - ۲۸۹

دوسرے ذریعہ کو اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن مجید میں ہے:۔

وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ (الحجرات: ۹)	اور اگر مومنوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو تم ان کے درمیان صلح کرا دو۔ پھر اگر ان میں سے ایک دوسری پر زیادتی کرے تو تم سب مل کر اس جماعت سے لڑو جو زیادتی کرتی ہے یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع کرے پس اگر وہ رجوع کرے تو تم ان کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے

اس آیت میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر ان میں کے دو گروہ کسی وجہ سے آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ اصلاح کی کوشش کی جائے، لیکن اگر کوئی فریق عدل و انصاف کے سامنے سر جھکانے کے لیے تیار نہ ہو تو مظلوم کی حمایت میں اس سے جنگ کی جائے۔ گویا پہلے سعی اصلاح کی ہدایت کی گئی ہے، اگر یہ کوشش بے کار ہو جائے تو قتال کا حکم ہے۔ اسی وجہ سے علماء نے بالاتفاق یہ بات کہی ہے کہ اگر وعظ و نصیحت کے ذریعہ اصلاح ہو سکتی ہے تو طاقت کا استعمال صحیح نہیں ہے۔ ہم چند علماء کی تصریحات یہاں پیش کرتے ہیں:۔

ابوبکر جصاص:۔

امر اللہ تعالٰی بالدعاء الی الحق قبل القتال ثم ان ابت الرجوع قوتلت[1]	اللہ تعالٰی نے قتال سے پہلے حق کی طرف بلانے کا حکم دیا ہے۔ اس کے بعد جو فریق حق کی طرف رجوع سے انکار کر دے اس سے جنگ کی جائیگی

زمخشری:۔

یبتدی بالسھل فان لم ینفع ترقی الی الصعب[2]	آسان طریقہ سے ابتدا کی جائے گی۔ اگر وہ غیر مفید ثابت ہو تو اگلا مرحلہ یہ ہوگا کہ مشکل طریقہ اختیار کیا جائے۔

[1] احکام القرآن ج ۳ ص ۴۹۲ [2] الکشاف عن حقائق التنزیل مطبوعہ کلکتہ ۱۲۷۶ھ ج ۱ ص ۲۲۴-۲۲۵

ابن عربی مالکی

ان اللہ سبحانہ امر بالصلح قبل القتال وعین لقتال عند البغی[1]	اللہ تعالیٰ نے قتال سے پہلے صلح کا حکم دیا ہے اور قتال کا تعین اس وقت کیا ہے جبکہ اس سے بغاوت ہو۔

ابو عبداللہ قرطبی :۔

فالمنکر اذا امکنت ازالتہ باللسان للناھی فلیفعل وان لم یمکنہ الا بالعقوبۃ او القتل فلیفعل فان زال بدون القتل لم یجز القتل[2]	منکر کا ازالہ جب اس کے منع کرنے والے کے لیے زبان کے ذریعہ ممکن ہو تو اسی کو اختیار کرے اور اگر اس کا ازالہ سزا یا قتل ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہو تو اسے بھی اختیار کر سکتا ہے لیکن قتل کے بجائے اس سے کم تر کسی طریقے سے ازالہ منکر ہو سکے تو قتل کرنا جائز نہیں ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے سلسلے میں طاقت کو کام میں لانے سے پہلے اصلاح کی کوشش کی جائے گی۔ اس کا حق ہر مسلمان کو حاصل ہے بلکہ یہ اس کی شرعی ذمہ داری ہے کہ معروف کی تبلیغ کرے اور منکر کے خلاف آواز اٹھائے۔ البتہ طاقت کے استعمال کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کی اجازت شریعت نے ہر اس شخص کو دے رکھی ہے جس کے پاس طاقت ہو یا یہ صرف حکومت کا حق ہے۔ اس سوال پر علماء نے بڑی لمبی بحثیں کی ہیں۔ ہم ان کے خیالات کو یہاں بہت ہی اختصار کے ساتھ پیش کریں گے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے سلسلے میں طاقت کے استعمال کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی شئے منکر کو ہم مٹانا چاہیں اور اس کے خلاف طاقت کو کام میں لائیں۔ مثلاً شراب بہا دی جائے یا گانے بجانے کا سامان توڑ دیا جائے۔ دوسری صورت یہ کہ طاقت کا استعمال شئے منکر کے خلاف نہیں بلکہ منکر کا ارتکاب کرنے والے کے خلاف کیا جائے۔ مثلاً ایک شخص زنا کرنے جا رہا ہے اسے مار پیٹ کر اس سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے۔ اگر اس سے بھی وہ باز نہ آئے تو اسے قتل کر دیا جائے۔

پہلی صورت کے بارے میں امام غزالی فرماتے ہیں :۔

کسر الملاھی واراقۃ الخمور فانہ تعاطی ما یعرف کونہ حقا من غیر	آلات لہو ولعب کا توڑ دینا اور شراب کا بہا دینا تو یہ ایسی چیز ہے کہ جس کا حق ہونا بغیر

[1] احکام القرآن ج ۲ ص ۲۲۲ [2] الجامع لاحکام القرآن ج ۴ ص ۴۹

اجتهاد فلم يفتقر الى الامام[1]

کسی اجتہاد کے معروف ہے۔ تو یہ کام امام کی اجازت کا محتاج نہیں ہے

قاضی عیاض کہتے ہیں:۔

حق المغيرات يغيره بكل وجه امكنه زواله به قولا كان او فعلا فيكسر آلات الباطل ويريق المسكر بنفسه او يامر من يفعله وينزع الغصوب ويردها الى اصحابه بنفسه او بامره اذا امكنه[2]

تغییر منکر کرنے والے کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ منکر کو ہر اس طریقے سے مٹا دے جس سے اس کا مٹانا ممکن ہو خواہ وہ قول کے ذریعہ ہو یا عمل کے ذریعہ۔ پس وہ یا تو خود ہی آلات باطل کو توڑے گا اور شراب بہائے گا۔ یا کسی ایسے شخص کو حکم دے گا جو اس کام کو انجام دے۔ اسی طرح وہ غصب شدہ چیز کو چھین کر اس کے مالک کے حوالے یا تو خود ہی کرے گا یا اس کے حکم سے کوئی دوسرا یہ کام کرے گا جب کہ یہ سب کچھ اس کے امکان میں ہو۔

حافظ ابن قیم فرماتے ہیں:۔

لا ضمان فی کسر اوانی الخمر وشق زقاقه[3]

شراب کے برتنوں اور اس کے مشکوں کو توڑنے میں کوئی ضمان نہیں ہے۔

امام غزالی اور قاضی عیاض شافعی المسلک ہیں اور حافظ ابن قیم امام احمدؒ کے متبع ہیں۔ اس لیے ان تینوں حضرات نے شافعی اور حنبلی فقہ کی ترجمانی کی ہے۔ لیکن احناف اس مسئلے میں کافر کی ملکیت اور مسلمان کی ملکیت میں فرق کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس شیئِ منکر کو تلف کیا گیا ہے اس کا مالک مسلمان ہے تو یقیناً اس کا کوئی تاوان اسے نہیں دلوایا جائے گا۔ خواہ اس کا تلف کرنے والا کوئی کافر ہو یا مسلمان۔ کیونکہ ایک مسلمان کے نزدیک کسی ناجائز چیز کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس تلف شدہ چیز کا مالک کافر ہے تو اس کو لازماً اس کا تاوان دلوایا جائے گا قطع نظر اس سے کہ اس کا تلف کرنے والا مسلمان ہے یا کافر۔ کیونکہ اس کے نقطۂ نظر سے اس کی قیمت چیز تلف کی گئی ہے۔ علامہ کاسانی فرماتے ہیں۔

---

[1] احیاء علوم الدین ج ۲ صفحہ ۲۷ [2] شرح مسلم للنووی ج ۱ ص ۵۱ [3] الطرق الحکمیہ فی السیاسۃ الشرعیہ صفحہ ۲۵۶

لا یجب الضمان باتلاف الخمر	(کسی مسلمان کی) شراب اور سؤر کو کوئی تلف
والخنزیر علی المسلم سواء کان	کر دے تو اسے تاوان نہیں ملے گا۔ خواہ اس کا
المتلف مسلما او ذمیا لسقوط تقوم	تلف کرنے والا مسلمان ہو یا ذمی۔ کیونکہ مسلمان کے
الخمر والخنزیر فی حق المسلم و	حق میں شراب اور سور کی قیمت ساقط ہو جاتی ہے
لو اتلف مسلم او ذمی علی ذمی	لیکن اگر کوئی مسلمان یا ذمی کسی ذمی کی شراب یا
خمرا او خنزیرا یضمن	سور کو تلف کر دے تو وہ ہمارے (حنفیہ) نزدیک
عندنا خلافا	تاوان دے گا۔ امام شافعی کو اس سے اختلاف
للشافعی [1]	ہے (وہ اس دوسری صورت میں بھی تاوان کے
	قائل نہیں ہیں۔)

یہ گفتگو کسی منکر شے کے خلاف طاقت کے استعمال سے متعلق تھی۔ اب ہمیں منکر کا ارتکاب کرنے والے کے خلاف طاقت کے استعمال کے بارے میں اہل علم کا نقطہ نظر معلوم کرنا ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سلسلے میں عام افراد صرف ان ہی طریقوں کو استعمال کر سکتے ہیں جن میں طاقت کے استعمال کی ضرورت نہ ہو۔ طاقت کے استعمال کا حق حکومت کو ہے، عوام کو نہیں۔ علامہ قرطبی کہتے ہیں:۔

قال العلماء: الامر بالمعروف	علماء نے کہا ہے کہ قوت کے ذریعہ امر بالمعروف
بالید علی الامراء وباللسان علی العلماء	کا فرض انجام دینا حکام کی، زبان کے ذریعہ انجام
وبالقلب علی الضعفاء یعنی عوام	دینا علماء کی اور دل کے ذریعہ انجام دینا عوام
الناس [2]	کی ذمہ داری ہے۔

لیکن اس رائے سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ اسلام نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا جو نظام مقرر کیا ہے اس سے یہ رائے مطابقت نہیں رکھتی۔ اسلام ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ اگر کہیں معصیت کا ارتکاب ہو رہا ہے تو معاشرے کا ایک عام فرد اسے دیکھ کر خاموش ہو جائے بلکہ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ جو بھی شخص منکر کو دیکھے تو اسے نرمی اور محبت سے مٹانے کی کوشش کرے اور اگر اس میں کامیاب نہ ہو تو بزور اسے مٹا دے۔ علامہ عبدالقادر عودہ شہید ارتکاب جرم کے بارے میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے پہلو سے بحث کرتے ہوئے

[1] بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج ۷ ص ۱۶۷ [2] الجامع لاحکام القرآن ج ۴ ص ۴۹

لکھتے ہیں :-

اذا شوهد الجاني وهو يرتكب الجناية كان لاى شخص ان يمنعه من القوة عن ارتكاب الجريمة وان يستعمل القوة اللازمة لمنعه سواء كانت الجريمة اعتداء على حقوق الافراد كالسرقة او اعتداء على حقوق الجماعة كشرب الخمر والزنا وهذا ما يسمى بحق الدفاع الشرعي العام[1]

جب مجرم اس حال میں دیکھا جائے کہ وہ جرم کا ارتکاب کر رہا ہے تو ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اسے جرم کے ارتکاب سے بزور روکے اور اس کو روکنے کے لیے جو ضروری قوت درکار ہے اسے استعمال کرے خواہ جرم کی نوعیت افراد کے حقوق پر زیادتی کی ہو جیسے چوری، یا جماعت کے حقوق پر زیادتی کی جیسے شراب نوشی اور زنا۔ یہ وہ چیز ہے جسے شریعت کے عمومی دفاع کا حق کہا جاتا ہے۔

علامہ ابوبکر جصاص نے اس موضوع پر بڑی مدلل اور تفصیلی بحث کی ہے۔ ہم یہاں اس کے ضروری حصے تھوڑی سی ترتیب بدل کر نقل کرتے ہیں۔

"امر بالمعروف ونہی عن المنکر جن حالات میں انجام دیا جاتا ہے وہ دو طرح کے ہو سکتے ہیں۔ ایک حالت تو یہ کہ اس میں تغییر منکر ممکن ہی نہ ہو اور دوسری حالت یہ کہ اس میں منکر کو بدلنا اور اسے دور کرنا ممکن ہوگا۔ اس صورت میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ جو شخص اس کو اپنے ہاتھ سے دور کرنے کی طاقت رکھتا ہو اس کا فرض ہے کہ اسے اپنے ہاتھ سے دور کر دے۔ اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ منکر کا ازالہ بغیر تلوار اٹھائے اور بغیر منکر کا ارتکاب کرنے والے کو ختم کیے ناممکن ہو جائے۔ ایسی صورت میں اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی یہ دیکھے کہ ایک شخص اس کے یا کسی دوسرے کے قتل کا ارادہ کر رہا ہے، یا اس کا مال چھیننا چاہتا ہے یا یہ کہ کسی عورت کے ساتھ زنا کرنے یا اسی طرح کی اور کوئی سنگین حرکت کرنے جا رہا ہے اور ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر اس کو زبان سے سمجھایا جائے یا بغیر ہتھیار کے اس کی مزاحمت کی جائے تو وہ باز نہیں آئے گا، تو لازماً اسے اس بدکار کو قتل کر ہی دینا چاہیے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم سے جو بھی شخص منکر کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے۔" پس جب تغییر منکر کی اگر کوئی صورت سوائے اس کے نہ رہ جائے کہ منکر کا ارتکاب کرنے والے کو ختم کر دیا جائے تو ضروری ہے کہ اسے ختم ہی کر دیا جائے

[1] التشریع الجنائی ص۸۶

امام محمد فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی کا مال غصب کر لے تو آپ کو اجازت ہے کہ اسے قتل کر دیں اور سامان اس کے مالک کے حوالے کر دیں۔ اسی طرح امام ابو حنیفہؒ نقب زن کے بارے میں فرماتے ہیں کہ آپ اس کو قتل کر سکتے ہیں۔ اس سے آگے یہ بھی ان کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارا دانت توڑنا چاہے تو تم اس کی جان لے سکتے ہو، بشرطیکہ تم ایسے حالات میں گھر جاؤ کہ اس کے خلاف کوئی تمہاری مدد کرنے والا نہ ہو۔

یہی بات ہم ان افراد کے بارے میں بھی کہیں گے جو لوگوں سے غیر قانونی ٹیکس وصول کرتے ہیں یعنی یہ کہ وہ مباح الدم ہیں اور مسلمانوں پر ان کا قتل کرنا واجب ہے۔ ہر فرد کو اس کی اجازت ہے کہ ان میں سے جس کسی کے قتل پر بھی وہ قادر ہو اسے قتل کر دے۔ اس کے لیے ان کو پہلے سے نہ تو سمجھانے بجھانے کی ضرورت ہے اور نہ تنبیہ کرنے کی۔ کیونکہ وہ اسے ناجائز سمجھنے کے باوجود کیے جا رہے ہیں۔ اس لیے ان کو نصیحت کرنا بے فائدہ ہے۔ وہ کبھی اس کو قبول نہیں کریں گے۔ اسی طرح انہیں تنبیہ کرنے کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ جو شخص ان کے منکر کو ختم کرنا چاہتا ہے وہ اگر ان کو پہلے سے ڈرائے اور اپنے ارادے آگاہ کر دے تو وہ اس سے بچنے لگیں گے۔ اس طرح اس کے لیے ان کے منکر کو مٹانا ناممکن ہو جائے گا۔

یہی حکم ہے ان تمام لوگوں کے بارے میں جو بڑے بڑے اور تباہ کن معاصی پر جمے ہوئے ہوں اور علی الاعلان ان کا ارتکاب کرتے ہوں یعنی امکان کی حد تک ان پر نکیر کرنا اور طاقت ہو تو ان کے عمل کو روکنا واجب ہے۔

اوپر جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کی دلیل قرآن کی یہ آیت ہے۔ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ (تم ان سے لڑو یہاں تک کہ بغاوت کرنے والا فریق خدا کے حکم کی طرف رجوع کر لے) اس میں اللہ نے باغی فریق سے اس وقت تک جنگ کرنے کا حکم دیا ہے جب تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف لوٹ نہ جائے اور اپنی بغاوت اور منکر کو چھوڑ نہ دے۔"[1]

اس سے معلوم ہوا کہ تغییر منکر کے لیے انسان وقت ضرورت کسی شخص کی جان بھی لے سکتا ہے۔ خواہ وہ یہ فرض اپنی ذات کی مدافعت میں انجام دے یا کسی دوسرے کی مدافعت میں، فرد کی حمایت میں انجام دے یا معاشرے کی حمایت میں لیکن یہ اقدام اسی وقت صحیح ہوگا جب کہ اس سے فی الواقع منکر کے مٹنے اور معروف کے قائم ہونے کی توقع ہو اور کوئی فتنہ نہ پیدا ہو۔ امام غزالی فرماتے ہیں کہ عام افراد کو اس کا حق ہے کہ منکر کا ارتکاب

---

[1] احکام القرآن ج ۲ ص ۳۶، ۳۷

کرنے والے کو وقتِ ضرورت زد و کوب کریں لیکن اس کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی اجازت اسی وقت ہو گی، جب کہ اس سے فتنے کے پیدا ہونے کا خطرہ نہ ہو۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ امام غزالیؒ نے احتساب کے آٹھ درجات بیان کیے ہیں، ان میں سے ساتویں درجے کے ذیل میں لکھتے ہیں :-

الدرجة السابعة مباشرة الضرب باليد والرجل وغير ذالك مما ليس فيه شهر سلاح وذالك جائز للآحاد وبشرط الضرورة والاقتصار على قدر الحاجة في الدفع فاذا اندفع المنكر فينبغي ان يكف .... فان احتاج الى شهر سلاح وكان يقدر على دفع المنكر بشهر السلاح وبالجرح فله ان يتعاطى ذالك ما لم تثر فتنة [له]

ساتواں درجہ احتساب کا یہ ہے کہ منکر کا ارتکاب کرنے والے کو ہاتھ اور پیر سے مارا جائے یا کوئی ایسی سزا دی جائے جس میں ہتھیار کا استعمال نہ ہو۔ یہ عام افراد کے لیے جائز ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ ضرورت کے وقت یہ اقدام کیا جائے اور منکر کو دفع کرنے کے لیے جس قدر اقدام کی حاجت ہے اسی پر اکتفا کیا جائے۔ جب منکر دفع ہو جائے تو رک جانا چاہیے ...... اگر احتساب کرنے والا ہتھیار نکالنے کی ضرورت محسوس کرے اور وہ اس کو استعمال کر کے اور منکر کا ارتکاب کرنے والے کو زخمی کر کے منکر کو دفع کرنے کی طاقت رکھتا ہو تو اس پر عمل کی اس کو اجازت ہے بشرطیکہ اس سے کوئی فتنہ نہ پیدا ہو۔

اب تک ہم نے اس سوال سے بحث کی تھی کہ منکر کا ارتکاب کرنے والے فرد کے خلاف اسلامی ریاست کا کوئی شہری قوت کا استعمال کر سکتا ہے یا نہیں؟ اس کے بعد دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر منکر کا ارتکاب کوئی جماعت کر رہی ہو یا کوئی ایسا شخص کر رہا ہو جس کا مقابلہ تنہا کوئی فرد نہ کر سکے تو کیا وہ اپنے ہم خیال لوگوں کو جمع کر کے اس کے منکر کو مٹانے کی کوشش کر سکتا ہے؟ یہ سوال اہم بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔ کیونکہ اس طرح کے کسی اقدام میں جہاں منکر کے مٹنے اور معروف کے قائم ہونے کا امکان ہے وہاں فتنہ و فساد کا زبردست خطرہ

له احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۲۹۱-۹۲

ہے۔ امام غزالی فرماتے ہیں :۔

اما جمع الاعوان وشهر الاسلحة فذلك قد يجر الى فتنة عامة ففيه نظر[۱]

مدد کرنے والوں کو جمع کرنا اور ہتھیار کا نکال لینا، یہ ایسا اقدام ہے جو کبھی عمومی فتنہ کا سبب بن سکتا ہے اس لیے یہ قابلِ غور مسئلہ ہے۔

خود امام غزالی کی رائے اس مسئلے میں یہ ہے کہ تغییرِ منکر کے لیے انسان کو اپنے اعوان وانصار کو جمع کرنے اور جنگ کرنے کی ضرورت کم ہی پڑ سکتی ہے۔ لیکن اگر ضرورت پڑے تو وہ اپنے اعوان وانصار کے ساتھ منکر کو مٹانے کے لیے جنگ بھی کر سکتا ہے۔ انھوں نے احتساب کے جو آٹھ درجات بیان کیے ہیں ان میں آٹھواں اور سب سے آخری درجہ یہ ہے کہ "آدمی تغییرِ منکر پر خود قادر نہ ہو اور اس کے لیے ایسے معاونین کا محتاج ہو جو ہتھیار استعمال کر سکتے ہوں۔ اس صورت میں جس فاسق سے مقابلہ ہے، بسا اوقات وہ بھی اپنے اعوان وانصار سے مدد طلب کر سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ دونوں گروہ صف آرا ہو جائیں اور ایک دوسرے سے جنگ کریں۔ اس صورت کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا اس کے لیے امام کی اجازت کی ضرورت ہے یا نہیں؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عام افراد اس کو اپنے طور پر نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس سے فتنوں کو حرکت ہوگی، فساد پھیلے گا اور ملک برباد ہوگا۔ اس کے برعکس بعض دوسرے اصحاب کا خیال ہے کہ اس کے لیے امام کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ عام افراد کو جب امر بالمعروف کی اجازت ہے اور اس کا پہلا درجہ دوسرے درجے کی طرف اور دوسرا درجہ تیسرے درجے کی طرف لے جاتا ہے۔ تو یہ لامحالہ کبھی آٹھویں درجے تک بھی پہنچا سکتا ہے اور مار پیٹ کی نوبت بھی آ سکتی ہے۔ مار پیٹ میں اس کا بھی امکان ہے کہ دوسروں سے مدد حاصل کرنی پڑے۔ پس جب امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض انجام دینا ہی ہے تو اس راہ کے فطری لوازم کی خواہ وہ کتنے ہی سنگین کیوں نہ ہوں، پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ اس کی آخری حد خدا کی راہ میں صف آرائی اور اس کے معاصی کو مٹانا ہے۔ جب ہم عام سپاہیوں کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ خود آپس میں متحد ہو کر اہلِ کفر کے مختلف فرقوں کے قلع قمع کے لیے جنگ کر سکتے ہیں تو اسی طرح اہلِ فساد کا قلع قمع بھی عام افراد کے لیے جائز ہونا چاہیے۔ مختصر یہ کہ احتساب کے سلسلے میں معاملہ کا اس حد تک پہنچنا شاذ و نادر ہی ہے لیکن اس سے قیاس کو بدلا نہیں جا سکتا۔"[۲]

---

۱ احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۲۷۶ ۲ ایضاً ص ۲۹۲

امام غزالی کی اس رائے سے پوری طرح اتفاق کرنا دشوار ہے۔ اگر کسی ریاست کے شہری ایک دوسرے کے خلاف طاقت کو اس وسیع پیمانے پر استعمال کرنے لگیں جس کی امام موصوف نے اجازت دی ہے تو امن و امان کبھی باقی نہیں رہ سکتا۔ بلکہ ایسا انتشار پھیلے گا کہ خود حکومت بھی اس پر قابو نہیں پاسکے گی۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تغییر منکر کے لیے جب ایک فرد دوسرے فرد کو قتل کرسکتا ہے تو اسی مقصد کے لیے کسی جماعت کو دوسری جماعت کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی اجازت کیوں نہیں ہے؟

اس سوال کو حل کرنے کے لیے ہمیں دو باتوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔

پہلی بات یہ کہ جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے سلسلے میں کوئی بھی فرد کسی شخص کے قتل کا اقدام اسی وقت کرسکتا ہے جب کہ اس سے کسی فتنے کے پیدا ہونے کا خطرہ نہ ہو۔ اگر فتنے کا خطرہ موجود ہو تو یہ اجازت ختم ہوجائے گی اور اس کے لیے اقدام قتل ناجائز ہوگا۔

اس بنیاد پر جب آپ اس سوال پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ جماعت کا معاملہ افراد کے معاملے سے مختلف ہے۔ تغییر منکر کے لیے اگر ایک فرد دوسرے فرد کے خلاف قوت کا استعمال کرتا ہے تو اس میں فتنہ کا اتنا خطرہ نہیں ہے جتنا کہ ایک جماعت کے دوسری جماعت کے خلاف ہتھیار اٹھانے میں ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ افراد کے معاملے میں فتنہ وفساد کا خطرہ اگر ایک درجہ کا ہے تو جماعتوں کے معاملے میں یہ بڑھ کر سو درجہ کا ہوجاتا ہے۔ اس لیے جماعتوں کو بعینہٖ افراد پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے

دوسری بات یہ کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے سلسلے میں بلاشبہ افراد کو بوقت ضرورت کسی کی جان لینے کی بھی اجازت ہے لیکن یہ اجازت بہت ہی ناگزیر حالات میں دی گئی ہے۔ ورنہ عام حالات میں تو علماء نے صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ اس کام میں جہاں جنگ اور قتال کی نوبت آئے وہاں اسے حکومت کے حوالے کردینا چاہیے۔ ذیل میں ہم دو تین علماء کی تصریحات پیش کرتے ہیں۔

اگر کوئی فرد تغییر منکر کے لیے ہتھیار اٹھائے تو ابن عربی مالکی اس کی مخالفت کرتے ہیں الا یہ کہ منکر کی نوعیت ایسی ہو کہ اس کے خلاف ہتھیار کا اٹھانا ضروری ہوجائے۔ اور نہ اٹھانے میں کسی بڑے منکر کے وجود میں آنے کا خطرہ ہو۔ مثال کے طور پر کوئی شخص کسی کی جان لینے کے درپے ہو تو اس کو بچانے کے لیے ظالم کا مقابلہ کیا جائے۔ اس طرح کے مخصوص حالات سے ہٹ کر عام حالات میں ان کا فتویٰ یہ ہے کہ:-

فان لم یقدر الا بمقاتلۃ و اگر کوئی شخص تغییر منکر پر سوائے اس کے کسی

سلاحہ فلیترکہ وذالک انما ھو الی السلطان لان شھر السلاح بین الناس قد یکون مخرجا الی الفتنة ومؤدیا الی فساد اکثر من الامر بالمعروف والنھی عن المنکر[1]

دوسری صورت سے قادر نہ ہو کہ جنگ کرے اور ہتھیار اٹھائے تو اس کو چھوڑ دے کیونکہ یہ اس کا کام نہیں بلکہ حاکم کا کام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام لوگوں کے درمیان ہتھیار کا نکل آنا بعض اوقات فتنے کا سبب بن جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں ایسا فساد پیدا ہوتا ہے جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فائدے کے مقابلے میں بہت بڑا ہوتا ہے

امام الحرمین فرماتے ہیں:-

یسوغ لآحاد الرعیة ان یصد مرتکب الکبیرة ان لم یندفع عنھا بقولہ ما لم ینتہ الامر الی نصب قتال وشھر سلاح فان انتھی الامر الی ذالک ربط الامر بالسلطان[2]

(اسلامی سلطنت کی) رعایا میں سے ہر فرد کے لیے جائز ہے کہ وہ معصیت کبیرہ کا ارتکاب کرنے والے کی مزاحمت کرے اور اسے اس سے روکے اگر وہ نصیحت اور بات چیت کے بعد بھی معصیت سے دور نہ رہے۔ لیکن یہ اجازت اسی وقت ہے جب کہ نوبت دونوں کے درمیان جنگ کی نہ آجائے۔ اگر معاملہ اس حد کو پہنچ جائے تو وہ حاکم سے متعلق ہو جائے گا۔

علامہ جار اللہ زمخشری کہتے ہیں:-

الانکار الذی بالقتال فالامام وخلفاؤہ اولی لانھم اعلم بالسیاسة ومعھم عدتھا[3]

جنگ کے ذریعہ نہی عن المنکر کا حق امام اور اس کے خلفاء کو ہے (نہ کہ عوام کو) کیونکہ وہ سیاست سے زیادہ واقف ہیں اور ان کے پاس اس کا ساز و سامان بھی ہوتا ہے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے سلسلے میں جب افراد کے لیے بھی ہتھیار اٹھانے کی مخالفت کی گئی ہے تو

[1] احکام القرآن ج ۲ ص ۳۲ [2] شرح مسلم للنووی ج ۱ ص ۵۲ [3] الکشاف عن حقائق التنزیل ج ۱ ص ۴۴۸ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۹

جماعتوں کے لیے اس کی اجازت کیسے ہوسکتی ہے۔ ہاں جس طرح ناگزیر حالات میں افراد کو قوت کے ذریعہ تغییر منکر کا حق ہے اسی طرح یہ حق جماعتوں کو بھی دیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکوؤں کا کوئی گروہ کسی گاؤں پر حملہ کردے تو اس گاؤں کے سب ہی لوگوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس کا مقابلہ کریں اور بھگانے کی کوشش کریں بلکہ اگر ضرورت پڑے تو انہیں اس کی بھی اجازت ہے کہ ڈاکوؤں کو ختم کردیں۔

ان تفصیلات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ منکر کا ارتکاب کرنے والے کسی گروہ کے خلاف کوئی جماعت اس وقت ہتھیار اٹھا سکتی ہے جب کہ وہ (۱) اس کام کو حکومت کے حوالے کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو (۲) اس سے کسی فتنہ وفساد اور امن وامان کے بگڑنے کا اندیشہ نہ ہو۔ (۳) ہتھیار نہ اٹھانے میں کسی بڑے منکر کے وجود میں آنے کا ڈر ہو۔

اس کے باوجود اس طرح کے ہر اقدام کی حیثیت ایک استثنار کی ہوگی۔ عام حالات میں صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ کسی بھی جماعت کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لیے کسی فرد یا گروہ کے خلاف طاقت کے استعمال کی اجازت نہیں ہے۔

آخرت

(مولانا محمد یوسف اصلاحی)

دنیا کی زندگی آزمائش کا ایک وقفہ (Period) اور عمل کی ایک مہلت ہے۔ اصل زندگی موت کے بعد شروع ہوگی۔ مرنے کے بعد سارے انسان خدا کے حضور پیش ہوں گے۔ اپنے اعمال کا حساب دیں گے اور ہر ایک اپنے عمل کے مطابق یا جنت کی لازوال نعمتیں پائے گا یا جہنم کی ہولناک سزا۔ اس عقیدے کا منکر درحقیقت خدا کا منکر ہے، اس کو نہ ماننے کے بعد نہ خدا کو عادل و حکیم ماننے کے کوئی معنی رہتے ہیں اور نہ رسول و شریعت کو ماننے کا کوئی مفہوم رہ جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن نے اس عقیدے کو انتہائی اہمیت کے ساتھ بیان کیا ہے اور اسے ذہن میں جمانے پر اتنا زور دیا ہے کہ قرآن کا کوئی ایک صفحہ ایسا نہیں جس میں آخرت کا فکر نہ ہو۔

عقیدۂ آخرت کی اہمیت

قبولِ حق کی اساس

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ (الانعام ۹۲)

جو لوگ آخرت کو مانتے ہیں وہی کتاب الٰہی پر ایمان لاتے ہیں۔

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝ (النحل ۲۲)

تمہارا خدا بس ایک ہی ہے، لیکن جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے ان کے دل اس کے ماننے سے انکاری ہیں اور وہ اپنی بڑائی کے نشہ میں ہیں

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَیْنَكَ وَبَیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۝ وَّجَعَلْنَا

اور جب آپ لوگوں کو قرآن پڑھ کر سناتے ہیں تو ہم آپ کے اور آخرت کو نہ ماننے والوں کے درمیان پردہ حائل کر دیتے ہیں اور ان کے دلوں

عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْٓ
اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ
فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ
نُفُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل)

پر ایسا پردہ ڈال دیتے ہیں کہ وہ کچھ نہ سمجھ پائیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دیتے ہیں اور جب آپ قرآن میں اپنے ایک ہی رب کا ذکر کرتے ہیں تو وہ بے زاری سے منہ موڑے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں

وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ
عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ (المؤمنون ۷۴)

اور جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ سیدھی راہ سے ہٹ کر چلنا چاہتے ہیں۔

یعنی خدا کے حضور پیشی کا تصور اور اس کی باز پُرس کا خوف جس دل میں ہوگا وہی حق کی آواز پر کان دھرے اور وہی حق کو قبول کرے گا اور جن کے دل اس تصور سے خالی ہیں ان سے کوئی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ہدایت کی راہ پر آئیں اور حق کو قبول کریں۔

اصلاحِ حال کی ضمانت

اُنْظُرْ كَيْفَ
ضَرَبُوْا لَكَ
الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ
سَبِيْلًا ۝ تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ
جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَيَجْعَلْ
لَّكَ قُصُوْرًا ۝ بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ
(الفرقان: ۹-۱۰-۱۱)

ذرا غور کیجیے یہ لوگ کیسی کیسی تمثیلوں سے آپ کو یاد کرتے ہیں۔ ایسے بھٹکے ہیں کہ اب راہ پا ہی نہیں سکتے۔ بڑا ہی بابرکت ہے وہ جو اگر چاہے تو ان کی تجویز کردہ چیزوں سے بھی بڑھ چڑھ کر وہ آپ کے لیے مہیا کر دے۔ کتنے ہی باغ جن کے نیچے سے نہریں بہہ رہی ہوں۔ اور شاندار محل (یہ وجہ نہیں ہے) بلکہ دراصل انھوں نے آخرت کی گھڑی کو جھٹلا دیا ہے۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ
كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ فَرَّتْ
مِنْ قَسْوَرَةٍ ۝ بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ
مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ۝
كَلَّا ؕ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ
(مدثر ۴۹-۵۳)

ان کو کیا ہوا ہے کہ وہ یاد دہانی سے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ گویا گدھے ہیں کہ بدکے ہوئے ہیں شیر کے ڈر سے بھاگ رہے ہیں۔ دراصل ان میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کے پاس براہِ راست کھلی ہوئی کتاب آئے۔ یہ سب کچھ نہیں اصل بات یہ ہے کہ یہ آخرت سے نہیں ڈرتے۔

یعنی رسالت پر یہ بے سروپا اعتراضات شانِ نبوت میں یہ گستاخیاں اور بدزبانیاں حق کے مقابلے میں یہ استکبار اور ڈھٹائی کچھ اس لیے نہیں ہے کہ واقعی سچائی کے ساتھ ان کو کچھ شبہات ہیں۔ درحقیقت ان گمناؤنے مظاہروں کا ایک ہی سبب ہے وہ یہ کہ آخرت کے لرزہ خیز تصور سے ان کے دل بے خوف ہیں۔ ان کی اصلاح حال اگر ہوسکتی ہے تو صرف اس یقین سے کہ ایک دن خدا کے حضور پہنچ کر پوری زندگی کا حساب دینا ہے۔

اعمالِ خیر کا حقیقی محرک

وَ إِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ — بلاشبہ نماز ایک بڑا ہی کٹھن کام ہے، مگر ان

الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُوا رَبِّهِمْ — فرماں برداروں کے لیے نہیں جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ آخرکار انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اسی کی طرف

وَ أَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ٥ (البقرۃ) — پلٹ کر جانا ہے۔

نماز جس کا قیام پورے دین کا قیام ہے اور جو تمام اعمالِ خیر کا سرچشمہ ہے ـــــ اس کو شوق و جذبے کے ساتھ وہی لوگ ادا کرسکتے ہیں جن کے دلوں میں یہ محرک موجود ہے کہ آخرکار ہمیں اپنے خدا کے پاس پلٹ کر جانا ہے۔

وَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ — اور جو لوگ آخرت کو مانتے ہیں وہی کتاب

يُؤْمِنُونَ بِهِ وَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ — الٰہی پر ایمان لاتے ہیں اور وہ ہی اپنی نمازوں کی

يُحَافِظُونَ ٥ (انعام-۹۲) — حفاظت کرتے ہیں۔

یعنی آخرت کا عقیدہ ہی وہ محرک ہے جو کتابِ ہدایت کو ماننے اور نماز کی پوری پوری حفاظت کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔

منکرینِ آخرت کے اعمال بے سود ہیں

وَ الَّذِينَ كَذَّبُوا — اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور

بِآيَاتِنَا وَ لِقَاءِ الْآخِرَةِ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ — آخرت کی پیشی کا انکار کیا۔ ان کے سارے اعمال اکارت ہیں۔ کیا لوگ اس کے سوا کچھ اور جزا

هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ٥ (اعراف) — پاسکتے ہیں کہ جیسا کریں ویسا بھریں۔

جب آخرت کے منکروں نے آخرت کے لیے کچھ کیا ہی نہیں ہے تو آخر وہاں کس چیز کا اجر پائیں گے۔

آخرت کا انکار خدا کا انکار ہے

وَ إِنْ تَعْجَبْ — اگر آپ تعجب خیز بات چاہیں تو

فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ إِذَا كُنَّا تُرَابًا ءَ إِنَّا — سب سے زیادہ تعجب خیز ان لوگوں کا یہ قول ہے کہ جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے

لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ۵ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ	تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے۔ یہ
کَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ (الرعد ۔ ۵)	وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کا انکار کر رہے ہیں۔

جو شخص اپنے دوبارہ پیدا کیے جانے سے انکار کرتا ہے وہ درحقیقت خدا کی قدرت وحکمت کا انکار کرتا ہے۔ معاذ اللہ خدا کو عاجز و درماندہ سمجھتا ہے اور اس کے علم و حکمت کا منکر ہے

عقیدۂ آخرت میں بگاڑ

نبیوں کو دنیا سے رخصت ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ ان کے پیرو اپنی سہل انگاری دنیوی مفاد اور خواہش پرستی کے نتیجے میں آخرت کے صاف اور نکھرے ہوئے عقیدے میں طرح طرح کے بگاڑ پیدا کر لیتے ہیں۔ قرآن نے اہل کتاب کے عقائد و اعمال پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی ان تمام بے بنیاد خوش فہمیوں کو کھول کھول کر بیان کیا ہے جن میں مبتلا ہو کر انھوں نے عقیدہ آخرت کو مسخ کر کے بالکل ہی بے جان بنا دیا تھا۔

قومی برتری کا احساس

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ	اور یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے
وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ	بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ ان سے پوچھیے! پھر خدا
اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ۭ قُلْ فَلِمَ	تمہارے گناہوں پر تمہیں سزا کیوں دیتا ہے؟ درحقیقت
يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ	تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے اور انسان خدا نے
مِّمَّنْ خَلَقَ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ	پیدا کیے ہیں، وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور
مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ	جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے۔ آسمانوں اور زمین
وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۡ وَاِلَيْهِ	اور ان کے درمیان کی ساری موجودات پر اسی
الْمَصِيْرُ ۵ (المائدہ : ۱۸)	کی حکمرانی ہے، اور اسی کی طرف آخر کار سب کو لوٹنا ہے

اہل کتاب اس بے بنیاد قومی پندار میں مبتلا تھے کہ ہم خدا کے چہیتے ہیں۔ دنیا میں جو چاہیں کریں، خدا ہمیں سزا نہ دے گا۔ یہ تصور سراسر جاہلانہ ہے۔ اہل کتاب کبھی انکار نہیں کر سکتے کہ دنیا میں ان کے اعمال کی پاداش میں ان کو کیسی کیسی عبرتناک سزائیں دی گئیں ـــــــ اگر یہ خدا کے چہیتے ہیں تو یہ سزائیں کیسی؟ ـــــــ دراصل خدا کی نظر میں اس کی پیدا کی ہوئی ساری مخلوق برابر ہے۔ کسی کو کسی پر کوئی قومی یا پیدائشی برتری نہیں سب کو چار و ناچار اسی کی طرف لوٹنا ہے اور اس کے ارادے پر کسی کا کوئی دباؤ نہیں وہ جسے چاہے بخشے اور جسے چاہے سزا دے۔

نجات کو قومی حق سمجھنا

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝

اور ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ جنت میں یہود و نصاریٰ کے علاوہ کوئی داخل نہ ہو سکے گا۔ یہ ان کی خوش فہمیاں ہیں۔ ان سے کہیے اپنی دلیل لاؤ۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ ہاں بات یوں ہے کہ جو شخص بھی خدا کے آگے سر اطاعت جھکا دے اور اچھی روش اختیار کرے اس کے لیے اس کے رب کے پاس اجر ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی رنج

نجات کسی قوم کا مخصوص حق نہیں ہے کہ چاہے وہ اپنے عمل و کردار میں کیسی ہی ہو، نجات کی حق دار ہو۔ اس معاملے میں کسی کی کوئی خصوصیت نہیں۔ نجات کا دار و مدار جس بات پر ہے وہ صرف یہ ہے کہ کون اپنے رب پر ایمان لا کر اپنے آپ کو اس کی اطاعت کے حوالے کرتا ہے۔ اور نیک روش اختیار کرتا ہے۔

خودساختہ فریب

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ ۖ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝

(البقرہ: ۸۰-۸۲)

اور ان کا کہنا ہے کہ دوزخ کی آگ ہمیں ہرگز چھونے والی نہیں، مگر یہ کہ چند روز کی سزا مل جائے تو مل جائے۔ ان سے پوچھیے کیا تم نے خدا سے کوئی اقرار لے رکھا ہے کہ وہ اس اقرار کی خلاف ورزی نہ کر سکے گا۔ یا یہ کہ تم اللہ کے ذمے ڈال کر ایسی باتیں کہہ دیتے ہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں کہ اس نے ان کا ذمہ لیا ہے؟ آخر تمہیں دوزخ کی آگ کیوں نہ چھوئے گی؟ جو بھی بدی کمائے گا اور اپنی خطاؤں کے چکر میں پڑا رہے گا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں اور ہمیشہ دوزخ ہی میں رہیں گے۔ اس کے برخلاف جو ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے وہی جنتی ہیں اور ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔

یعنی جنت بے بنیاد خوش فہمیوں کی بنیاد پر نہیں ملا کرتی۔ خدا کی جنت کا مستحق اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف

اسی طرح کہ خدا پر ایمان لا کر نیک اعمال سے اپنی زندگی کو سنوارے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا
مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى
كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ
يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا
النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ
وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا
كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ○
فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ
لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ
وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا
كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○
(آل عمران: ۲۳ - ۲۵)

کیا آپ نے ان لوگوں کے حال پر غور نہیں
کیا جنھیں آسمانی کتاب کا ایک حصہ ملا ہے انہیں
جب کتاب الٰہی کی طرف بلایا جاتا ہے' تاکہ ان کے
معاملات اس کی روشنی میں طے ہوں' تو ان میں
سے ایک فریق پہلو تہی کرتا ہے اور خدا کے احکام
سے منہ پھیر لیتا ہے۔ ان کا یہ طرز عمل اس وجہ سے
ہے کہ وہ کہتے ہیں آتش دوزخ ہمیں ہرگز نہ
چھوئے گی اور اگر ہمیں سزا ملی بھی تو بس چند روز
ان کے خود ساختہ عقیدوں نے ان کو دین کے
معاملے میں بڑے فریب میں ڈال رکھا ہے۔ مگر کیا
بنے گی ان پر جب ہم انہیں اس روز جمع کریں گے۔
جس کا آنا یقینی ہے۔ اس دن ہر شخص کو اس کی
کمائی کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور کسی پر کوئی ظلم نہ ہوگا

یہود اس فریب میں تھے کہ ہم خاندان نبوت کے افراد ہیں' حضرت یعقوب کی اولاد ہیں اور حضرت موسےٰ کی امت ہیں —— بھلا جہنم کی آگ ہمیں چھونے کی جرأت کیسی کر سکتی ہے! —— زیادہ سے زیادہ اگر ہمیں جہنم کی سزا ملی بھی تو بس اتنے ہی دن' جتنے دنوں ہم نے مصر میں بچھڑے کی پرستش کی —— پھر آخرت میں ہمارے لیے وہی سب کچھ ہے جو خدا کے "پیاروں" کے لیے ہونا چاہیے —— یہ ایک خود ساختہ فریب تھا جس نے ان کو فکر و عمل کی انتہائی پستی میں گرا دیا۔

شفاعت کا بے بنیاد تصور

وَيَقُوْلُوْنَ
هٰٓؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا
عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا
يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے یہ معبود
اللہ کے ہاں ہماری شفاعت کریں گے۔ ان سے
پوچھیے کیا تم لوگ خدا کو ایک ایسی چیز کی خبر دیتے ہو
جس کے بارے میں اسے کوئی علم نہیں نہ آسمانوں

الْاَرْضِ (یونس: ۱۸) میں اور نہ زمین میں۔

بنی اسماعیل اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ ہم جن ہستیوں کو پوج رہے ہیں' یہ آخرت میں ہماری شفاعت کر کے ہمیں بخشوا لیں گے۔ یہ ایک ایسی بے بنیاد خوش فہمی ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ خدا کو کوئی علم نہیں کہ زمین و آسمان میں کچھ ایسی ہستیاں ہوں جن کے سپرد یہ ذمہ داری ہو' اور خدا کے علم میں کسی چیز کے نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ چیز سرے سے موجود ہی نہیں ہے ـــــ اسی طرح نصاریٰ کے اس جاہلانہ تصور کی بھی کوئی اصل نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ان کے گناہوں کا کفارہ ہو چکے ہیں۔

انکارِ آخرت کے اسباب

کوتاہ فکری

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّا اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَا اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (الجاثیہ ۲۴-۲۶)

اور ان لوگوں کا کہنا ہے کہ زندگی تو بس یہی دنیا کی زندگی ہے۔ ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں ہم تو گردش زمانہ سے ہلاک ہوتے ہیں۔ اور ان کے پاس اس بات کا ذرا بھی علم نہیں محض گمان سے کام لے رہے ہیں اور جب ان کے سامنے ہماری صاف صاف آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو ان کی بس یہی حجت ہوتی ہے کہتے ہیں لے آؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو۔ ان سے کہیا اللہ ہی تمہیں زندگی دیتا ہے پھر وہی تمہیں موت دیتا ہے' پھر وہی تم سب کو قیامت کے دن جمع کرے گا جس کا آنا یقینی ہے' لیکن بہت سے لوگ سمجھتے نہیں۔

وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ۝ اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ۝ (مریم ۶۶، ۶۷)

اور انسان کہتا ہے کیا میں جب مر چکوں گا تو پھر زندہ کر کے نکال لایا جاؤں گا؟ کیا انسان یاد نہیں کرتا کہ ہم پہلے اس کو پیدا کر چکے ہیں جب کہ وہ کچھ بھی نہ تھا۔

قدرت الٰہی کا ناقص تصور

وَقَالُوٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ

اور کہتے ہیں جب ہم زمین میں مرکھپ جائیں گے تو کیا نئے سرے سے پھر پیدا ہوں گے

وَقَالُوْآ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِیْدًا (بنی اسرائیل ۴۹)

اور کہتے ہیں جب محض ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا نئے سرے سے جی اٹھیں گے۔

یہ ان لوگوں کے اقوال ہیں جو خدا کو اپنا خالق تسلیم کرتے ہیں۔ یہ خدا کی قدرت کا انتہائی ناقص تصور رکھتے ہیں جو خدا پہلی بار پیدا کرنے پر قادر ہے۔ آخر دوسری بار پیدا کرنا اس کی قدرت سے باہر کیوں ہے

اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ بَلْ هُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ۝ (ق: ۱۵)

کیا ہم پہلی بار پیدا کر کے تھک گئے ہیں نہیں بلکہ وہ نئے سرے سے پیدا کرنے کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں

دنیا پرستی

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ۝ (الدھر ۲۷)

حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ حاضر (یعنی دنیا) پر ریجھے ہوئے ہیں اور اس کے بالمقابل بھاری دن (یعنی آخرت) کو پس پشت ڈالے ہوئے ہیں

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ (البقرہ)

یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی آخرت بیچ کر اس کے بجائے دنیا کی زندگی خرید لی ہے۔

دولت کی بدمستی

وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّیْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۝ (کہف ۳)

اور مجھے گمان بھی نہیں کہ قیامت کبھی برپا ہوگی تاہم اگر مجھے کبھی رب کے حضور پلٹایا گیا تو ضرور میں اس سے بھی زیادہ بہتر جگہ پاؤں گا۔

یعنی دولت و عیش کی سرمستی نے اسے کبھی سوچنے ہی نہ دیا کہ وہ خدا کے حضور پہنچ کر حساب دے گا۔

امکانِ آخرت کے دلائل

وَاللّٰهُ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ

اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے پھر وہ بادل کو اٹھاتی ہیں۔ پھر ہم اسے ایک اجاڑ علاقے کی طرف لے جاتے ہیں اور اسی زمین کو جلا اٹھاتے

مَوْتِهَا كَذَٰلِكَ النُّشُورُ ہیں جو مردہ پڑی ہوئی تھی۔ اسی طرح ہوگا مرے ہوئے
(فاطر: ۹) انسانوں کا جی اٹھنا بھی۔

ہر شخص دیکھتا ہے کہ مدتوں سے ایک زمین مردہ اجاڑ پڑی ہوئی ہے۔ مگر بادلوں سے چند چھینٹے گرتے ہی مدتوں سے مری ہوئی جڑیں یک بارگی سرسبز و شاداب ہوکر زمین کی تہوں سے سر نکال لیتی ہیں اور زمین لہلہا اٹھتی ہے ــــ بار بار یہ منظر دیکھنے والا آخر یہ کیوں ناممکن سمجھتا ہے کہ یہ مرے ہوئے انسان بھی ایک دن خدا کا حکم پاکر اسی طرح اٹھ کھڑے ہوں گے۔

فَانْظُرْ إِلَىٰ أَثَرِ رَحْمَتِ اللَّهِ	غور کرو اللہ کی رحمت کے اثرات کہ مردہ
كَيْفَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا	پڑی ہوئی زمین کو وہ کس طرح جلا اٹھاتا ہے۔
إِنَّ ذَٰلِكَ لَمُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَهُوَ عَلَىٰ	یقیناً وہ مردوں کو زندگی بخشنے والا ہے، اور
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (روم-۵۰)	وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

علم محیط و قدرت کاملہ

أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ	بھلا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا
السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ	کیا وہ اس بات پر قادر نہیں کہ ان کو دوبارہ اسی
بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ	طرح پیدا کر دے۔ کیوں نہیں وہ بڑا ہی پیدا
بَلَىٰ وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ ۝ إِنَّمَا	کرنے والا اور بہت زیادہ علم والا ہے۔ اس کی
أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ	شان یہ ہے کہ وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے
لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝ (یٰسٓ- ۸۱، ۸۲)	تو اسے حکم دیتا ہے ہوجا! اور وہ ہوجاتی ہے۔

یعنی وہ مرنے والوں کے ایک ایک ریزے کا پورا پورا علم رکھتا ہے، اور کوئی چیز اس کی قدرت سے باہر نہیں۔ اس کا اشارہ پاتے ہی ہر مردہ اٹھ کھڑا ہوگا۔ چاہے وہ زمین میں رل مل گیا ہو، سمندر کی تہہ میں کھو گیا ہو یا کسی جانور کی خوراک بن گیا ہو، یا راکھ بن کر فضا میں تحلیل ہوگیا ہو۔

قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ	کہنے لگا کون ہے جو ہڈیوں کو زندگی بخشے گا
رَمِيمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا	جب کہ وہ گل کر خاک ہوچکی ہوں۔ کہہ دیجیے ان کو
أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ۝	وہی زندگی بخشے گا جس نے ان کو پہلی بار پیدا کیا
(یٰس- ۷۹-۸۰)	تھا۔ اور وہ سب طرح کا پیدا کرنا جانتا ہے۔

یعنی گل سڑ کر خاک ہو جانے والی ان ہڈیوں کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا ریزہ بھی اس کے علم سے باہر نہیں۔

ابتدائی پیدائش سے اعادے پر دلیل

قُلْ كُونُوا حِجَارَةً أَوْ حَدِيدًا ۝ أَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ ۚ فَسَيَقُولُونَ مَن يُعِيدُنَا ۖ قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ (بنی اسرائیل ۵۱)

ان سے کہیے تم پتھر بن جاؤ یا لوہا یا اور کوئی سخت ترین چیز جو تمہارے ذہن میں قبولِ حیات سے بعید تر ہو (پھر بھی تم اٹھا کر رہو گے) وہ ضرور پوچھیں گے وہ کون ہے؟ جو ہمیں پھر سے زندگی بخشے گا۔ کہیے وہی خدا جس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا۔

مخلوقاتِ عالم کا پیہم اعادہ

أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللَّهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ۚ ثُمَّ اللَّهُ يُنشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (عنکبوت ۱۹-۲۰)

کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ خدا کس طرح خلق کی ابتدا کرتا ہے اور پھر بار بار پیدا کرتا رہتا ہے، بلاشبہ یہ اعادہ اللہ کے لیے نہایت آسان ہے۔ ان سے کہیے کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلق کی ابتدا کی ہے۔ پھر اللہ دوسری بار بھی زندگی بخشے گا۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

یعنی کائنات میں اعادے کا یہ عمل برابر جاری ہے۔ ہر چیز فنا ہوتی ہے اور بار بار پیدا ہوتی ہے۔ ہر نوع کے افراد مٹتے بھی ہیں اور پھر ویسے ہی افراد پیہم پیدا بھی ہوتے رہتے ہیں۔ ہر سال کروڑوں من غلہ جاندار وں کی غذا بن کر زمین میں رل مل جاتا ہے لیکن فصل آتے ہی کروڑوں من ویسا ہی غلہ پھر پیدا ہو جاتا ہے، اور یہ عمل نہ جانے کب سے انسان اسی طرح دیکھتا چلا آ رہا ہے ــــ اگر یہ اعادہ اللہ کے لیے دشوار نہیں ہے، تو پھر انسانوں کا دوبارہ پیدا کرنا کیوں دشوار ہے۔

ابتدا سے اعادہ آسان تر ہے

وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ (روم ۲۷)

وہی ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہے، پھر وہی اس کو دوبارہ زندگی بخشے گا اور یہ اعادہ اس کے لیے آسان تر ہے۔

ظاہر ہے ایک دفعہ جس نے کسی چیز کو بنایا ہو اسی چیز کو دوبارہ بنانا اس کے لیے پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ آسان ہونا چاہیے۔

انسانی تخلیق کی شہادت

أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن

کیا انسان منی کا ایک قطرہ نہ تھا جو ٹپکائی

مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ
فَسَوّٰى ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ
الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ
عَلٰى اَنْ يُّحْيِیَ الْمَوْتٰى ۝ (القیمۃ ۳۷-۴۰)

جاتی ہے پھر وہ ایک لوتھڑا بنا اور خدا نے اس کا
پورا ڈھانچہ بنایا اور ہر طرح اعضا درست فرمائے
پھر اس کی دو قسمیں بنائیں۔ مرد اور عورت، کیا وہ
خدا اس پر قادر نہیں کہ وہ مردوں کو جلا اٹھائے

جامع دلیل

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ
فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا
خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ
ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ
وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۭ وَنُقِرُّ
فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَاۗءُ اِلٰٓى اَجَلٍ
مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ
لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ
يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى
اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ
بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـــًٔا ۭ وَتَرَى الْاَرْضَ
هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا
عَلَيْهَا الْمَاۗءَ اهْتَزَّتْ
وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ
زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ
هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى
وَاَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ
وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ
فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي

لوگو! اگر تمہیں موت کے بعد جی اٹھنے کے
بارے میں کچھ شک ہے تو (سوچو) ہم نے تم کو مٹی
سے پیدا کیا پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے
پھر گوشت کی بوٹی سے جس کی بناوٹ کامل بھی ہوتی
ہے اور ناقص بھی۔ (یہ سب اس لیے بتا رہے ہیں)
تاکہ تم پر حقیقت واضح کر دیں۔ ہم جس (نطفے) کو
چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے
رکھتے ہیں۔ پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال
لاتے ہیں۔ پھر (تمہاری پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم
اپنی جوانی کو پہنچو اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس
بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا
جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے
اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے۔ پھر
جہاں ہم نے اس پر مینہ برسایا کہ یکایک وہ پھبک
اٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر
نباتات اگانی شروع کر دی ـــــ یہ سب اس
لیے کہ اللہ ہی حق ہے اور اس لیے کہ وہ مردوں
کو زندہ کرتا ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے
یہ (اس حقیقت کی دلیل ہے) کہ قیامت کی گھڑی آکر

فِی الْقُبُوْرِ ۝ (الحج ۔ ۵، ۷)

رہے گی۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں اور اللہ تعالیٰ ضرور ان لوگوں کو جلا اٹھائے گا جو قبروں میں پڑے ہوئے ہیں۔

آخرت ایک حقیقت و ضرورت

کائنات کا ایک خاموش اعلان

یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ لَا یُجَلِّیْهَا لِوَقْتِهَا اِلَّا هُوَ ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِیْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً (الاعراف ۱۸۷)

یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ قیامت کب آکر لنگر انداز ہوگی۔ ان سے کہیے اس کا علم تو میرے رب ہی کو ہے، اپنے وقت پر اس کو وہی ظاہر کرے گا۔ وہ آسمانوں اور زمین میں ایک بھاری بوجھ بنی ہوئی ہے وہ آئے گی تو اچانک ہی آجائے گی

قیامت زمین و آسمان میں ایک بھاری بوجھ بنی ہوئی ہے۔ گویا کائنات قیامت کے حمل سے بوجھل ہو رہی ہے اور جس طرح ایک حاملہ عورت بچے کو پیٹ میں چھپا رکھنے کے باوجود اپنی ظاہری حالت سے بچے کی پیدائش کا اعلان کرتی ہے ٹھیک اسی طرح قیامت کے پوشیدہ ہونے کے باوجود کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی آمد کا خاموش اعلان کر رہا ہے۔ جونہی وقت آئے گا خدا کے حکم سے قیامت کا یہ عظیم دن کائنات کے بطن سے اچانک نمودار ہوگا۔

کائنات کی پیدائش کا ایک مقصد ہے

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ ۝ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ مِیْقَاتُهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝ (الدخان ۳۸-۴۰)

اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے کھیل تماشے کرتے ہوئے نہیں پیدا کیا۔ ہم نے ان کو ایک مقصد ہی سے پیدا کیا ہے لیکن اکثر لوگ سوچتے سمجھتے نہیں ۔۔۔ یہ حقیقت ہے کہ فیصلہ کا دن ان سب کے جی اٹھنے کا وقت ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِیَةٌ (الحجر ۸۵)

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو ایک ہی مقصد سے پیدا کیا ہے اور یقیناً فیصلہ کی گھڑی آکر رہے گی۔

یعنی زمین و آسمان کی تخلیق بچوں کا بے مقصد کھیل تماشا نہیں ہے۔ یہ ایک دانا و بینا خدا کی تخلیق ہے یہ آزمائش کی ایک مہلت ہے، یہاں اچھے عمل بھی ہو رہے ہیں اور برے بھی۔ یقیناً انسان دوبارہ اٹھائے جائیں گے اور جزا و سزا کی گھڑی آکر رہے گی۔

انسان ایک ذمہ دار ہستی ہے

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَكَ سُدًی (القیامۃ)

کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ اسے یونہی چھوڑ دیا جائے گا

یعنی وہ کوئی غیر ذمہ دار ہستی نہیں ہے کہ جو چاہے کرے اور اس سے کوئی باز پرس نہ ہو۔

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ٥ (بنی اسرائیل)

یہ حقیقت ہے کہ کان، آنکھ اور دل ہر ایک کے بارے میں باز پرس ہونی ہے۔

یہ عظیم قوتیں دے کر انسان کو آزاد نہیں چھوڑ دیا گیا ہے کہ جو چاہے ان سے کام لے بلکہ ایک دن ان سب کے بارے میں لازماً باز پرس ہوگی۔

فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِیْنَ اُرْسِلَ اِلَیْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِیْنَ (اعراف)

تو ہم یقیناً ان لوگوں سے باز پرس کریں گے جن کی طرف پیغمبر بھیجے گئے اور پیغمبروں سے بھی پوچھ کر رہیں گے۔

یعنی ان لوگوں سے لازماً پوچھا جائے گا کہ انھوں نے دعوت رسول پر کان دھرے یا نہیں اور پیغمبروں سے بھی پوچھیں گے کہ ان کے مخاطبین نے ان کی دعوت کے ساتھ کیا سلوک کیا۔

عدل و انصاف کا تقاضا

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ كَالْفُجَّارِ (ص ۲۸)

جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے، کیا ان کو ہم ان کی طرح کر دیں گے جو ملک میں فساد کرتے ہیں، یا پرہیزگاروں کو بدکاروں کی طرح کر دیں گے۔

دنیا میں نیک کام کرنے والے مومن بھی ہیں اور فساد پھیلانے والے خدا سے غافل بھی، پرہیزگار بھی ہیں اور بدکار بھی ——— کیا یہ دونوں یونہی مرکھپ کر مٹی ہو جائیں گے اور ان کے اچھے اور برے اعمال کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔ عدل و انصاف کا کھلا تقاضا ہے کہ نیک کام کرنے والے پرہیزگار اجر و انعام پائیں اور بدکار و فسادی بدترین سزائیں بھگتیں۔

أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُونَ ○ أَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَأْوٰى نُزُلًا بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ○ وَأَمَّا الَّذِينَ فَسَقُوا فَمَأْوٰهُمُ النَّارُ كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا وَقِيلَ لَهُمْ ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ ○ (السجدۃ ۱۸-۲۰)

بھلا فرماں بردار مومن اور نافرمان کافر کے اعمال و نتائج یکساں ہو سکتے ہیں — نہیں دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان کے ٹھکانے جنتوں میں ہیں یہ مہمان نوازی ان کے نیک کاموں کا انعام ہے اور جو لوگ نافرمانی کرتے رہے، ان کا ٹھکانا جہنم کی آگ ہے، جب کبھی اس آگ سے نکلنا چاہیں گے۔ پھر اس میں لوٹا دیے جائیں گے اور انہیں سنایا جائے گا — چکھو اب اس آگ کا مزہ جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئٰتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَاءً مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ○ (جاثیہ ۲۱)

اور جو لوگ برے کرتوت کرتے رہے کیا ان کا خیال یہ ہے کہ ہم انہیں ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے۔ کیا ان دونوں کی موت اور زندگی یکساں ہوگی۔ کیا ہی برا ہے ان کا فیصلہ۔

یہ حقیقت ہے کہ مومن اور فرماں بردار کی زندگی رحمت و سکون کی زندگی ہوگی۔ معاشرے میں اس کے لیے عزت و محبت کے جذبات ہوں گے۔ اور ایک نافرمان اور بدکار کی زندگی فساد و انتشار کی زندگی ہوگی۔ معاشرے میں اس کے لیے ذلت اور نفرت کے جذبات ہوں گے۔ ٹھیک اسی طرح دونوں کی موت اور نتائج اعمال بھی یکساں نہیں ہو سکتے۔ جو لوگ گناہوں اور نافرمانیوں میں بدمست ہونے کے باوجود یہ سمجھتے ہیں کہ مومن اور کافر نیک و بد اس زمین میں رل مل کر خاک ہو جائیں گے اور دونوں کا انجام ایک ہی ہے، وہ نرے بے عقلے ہیں اور بڑا ہی احمقانہ فیصلہ کر رہے ہیں۔

علم وحکمت کا فیصلہ

إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ○ يُدْخِلُ

بلاشبہ خدا علم و حکمت والا ہے۔ جس کو چاہے گا اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔

مَنْ يَّشَاۗءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ (الدہر ۳۱:۷۶)

اور ظالموں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

یعنی خدا کے علم و حکمت کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ فرماں بردار مومنین خدا کی رحمت کے آغوش میں ہیں اور نافرمان ظالم دردناک عذاب بھگتیں۔

خدا کی رحمت کا تقاضا

كَتَبَ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (انعام: ۱۲)

خدا نے اپنے اوپر رحم و کرم کو لازم کر لیا ہے۔ وہ ضرور تم سب کو جمع کرے گا۔ یہ ایک حقیقت ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ مگر جن لوگوں نے خود کو تباہ کر لیا ہے، وہ اس حقیقت پر ایمان نہیں لاتے۔

جو لوگ دنیا میں خدا پرستی کی زندگی گزارنے کے لیے طرح طرح کے دکھ سہہ رہے ہیں اور ہر طرح کی سختیوں اور تنگیوں کو خوشی خوشی برداشت کر رہے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ مر کر ہمیشہ کے لیے خاک ہو جائیں اور ان کے اعمال کا کوئی نتیجہ نہ ہو، خدا نے اپنے اوپر رحمت لازم کر لی ہے وہ ضرور ایک دن سب کو جمع فرمائے گا اور اپنی رحمت سے اپنے ان مزدوروں اور غلاموں کو غیر فانی انعام و اکرام سے سرفراز فرمائے گا۔

اعمال محفوظ ہو رہے ہیں

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ښ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ۝ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝ (ق ۱۶-۱۸)

اور ہم ہی نے انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم ان خیالات کو خوب جانتے ہیں جو اس کا نفس اسے سجھاتا ہے اور ہم اس کی رگ جان سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں۔ جب لیتے (اور محفوظ کرتے) جاتے ہیں دو لینے والے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے۔ کوئی بات اس کی زبان پر آتی ہی ہے کہ ایک نگراں (اسے محفوظ کرنے کے لیے) تیار رہتا ہے۔

دنیا چند روزہ بہار ہے

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَاۗءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَاۗءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ

اور انہیں حیات دنیا کی حقیقت اس مثل سے سمجھائے کہ جیسے آسمان سے پانی برسایا تو زمین کی پیداوار خوب گھنی ہو گئی اور پھر یہ سب کچھ سوکھ کر

نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا

چورا چورا ہوگئی جسے ہوائیں اڑائے لیے پھرتی ہیں اور خدا ہر کام کے کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَي الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝ وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ۝

(الکہف:۔ ۷، ۸)

واقعہ یہ ہے کہ یہ جو کچھ سروسامان بھی زمین پر ہے، اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ ان لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ آخرکار ان سب کو ہم ایک چٹیل میدان بنا دینے والے ہیں۔

یعنی دنیا کی یہ زیب و زینت اور دل فریب سروسامان دائمی نہیں۔ یہ تو انسان کی آزمائش کے لیے روزہ بہار ہے۔ آخرکار یہ آراستہ اور مزین زمین ایک دن چٹیل میدان بن کر رہ جائے گی۔

یلہ صفحہ ۵۴) کیا گیا۔ بس جرم صرف اتنا ہے کہ رسائل و مسائل میں ایک سائل کا جواب دیتے ہوئے ت کی سربراہی اور احکام کی شرعی تقسیم کے مسئلے پر دلائل کے ساتھ اپنا خیال ظاہر کر دیا گیا تھا اور وہ بھی وقت، جب ہر طرف سے مولانا مودودی مدظلہ اور جماعت اسلامی پاکستان کو ہادم شریعت، ابن الوقت، گمراہ ں اور بے دین کہا جانے لگا، لیکن اب مولانا اصلاحی فرما رہے ہیں کہ اصل مسئلہ مطلقاً عورت کی سربراہی کا ، بلکہ مس فاطمہ جناح کی سربراہی کا تھا اور خاص طور پر ہمیں ان کی سربراہی کے مسئلے پر اظہار خیال کرنا چاہیے اور ایسا نہ کرکے ہم نے جماعتی عصبیت کے تحت وہاں کی جماعت کے پلڑے میں اپنا وزن ڈالا۔ انصاف یہ قسم مولانا کے سوا اور کہاں ملے گی؟ اپنے ارشادات کی تان انھوں نے جس عبارت پر توڑی ہے یہ ہے:۔

"مدعیانِ دین کی یہی وہ حرکتیں ہیں جن سے موجودہ نسل روز بروز دین اور اہل دین سے بد دل اور بدگمان ہوتی جا رہی ہے"

اس سلسلے میں اس کے سوا اور کیا عرض کیا جائے کہ وہ دن آ رہا ہے جب یہ ناقابل انکار فیصلہ صادر ہوگا م جیسے مدعیانِ دین کی حرکتوں سے دین کو نقصان پہنچا تھا، یا آپ جیسے مدعیانِ دین کی حرکتوں سے ___

چند مختصر وضاحتیں

سید احمد قادری

راقم الحروف تقریباً سوا مہینے کے بعد وطن سے واپس آیا تو جنوری ۶۵ء کا ماہنامہ میثاق لاہور مطالعہ سے گزرا۔ اس شمارے میں میثاق کے فاضل مدیر نے جماعت اسلامی ہند کو بھی شرف مخاطبت سے نوازا ہے۔ مولانا اصلاحی نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے ان میں متعدد باتیں خلاف واقعہ نہ ہوتیں تو مجھے کچھ لکھنے کی ضرورت نہ پڑتی لیکن معلوم نہیں کس طرح مولانا کے قلم سے ایسی باتیں اور ایسے انتسابات نکل گئے ہیں جو صحیح نہیں ہیں، اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کے بارے میں اختصار کے ساتھ کچھ عرض کر دیا جائے

حضرت مولانا نے اپنی مخاطبت کی ابتدا ان جملوں سے کی ہے:۔

آج میں جماعت اسلامی ہند سے بھی کچھ گلہ کرنا چاہتا ہوں۔ میثاق کے قارئین اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ میں نے جماعت اسلامی ہند کے خلاف ان صفحات میں کبھی ایک فقرہ بھی نہیں لکھا۔

ص ۱۴-۱۵

میں بھی میثاق کے قارئین میں ہوں اور جانتا ہوں کہ جماعت کا نام لے کر مولانا نے اس سے پہلے کچھ نہیں لکھا ہے لیکن نام لیے بغیر انھوں نے ایک ہی فقرہ نہیں متعدد فقرے لکھے ہیں اور وہ اتنے نمایاں ہیں کہ نام لینے کی ضرورت بھی نہ تھی اس لیے کبھی ایک فقرہ بھی نہ لکھنے کی نفی لفظی طور پر صحیح ہو سکتی ہے معنوی طور پر ہرگز صحیح نہیں ہے۔ مئی ۶۲ء کے میثاق میں ہفت روزہ ندائے ملت لکھنؤ کے تعارف اور بھارت کے مسلمانوں کی قیادت پر اظہار خیال کے ضمن میں مولانا نے لکھا تھا:۔

"حد یہ ہے کہ جو لوگ خالص اسلامی قیادت اور اسلامی انقلاب برپا کرنے کے عزم و جزم کے ساتھ کام کر رہے تھے ان کو بھی حالات کی بے مہری نے "پس چہ باید کرد" کے مقام حسرت و یاس پر لے جا کر

ٹھہرا کر دیا تھا:
(صفحہ ۔)

"پس چہ باید کرد" کے عنوان سے اسی زمانے میں محترم امیر جماعت اسلامی ہند کا طویل مقالہ دعوت دہلی میں شائع ہوا تھا۔ اس عبارت کو پڑھ کر ہر وہ شخص جو بھارت کی جماعتوں سے تھوڑی واقفیت بھی رکھتا ہے اور اخبارات پڑھتا رہتا ہے بلا تامل سمجھ لے گا کہ مولانا نے یہ برچھی کس پر چلائی ہے۔ ایسی صورت میں کیا ضرورت تھی کہ جماعت اسلامی ہند کا نام بھی لیا جاتا۔ پھر جون ۶۲ء کے میثاق میں ایک سائل کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا۔

لیکن جہاں مسلمان علاقوں میں گھری ہوئی ایک مظلوم اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں وہاں تو یہ غلط طرز عمل نہ صرف اسلام کے خلاف ذہنوں میں (مسلموں اور غیر مسلموں دونوں کے) شدید قسم کی الجھن پیدا کر دے گا بلکہ اندیشہ اس بات کا بھی ہے کہ اس کا ردِ عمل ایسی صورت میں ظاہر ہو کہ وہاں اسلام اور مسلمانوں کو شدید قسم کا نقصان پہنچ جائے سوچیے کہ اگر غیر مسلموں کے کسی ملک میں کچھ مسلمان، اسلام کے داعی بن کر جائیں اور اپنی دعوت کا آغاز وہ اس نقطہ سے کریں کہ ہم یہاں اسلام کی حکومت قائم کرنے یا انقلاب قیادت کے لیے آئے ہیں تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس میں تو شبہ نہیں کہ یہ کہنا حوصلہ کا کام ہے لیکن کیا ساتھ ہی یہ ایک حماقت کی بات نہیں ہے؟ دنیا کے بے شمار ملکوں میں مسلمانوں نے اسلام کی دعوت دی جن میں سے بہتوں میں اسلام کی حکومتیں بھی بعد میں قائم ہوگئیں لیکن بتلایئے کہ کس جگہ انھوں نے حکومت الٰہیہ کی دعوت یا انقلاب قیادت کے نعرے سے اپنے کام کا آغاز کیا؟ ان داعیوں کے متعلق اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ ان کی دعوت ادھوری تھی یا ان کو پورے دین کا شعور نہیں تھا تو میں ایسے شخص کو اسلامی نظام کے شعور سے بالکل محروم خیال کرتا ہوں۔

(صفحہ ۔)

کون تعلیم یافتہ شخص اس سے بے خبر ہو سکتا ہے کہ یہ تمام باتیں ہندستان اور یہاں کی جماعت اسلامی کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ آگے مولانا مزید رقم طراز ہیں:۔

یہ بات تو ٹھیک ہے کہ اسلام صرف مسجد کا دین نہیں ہے بلکہ حکومت کا بھی دین ہے لیکن یہ بات بالکل غلط ہے کہ اسلام کی دعوت ہر معاشرے اور ہر ماحول میں حکومت الٰہیہ یا انقلاب قیادت کی دعوت سے شروع ہوتی ہے یہ بڑی ہی شدید غلط فہمی بلکہ شدید قسم کی جہالت ہے جس کی جس قدر جلد اصلاح ہو جائے اچھا ہے۔

ص ۵۲

کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ کسی جماعت کے نصب العین کو حماقت اور شدید قسم کی جہالت قرار دیا جائے

اور ساتھ ہی ساتھ ارشاد فرمایا جائے کہ اس جماعت کے خلاف کچھ نہیں کہا گیا۔ جس زمانے میں مولانا نے یہ جواب شائع کیا تھا اسی زمانے میں یہاں کے ایک سائل کے جواب میں مولانا صدر الدین اصلاحی نے مولانا کے ان ارشادات کی توضیح کی تھی اور ان کا جواب دیا تھا ملاحظہ ہو زندگی اگست ۶۳ء ــــ ان تمام باتوں کے باوجود فاضل مدیر میثاق نے کس صفائی سے لکھ دیا ہے کہ انھوں نے جماعت اسلامی ہند کے خلاف کبھی ایک فقرہ بھی نہیں لکھا۔

جنوری ۶۵ء کے میثاق میں مولانا مزید رقم طراز ہیں:۔

"میرے اس رویے کے مقابل میں جماعت اسلامی ہند کا رویہ میں ابتدا سے یہ دیکھ رہا ہوں کہ پاکستان کی جماعت پر جب میں کوئی تنقید کرتا ہوں تو وہاں کے بہت سے ارکان مجھے گمنام نصیحتوں اور گالیوں کے خطوط لکھنے شروع کر دیتے ہیں اور فوراً ایک فریق بن کر اپنے پاکستانی امیر کی حمایت میں مورچے سنبھال لیتے ہیں اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ دونوں جگہ قیادت کا مزاج اور ارکان کی تربیت کا انداز ایک ہی ہے" ص۱۵

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ عرض کرنی ہے کہ اگر مولانا یقین فرمائیں تو ہم پورے اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان "بہت سے ارکان" میں سے ہم کسی ایک رکن سے بھی واقف نہیں ہیں جنھوں نے مولانا کو نصیحتوں اور گالیوں کے گمنام خطوط لکھے ہیں پھر یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ جب خطوط گمنام ہوتے ہیں تو مولانا نے یہ کیسے یقین فرما لیا کہ وہ لازماً یہاں کے ارکان ہی نے لکھے ہوں گے۔ ہم مولانا سے عرض کرتے ہیں کہ اگر یہاں کے کسی رکن کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ اس نے ان کو گالی لکھنے کی جہالت کی ہے تو ہمیں یقین ہے کہ جماعت اسلامی ہند اس کے خلاف تادیبی کارروائی کرے گی۔ یہ بات بھی مولانا ہی کی تحریر سے معلوم ہوئی کہ مخالف کو گمنام خطوط لکھ کر بھی کسی کی حمایت میں مورچہ سنبھالا جا سکتا ہے۔ گمنام خطوط میں گالیاں لکھنا تو بزدلی اور مخالف سے مرعوبیت کی علامت ہے ایسے لوگ کسی کی حمایت میں مورچہ سنبھال نہیں سکتے' اور یہ بات تو کسی طرح قرین انصاف نہیں ہے کہ گمنام خطوط کی بنیاد پر مولانا نے جماعت اسلامی ہند کا رویہ متعین کر لیا اور یہاں کی قیادت کے مزاج پر ریمارک کر ڈالا۔ جوشِ غضب میں "اپنے پاکستانی امیر" کا زہریلا جملہ تک مولانا کے قلم سے نکل گیا ہے اور یہ سب کچھ محض گمنام خطوط کی بنیاد پر۔ کیا اس طرزِ عمل سے خود مولانا کے مزاج اور ان کے تزکیۂ نفس پر کوئی روشنی نہیں پڑتی؟

فاضل مدیر میثاق لکھتے ہیں:۔

"یہ خیال بھی آپ کے مفتی صاحب کا بالکل غلط ہے کہ قتل کی حرمت بھی ان حرمتوں میں سے ہے جو کسی

حالت میں سقوط قبول نہیں کرتی "

ص۱۶

معلوم نہیں "آپ کے مفتی صاحب" کس کو لکھا گیا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے جماعت اسلامی ہند کے ارکان میں صرف میں نے رسائل و مسائل کے صفحات میں ایک سائل کے جواب میں عورت کی سربراہی کے مسئلے پر مختصر سی اصولی بحث کی ہے اور مولانا کی مخاطبت چونکہ جماعت اسلامی ہند ہی سے ہے اس لیے غالب قرینہ ہے کہ یہ حقیر ہی اس خطاب سے نوازا گیا ہے۔ لیکن میں نے قابل سقوط حرمتوں میں قتل کی مثال پیش نہیں کی ہے اس لیے میری طرف یہ انتساب صحیح نہیں ہے۔ جس کا جی چاہے زندگی جنوری کا شمارہ پڑھ لے۔ ایک غلط انتساب کے بعد اپنی نفی واقفیت کا مظاہرہ مولانا کو زیب نہیں دیتا۔

مولانا ایک جگہ اور لکھتے ہیں :۔

"آپ حضرات کے فقیہ صاحب کا یہ خیال بھی بالکل باطل ہے کہ فقہاء جو "ضرورت" کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور جس کے تحت وہ ممنوعات کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔ یہ لفظ اس معنی میں ہے جس معنی میں ہم اور آپ اپنی بول چال میں لفظ ضرورت استعمال کرتے ہیں۔ اگر اس معنی میں ہے تب تو سمجھیے کہ تمام حرمتوں کے دروازے آپ نے چوپٹ کھول دیے "

میری طرف یہ انتساب بھی صرف غلط ہی نہیں ہے بلکہ میری تحریر کے بالکل برعکس ہے۔ اپنی عبارتیں پیش کرنے سے پہلے میں ایک اور بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ مولانا کی یہ عبارت پڑھنے والے سمجھیں گے کہ فقہاء کی اصطلاح "ضرورت" پر پہلے اپنے "تذکرہ و تبصرہ" میں بحث کر چکے ہوں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں اس کا کوئی اشارہ بھی نہیں بلکہ شدید انکار موجود ہے۔ میں یہاں ان کی چند عبارتیں پیش کرتا ہوں :۔

"شریعت نے حرمتوں کے درمیان نہ تو ابدی اور غیر ابدی قطعی اور غیر قطعی قسم کی کوئی تفریق کی ہے' نہ "شدید ضرورت" کے تحت کسی حرمت کے حلت میں تبدیل ہو جانے کا فتویٰ دیا ہے۔ یہ دونوں باتیں ان حضرات کے اپنے ذہن کی ایجاد ہیں اور مقصود ان کی ایجاد سے شریعت کی ان پابندیوں سے پیچھا چھڑانا ہے جن کو کتا بول میں لکھ کر فروخت کرنا تو آسان تھا لیکن سیاسی حوصلوں کے ساتھ اب عملاً ان کو نباہنا ان کے لیے ممکن نہیں۔ شریعت میں جو بات کہی گئی ہے وہ تو یہ ہے کہ ہر حرام سے بچو' البتہ اگر اکراہ یا اضطرار کی حالت پیش آ جائے تو اس صورت میں آدمی کو اس بات کی رخصت ہے کہ کسی حرام سے فائدہ اٹھائے بشرطیکہ اس حرام کا خواہش مند ہو' نہ اس حد سے آگے بڑھے جو رفع ضرورت کے لیے ناگزیر ہے "

ملاحظہ ہو ... ۱۹۶۳ ...

استنے سے تسلی نہیں ہوئی اس لیے آگے پھر لکھتے ہیں :۔

" اضطرار و اکراہ " کو شدید ضرورت سے تعبیر کرنا اور شرعی حرمتوں کو ابدی اور غیر ابدی یا قطعی اور غیر قطعی کے دو الگ الگ خانوں میں بانٹ دینا محض تعبیر کی خامیاں نہ غلطی نہیں ہے بلکہ اسلامی شریعت کے خلاف یہ دیدہ و دانستہ ایک ایسی شرارت ہے جس کی اگر بروقت بیخ کنی نہ کی گئی تو یہ فتنہ بن کر بہت جلد پوری شریعت کو اپنے لپیٹ میں لے لے گی ۔ (صٹ)

کچھ آگے مزید رقمطراز ہیں :۔

ہم یہاں تھوڑی دیر کے لیے اس فرق کو نظر انداز کرتے ہیں جو " شدید ضرورت " اور " اکراہ و اضطرار کے درمیان ہو ہم یہ فرض کیے لیتے ہیں کہ ان حضرات نے " شدید ضرورت " سے اضطرار و اکراہ ہی کو مراد لیا ہو " (صل)

ان عبارتوں سے بوضاحت معلوم ہوا کہ " ضرورت " یا شدید ضرورت " فقہاء کی سرے سے کوئی ایسی اصطلاح ہی نہیں ہے جس کے تحت ممنوعات کے جواز کا فتویٰ دیا جاسکے ۔ چنانچہ مولانا کی عبارتیں پڑھ کر مجھ سے ایک سائل نے جو سوال کیا تھا وہ یہ ہے :۔

اضطرار و اکراہ کی صورت میں تو بعض حرام چیزوں کے استعمال کی رخصت مشہور ہے لیکن یہ شدید ضرورت " کی نئی اصطلاح کہاں سے نکل آئی ۔ (زندگی جنوری ۶۵ء صلہ)

اس سوال کے جواب میں میں نے جو کچھ لکھا تھا اس کو پڑھ کر مولانا کو خیال آیا ہوگا کہ ان سے چوک ہوگئی ہے لیکن افسوس کہ انھوں نے اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کیا بلکہ میری طرف الٹی بات منسوب کردی ۔ میرے جواب کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں :۔

" اضطرار " مجبوری کو کہتے ہیں اور اکراہ زبردستی کو ۔ اکراہ میں کسی دوسرے شخص یا اشخاص کی طرف سے دباؤ ہوتا ہے اور اضطرار میں کسی دوسرے شخص کی طرف سے زبردستی ضروری نہیں ہے " ضرورت " کا لفظ فقہی اصطلاح میں ایسی شدید احتیاج کے لیے استعمال ہوتا ہے کہ اس کو نظر انداز کرنا شخصی یا اجتماعی طور پر سخت نقصان کا سبب بن جائے اس لیے اضطرار اور ضرورت میں کوئی خاص فرق باقی نہیں رہتا " (زندگی جنوری صلہ)

یہ عبارت بھی صاف بتا رہی ہے کہ فقہاء جو " ضرورت " کا لفظ استعمال کرتے ہیں اس کو میں نے اس معنی میں نہیں لیا ہے جس معنی میں ہم اور آپ اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں کچھ آگے چل کر میں نے لکھا ہے :۔

" یہی فقہی ضرورت " ہے جس کو وہاں کی مجلس شوریٰ نے " شدید ضرورت " کہا ہے ۔ اور یہ احتیاطاً اس لیے کی گئی

ہوگی کہ اردو میں ضرورت کا لفظ ہر چھوٹی بڑی حاجت کے لیے استعمال ہوتا ہے اس سے بچنے کے لیے اس پر "شدید" کا اضافہ کیا گیا ہے" ص ۹۹

کیا اس عبارت کو پڑھنے کے بعد بھی اس بات کی کوئی گنجائش ہے کہ میری طرف یہ خیال منسوب کیا جائے کہ میں فقہ کے استعمال کردہ لفظ "ضرورت" اور اردو بول چال کے لفظ ضرورت کو ایک سمجھتا ہوں؟ لیکن مولانا میری طرف پوری صراحت کے ساتھ یہ خیال منسوب کر رہے ہیں، اسے باطل قرار دے رہے ہیں اور ان کا قلم معلوم نہیں کیا کچھ اگل رہا ہے؟ مولانا کی اس روش پر ہمیں سخت افسوس ہے۔

فاضل مدیر میثاق اس بات سے بھی ناواقف نہیں ہو سکتے کہ کسی علم وفن کے مسائل واحکام بیان کرتے ہوئے اس فن کا جو اصطلاحی لفظ استعمال کیا جاتا ہے اس سے مراد اصطلاحی معنی ہوتا ہے نہ کہ عام بول چال کا معنی۔ اس لیے اگر میں بغیر کسی قید کے بھی لفظ ضرورت استعمال کرتا تو اس سے عام بول چال کا معنی مراد لینا صحیح نہ ہوتا ۔ چہ جائیکہ میں نے اسے فقہی اصطلاح کی قید کے ساتھ بیان کیا اور اس کی تشریح کی ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی عرض کردوں کہ اگر وہاں کی مجلس شوریٰ صرف لفظ "ضرورت" استعمال کرتی جب بھی یہ کہنا غلط ہوتا کہ اس نے نئی اصطلاح ایجاد کرلی ہے اور صورت حال یہ ہے کہ اس نے مزید احتیاط کے لیے اس پر لفظ "شدید" کا اضافہ کر دیا ہے۔ مولانا کا بار بار یہ دہرائے چلے جانا کہ اس نے نئی تعبیر اور نئی اصطلاح ایجاد کرلی ہے صحیح نہیں ہے۔ ضرورت کا لفظ فقہا نے استعمال کیا ہے اور بکثرت استعمال کیا ہے۔ اس لیے نئی اصطلاح کا الزام اگر عائد ہوتا ہے تو فقہا پر ہوتا ہے اور لطیفہ یہ ہے کہ مولانا نے جس تذکرہ وتبصرہ میں الزام عائد کیا اور شدید ضرورت کی اصطلاح سے بشدت انکار کیا ہے اس میں انھوں نے خود شاید غیر شعوری طور پر ضرورت کا لفظ استعمال کیا ہے اس لیے ان کا سارا اعتراض ہی ختم ہو جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"بشرطیکہ نہ اس حرام کا خواہش مند ہو نہ اس حد سے آگے بڑھے جو رفع ضرورت کے لیے ناگزیر ہے"

میں بڑے ادب سے پوچھتا ہوں کہ اس عبارت میں "ضرورت" کا لفظ کس معنی میں استعمال ہوا ہے اور وہ ضرورت کیا ہے جس کو رفع کرنے میں ناگزیر حد سے آگے بڑھنا غلط ہے؟ بس سمجھ لیجیے کہ اسی طرح کی "ضرورت" کے تحت ممنوعات کے جواز کا فتویٰ دیا جاتا ہے۔

مولانا تحریر فرماتے ہیں :۔

میں نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ فقہاء جو "ضرورت" کا لفظ استعمال کرتے ہیں یہ ان کی اپنی ایک اصطلاح ہے اور اس سے مراد وہی چیز ہے جس کو قرآن میں اضطرار کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اضطرار کا مفہوم اردو میں ہرگز ضرورت یا شدید ضرورت سے ادا نہیں ہوتا۔ اس سلسلے کے مضامین میں واضح کرچکا ہوں کہ اضطرار کے معنی بے بسی کی اس حالت کے ہیں جس میں آدمی کے لیے دو حراموں سے ایک حرام کے اختیار کرنے کے سوا اور کوئی مفر باقی نہ رہ جائے ۔ میثاق جنوری ۶۵ء صفحہ ۱

پہلے تو میں شکر ادا کرتا ہوں کہ مولانا کو فقہاء کی اصطلاح "ضرورت" یاد آگئی۔ اس کے بعد نہایت احترام سے عرض کرتا ہوں کہ ان کو یہ گھپلا اس لیے پیش آرہا ہے کہ انھوں نے اضطرار کا جو معنی بیان کیا ہے وہ جامع نہیں بلکہ ادھورا ہے۔ اضطرار کی حالت میں دو حراموں کا وجود ضروری نہیں ہے بلکہ کبھی دو حراموں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا پڑتا ہے اور کبھی حرام ایک ہی ہوتا ہے اور اس کو کسی شدید شخصی یا اجتماعی نقصان سے بچنے کے لیے اختیار کرنا پڑتا ہے۔ میں مولانا ہی کی پیش کی ہوئی ایک مثال یہاں نقل کرتا ہوں۔ وہ قتل مسلم کے جائز ہوجانے کی تازہ مثال پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"فرض کیجیے بھارت ہم پر حملہ کردیتا ہے اور بلا امتیاز ہمارے شہروں پر بمباری شروع کردیتا ہے تو اس کے جواب میں آخر ہم بھی اس امر میں حق بجانب ہوں گے کہ اس کے شہروں پر بمباری کریں جس کے نتیجے میں اس امر کا واضح امکان ہے کہ نہ صرف غیر مصافی آبادی ہلاک ہو بلکہ بہت سے مسلمان مرد عورتیں اور بچے بھی ہلاک ہوں۔ قتل مسلم اگرچہ بہت سنگین بات ہے لیکن صورت اضطرار کی وجہ سے یہ گوارا کرنی پڑے گی۔"

(میثاق جنوری ۶۵ء صفحہ ۱۷)

دیکھیے یہاں صرف ایک ہی حرام موجود ہے یعنی بھارت کے مسلمانوں کا قتل، لیکن صورت اضطرار کی وجہ سے مولانا اس کو اختیار کرنے کی اجازت مرحمت فرما رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس صورت میں وہ دوسرا حرام کون سا ہے جس کو چھوڑ کر اس پہلے حرام کو اختیار کیا جائے گا ـــــ مولانا ہی کی ایک اور عبارت ملاحظہ کیجیے۔

"قلبی اعتقاد جو سقوط قبول نہیں کرتا تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ظاہری اقرار کے سقوط سے اضطرار رفع ہوجاتا ہے۔" (صفحہ ۱۱)

یہاں بھی سوال یہ ہے کہ منہ سے کلمۂ کفر نکالنا تو ایک حرام ہوا لیکن وہ دوسرا حرام کون سا ہے جسے ترک کرکے اس کو

اختیار کیا جائے گا؟ اس صورت میں دوسری بات تو صرف یہ ہے کہ مومن ظاہری اقرار پہ جما رہے اور قتل ہو جائے تو کیا اپنے قتل کو اختیار کرنا مولانا کے نزدیک دوسرا حرام ہے؟ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ اس حالت میں مومن قتل ہو جانے کی صورت اختیار کرے اور قتل ہو جائے تو شہید ہوگا۔ معلوم ہوا کہ مولانا نے اضطرار کا جو معنی بیان کیا ہے وہ اس درجہ ناقص ہے کہ مثال پیش کرتے ہوئے انہیں خود یاد نہ رہا

میں نے اوامر و نواہی کے قابل سقوط اور ناقابل سقوط ہونے کی جو مختصر اصولی بحث کی تھی اس کے جواب میں مولانا نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس پر کسی لمبے تجزیے سے بچتے ہوئے اتنی وضاحت کافی سمجھتا ہوں کہ مجھے ابدی اور غیر ابدی کے الفاظ سے بحث نہیں ہے بلکہ بحث صرف اس سے ہے کہ شریعت میں کچھ اوامر ہر حال میں ناقابل سقوط ہیں اور کچھ بعض حالات میں سقوط قبول کرتے ہیں۔ اور یہی حال نواہی کا ہے۔ یہ تقسیم موجود ہے۔ چاہے کوئی شخص اس کا جو نام بھی رکھ لے۔ گفتگو اس میں نہیں ہے کہ ناقابل سقوط اوامر و نواہی ناقابل سقوط کیوں ہیں اور قابل سقوط اوامر و نواہی قابل سقوط کیوں ہیں۔ اس تقسیم کے اسباب سرے سے زیر بحث نہیں ہیں اس لیے سبب اور وجہ کی بحث چھیڑ کر مغالطہ دینا اور خلط مبحث کرنا مولانا کے شایان شان نہیں ہے۔ یہ کون کہتا ہے کہ اوامر و نواہی کی یہ شرعی تقسیم بلا وجہ ہے۔ وجہ کوئی بھی ہو سوال یہ ہے کہ یہ تقسیم موجود ہے یا نہیں۔ شکر ہے کہ مولانا نے اس تقسیم کو قبول کر لیا اب ابدی اور غیر ابدی کے الفاظ ناموزوں و نامناسب ہیں تو وہ اس کے لیے موزوں مناسب الفاظ تجویز کر لیں۔

آخر میں مولانا نے جو باتیں تحریر فرمائی ہیں وہ بھی عجیب و غریب ہیں۔ یہ سب جانتے ہیں کہ جماعت اسلامی پاکستان نے مس فاطمہ جناح کی تائید و حمایت کا فیصلہ کیا تو بالعموم ہندوستان و پاکستان کے مدیران کرام اور صاحبان اخبار و توقع میں سے جو بھی اس کے خلاف میدان میں کودا وہ عورت کی سربراہی کے اصولی مسئلے کو لے کر شریعت کی حمایت کے نام پہ کودا اور وہ بھی اس طرح جیسے

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

خاص طور سے مس فاطمہ جناح اور صدر ایوب کے مقابلے سے بہت کم تعرض کیا گیا اور لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ جماعت اسلامی ہند نے وہاں کی جماعت اسلامی کی حمایت میں کوئی بحث نہیں چھیڑی۔ دعوت نے اس پر ایک حرف نہیں لکھا۔ زندگی کے اشارات میں اس پر کچھ نہیں آیا۔ آج سے پہلے اس پر کوئی مقالہ شائع نہیں ہوا (باقی صفحہ ۴۳ پر)

پاکستان کا صدارتی انتخاب اور عورت کی سربراہی کا مسئلہ

جناب ڈاکٹر عبدالحق انصاری، ایم اے

پاکستان کا صدارتی انتخاب اگرچہ ختم ہو چکا لیکن اس نے جو اہم شرعی مسئلہ اٹھا دیا تھا اس پر بحث اب تک جاری ہے، نہ صرف پاکستان کے اہل علم نے اس میں حصہ لیا ہے بلکہ ہندستان کے علماء نے بھی اس سے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ آثار بتا رہے ہیں کہ غالباً یہ بحث ابھی کچھ عرصے اور جاری رہے گی۔ پیش نظر مقالے کا مقصد اس پوری بحث کا جائزہ لینا ہے۔ میرا احساس ہے کہ جو لوگ پاکستان کے مخصوص حالات میں عورت کی سربراہی کے جواز کے قائل تھے ان کا موقف دو وجوہ سے ہندوستان کے قارئین کے سامنے پوری طرح نہیں آسکا۔ ایک تو اس لیے کہ وہ اخبارات و رسائل جن میں اس موقف کی وضاحت کی گئی ہے، چند مخصوص لوگوں کو چھوڑ کر عام افراد تک کم پہنچے ہیں۔ اور ہندوستان کے وہ رسائل جن میں عورت کی سربراہی کی مخالفت کی گئی ہے۔ ان کے ذریعہ یہ موقف اپنی صحیح صورت میں سامنے نہیں آسکا ہے، بلکہ بسا اوقات بگڑ کر ہی پیش ہوا ہے۔ اس مقالے کے ذریعہ میں اس موقف کو اس کے دلائل کے ساتھ صحیح صورت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

میرا دوسرا احساس یہ ہے کہ اس موقف کے خلاف جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر بعض ایسے عوامل اور محرکات نے خاصا اثر ڈالا ہے جنھیں ایک سنجیدہ بحث میں دخل انداز نہ ہونا چاہیے تھا۔ اس کی وجہ سے اس قسم کی تحریروں میں سنجیدہ دلائل کے ساتھ ساتھ طنز و تشنیع اور تعریض و استہزاء کا ایک خاصا عنصر ملتا ہے جس نے بعض اوقات سنجیدہ استدلال کو بھی بے حد متاثر کیا ہے۔ ہمارے دینی حلقے کی بڑی بدقسمتی ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ایک افسوسناک المیہ ہے کہ جب بھی کوئی اہم دینی بحث شروع ہوتی ہے تو اسے ہم ایک خالص دینی مسئلے کی حیثیت سے نہیں لیتے۔ ہماری جماعتی عصبیتیں اور شخصی اختلافات اس قدر ہم پر غالب ہو جاتے ہیں کہ نہ صرف انصاف کا دامن ہمارے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے بلکہ شائستگی اور تہذیب کے عام انسانی حدود سے بھی ہم بعض اوقات نیچے گر جاتے ہیں۔

ہیں نے کوشش کی ہے، طنز و تعریض کے اس عنصر کو نظر انداز کر کے مخالفت میں جو سنجیدہ دلائل دیے گئے ہیں انھیں بھی بے کم و کاست سامنے لاؤں تاکہ قارئین کو خود سے کسی نتیجے پر پہنچنے میں آسانی ہو۔ البتہ میں طنز و استہزاء کے بعض نمونے ضرور سامنے لانا چاہتا ہوں تاکہ ہر شخص اندازہ کر سکے کہ اس طرح کے نمونے کسی طرح بھی اہلِ علم کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ کسی صورت سے انہیں "دینی خدمت" نہیں کہا جا سکتا۔ اور اسلام تو بہت بلند ہے عام انسانی اخلاق کے معیار سے بھی وہ کس قدر فروتر ہیں۔

اصل شرعی مسئلہ جسے پاکستان کے صدارتی انتخاب نے اٹھایا اس کے دو اجزاء ہیں جنھیں دو سوالات کی صورت میں اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔

(۱) پہلا سوال یہ ہے کہ اسلامی شریعت میں عام حالات کے اندر کسی ملک کی سربراہی کے لیے مسلمان عورت کے انتخاب یا تقرر کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اگر عام حالات کے بجائے غیر معمولی حالات ہوں تو ایسی صورت میں عورت کا اس ملک کی سربراہی کے منصب پر آنا یا لانا خواہ اس کی صورت انتخاب کی ہو یا تقرر کی شریعت کی نگاہ میں کیسا ہے؟ اگر ایسا کرنا جائز ہو تو کن قیود و شرائط کے ساتھ!

(۲) اگر بعض غیر معمولی حالات میں عورت کی سربراہی جائز ہو سکتی ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان میں واقعۃً وہ حالات تھے جن میں ایک مسلمان عورت کو ایک مسلمان مرد کے مقابلے میں کھڑا کرنا جائز ہو سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں کیا پاکستان میں ایسے حالات تھے جن میں صدر ایوب کے مقابلے میں مس فاطمہ جناح کی حمایت کرنا شرعاً جائز تھا؟

پہلا سوال ایک اصولی سوال ہے اور پاکستان میں یہ سوال پیش آتا یا نہ آتا نظری اعتبار سے اس سوال پر ہمیشہ بحث ہو سکتی ہے۔ دوسرا سوال ایک عملی سوال ہے اور ایک اصول کے انطباق کا مسئلہ ہے۔ پہلے سوال کے تین جوابات منطقی طور پر ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ عورت مرد کی طرح عام حالات میں بھی صدر مملکت ہو سکتی ہے۔ دوسرا یہ کہ صرف غیر معمولی حالات میں فلاں فلاں قیود و شرائط کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ اور تیسرا یہ کہ نہ عام حالات میں ہو سکتی ہے اور نہ غیر معمولی حالات میں کسی بھی حالت میں اس کی سربراہی جائز نہیں ہو سکتی۔ اگر پہلا جواب صحیح ہو تو پھر یہ معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ پاکستان کے حالات غیر معمولی تھے یا نہیں؟ یہی بات اس وقت بھی کہی جا سکتی ہے جب کہ تیسرا جواب شرعاً صحیح ہو۔ اگر دوسرا جواب صحیح ہو تو صرف اسی صورت میں یہ معلوم کرنا ضروری ہوگا کہ پاکستان کے حالات غیر معمولی تھے یا نہیں۔

مسئلے کی تنقیح کے بعد ہم ان لوگوں کا موقف اور اس کے حق میں دیے گئے دلائل پیش کریں گے جو مس فاطمہ جناح کی حمایت کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے پاکستان کی جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کی وہ قرارداد آتی ہے جس میں

ے فاطمہ جناح کی امیدواری کی تائید کا فیصلہ کیا گیا۔ قرارداد کی اہمیت کے پیش نظر اسے پورا نقل کرنا ضروری ہے۔

جماعت اسلامی ابتدا سے اس ملک میں جمہوری اقدار کی بحالی کے لیے متحدہ محاذ قائم کرنے کی کوششوں میں برابر شریک رہی ہے اور آئندہ انتخاب کے لیے حزب اختلاف کو ایک متفقہ پروگرام پر جمع کرنے میں اس سے تعلق رکھنے والوں نے پورا پورا حصہ لیا ہے لیکن جب صدارت کے لیے حزب اختلاف کی طرف سے ایک متفق علیہ امیدوار کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو ہم اس پیچیدہ صورت حال سے دوچار ہو گئے۔ کہ چار جماعتوں نے محترمہ فاطمہ جناح کو منتخب کرنے پر اتفاق کر لیا جسے قبول کرنا ان شرعی احکام کی موجودگی میں ہمارے لیے مشکل تھا جن کی رو سے کوئی عورت مسلمانوں کی امیر نہیں ہو سکتی اسی بنا پر ہم نے صدارت کے مسئلے میں حزب اختلاف کے ساتھ اتفاق یا ان سے علیحدگی کا کوئی اعلان نہیں کیا تاکہ مسئلے کے تمام پہلوؤں کا اچھی طرح جائزہ لینے اور اہل علم[1] سے مشورہ کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کیا جا سکے۔ اب کافی غور اور مشورے کے بعد جماعت جس نتیجے پر پہنچی ہے وہ یہ ہے:۔

شریعت میں جو چیزیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں ان میں سے بعض کی حرمت تو ابدی اور قطعی ہے جو کسی حالت میں حلت سے تبدیل نہیں ہو سکتی اور بعض کی حرمت ایسی ہے جو شدید ضرورت کے موقع پر ضرورت کی حد تک جواز میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اب یہ واضح ہے کہ عورت کو امیر بنانے کی ممانعت ان حرمتوں میں سے نہیں ہے جو ابدی اور قطعی ہیں بلکہ دوسری قسم کی حرمتوں ہی میں اس کا شمار ہو سکتا ہے اس لیے ہمیں ان حالات کا جائزہ لے کر دیکھنا چاہیے جن میں یہ مسئلہ ہمارے سامنے آیا ہے۔ حالات یہ ہیں کہ موجودہ صدر کے گزشتہ چھ سالہ دورِ اقتدار میں ملک دینی، اخلاقی اور سیاسی و معاشی حیثیت سے سخت تنزل کا شکار ہو چکا ہے۔ دینی حیثیت سے یہاں شعائر دینی کی بے حرمتی اور صریح منکرات و فواحش کی ترویج اس چھ سال کے عرصے میں جتنے بڑے پیمانے پر ہوئی ہے اسے ہر وہ شخص انتہائی رنج و افسوس کے ساتھ دیکھتا ہے جس کے اندر کوئی دینی حس موجود ہے۔ پھر جس طرح خدا اور رسول کے صریح احکام کو نئے عائلی قوانین کے ذریعہ سے بدل کر رکھ دیا گیا ہے اس جسارت کی کوئی نظیر نہ انگریزی دورِ اقتدار میں ملتی ہے اور نہ بدنام سیاست دانوں کے دورِ اقتدار میں۔ اخلاقی حیثیت سے موجودہ حکمران گروہ نے اپنے سیاسی اقتدار کو مضبوط کرنے کے لیے خوف اور طمع کے ہتھیار استعمال کر کے پوری قوم میں ضمیر فروشی اور بزدلی کی بیماری وبا کی طرح پھیلا دی ہے جس سے ملک کا ہر دشمن فائدہ اٹھا سکتا ہے سیاسی حیثیت سے اس حکمران گروہ نے ملک کے باشندوں کو ایک طرف جابرانہ قوانین سے جکڑ کر اور پریس، تقریر اور اجتماع کی آزادیوں

[1] مجلس شوریٰ نے جن علماء سے مشورہ کیا ان میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب جیسے جلیل القدر عالم دین بھی شامل تھے۔ (فاران کراچی مارچ ۶۵ء صفحہ)

سے محروم کر کے پوری طرح بے زبان اور بے بس کر دیا ہے اور دوسری طرف اس نے پوری کوشش کی ہے کہ ملک میں کوئی متبادل قیادت باقی نہ رہنے دی جائے تاکہ یہ قوم چار و ناچار اس گروہ کی بندگی کرتی رہے۔ معاشی حیثیت سے ملک کا بال بال بیرونی سودی قرضے میں بندھ چکا ہے۔ ملک کی دولت چند خاندانوں کے ہاتھوں میں مرکوز ہو چکی ہے اور ہوتی جا رہی ہے غریب اور متوسط طبقوں کی کمر روزافزوں گرانی نے توڑ کر رکھ دی ہے اور یہ گرانی قدرتی اسباب سے نہیں ہے بلکہ اس طبقہ کی پیدا کردہ مصنوعی گرانی ہے جو سیاسی اقتدار کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے معیشت کی ساری کنجیوں پر قابض ہو گیا ہے۔

یہ عام اور معمولی حالات نہیں بلکہ خاص اور غیر معمولی حالات ہیں۔ اس اسلامی مملکت اور مسلمان قوم کو ان خطرات سے بچانا ہم پر فرض ہے جو ان حالات کے مسلسل جاری رہنے میں صریحاً مضمر ہیں۔ اگر اس صورت حال میں ہماری کوتاہی کے باعث توسیع ہوئی تو ہم اس کے وبال سے نہ بچ سکیں گے۔ ان حالات کو بدلنے کی ایک ہی آئینی صورت اب باقی ہے اور وہ یہ کہ جن لوگوں کو بھی خرابیوں کا احساس ہے وہ مجتمع ہو کر آئندہ انتخابات میں موجودہ برسر اقتدار طبقہ کو مسند اقتدار سے ہٹانے کی کوشش کریں اور ایسے لوگوں کو معاملات کی سربراہی سونپیں جن سے کم از کم یہ امید ہو کہ وہ موجودہ استبدادی نظام کی جگہ جمہوری اقدار کو بحال کر دیں گے تاکہ قوم بالکل بے بس اور بے آواز ہو کر نہ رہ جائے اور آزادی کے ماحول میں دین و اخلاق اور تمدن و معاشرت کے اس روز افزوں بگاڑ کو روکنے کے لیے کچھ کیا جا سکے۔ یہی جمہوریت کی بحالی ہے جس کے لیے حزب اختلاف نو نکاتی پروگرام پر متفق ہوئی ہیں اور انھوں نے مل کر انتخاب میں کام کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس پروگرام کی کامیابی کا بہت بڑی حد تک انحصار اس پر ہے کہ موجودہ صدر کے مقابلے میں کسی ایسے شخص کو صدارتی انتخاب کے لیے کھڑا کیا جائے جو بے لوث اور بے غرض ہو جس پر پوری طرح یہ اعتماد کیا جا سکے کہ برسر اقتدار آ کر وہ اپنے ذاتی اقتدار کو مضبوط کرنے کی فکر نہ کرے گا بلکہ فی الواقع پوری ایمان داری کے ساتھ جمہوریت کو بحال کر دے گا اور جس کو ملک کے باشندوں میں اتنی ہردلعزیزی حاصل ہو کہ انتخاب میں اس کے کامیاب ہونے کی توقع کی جا سکے۔

جماعت اسلامی کے سوا دوسری اپوزیشن پارٹیوں نے اس مقصد کے لیے محترمہ فاطمہ جناح کو پسند کیا ہے اس انتخاب میں اس کے سوا کوئی قباحت نہیں ہے کہ وہ ایک خاتون ہیں۔ اس پہلو کے سوا باقی ہر حیثیت سے ان کے اندر وہ اوصاف موجود ہیں جو اوپر ایک موزوں صدارتی امیدوار کے لیے بیان کیے گئے ہیں۔ نیز انھوں نے اس ارادے کا بھی اظہار کیا ہے کہ منتخب ہونے کے بعد وہ جلد از جلد نو نکاتی پروگرام کے مطابق دستور میں ترمیم کرا کے اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہ راست انتخاب کرا کے اقتدار عوام کے نمائندوں کے سپرد کر دیں گی۔ جماعت کو اب تک صرف

اس شرعی قباحت کی بنا پر یہ انتخاب قبول کرنے میں تامل رہا ہے۔ لیکن حالات کی غیر معمولی نوعیت دیکھتے ہوئے جماعت نے پورے غور و خوض کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ ان خاص حالات میں اس انتخاب کو قبول کر لینا شرعاً ناجائز نہ ہوگا۔ اس کے ساتھ جماعت یہ امر بھی پوری طرح واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اصل شرعی قاعدہ بجائے خود قائم ہے اور موجودہ غیر معمولی حالات میں اس طرح کا کوئی فیصلہ آئندہ کے لیے نظیر نہیں بن سکتا۔

مذکورہ بالا وضاحت کی روشنی میں اس مجلس نے صدارتی انتخاب کے لیے موجودہ صدر کے مقابلہ میں محترمہ فاطمہ جناح کی تائید اور حمایت کا فیصلہ کیا ہے اور یہ مجلس عوام سے اپیل کرتی ہے اور جماعت کے کارکنوں کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ جبر و استبداد سے نجات پانے کے اس آخری موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اور اس مہم کو تن من دھن سے کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔ (شہاب - ۱۱ ر اکتوبر ۱۹۶۴ء)

پہلی بات جو اس قرارداد میں بہت واضح لفظوں میں تسلیم کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی شریعت عام حالات میں عورت کی امارت کو جائز نہیں قرار دیتی۔ یہ بات پہلے پیراگراف میں صراحت سے کہی گئی ہے۔ چوتھے پیراگراف کے آخری جملہ میں اسے دوبارہ دہرایا گیا ہے اور اسی پیراگراف کی ابتدائی سطروں میں دو مرتبہ اس کی شرعی قباحت کا اعتراف کیا گیا ہے۔ رہی یہ بات کہ مجلس شوریٰ عورت کی امارت کو کس معنی میں ناجائز سمجھتی ہے اس سوال کے جواب میں قرارداد کا ہر پڑھنے والا یہی سمجھے گا کہ مجلس شوریٰ اسے شرعاً حرام سمجھتی ہے۔ قرارداد کے دوسرے پیراگراف کی تیسری اور چوتھی سطروں میں اس حرمت کو جن الفاظ میں تسلیم کیا گیا ہے ان پر دوسرا جو بھی اعتراض ہو یہ بات بہرحال ہر شبہہ سے بلند ہے کہ جماعت اسلامی کے نزدیک شریعت نے عورت کی امارت کو عام حالات میں حرام ہی قرار دیا ہے۔ دوسرے پیراگراف کی ابتدائی سطروں کو پڑھنے کے بعد اس کے علاوہ کوئی اور رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

دوسری بات جو اس قرارداد میں واضح طور پر کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ مجلس شوریٰ عام حالات میں عورت کی سربراہی کو شرعاً ناجائز ہی سمجھتی ہے لیکن غیر معمولی حالات میں وہ اس کے جواز کی قائل ہے۔ قرارداد میں غیر معمولی حالات کے بجائے "شدید ضرورت" کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ قرارداد میں اس بات کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ شریعت میں جو حرام چیزیں شدید ضرورت کے وقت جائز ہوتی ہیں وہ محض ضرورت کی حد تک جائز ہوتی ہیں۔ چنانچہ پاکستان کے حالات میں جماعت عورت کی سربراہی کے جواز کو بھی اس قید سے مقید سمجھتی ہے اس لیے وہ آگاہ کرتی ہے کہ اس کا عمل عام حالات کے لیے نظیر نہیں ہے۔ عام حالات میں ہمیشہ عورت کی امارت اصل قاعدے کے مطابق حرام ہی رہے گی۔ یہ باتیں قرارداد میں اس قدر واضح ہیں کہ کوئی انصاف پسند قاری ان کے بارے میں کسی شبہہ میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ہر شخص کو قرارداد کے دوسرے پیراگراف کی ابتدائی عبارت بھی کھٹکے گی۔ بالخصوص ابدی اور قطعی کے الفاظ کے بارے میں میرا خیال ہے کہ اور دوسرے لوگ بھی اس خیال کی تائید کریں گے کہ وہ غیر موزوں ہی نہیں غلط بھی ہیں اس بات کو ادا کرنے کے لیے کہ شریعت میں جو چیزیں حرام ہیں ان میں سے بعض ایسی ہیں جو کسی حالت میں بھی جائز نہیں ہوتیں اور بعض ایسی ہیں جو بعض حالات میں جائز ہو جاتی ہیں۔ قرارداد کی یہ عبارت "شریعت میں جو چیزیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں ان میں بعض کی حرمت تو ابدی اور قطعی ہے جو کسی حالت میں بھی حلت سے تبدیل نہیں ہو سکتی اور بعض کی حرمت ایسی ہے جو شدید ضرورت کے موقع پر ضرورت کی حد تک جواز میں تبدیل ہو سکتی ہے" ۔ خود قرارداد کے منشا کے خلاف ہے۔ شریعت کی حرام کی ہوئی چیزوں میں سے بعض کو ابدی طور پر حرام کہنے اور بعض کو ان سے مختلف کہنے سے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ شاید مجلس شوریٰ یہ سمجھتی ہے کہ شریعت کی بعض حرام چیزیں ایسی ہیں جن کی حرمت کسی وقت یا زمانے کے بعد ختم ہو سکتی ہے۔ بر خلاف دوسری حرام چیزوں کے جن کی حرمت تا قیامت باقی رہے گی۔ قرارداد میں ابدی کے ساتھ قطعی کا لفظ بھی آیا ہے۔ شریعت کی محرمات میں اگرچہ ابدی اور غیر ابدی کی تقسیم ان الفاظ کے ساتھ غلط ہے لیکن قطعی اور غیر قطعی کی تقسیم ایک مخصوص تشریح کے ساتھ صحیح ہو سکتی ہے۔ فقہائے احناف جس طرح فرض و واجب میں دلیل قطعی اور ظنی کی بنیاد پر فرق کرتے ہیں۔ اسی طرح حرام اور مکروہ تحریمی کے درمیان بھی قطعی اور ظنی دلیل کی بنا پر فرق کرتے ہیں۔ دوسرے مکاتب فقہ کے نزدیک یہ تقسیم عملاً تسلیم نہیں کی جاتی۔ حرام اور مکروہ تحریمی کے معنی میں قطعی حرام اور غیر قطعی حرام کی تقسیم پر فقہ حنفی کی رو سے اگرچہ کوئی اعتراض نہیں ہوتا لیکن مجلس شوریٰ کی اس قرارداد میں ابدی کے ساتھ قطعی کا لفظ بے موقع استعمال ہوا ہے جس کی کوئی ضرورت یہاں نہیں معلوم ہوتی۔

یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ ابدی اور قطعی کے الفاظ کا استعمال بے ضرورت اور نامناسب ہے یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا مجلس شوریٰ اپنی قرارداد کے دوسرے پیراگراف کی ابتدائی عبارت سے جس میں یہ الفاظ آئے ہیں لوگوں کے سامنے یہ نظریہ رکھنا چاہتی ہے کہ شریعت کے محرمات دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو رہتی دنیا تک حرام رہیں گے اور ایک وہ جو ایک دور، زمانہ یا وقت کے بعد حرام باقی نہیں رہیں گے ان کی حرمت منسوخ ہو جائے گی اور دوسری حلال چیزوں کی طرح وہ بھی حلال ہو جائیں گے۔

اس سوال کے معاملے میں بھی مجھے یقین ہے کہ ہر انصاف پسند اور غیر جانبدار شخص پوری قرارداد کو پڑھنے کے بعد اس نتیجہ پر لازماً پہنچے گا کہ مجلس شوریٰ اس طرح کا کوئی نظریہ اپنے ذہن میں نہیں رکھتی، بلکہ اس قرارداد میں ایسے دلائل بھی جابجا موجود ہیں جن کی موجودگی میں اس نظریے کو اس کی طرف منسوب کرنا قطعاً غلط ہے۔

یہ تو واضح ہے کہ قرارداد کی جس عبارت کی بنیاد پر یہ نظریہ مجلس شوریٰ کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے وہ عورت کی امارت کے مسئلے کے سلسلے میں آئی ہے سوال یہ ہے کہ کیا قرارداد نے اس مسئلے کے سلسلے میں اپنی رائے کے بارے میں

کسی کے لیے ادنیٰ شبہہ کرنے کا موقع بھی چھوڑا ہے۔ کیا وہ عام حالات میں عورت کی امارت کے عدمِ جواز کی صریح الفاظ میں قائل نہیں ہے، کیا قرارداد کے یہ الفاظ صریح نہیں ہیں؟

"جب صدارت کے لیے حزبِ اختلاف کی طرف سے ایک متفق علیہ امیدوار کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو ہم اس پیچیدہ صورتِ حال سے دوچار ہو گئے کہ چار جماعتوں نے محترمہ جناح کو منتخب کرنے پر اتفاق کر لیا جسے قبول کرنا ان شرعی احکام کی موجودگی میں ہمارے لیے مشکل تھا جن کی رو سے کوئی عورت مسلمانوں کی امیر نہیں ہو سکتی۔"

پھر جماعت کے افراد کو مس فاطمہ جناح کی تائید میں تامل کی وجہ شریعت کا یہی حکم تو رہا ہے۔

"اس انتخاب میں اس کے سوا کوئی قباحت نہیں ہے کہ وہ ایک خاتون ہیں۔"

"جماعت کو اب تک صرف اس شرعی قباحت کی بنا پر انتخاب قبول کرنے میں تامل رہا ہے۔"

پھر جماعت نے صاف الفاظ میں یہ بات واضح کر دی ہے کہ یہ شرعی قباحت ابدی ہے نہ کہ عارضی اور وقتی۔ قرارداد کے الفاظ یہ ہیں:۔

"اس کے ساتھ جماعت یہ امر بھی پوری طرح واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اصل شرعی قاعدہ علیٰ حالہٖ قائم ہے اور موجودہ غیر معمولی حالات میں اس طرح کا کوئی فیصلہ آئندہ کے لیے نظیر نہیں بن سکتا۔"

تیسری بات اس قرارداد سے یہ سامنے آتی ہے کہ مجلس شوریٰ، پاکستان کے حالات کو عام حالات نہیں، بلکہ غیر معمولی حالات قرار دیتی ہے اور انھیں حالات کے پیش نظر وہ عوام سے مس فاطمہ جناح کے حق میں ووٹ دینے کی اپیل کرتی ہے۔ اس بات کے لیے قرارداد میں جو دلیل دی گئی ہے اسے ذیل کے مقدمات میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) صدر ایوب خاں کے گزشتہ چھ سالہ دورِ اقتدار میں ملک دینی، اخلاقی، سیاسی اور معاشی حیثیت سے تنزل کا شکار ہو چکا ہے۔

(۲) صدر ایوب سے اس بات کی قطعاً توقع نہیں ہے کہ وہ ان حالات کی اصلاح کی کوشش کریں گے۔

(۳) ان کے استبدادی نظام حکومت میں اس کی بھی توقع نہیں ہے کہ کوئی انفرادی یا اجتماعی کوشش اس صورتِ حال کو بدلنے میں کامیاب ہو سکے گی۔

(۴) اب اس صورتِ حال کو بدلنے کے لیے واحد آئینی طریقہ یہ رہ گیا ہے کہ صدر ایوب کے استبدادی نظام کی جگہ پر جمہوری نظام کو بحال کیا جائے۔ جمہوریت کی بحالی بجائے خود مقصود نہیں ہے بلکہ اس کی ضرورت اس لیے ہے کہ ان اصلاحی کوششوں کی کامیابی کے امکانات پیدا ہو سکیں جو صدر ایوب کے استبدادی نظام میں ممکن نہیں ہیں۔

(۵) جماعت اسلامی تنہا اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ وہ جمہوریت کو بحال کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ متحدہ محاذ کی دوسری پارٹیوں کے ساتھ تعاون سے اسے توقع ہے کہ وہ جمہوریت کو بحال کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

(۶) متحدہ محاذ کی دوسری پارٹیوں نے اپنے امیدوار کی حیثیت سے مس فاطمہ جناح کو منتخب کیا۔ جماعت اسلامی کے نمائندے شرعی قباحت کے پیش نظر اس فیصلے کے حق میں نہ تھے۔

(۷) مگر متحدہ محاذ کے فیصلے کے بعد جماعت اسلامی کے سامنے اس کے سوا کوئی اور راستہ نہ تھا کہ وہ اس شرعی قباحت کو جو مس فاطمہ جناح کی صدارت کی تائید میں مضمر ہے گوارا کرے تاکہ وہ جمہوریت کو بحال کر کے ملک میں ان دینی اور اخلاقی خرابیوں کے خلاف مؤثر قدم اٹھا سکے جنہیں صدر ایوب کی حکومت اپنی قوت اور اپنے وسائل و ذرائع سے کام لے کر پیدا کر رہی ہے مجلس شوریٰ ان شدید تر اور وسیع تر خرابیوں کو دور کرنے کے لیے مس فاطمہ جناح کی صدارت کی تائید میں مضمر شرعی قباحت کو اختیار کرنا جائز سمجھتی ہے۔

ان مقدمات کو الگ الگ بیان کرنے سے مجھے توقع ہے کہ قرارداد میں دی گئی دلیل واضح ہو کر سامنے آ گئی ہو گی۔ ایسا کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ جو تنقیدیں جماعت اسلامی کے موقف پر کی گئی ہیں ان کا جائزہ لے کر متعین کیا جا سکے ان کی زد دلیل کی کس شق پر ہے اور جماعت اسلامی کے آزاد اخبار و رسائل نے اس دلیل کی ہر ہر شق کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے مقابلہ کر کے قارئین جماعت اسلامی کے موقف یا اس پر کی گئی تنقید کی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکیں۔

قرارداد میں اس دلیل کے بعض اجزا کی کسی قدر تشریح کی گئی ہے۔ دوسرے اجزا کی تشریح کے لیے جماعت اسلامی کے اخبارات و رسائل کے اقتباسات پیش کرنا ضروری ہیں تاکہ جماعت اسلامی کا موقف اچھی طرح پر واضح ہو جائے۔

دلیل کی شق نمبر ۱ کے تحت قرارداد نے ذیل کی باتیں درج کی ہیں۔

"دینی حیثیت سے یہاں شعائر دینی کی بے حرمتی اور صریح منکرات و فواحش کی ترویج اس چھ سال کے عرصے میں بڑے پیمانے پر ہوئی ہے۔ اسے ہر وہ شخص انتہائی رنج و افسوس کے ساتھ دیکھ رہا ہے جس کے اندر کوئی دینی حس موجود ہے پھر جس طرح خدا اور رسول کے صریح احکام کو نئے عائلی قوانین کے ذریعہ سے بدل کر رکھ دیا گیا ہے اس جسارت کی کوئی نظیر نہ انگریزی دور اقتدار میں ملتی ہے اور نہ بدنام سیاست دانوں کے دور اقتدار میں"

امیر جماعت اسلامی پاکستان نے ایک تقریر میں اس بات کی تشریح ان الفاظ میں کی:۔

"انہوں نے (صدر ایوب اور ان کی حکومت) عائلی قوانین کے ذریعہ قرآن و سنت کی جو تشریح پیش کی جو انگریز بھی اپنے دور میں نہ کر سکا اور نہ ہی بدنام سیاست دان یہ کام کر سکے۔ میں آپ حضرات سے ایک استفہام

کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اگر ایک شخص دوسری شادی کے جرم میں عدالت کے روبرو پیش کر دیا جائے اور وہ صرف یہ کہہ دے کہ میری داشتہ ہے بیوی نہیں ہے تو یہ قانون اسے معاف کر دیتا ہے لیکن اگر وہ اسے اپنی دوسری بیوی ظاہر کرے تو قانون اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا! فوجداری قانون میں ایک ترمیم کی گئی ہے جس کے تحت شادی شدہ خاتون کے ساتھ ارتکاب زنا کو قابل راضی نامہ قرار دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے یہ جرم قابل راضی نامہ نہ تھا۔

ملک کے اندر بے حیائی اپنے شباب پر ہے۔ گزشتہ سال شراب کی کھپت کا اندازہ پانچ لاکھ گیلن لگایا گیا ہے پنجاب یونیورسٹی ایم اے کی جماعتوں میں موسیقی کو مضمون کی حیثیت دی گئی ہے۔ پی آئی اے میں مسلمان لڑکیوں کو میں نے اپنی آنکھوں سے مسافروں کو شراب پلاتے دیکھا ہے۔ کراچی کے ایک بڑے ہوٹل میں نہ صرف لڑکیاں بیراگیری کرتی ہیں بلکہ انہیں خلوت میں مسافروں کی خدمت پر بھی مامور کیا جاتا ہے۔ ناچ رنگ کو عروج حاصل ہو چکا ہے۔ ادارہ تحقیقات اسلامیہ نامی ایک ادارہ ایک ایسے ماہر کی نگرانی میں کام کر رہا ہے جو اسلامی فقہ کی تعلیم ایک انگریز سے حاصل کر کے قرآن و سنت کی ایسی ایسی تاویلات پیش کر رہا ہے اور وہاں سے ایسے جرائد و رسائل نکل رہے ہیں کہ سبحان اللہ — سرکاری طور پر لوگوں کے ایمان خریدنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ (آئین - ۷ر نومبر ۱۹۶۲ء صفحہ ۳۴)

سیاسی اور معاشی حیثیت سے تنزل کے بارے میں مجلس شوریٰ نے جو کچھ کہا ہے اسے قرارداد کے دوسرے پیرے کے نصف آخر میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ دوبارہ نقل کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ امیر جماعت اسلامی پاکستان نے اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے :-

"جمہوریت کو چلانے کے لیے اگر پریس آزاد ہو تو ملکی معاملات منظر عام پر آتے رہتے ہیں اور حکومت کو بھی اپنی اصلاح کا موقع میسر آ جاتا ہے لیکن ان لوگوں نے پریس کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ پریس آرڈیننس جاری کیا گیا لیکن جب پھر بھی مقصد حل ہوتا نظر نہ آیا تو سرکاری اشتہارات کی تقسیم کا بورڈ قائم کر دیا گیا تاکہ اشتہارات کو صرف اپنی بات کہنے والے اخبارات ہی میں تقسیم کیا جا سکے اور جو مرضی کے خلاف ہو اسے پیٹ کی مار دی جا سکے۔ پھر بھی جب مطلب حل ہوتا نظر نہ آیا تو پریس ٹرسٹ قائم کر دیا گیا ..... آزادی تقریر کی راہ میں حائل ہونے کے لیے لاؤڈ اسپیکر آرڈیننس لایا گیا تاکہ عوام جلسہ عام منعقد نہ کر سکیں اور مقرر کی آواز بیس پچیس افراد سے زائد تک نہ پہنچ سکے۔ دفعہ ۱۴۴ کو امرت دھارا کی طرح استعمال کیا جا رہا ہے۔ امن عامہ کے آرڈیننس کا استعمال بے تحاشا کیا گیا سیفٹی ایکٹ کے تحت کارروائی کی گئی۔ مولوی فرید احمد کو مغربی پاکستان سے نکال دیا گیا۔ طلبہ کے ساتھ تشدد کیا گیا۔ تعلیمی اداروں میں بنیادی جمہوریتوں کا نظام داخل کیا گیا۔ درس گاہوں میں غلام نسلیں تیار کی جا رہی ہیں تاکہ انھیں اقتدار کے آگے سر اٹھانے کی جرأت نہ ہو۔"

آئین - ۷ر نومبر ۱۹۶۲ء صفحہ ۳۴

امیر جماعت نے اسی تقریر میں پاکستان کے معاشی حالات کے بارے میں تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور جو اعداد و شمار فراہم کیے ہیں جو گورنمنٹ ہی کے اکنامک سروے انسٹی ٹیوٹ کی شائع کردہ رپورٹوں سے لیے گئے ہیں طوالت کے خوف سے یہ تفصیلات

ہرتی نہیں کی جا رہی ہیں ۔

دلیل کی شق ۲ کے ضمن میں امیر جماعت اسلامی پاکستان کی تقریر کا یہ جز ملاحظہ ہو :۔

گزشتہ دنوں اسلامی مشاورتی کونسل نے ہر قسم کے سود کو حرام قرار دے دیا تھا لیکن اس مفید تجویز پر عمل نہیں ہوا ۔ اس کونسل کے ایک صدر اور ایک رکن علیحدہ ہو گئے ۔ مشاورتی کونسل نے ملک میں عیسائیت کی رفتار ترقی اور عیسائی اداروں سے متعلق ایک سوالنامہ مرتب کیا تھا ۔ یہ سوالنامہ بڑا عمدہ تھا لیکن یہ سوالنامہ کچھ ہی روز بعد صدارتی سکریٹریٹ کی طرف سے واپس لے لیا گیا ۔ خود مشاورتی کونسل کے اراکین کو یہ سوالنامہ واپس لینے کی اطلاع دوسرے روز اخبارات سے ہوئی ۔

(آئین : ۷ر نومبر ۱۹۶۴ء صفحہ ۳)

مولانا شمس الحق زید پوری مہتمم جامعہ قرآنیہ عربیہ نے صدر ایوب سے اپنی اور زید پور کے علماء و مشائخ سے ملاقات تذکرہ کیا ہے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ۔ کہتے ہیں :۔

"یہاں (زید پور مشرقی پاکستان) کے علماء و مشائخ کو صدر ایوب سے ملاقات کے لیے بلایا گیا تھا مجھے بھی یاد کیا گیا میں نے صدر ایوب سے چند سوالات کیے ۔ پہلا سوال عائلی قوانین سے متعلق تھا ۔ صدر ایوب نے جواب دیا ۔ اسے رد کرنا میرے اختیار میں نہیں ، اسمبلی ہی اسے ختم کرنے کی سفارش کر سکتی ہے ۔ دوسرا سوال تھا کہ اسلامی مشاورتی کونسل ، اسلامی تحقیقی ادارہ اور اسلامی اکاڈمی میں متجددین کی جگہ متقدر علماء کو کیوں شامل نہیں کیا جاتا ۔ جواب میں صدر صاحب نے فرمایا ۔ مولانا ! موجودہ اراکین کی زندگی میں تو یہ بات ممکن نہیں البتہ اگر یہ مر جائیں ، جس کی دعا میں نہیں کر سکتا تو دیکھا جائے گا "

(شہاب : ۲۷ر دسمبر ۱۹۶۴ء صفحہ ۶)

دلیل کی شق ۳ کے ضمن میں قرارداد کے وہ جملے جو ملک کے اخلاقی اور سیاسی تنزل کے سلسلے میں کہے گئے ہیں توجہ نامہ جنوری ۶۵ء کے ترجمان القرآن کے اداریے کا یہ ٹکڑا بھی ملاحظہ ہو :۔

"اس شخص نے پورے چھ سال بلا شرکت غیرے ملک پر حکمرانی کی اور اس دوران میں احکام شریعت کے اندر کھلم کھلا ترمیم و تنسیخ کی اور اس کے خلاف کسی فرد کو زبان کھولنے تک کی اجازت نہ دی ۔ جنہوں نے بولنے کی جرأت کی انہیں اس جرم کی پاداش میں تھانوں اور کچہریوں میں بلایا گیا اور وہاں ان کی ذلت اور رسوائی کی گئی ۔ اگر کسی نے کوئی مقالہ یا مضمون لکھا تو اس کو ضبط کر لیا گیا اور کسی غیرتمند شخص نے اس کے خلاف زبان کھولی تو اسے نظر بند کر دیا گیا ۔ طرح طرح کے جابرانہ قوانین نافذ کیے گئے جن کی بدولت پورا ملک ایک قید خانہ بن کر رہ گیا ۔ اخبارات جو عوام کی تربیت کا موثر ذریعہ ہیں ان کا گلا گھونٹ دیا گیا ۔ پریس آرڈیننس کی تلوار ان کے سر پر لٹکا دی ۔ اشتہارات پر کنٹرول کے ذریعے ان پہلی دباؤ ڈالا اور پھر بڑے بڑے سرمایہ داروں کے روپے سے پریس ٹرسٹ قائم کر دیا تاکہ آزاد صحافت کے متعلق [illegible] کر دیا گیا ۔ اخبارات کے علاوہ عوام کی تربیت کا دوسرا ذریعہ [illegible] ہیں لیکن حکومت نے اوقاف کا جو نیا انتظام کیا ہے اس کے نتائج ہر [illegible] دیکھ سکتا ہے جو جمعہ کے دن کسی ایسے امام صاحب کا خطبہ [illegible]

کے ملازم ہیں" (ترجمان القرآن جنوری ۶۵ء صفحہ ۳۵)

اس ضمن میں جماعت اسلامی پاکستان پر ۶ رجنوری ۶۴ء کو حکومت نے جو پابندی عائد کی اور امیر جماعت سمیت قریباً پچاس رہنماؤں کو گرفتار کر لیا اسے بھی پیش نظر رہنا چاہیے۔

دلیل کی شق ۴ اور ۵ کے تحت چودھری غلام محمد امیر جماعت اسلامی کراچی کے ایک مقالہ "پاکستان میں جمہوری اقدار کا ارتقاء اور جماعت اسلامی" سے دو اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہو سکے گا کہ جماعت اسلامی کے لیے متحدہ محاذ سے تعاون کی وجہ جمہوریت کی بحالی ہے۔

جب ۸ رجون ۶۲ء کو نیا دستور پاکستان میں نافذ ہوا تو مولانا مودودی نے اس دستور کو اسلامی نقطۂ نظر سے غیر تسلی بخش اور جمہوری نقطۂ نظر سے مایوس کن بتایا مجلس شوریٰ منعقدہ اگست ۶۲ء نے اپنی قرارداد میں کہا۔

"اس دستور کی پوری اسکیم ایک جمہوریت نما آمریت کی اسکیم ہے اس میں انتظامیہ کے جملہ اختیارات صدر کو سونپ دیے گئے ہیں اور مقننہ کو اس میں دخل دینے کا قطعاً کوئی راستہ نہیں دیا گیا ہے۔ قانون سازی بجٹ اور ترمیم دستور کے معاملے میں اس کے اختیارات نہایت محدود ہیں۔ اس کے بعد بنیادی حقوق اور قوانین کے جواز کے مسائل پر کلام کرنے کے حق سے عدلیہ کو محروم کر کے ریاست کے تیسرے بنیادی عضو کو بھی مفلوج کر دیا گیا ہے"

مجلس شوریٰ خوب سوچ سمجھ کر اس رائے پر پہنچی ہے کہ اس دستور کو بتدریج تبدیل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اس غرض کے لیے یہ ضروری ہے کہ ملک کے تمام جمہوریت پسند عناصر ایک دوسرے سے تعاون کر کے پہلے ان دستوری قانونی رکاوٹوں کو دور کرائیں جن کی موجودگی میں ملک کے اندر کوئی سیاسی جدوجہد نہیں ہو سکتی پھر دستور میں وقتاً فوقتاً ترمیمات کرائیں

جولائی ۶۴ء میں جب جماعت پر حکومت نے پابندی عائد کر دی تھی ڈھاکہ میں تمام اپوزیشن پارٹیوں کا ایک اجتماع ہوا جس میں تمام جماعتوں نے جمہوریت کی بحالی کے لیے طریق کار طے کیا۔ اس اجلاس میں ۹ نکاتی پروگرام پر اتفاق کیا گیا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ صدارتی انتخاب میں اپوزیشن پارٹیاں مل کر اپنا ایک امیدوار کھڑا کریں گی۔ اس اجتماع میں جماعت کے افراد بھی شریک تھے۔ آئین — ۷ نومبر ۶۴ء صفحہ ۳۵، ۳۶

ترجمان القرآن جنوری ۶۵ء کے اداریے میں پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کی اہمیت پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے:-

ہمارے بعض کرم فرما ہم پر جو مختلف الزامات لگا رہے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ پہلے تو ہم اسلامی نظام کے قیام کے علمبردار تھے پھر ہم نے اسلامی جمہوریت کے نصب العین کو اپنایا اور اب صرف جمہوریت کے پرستار بن کر رہ گئے ہیں حالانکہ جماعت اسلامی کے لٹریچر میں مغربی جمہوریت کو جی بھر کر کوسا گیا ہے۔ یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے جو ہمارے متعلق پھیلائی جا رہی ہے۔ صحیح حقیقت جسے لوگ نہیں سمجھ رہے ہیں یا جان بوجھ کر نظر انداز کر رہے ہیں یہ ہے کہ اس ملک بلکہ دنیا کے تمام مسلمان ملکوں میں اسلامی نظام برپا کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اگر کوئی ہے تو وہ مغرب زدہ ذہن رکھنے والوں کی آمریت ہے اور اسلامی نظام کی راہ اگر ہموار ہو سکتی ہے تو وہ ایک ایسی آزاد جمہوری فضا [illegible] اسلام کے لیے

آزادی کے ساتھ کام کیا جاسکے اور صرف رائے عام کی تبدیلی سے نظام زندگی کو بدلنا ممکن ہو جائے۔ ایسی فضا اگر موجود ہو تو نہ صرف اس ملک میں بلکہ تمام مسلمان ملکوں میں لازماً اسلامی نظام ہی برپا ہو کر رہے گا۔ کیونکہ قوم بنیادی طور پر مسلمان ہے اور اس کی رائے عام غیر اسلام کے حق میں ہموار نہیں ہو سکتی۔ یہی وہ اصل مصلحت ہے جس کی بنا پر ہم اس وقت آمریت کی جگہ جمہوریت کی بحالی کو ہر چیز پر مقدم سمجھتے ہیں۔ ہمارے اس موقف کو سمجھنے کے لیے آپ ذرا دنیائے اسلام اور خصوصاً اپنے ملک کے حالات پر نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ اسلام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ کون سی ہے۔ حالات کا غیر جانبدارانہ جائزہ لینے کے بعد آپ صرف ایک نتیجے پر پہنچیں گے کہ یہاں کے عام مسلمان اسلامی نظام کے قیام کے دل و جان سے خواہشمند ہیں اور اسی کی خاطر انھوں نے جان، مال، عزت و آبرو کی بے شمار قربانیاں دی ہیں لیکن یہاں جو طبقہ اس راستے میں سب سے زیادہ مزاحم ہو رہا ہے وہ مغرب زدہ طبقہ ہے جسے اتفاقات زمانہ نے ہم پر مسلط کر دیا ہے۔ یہ طبقہ اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر اس ملک کا انتظام و انصرام عوامی خواہشات کے مطابق چلایا جائے تو یہاں اسلامی نظام کے قیام کو کوئی چیز روک نہ سکے گی۔ اسی لیے اپنے مغربی استادوں کے فلسفۂ سیاست کے بالکل برعکس اس کی پالیسی یہ ہے کہ آزادانہ انتخابات کے ذریعہ سے برسر اقتدار آنے کے بجائے حکومت پر بالجبر قبضہ کیا جائے اور پھر ایک آمرانہ نظام قائم کر کے زبردستی اپنی قوم میں مغربی تہذیب کو رواج دیا جائے۔

یہ طبقہ بڑا با اثر ہے ملک کے اندر چونکہ اقتدار کی باگیں اس کے ہاتھ میں ہیں اس لیے یہ ملکی وسائل کو بے دینی کے فروغ دینے میں بے تحاشا خرچ کرتا ہے۔ پھر یہ طبقہ شروع ہی سے اس بات کا بھی التزام کر رہا ہے کہ یہاں عوامی خواہشات اور تمناؤں کو پنپنے نہ دیا جائے کیونکہ ان کی قوت مغربی تہذیب کے تسلط میں لازماً مانع ہوگی۔

پھر اس طبقے کو اہل مغرب کی پوری تائید حاصل ہے اور وہ آزادی اور جمہوریت کی ان ساری قدروں کو مسلمان ممالک میں برباد کرنے کے درپے ہیں جنھیں وہ اپنے ملکوں میں اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ وہ خوف ہے جو انھیں اسلام اور ملت اسلامیہ سے ہے اور اس کا اظہار انھوں نے اپنی مختلف تحریروں اور تقریروں میں بار ہا کیا ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمان ممالک میں جمہوریت کو نشو و نما پانے کا موقع ملا اور یہاں عوامی آرزوؤں اور امنگوں کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہو گئی تو پھر یہاں سوائے اسلام کے اور کوئی نظام حیات قائم نہیں کیا جاسکتا۔ (صفحہ ۳۵۹، ۳۶۰)

دلیل کی شق ۵ اور ۷ کی تشریح ترجمان القرآن جنوری ۶۵ء کے اداریہ میں اس طرح کی گئی ہے۔

"ان حقائق (جو اوپر کے اقتباس میں بیان کیے گئے ہیں) کو ذرا نگاہ میں رکھیے اور سوچیے کہ دینی اعتبار سے جماعت اسلامی کے لیے کونسا موقف صحیح ہے۔ ایک صورت یہ تھی کہ وہ صدر ایوب کی حمایت کا اعلان کرتی اور اس کے سارے نتائج کی ذمہ داری خدا اور خلق کے سامنے اپنے سر لیتی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ وہ اس فیصلہ کن مرحلے پر بالکل غیر متعلق تماشائی بن کر بیٹھ جاتی اور قوم کو سرے سے کوئی رہنمائی نہ دیتی۔ جو حضرات جماعت کو اس طرح کے مشورے دیتے ہیں انھیں شاید یہ احساس نہیں ہے کہ یہ بھی آمریت کے بقا میں مددگار بننے کی ایک دوسری صورت ہوتی۔ مزید برآں جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں جماعت اسلامی اب اس مقام پر نہیں ہے جہاں ملکی معاملات میں اس کے دخل دینے یا نہ دینے سے حالات پر کوئی خاص اثر نہ پڑتا ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ اب یہ جماعت اچھا ایک وزن رکھتی ہے اور اس کے فیصلے ملکی معاملات پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اس صورت حال میں اگر وہ غیر جانبدار رہتی تو یہ بھی آمریت کے ہاتھ مضبوط کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ [illegible]

جماعت اسلامی کے لیے دینی نقطۂ نظر سے مناسب ترین صورت یہی باقی رہ گئی تھی کہ وہ ان لوگوں سے تعاون کرے جو آمریت کو ختم کرنے اور اس کی جگہ جمہوریت کو بحال کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ صدارت کے لیے محترمہ فاطمہ جناح کا انتخاب جماعت اسلامی نے نہیں کیا بلکہ متحدہ حزب اختلاف کی دوسری چار جماعتوں نے کیا۔ اس فیصلے کے وقت امیر جماعت اور دوسرے اکابر جیل میں تھے جماعت کے سامنے حزب اختلاف کے اس فیصلے کے بعد مسئلہ کی حقیقی نوعیت یہ تھی کہ آیا ہم اس اتحاد سے الگ ہو کر خاموش بیٹھ جائیں یا صدر ایوب کے مقابلہ میں کوئی دوسرا آدمی کھڑا کر دیں؟ یا محترمہ فاطمہ جناح کی تائید کریں؟ ان تینوں شکلوں پر پوری طرح غور کرنے کے بعد جماعت کے لوگ اسی نتیجے پر پہنچے کہ دینی اور ملی نقطۂ نظر سے اس وقت جماعت کے لیے محترمہ فاطمہ جناح کی تائید کے سوا کوئی دوسرا جائز طریق کار نہیں ہے کیونکہ پہلی دونوں صورتوں کے اختیار کرنے کے معنی عملاً فیلڈ مارشل صاحب کو کامیاب کرانے اور اس آمریت کے بقا میں ممد و معاون ہونے کے ہیں۔ ہم خدا کے سامنے یہ ذمہ داری لینے کے لیے ہرگز تیار نہ تھے کہ ہمارے کسی فعل کی وجہ سے یہ آمریت اس ملک میں باقی رہے۔ اس لیے ہم نے محترمہ فاطمہ جناح کی تائید کا فیصلہ کیا۔ ہمیں تسلیم ہے کہ عورت کا سربراہ مملکت ہونا دینی اعتبار سے صحیح نہیں ہے لیکن ہماری نظروں سے یہ حقیقت بھی مستور نہیں کہ ایک غاصبانہ اور ظالمانہ استبدادی نظام کے بقا میں مددگار ہونا شریعت کی نگاہ میں عورت کو سربراہ مملکت بنانے سے بدرجہا زیادہ بڑا گناہ ہے۔"

جماعت اسلامی کے علاوہ پاکستان کے مختلف علماء نے اس مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے ان میں سے بعض بیانات مسئلے کے پہلے جزء سے متعلق ہیں کہ عورت بعض حالات میں مملکت کی صدر ہو سکتی ہے۔ بعض بیانات مسئلہ کے دوسرے جزء سے متعلق ہیں کہ موجودہ حالات کے اندر مسلمانوں کو مس فاطمہ جناح کی کامیابی کے لیے ووٹ دینا چاہیے۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دار العلوم کراچی نے مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے ایک فتوے کے پیش نظر ایک مستفتی کو جواب دیتے وقت یہ لکھا:۔[1]

"میرے نزدیک آپ کا خیال صحیح ہے کہ بحالات مندرجہ سوال امیدوار صدارت عورت کی حمایت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔"

(کیا عورت مسلمانوں کی سربراہ ہو سکتی ہے؟" ـــــ شائع کردہ مرکزی کمیٹی متحدہ حزب اختلاف مغربی پاکستان کراچی)

۱۷ر دسمبر کو مشرقی پاکستان کے علماء و مشائخ کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی[2] ان میں شریک ہونے والوں میں مولانا سید محمود شاہ مصطفیٰ مدنی پیر صاحب حضرت سید محمد سعید، مولانا تاج الاسلام صاحب، مولانا شمس الحق فریدپوری، مولانا اکرم خاں صاحب، مولانا اطہر علی صاحب، مولانا عبد الرحیم صاحب اور مولانا صدیق صاحب کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان علماء کرام نے پیر صاحب سرسینہ اور بعض دوسرے حضرات کے فتوے کا جائزہ لیا۔ شہاب کے نمائندے نے ان حضرات کا خیال ان الفاظ میں قلمبند کیا ہے۔

"اگرچہ ایک مثالی اسلامی ریاست کی سربراہی عورت کے سپرد نہیں ہونی چاہیے مگر یہ بھی صحیح ہے کہ صدر ایوب جیسا

---

[1] جیسا کہ پہلے حاشیہ میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ مفتی صاحب مس فاطمہ جناح کی صدارت کے بھی مؤید ہیں۔

[2] ۲۰ر دسمبر ۶۴ء کے روزنامہ جنگ نے اس جلسہ کی روئداد ان الفاظ میں مرتب کی ہے:۔

ڈھاکہ ۱۹ر دسمبر۔ آج علماء کانفرنس نے جو صوبے بھر کے مذہبی رہنماؤں نے طلب کی تھی، انتخابی اداروں کے ارکان سے کہا کہ وہ صدارتی انتخاب میں محترمہ فاطمہ جناح کو ووٹ دیں۔ کانفرنس نے ایک قرارداد میں کہا ہے کہ مکمل جمہوریت اور اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے موجودہ حکومت کو تبدیل کیا جانا چاہیے۔ علماء نے قرار دیا (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مرد بھی اسلامی حکومت کا سربراہ نہیں ہو سکتا، اگر مقابلہ مادر ملت اور ایوب خاں کے درمیان ہو تو ہر حال میں مادر ملت کو فوقیت دی جائے گی۔"

(شہاب: ۲۷ دسمبر ... ص ...)

اس جلسے کے صدر مولانا اطہر علی صاحب نے اپنی رائے ان الفاظ میں دی:۔

"صدر ایوب خاں اور ان کے حامیوں کو ووٹ دینا اور برسر اقتدار گروہ کے خلاف اسلام اقدامات کے واضح ثبوت کی موجودگی میں کسی طرح بھی ان کی تائید کرنا خلاف شرع ہے۔"

("کیا عورت مسلمانوں کی سربراہ ہو سکتی ہے"۔ ص ...)

پاکستان کے عام علماء و مشائخ کی رائے کا اندازہ ایک واقف حال اور ثقہ فرد کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے۔

"جن علماء کا فی الواقع اس ملک میں کوئی اثر یا علمی مقام ہے وہ سب کے سب اس بات میں متفق تھے کہ صدر ایوب کے مقابلہ میں فاطمہ جناح کی حمایت کرنی چاہیے۔ مفتی محمد شفیع، مولانا اطہر علی صاحب، مولانا شمس الحق فرید پوری، جمعیۃ اہل حدیث وغیرہ سب نے یہی موقف اختیار کیا۔ بریلوی علماء کا ایک گروہ اور مشائخ کا ایک گروہ بھی اس کا حامی تھا۔ جن لوگوں نے فاطمہ جناح کی مخالفت کی اور صدر ایوب کی حمایت کی ان کی بات کا کوئی وزن نہ تھا۔"

متحدہ علماء کے محولہ بالا پمفلٹ میں ماضی قریب کے جن بڑے علماء کی رائیں اس مسئلہ کے اول جزء سے متعلق نقل کی گئی ہیں ان میں مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کی رائے بھی شامل ہے جو اُن کی کتاب "سیرت عائشہؓ" کے باب "دعوتِ اصلاح" سے نقل کی گئی ہے۔

"یہ صحیح ہے کہ عورت کے طبعی حالات فرائض امامت کے منافی ہیں اور خود اسلام نے امام کے لیے جو ضروری شرائط قرار دیے ہیں ان سے یہ جنس لطیف کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ اس لیے وہ امامت کبریٰ اور خلافت الٰہی کے فرائض سے سبک دوش ہے لیکن اس سے یہ غلط استناد نہیں کرنا چاہیے کہ کسی مسلمان عورت کو کسی حالت میں بھی ملک کی سیاسی اور فوجی رہبری جائز نہیں۔"

غیر معمولی حالات میں عورت کی صدارت جائز ہو سکتی ہے اس کی تائید میں ہندوستان کے "علماء" کی رائیں نقل کی جاتی ہیں محترم مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب مدیر برہان کی رائے اگرچہ مسئلے کے دوسرے جزء سے متعلق یہ ہے کہ پاکستان کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ جن میں مس فاطمہ جناح کی صدارت جائز ہو لیکن اصولی طور پر وہ اس کے قائل ہیں کہ کسی ملک میں ایسے حالات ہو سکتے ہیں جن میں عورت کی صدارت جائز ہو، لکھتے ہیں:۔

"اضطرار کی حالت میں عورت کو سربراہ بنانا ہی نہیں بلکہ اور بھی بعض شرعی ممنوعات مثلاً اعضائے ستر کا کشف، شراب کا استعمال، اکل خنزیر وغیرہ سب چیزیں جائز ہو جاتی ہیں اور جائز ہی نہیں بلکہ بعض اوقات واجب اور فرض ہو جاتی ہیں۔"

(برہان، دہلی، دسمبر ...، ص ...)

(بقیہ حاشیہ) تصویر بنانے کو اسلامی تعلیمات کے منافی قرار دیا۔ رویت ہلال کمیٹیاں قائم کرنے پر حکومت کے خلاف نکتہ چینی کی اور اسلامی مشاورتی کونسل کی تشکیل پر زور دیا۔ مولانا اطہر علی نے اپنے صدارتی خطبہ میں انتخابی ادارہ کے ارکان سے کہا کہ وہ اسلام کی خاطر فاطمہ جناح کو ووٹ دیں۔ (بحوالہ فاران جنوری ... ص ...)

(بقیہ اشارات)

سہارے پر نہیں بلکہ محض ان بزرگوں کے تخیل پر قائم ہے۔ البتہ ظاہر ہے جو بات خود ہی بے اصل ہو اس کے اثبات کی ہم پر کوئی ذمہ داری نہیں۔

تعارفی پمفلٹ

جماعت اسلامی کے تعارف کے سلسلے میں ہمارا ایک انگریزی پمفلٹ ہے جو ۱۹۵۷ء سے برابر شائع ہو رہا ہے۔ اس میں ایک عنوان ہے "جماعت اسلامی اور سیکولرازم" اس کے تحت لکھا گیا ہے :-

ایک ایسے ملک میں جو علی الاعلان سیکولر ہے ایک مذہبی آئیڈیل کی تبلیغ کرنے سے جماعت اسلامی دستور ہند کی کسی مسلمہ دفعہ کی کوئی خلاف ورزی نہیں کر رہی ہے۔ اسٹیٹ کی پالیسی ہونے کی حیثیت سے سیکولرازم کے اس مفہوم پر کہ مذہبی عقیدے کی بنا پر کوئی امتیاز و جانبداری نہ ہونی چاہیے۔ مشکل ہی اعتراض کیا جا سکتا ہے اور وہ بھی ایک مذہبی اقلیت کی طرف سے لیکن اگر اس وفاداری کے ماورا کچھ لوگوں کے دماغوں میں سیکولرازم کے متعلق زیادہ گہرے فلسفیانہ مطالب موجود ہوں تو ہم ان سے با ادب اختلاف کرتے ہیں۔ ان فلسفیانہ مطالب کا سرچشمہ لازماً مغرب ہے اور ان کے ساتھ ایک روح اور ایک تاریخ وابستہ ہے جو ہمارے مزاج اور ہماری ضروریات کے لحاظ سے بالکل اجنبی ہیں۔

مذکورہ سوال اور میرے جواب کو سامنے رکھ کر اس عبارت پر غور فرمائیں کیا دونوں کے مطالب اجمال و تفصیل کے فرق کے ساتھ تقریباً یکساں نہیں ہیں۔

شوریٰ کی قرارداد

اب اس سے بھی ایک بڑا اور واضح ثبوت ملاحظہ فرمائیں۔ یہ جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کی وہ قرارداد ہے جو اس نے جولائی ۱۹۶۱ء میں خاص سیکولرازم کے بارے میں باضابطہ منظور کی تھی۔ اس موضوع پر شوریٰ کی قرارداد سے زیادہ مستند چیز اور کیا ہو سکتی ہے۔

"سیکولرازم کی اصطلاح مختلف معنی میں استعمال ہو رہی ہے۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے دور میں سائنس اور مذہبی طبقہ کے اختلافات اور ان کے تصادم میں اس اصطلاح کا ایک تاریخی پس منظر ہے جس میں نہ صرف مذہب بلکہ خدا کی مخالفت اس کی اصل روح تھی۔ ہر چند اس وقت پادری طبقہ کا رویہ جس کے ردعمل میں خلاف مذہب جذبات نے شدت اختیار کی ایک بالکل غلط اور مذہب کی روح کے خلاف رویہ تھا لیکن اس کے مقابلے میں لامذہبیت کا جو تخیل لایا گیا اس نے جو صدہا اخلاقی اقدار اور انسانیت کے اعلیٰ جذبات

کو پہنچا یا وہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس کو ہر دیکھنے والی آنکھ مغرب کی موجودہ مادہ پرستانہ زندگی اور اس کے مہلک نتائج میں دیکھ سکتی ہے۔ اس معنی میں جماعت سیکولرزم کی مخالف رہی ہے اور رہے گی کیونکہ اجتماعی معاملات سے خدا اور اس کی ہدایت کو بے دخل کر دینا اس کی اصلی روح ہے۔ اور یہی انسانی زندگی کی جملہ خرابیوں کی اصل جڑ ہے اور اسلام انسان کی انفرادی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کی اجتماعی زندگی کے لیے ایک مکمل نظام حیات پیش کرتا ہے اور اس نظام کی افادیت عمل کی کسوٹی پہ برحق ثابت ہو چکی ہے جس کا ریکارڈ تاریخ عالم میں موجود ہے۔

لیکن اگر سیکولرزم کا یہ مطلب لیا جائے جیسا کہ بعض حلقوں کی طرف سے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حکومتی کاروبار میں کسی مذہبی فرقے کے ساتھ امتیازی سلوک نہ کیا جائے اور اسی کے ساتھ بلا امتیاز مذہب و ملت یکساں برتاؤ ہو اور سب کو یکساں مواقع حاصل رہیں تو جماعت نے اس تخیل کی کبھی مخالفت نہیں کی ہے۔

میرے جواب اور شوریٰ کی اس قرارداد میں اجمال و تفصیل یا ترتیب کے فرق کے سوا اور کیا فرق ہے بلکہ وہ خاص بات جس کو نیا قرار دینے کی ان حضرات کو زیادہ فکر ہوگی وہ میرے جواب سے بھی کچھ زائد بات کے ساتھ شوریٰ کی قرارداد کے آخر حصے میں موجود ہے میں نے تو صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا تھا کہ مذکورہ خاص تعبیر کے ہم مخالف نہیں ہیں لیکن شوریٰ کی قرارداد میں اس سے بڑھ کر یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ اس تخیل کی جماعت نے کبھی مخالفت نہیں کی اب اگر کسی شخص کو اس پر اصرار ہو کہ شوریٰ کی یہ بات صحیح نہیں ہے اور جماعت پہلے اس تخیل کی مخالفت کر چکی ہے تو اسے اس کا ثبوت پیش کرنا چاہیے۔

بہرحال مذکورہ اقتباسات سے یہ بات واضح ہے کہ میں نے اپنے جواب میں سیکولرزم کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ان اقتباسات سے مختلف کسی معنی میں نہیں ہے بلکہ عین ان کے مطابق ہے اس لیے میرے جواب کے اس خاص جز کے بارے میں بھی جس میں سیکولرزم کی ایک خاص تعبیر کے بارے میں میں نے جماعت کے عدم اختلاف کا اظہار کیا ہے کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کوئی نئی بات ہے جو اس وقت کسی مفاد یا مصلحت کی خاطر ہم نے کہنی شروع کر دی ہے۔

ان اقتباسات سے کم از کم ۵۹ء تک تو اس کی تاریخ ضرور ہی پرانی ثابت ہوتی ہے اور اگر تلاش کیا جائے تو غالباً لٹریچر سے اس کے اور پرانے ہونے کا بھی ثبوت بآسانی مل سکتا ہے لیکن اگر بالفرض نہ بھی ملے تو اس سے ہماری بات متاثر نہیں ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکے گا کہ ہم نے اس سے پہلے اس تعبیر سے اپنی عدم مخالفت کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن یہ مسلم قاعدہ ہے کہ کسی چیز کا عدم اظہار اس کے عدم کی دلیل نہیں ہوتا ہے اور یہ کھلی ہوئی بات

ہے کہ اس عدم مخالفت کا اظہار نہ کرنا اس کی مخالفت کرنے کا ہم معنی کسی طرح بھی قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ اور اوپر یہ
گذر ہی چکا ہے کہ شوریٰ کی قرارداد میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ جماعت نے سیکولرزم کی اس تعبیر کی کبھی مخالفت نہیں
کی ہے اور اس طرح وہ بات گویا اتنی ہی پرانی ثابت ہوتی ہے جتنی کہ جماعت ۔ ہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ صراحت
اور عدم صراحت میں بہرحال کچھ نہ کچھ فرق ہے جس کی بنا پر خود شوریٰ نے اپنی قرارداد میں مذکورہ تعبیر سے اپنی عدم
مخالفت کے اظہار کی ضرورت سمجھی، تو ہمیں یہ فرق تسلیم ہے لیکن شوریٰ کے اس اظہار کی حیثیت اپنی سابقہ موقف میں
کسی تبدیلی کے اعلان کی نہیں ہے بلکہ وہ محض اس موقف کی تشریح و وضاحت ہے ۔ اس کے ذریعہ گویا یہ بات
بیان کی گئی ہے کہ وہ سیکولرزم کیا ہے جس کے ہم روز اول سے مخالف رہے ہیں ۔ اور جس کی مخالفت کرنا ہم ہر حال
میں ضروری سمجھتے ہیں لیکن اگر کوئی ایسا سیکولرزم سامنے لایا جاتا ہے جس پر اس کی تعریف صادق نہیں آتی یا وہ اس
سے کچھ مختلف ہے تو اس کے پیش نظر ہمارا رویہ اس کے سلسلے میں بدل بھی سکتا ہے اور اس ضمن میں اس کی ایک
مخصوص تعبیر کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ ہم اس کے خلاف نہیں ہیں ۔ اور یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اس
وضاحت کا کوئی تعلق اس سے نہیں ہے کہ خدانہ خواستہ ہمیں اپنے حال و مستقبل کی فکر دامن گیر ہو گئی تھی ۔ سوچیے
کہ جب اس وضاحت کا مآل بھی یہی ہے کہ ہم نے ایک خاص قسم کے سیکولرزم کی ہر حال میں مخالفت کرنے کا
ارادہ ظاہر کیا ہے اور دوسری قسم کے سیکولرزم کے بارے میں بھی صرف اپنے عدم مخالفت کے رویے کا اظہار
کیا ہے نہ کہ دل و جان سے اس کو قبول کرنے کا ۔ تو کون سیکولرزم کے حامی ہیں جو ہم پر ہن برسانا شروع کر دیں
گے، یا ہم سے خوش ہو کر ہمیں ممبریاں اور وزارتیں وغیرہ پیش کرنا شروع کر دیں گے ۔ ایسے عقل کے پورے سیکولرزم کے
علم برداروں کی کم از کم ہمیں تو کوئی خبر نہیں ہے اور اگر ایسے لوگ ہوں تو مولانا اسعد صاحب کرم فرما کر ان کے نام و
نشان سے ہمیں ضرور مطلع کر دیں ۔ اپنی نالائقی کی وجہ سے ان سے کوئی منفعت ـــــ شاید ہم حاصل نہیں کر سکیں گے
لیکن ایسی نادر الوجود ہستیوں کی ملاقات سے جو یقیناً ہمارے قدرداں بھی ہوں گے ہمیں خوشی ضرور ہو گی ۔ بہرحال اس
وضاحت کا رشتہ آپ بدگمانی کے ساتھ ہمارے حال و مستقبل کی فکر سے جوڑنا چاہیں تو ضرور ایسا کر سکتے ہیں
لیکن ہمارے اپنے احساس کے مطابق ہمارے سامنے ایک خاص مسئلہ تھا جس کی رعایت میں یہ وضاحت کرنی
پڑی اور وہ ہے ہندوستان کے موجودہ حالات میں اسلام کے قیام و بقا اور مسلمانوں کے بحیثیت مسلمان زندہ رہنے
کا مسئلہ جس پر کچھ گفتگو ان شاء اللہ ہم آگے کریں گے

سیکولرزم اور ہمارا موقف ـــ میرے مذکورہ جواب کو بہانہ بنا کر جو باتیں ہمارے خلاف کہی جا رہی ہیں ان کی حقیقت

امید ہے اوپر کی سطروں سے اچھی طرح واضح ہوگئی ہوگی۔ لیکن ہمارا اصل مقصد اعتراضات والزامات کا جواب دینا نہیں ہے بلکہ سیکولرزم کے بارے میں جماعت کے اصل موقف کی وضاحت ہے جس کے بارے میں شاید ہمارے بہت سے دوستوں کا بھی ذہن صاف نہیں ہے اس لیے موضوع کے کچھ اور گوشوں پر بھی میں کچھ روشنی ڈالنی چاہتا ہوں

اوپر میرے جواب سمیت جو حوالے پیش کیے گئے ہیں ان کی اس خصوصیت کی طرف میں پہلے ہی توجہ دلا چکا ہوں کہ ان میں سیکولرزم کو دو الگ قسموں میں تقسیم کرکے دونوں کے بارے میں الگ الگ نقطہ نظر ظاہر کیے گئے ہیں یعنی ان میں سے ایک کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ ہمیں اس سے شدید اختلاف ہے اور دوسرے کے بارے میں صرف اتنی بات کہی گئی ہے کہ ہم اس کے مخالف نہیں ہیں اور میں یہ بھی عرض کر چکا ہوں کہ ہمارا موقف سمجھنے کے لیے ان حوالوں کے ان دونوں اجزاء کو بیک وقت سامنے رکھنا ضروری ہے کیونکہ ان میں سے کسی ایک کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہمیں اس کا مخالف فرض کر لیا جائے یا غیر مخالف حالانکہ ہم دونوں ہی ہیں اور ہماری مخالفت اور عدم مخالفت اس کے دو الگ الگ مفہوموں سے تعلق رکھتی ہے نہ یہ کہ ہم اس کے کسی ایک مفہوم کے لحاظ سے اس کے مخالف یا غیر مخالف ہیں۔

اب میں ان حوالوں کی ایک دوسری مشترک خصوصیت کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ جس کو سامنے رکھنا بھی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر سیکولرزم کے ضمن میں ہمارا موقف پوری طرح واضح نہیں ہو سکتا اور وہ یہ ہے کہ ان حوالوں میں سیکولرزم کو دو الگ الگ مفہوموں میں تقسیم کرکے دونوں کے بارے میں الگ الگ اپنا نقطہ نظر تو ضرور واضح کر دیا گیا ہے لیکن ان میں اس سوال سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا ہے کہ واقعی سیکولرزم کیا ہے؟ یا ان دونوں میں سے کس پر اس کا صحیح طور سے اطلاق ہو سکتا ہے۔ البتہ ان حوالوں سے یہ بات ضرور سمجھی جا سکتی ہے کہ اسٹیٹ کی غیر جانبداری یا سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کے مقابلہ میں ہمارا رجحان اس کے اس مفہوم کی طرف زیادہ ہے جس کی رو سے مذہب کو زیادہ سے زیادہ افراد کے ایک انفرادی معاملے کی حیثیت سے زندہ رہنے کی اجازت دے دی جاتی ہے لیکن اجتماعی زندگی کے جملہ معاملات خدا اور اس کی ہدایت سے بے نیاز ہوکر محض عقل و تجربے کی روشنی میں انجام دیے جاتے ہیں خاص طور سے مجلس شوریٰ کی قراردادوں میں تو یہ رجحان بہت کافی نمایاں ہے

اس تفصیل کے سامنے آجانے کے بعد غالباً اس طرف اشارہ کرنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ سیکولرزم کے بارے میں ہمارا موقف ان لوگوں سے قطعی مختلف ہے جو سیکولرزم کو کسی تفریق کے بغیر اس کی مطلق شکل میں اپنے سامنے رکھ کر یا تو اس کے قطعی مخالف ہیں یا قطعی موافق۔ ہمارا معاملہ ان دونوں کے بین بین ہے یعنی اس کی مطلق شکل میں ہم نے

ں کی مخالفت یا موافقت کا کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ سیکولرزم کی تعریف و تجزیہ کے ساتھ جیسا کہ گزر چکا ہم اس کے الگ الگ مفہوموں کے لحاظ سے ایک کے لحاظ سے اس کے غیر مخالف اور دوسرے کے لحاظ سے اس کے مخالف ہیں

لیکن ہمارے اور دوسروں کے رویہ کے اس فرق کو سمجھ لینے کے بعد قدرۃً کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ہم نے مطلق سیکولرزم کے بارے میں دوسروں کی طرح اس کی قطعی مخالفت یا تائید کرنے کی بجائے یہ تیسری راہ کیوں اختیار کی ہے درآں حالیکہ ہمارا رجحان اس کے اس مفہوم کی طرف زیادہ ہے جس کی مخالفت کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس سوال کا جواب ان لوگوں کے نزدیک جو ہمارے ارادہ و نیت کے بارے میں ہر طرح کا سوءِ ظن روا رکھتے ہیں، یہی ہو سکتا ہے کہ اس میں بھی مستقبل سنوارنے ہی کا کوئی راز مستتر ہے لیکن ذرا غور و فکر سے کام لیا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ سیکولرزم کی مطلق تائید یا مطلق مخالفت کے مقابلہ میں ہمارا یہ رویہ زیادہ صحیح معقول حقیقت پسندانہ اور اسلام اور مسلمانوں کے حقیقی مفاد کے لحاظ سے ان دونوں کے لیے زیادہ نفع بخش ہے۔ درحقیقت یہ بہت سی چیزوں کے حقیقت پسندانہ جائزے کا نتیجہ ہے۔ مثلاً یہ کہ سیکولرزم کی تاریخ پیدائش کیا ہے وہ کن اسباب و عوامل کے تحت وجود میں آئی ہے۔ اس کی کیا کیا شکلیں یورپ اور ایشیا کے مختلف ملکوں میں رائج ہیں اور اس کے کیا اثرات و نتائج برآمد ہو رہے ہیں اور خود ہمارے ملک میں اس کے رواج پانے کے عوامل کیا ہیں اور یہاں وہ کس روح و مزاج کے ساتھ رواج پا رہی ہے اس کی تعبیر کے بارے میں یہاں کے اصحاب فکر و ارباب اختیار کے درمیان کیا اختلافات اور اس کی کامیابی و ناکامیابی کے کیا امکانات ہیں اور پھر ان کے ساتھ ہی یہاں کی مختلف جماعتوں کے درمیان کیا فکری اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اور ان سے یہاں کس طرح کے حالات و مسائل پیدا ہونے کے امکانات ہیں اور ان کے اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل پر کیا امکانی اثرات مرتب ہو سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ ظاہر ہے ان سب پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اس مسئلے پر گفتگو کرنے کے لیے بہت کافی وقت اور فرصت درکار ہے۔ اس لیے اسے کسی اور وقت کے لیے ملتوی کرتے ہوئے اس وقت میں صرف بعض پہلوؤں پر کچھ مختصر گفتگو کرنی چاہتا ہوں۔ ان شاء اللہ اس سے آپ کو کم از کم یہ اندازہ تو ہو ہی جائے گا کہ ہم نے کچھ یوں ہی یہ موقف اختیار نہیں کیا ہے اور نہ یہ محض مستقبل سنوارنے کی فکر کا رہینِ منت ہے۔

Monthly 'ZINDGI' Rampur, April 1965 Regd. No. L-688

Only Title printed at Shanker Press, Rampur

زندگی

رام پور، یوپی

سالانہ چھ روپے

فی پرچہ ۶۰ پیسے

[illegible]

... مستقل ... چھوڑا ہے ...

[illegible] تحریک اور حکومت ... اور شاہ اسمٰعیل شہید ...

از مولانا ابو الاعلیٰ مودودی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

قومیت — مغرب میں قومیت اور قوم پرستی Nationalism کا جو ... مفہوم ... میں مقبول ہو رہا ہے مگر اسلام اس قومیت اور قوم پرستی ... ہے۔ اس کتاب میں اس مسئلہ کی پوری وضاحت کی گئی ہے ...

از مولانا ابو الاعلیٰ مودودی — قیمت ایک روپیہ ۷۰ پیسے

... شرک — اس رسالہ میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ انسان کی ... کی غلط فہمی ... اور دوسری کمزوریوں کی وجہ سے ...

از مولانا امین احسن اصلاحی — قیمت ۵۰ پیسے

... اس مقالہ میں مولانا مودودی نے ثابت کیا ہے کہ اسلام ... ہے

قیمت ۳۲ پیسے

... اس رسالہ میں ... [illegible]

ماہنامہ

زندگی

رامپور

مدیر: سید احمد قادری

جلد: ۳۴
شمارہ: ۴-۵

اشارات

• خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ

• زر سالانہ: چھ روپیہ — ششماہی: تین روپیہ — فی پرچہ ۶۰ پیسے
— ممالک غیر سے بارہ شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

مالک: جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر: سید احمد قادری۔ پرنٹر پبلشر: احمد حسن۔ مطبع: دلی پرنٹنگ ورکس محلہ جگواڑا دہلی خاں رامپور
مقام اشاعت: دفتر زندگی رامپور یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

سید احمد قادری

آج ان صفحات میں ان لوگوں کو جو جماعت اسلامی کے نصب العین سے متفق ہیں اور جماعت سے ہمدردی و تعاون کا تعلق رکھتے ہیں، بالعموم اور ان لوگوں کو جو جماعت اسلامی کے رکن ہیں بالخصوص ایک ضروری بات یاد دلا رہا ہوں۔

پہلے میں جماعت اسلامی کے ارکان کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جو لوگ ہمارے نصب العین سے متفق نہیں ہیں اور ہماری مخالفت کو اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہیں، ان کے ساتھ ہمارا برتاؤ کیا اور کیسا ہے؟ اس پر ہمیں کڑی نظر رکھنی چاہیے اور برابر یہ دیکھتے رہنا چاہیے کہ اس سلسلے میں کتاب و سنت کی جو تعلیمات ہیں وہ ہمارے عمل میں رچی بسی ہوئی ہیں یا نہیں؟ اتہامات و الزامات کے ہجوم اور اشتعال انگیزیوں کی فضا میں خود ہمارا حال کیا ہے؟ میں یہاں محض یاد دہانی کے طور پر سورہ حٰم السجدہ کی آیات ۳۳ تا ۳۶ کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراتا ہوں — آیات کا متن آپ اپنے سامنے رکھ لیں۔ ان میں فرمایا گیا ہے:-

اور اس شخص کے قول سے بہتر قول کس کا ہوگا جس نے (اللہ کے بندوں کو) اللہ کی طرف بلایا اور خود نیک کام کیے اور کہا کہ میں مسلمان ہوں نیکی اور بدی دونوں برابر نہیں ہیں۔ تم بدی کو بہترین نیکی سے دفع کرو۔ تم دیکھو گے کہ جو شخص تمہارا دشمن بنا ہوا تھا وہ تمہارا قریبی دوست بن گیا ہے۔ اس نصیحت کو وہ لوگ قبول کیا کرتے ہیں جو صبر کرتے ہیں اور وہ لوگ جو بڑی قسمت والے ہیں اور اگر شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگو۔ بلاشبہ وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

پہلی آیت میں تین باتیں بتائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اس دنیا میں سب سے اچھی بات دعوت الی اللہ ہے،

کسی شخص کی بات اس شخص کی بات سے بہتر نہیں ہو سکتی جو اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف بلاتا ہے۔ یا اللہ کی طرف بلانا وہ کام ہے جس سے بہتر اس آسمان کے نیچے کوئی دوسرا کام نہیں ہو سکتا۔ دوسری بات یہ کہ اللہ کی طرف دعوت صرف قولی نہ ہو بلکہ عملی بھی ہو۔ داعی کو اپنے عمل سے یہ ثابت کرنا چاہیے کہ جس اللہ کی طرف وہ لوگوں کو بلا رہا ہے خود اس کا مطیع و فرماں بردار ہے اور جو دعوت وہ دوسروں کے سامنے پیش کر رہا ہے اس کی حقانیت اور افادیت پر اس کو خود کامل یقین حاصل ہے۔ تیسری بات یہ کہ اسلام کے مبلغ کو پوری جرأت کے ساتھ اس کا اعلان کرنا چاہیے کہ وہ مسلمان ہے اس تیسری بات کو سمجھنے کے لیے ان حالات کو سامنے رکھیے جن میں یہ آیت نازل ہوئی تھی اس وقت حال یہ تھا کہ اپنے مسلمان ہونے کا اعلان بھڑوں کے چھتے میں پتھر مار دینے سے کم نہ تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالفت کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو ایک مسلمان کو پوری جرأت اور فخر کے ساتھ اعلان کرنا چاہیے کہ "میں مسلمان ہوں" ——— دوسری آیت میں بھی تین باتیں کہی گئی ہیں ان باتوں کو پوری طرح سمجھنے کے لیے اس ماحول پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے جس میں یہ باتیں سکھائی گئی تھیں صورت حال یہ تھی کہ :-

> "دعوت حق کا مقابلہ انتہائی ہٹ دھرمی اور سخت جارحانہ مخالفت سے کیا جا رہا تھا جس میں اخلاق انسانیت اور شرافت کی ساری حدیں توڑ ڈالی گئی تھیں۔ ہر جھوٹ حضورؐ اور آپ کے ساتھیوں کے خلاف بولا جا رہا تھا ہر طرح کے ہتھکنڈے آپ کو بدنام کرنے اور آپ کی طرف سے لوگوں کو بدگمان کرنے کے لیے استعمال کیے جا رہے تھے۔ طرح طرح کے الزامات آپ پر چسپاں کیے جا رہے تھے اور مخالفانہ پروپیگنڈہ کرنے والوں کی ایک فوج آپ کے خلاف دلوں میں وسوسے ڈالتی پھر رہی تھی۔

ان حالات میں پہلی بات جو اس آیت میں بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ نیکی اور بدی اپنے اثرات و احکام میں یکساں نہیں ہیں۔ بدی کے مقابلے میں بدی کا اثر کچھ اور ہوتا ہے اور بدی کے مقابلے میں نیکی کا کچھ اور ——— بدی کے مقابلے میں بدی کا حکم دوسرا ہے اور بدی کے مقابلے میں نیکی کا دوسرا۔ بدی بظاہر کتنی ہی طاقتور نظر آ رہی ہو لیکن فی الواقع وہ بہت کمزور ہوتی ہے اور نیکی بظاہر کتنی ہی کمزور نظر آتی ہو مگر فی الواقع وہ بہت طاقتور ہوتی ہے اور زیادہ دن نہیں گزرتے کہ وہ بدی کو مغلوب کر لیتی ہے۔ دوسری بات اس آیت میں یہ بتائی گئی کہ جب حقیقت یہ ہے تو پھر اے نبی اور اے نبی کے ساتھیو! تمہیں بدی کو بہترین نیکی سے دفع کرنا چاہیے یعنی صرف یہی نہیں کہ تم بدی کرنے والوں کو معاف کر دو بلکہ ان پر ان کی برائی کے بدلے میں احسان کرو۔ اپنے ساتھ کی ہوئی برائی کو معاف کر دو یہ بے شک ایک نیکی ہے لیکن اس سے بڑی نیکی یہ ہے کہ اس کے مقابلے میں حسن سلوک

اور احسان کا رویہ اختیار کیا جائے۔ تیسری بات جو اس آیت کریمہ میں بتائی گئی ہے وہ دوسری بات کا نتیجہ ہے کہا یہ گیا ہے کہ اگر تم ایسا کرو گے تو خود دیکھ لو گے کہ کل تک جو تمہارا بدترین دشمن تھا وہ آج تمہارا دوست بن گیا ہے الا یہ کہ کوئی شخص اپنی فطرت کو بچھو کی فطرت میں تبدیل کر دے۔

تیسری آیت میں جس حقیقت پر متنبہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس نصیحت و وصیت کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس پر عمل وہی لوگ کر سکتے ہیں جو بڑے خوش قسمت اور صابر ہوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ اس پر عمل نہیں کر سکتے وہ بے صبرے اور قسمت کے ہیٹے ہیں۔

چوتھی آیت میں دو باتیں بتائی گئی ہیں ایک یہ کہ داعیان حق کا اپنے مخالفوں کے مقابلے میں یہ رویہ شیطان کو سخت ناپسند ہے وہ ہر وقت اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ داعئ حق کے غصے کو بھڑکا دے اور اس کو مشتعل کر کے اسی میدان میں اتار لائے جس میں مخالفین حق اپنے کرتب دکھا رہے ہیں تاکہ اشاعت حق کا کام رک جائے اور حق کے لیے دلوں کے دروازے بند ہو جائیں۔ اس لیے اے نبی اور اے نبی کے ساتھیو اگر تم کبھی شیطان کی طرف سے اس قسم کی اکساہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگو کیونکہ صرف یہی پناہ گاہ تمہیں اس اکساہٹ کے اثرات بد سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ نگاہوں سے اوجھل اس عدو مبین کے شر سے صرف خدا تمہیں بچا سکتا ہے۔ اپنے صبر اور قوت برداشت پر نہ اتراؤ بلکہ خدا کی پناہ میں آ جاؤ۔ دوسری بات یہ بتائی کہ اللہ سب کچھ سن رہا اور سب کچھ جان رہا ہے وہ صرف یہی نہیں کہ تمہاری پکار سنے گا بلکہ تمہاری اطاعت کے صلے میں تمہاری حفاظت بھی کرے گا۔

یہ ہے وہ تعلیم جو قیامت تک کے لیے تمام داعیان حق اور تمام مسلمانوں کو دی گئی ہے۔ الزامات و اتہامات اور کذب و افترا کا بازار جن لوگوں کی طرف سے بھی گرم کیا جائے اسی تعلیم سے ان کا مقابلہ کیا جانا چاہیے۔ قرآن کی اس تعلیم پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مقدس صحابہ نے جس طرح عمل کیا اور جو بہترین اسوہ ہمارے سامنے پیش کیا اس سے ہم ناواقف نہیں ہیں۔ بدترین ایذا رسانی کے مقابلے میں بھی کبھی حضور کی زبان مبارک پر اپنے مخالفوں کے لیے سب وشتم کا کوئی کلمہ نہیں آیا اور فتح مکہ کے بعد آپ نے اپنے اور اسلام کے سخت ترین دشمنوں کو جس طرح معاف کیا وہ تو انسانی تاریخ کا بے مثال واقعہ ہے۔

اس سلسلے میں آپ کی قولی و عملی تعلیمات سے احادیث اور تاریخ و سیر کی کتابیں بھری پڑی ہیں حضور

ایک ارشاد یہاں لکھنا کافی ہوگا۔ حضورؐ نے فرمایا:۔

لَیْسَ الْمُؤْمِنُ بِطَعَّانٍ وَلَا لَعَّانٍ
وَلَا فَاحِشٍ وَلَا بَذِیٍّ

مومن لعن طعن کرنے والا اور بدخو و بدگو نہیں ہوتا۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا یہ ایک ایسی تعلیم ہے جو ہمیشہ ہمارے سامنے رہنی چاہیے اور گاہے گاہے اس کی یاد دہانی بھی ہونی چاہیے لیکن اس وقت ایک خاص سبب سے اس کی ضرورت محسوس کی گئی ہے ——

محترم مولانا امین احسن اصلاحی نے میثاق جنوری ۶۶ء میں جماعت اسلامی ہند کے ساتھ اپنے بہتر رویے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے

> میرے اس رویے کے مقابل میں جماعت اسلامی ہند کا رویہ میں ابتدا سے یہ دیکھ رہا ہوں کہ پاکستان کی جماعت پر جب میں کوئی تنقید کرتا ہوں تو وہاں کے بہت سے ارکان مجھے گم نام نصیحتوں اور گالیوں کے خطوط لکھنے شروع کر دیتے ہیں اور فوراً ایک فریق بن کر اپنے پاکستانی امیر کی حمایت میں مورچے سنبھال لیتے ہیں اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ دونوں جگہ قیادت کا مزاج اور ارکان کی تربیت کا انداز ایک ہی ہے۔ اس موقع پر بھی بعض حضرات نے مجھے آگاہ کیا ہے کہ میں نے اپنی عاقبت خراب کر لی ہو اور بعض حضرات نے لکھا ہے کہ میں نے جو کچھ بھی لکھا ہے صرف اس وجہ سے لکھا ہے کہ مجھے ان کے پاکستانی امیر صاحب پر حسد ہے۔ (صفحہ ۱۵)

راقم الحروف کو یقین ہے کہ یہاں کے "بہت سے ارکان" نے مولانا کو گالیوں کے گم نام خطوط نہیں لکھے ہوں گے لیکن اگر یہاں کے کسی ایک رکن نے بھی ایسا کیا ہے تو اس نے ہر لحاظ سے یہ ایک غلط کام کیا ہے اس نے کتاب و سنت کی تعلیم کو بھی نظر انداز کیا ہے اور اس جماعت کو بھی نقصان پہنچایا ہے جس کا وہ رکن ہے۔

مولانا نے "بہت سے ارکان" اور جماعت اسلامی ہند کی قیادت کے مزاج پر جو ریمارک کیا ہے میں اس کا جواب اپریل کے شمارے میں دے چکا ہوں لیکن اس ریمارک سے ہمیں یہ فائدہ ضرور اٹھانا چاہیے کہ مخالفین کے ساتھ ہم اپنے رویے کا از سر نو جائزہ لیں اور اس پر کڑی نظر رکھیں۔

ضمناً یہاں یہ بات بھی صاف کر دینی چاہیے کہ اگر ہماری سنجیدہ تنقید کو بھی ہم سے اختلاف رکھنے والے لوگ گالی قرار دیں تو پھر اس الزام کو بھی ان کے دوسرے الزامات کی فہرست میں شامل کر کے

ہمیں صبر کرنا چاہیے۔

اب میں چند باتیں جماعت اسلامی ہند کے متاثرین اور ہمدردوں کی خدمت میں بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔

اگر کوئی شخص یا گروہ جماعت اسلامی کے نصب العین کا مذاق اڑائے اور جماعت کے نمایاں افراد کے اخلاق و کردار اور ان کی نیتوں پر ظالمانہ اور رکیک حملے کرے تو اس سے یقیناً آپ کے قلب کو تکلیف پہنچتی ہوگی۔ اس صورت حال میں آپ کی قلبی تکلیف فطری بھی ہے اور لائق قدر بھی۔ لیکن آپ کو اپنی تکلیف اور رنج کا اظہار ایسے طریقوں سے نہ کرنا چاہیے جو اسلامی اور عام انسانی اخلاق کے منافی ہوں۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ آپ میں سے کچھ لوگوں نے جماعت کے کسی مخالف کو گمنام خطوط میں گالیاں لکھی ہیں یا نہیں کیونکہ یہ کام جماعت کو بدنام کرنے کے لیے کچھ دوسرے لوگ بھی انجام دے سکتے ہیں لیکن اگر آپ میں سے کسی نے یہ حرکت کی ہے تو یہ کسی جہت سے بھی صحیح نہیں ہے۔ آپ خود ٹھنڈے دل سے غور کریں تو محسوس کرلیں گے کہ یہ طریقہ غلط ہے

فرض کیجیے، میں کسی شخص کو گمنام خط میں "بزدل" لکھوں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ میں خود اپنی بزدلی کا ثبوت فراہم کر رہا ہوں۔ مجھ میں اتنی جرأت بھی نہیں کہ مخالف کے سامنے اپنا نام ظاہر کرسکوں کیونکہ اس کی دو ہی وجہیں ہوسکتی ہیں۔ یا تو میں مخالف سے مرعوب ہوں یا ڈرتا ہوں کہ لوگوں پر میرا نام ظاہر ہوگیا تو وہ مجھے اس ناپسندیدہ حرکت پر ملامت کریں گے۔ اس بزدلی کے ساتھ کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ میں کبھی کسی کی حمایت میں علی الاعلان کوئی خدمت انجام دے سکوں گا۔ بزدلی کے ساتھ ساتھ یہ حرکت حماقت بھی ہے اس لیے کہ لوگ آگاہ نہ ہوں لیکن خدا میری اس ناپسندیدہ حرکت سے ضرور آگاہ ہوگا پھر میں اس کی ملامت اور پکڑ سے کیسے بچ سکوں گا۔

اس کے علاوہ قابل غور بات یہ بھی ہے کہ اس سے اس شخص یا جماعت کو کیا فائدہ پہنچے گا جس کی حمایت کے غلط جوش میں ایسا کیا گیا ہے نیز یہ کہ اس حرکت سے اس مخالف کو بھی ذرہ برابر نقصان نہیں پہنچے گا جس کے نام گمنام خط لکھا گیا۔ ہاں اس جماعت کو یقیناً نقصان پہنچ جائے گا جس کی حمایت میں یہ حرکت کی گئی۔ مخالف اس کو اس جماعت کے خلاف استعمال کرے گا اور لوگوں کو بتائے گا کہ دیکھو فلاں جماعت میں اس کردار کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ شرعاً و عقلاً ہر لحاظ سے کسی کو گمنام خطوط میں برا بھلا لکھنا ایک مذموم حرکت ہے شریعت کی رو سے جب کسی کو کھلم کھلا گالی دینا ناجائز اور قبیح فعل ہے تو گمنام خط میں ایسا کرنا اس کی قباحت کو دوچند کر دے گا۔ اس چیز پر ایک اور پہلو سے غور کرنا چاہیے۔ جو لوگ جماعت اسلامی سے اختلاف رکھتے ہیں

چاہے وہ ہمیشہ سے اختلاف رکھ رہے ہوں یا پہلے ہمارے ساتھ تھے اور اب نہیں رہے۔ ان سب کے بارے میں ہم اور آپ کیا چاہتے ہیں؟ کیا یہ چاہتے ہیں کہ جو مخالف ہیں یا اب اختلاف کرنے لگے ہیں وہ ہمیشہ اس جماعت کے مخالف ہی رہیں یا یہ چاہتے ہیں کہ ان کا اختلاف ختم ہو جائے؟ ظاہر ہے کہ اقامت دین کے نصب العین سے محبت رکھنے والا کوئی شخص پہلی بات کا خواہش مند نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کی خواہش یہی ہوگی کہ ان کا اختلاف دور ہو۔ ایسی صورت میں یہ بات کس طرح معقول ہو سکتی ہے کہ پریس کے ذریعہ یا خطوط لکھ کر ان کو سب و شتم کیا جائے اور ان کی نیتوں پر حملے کیے جائیں۔ اس طرح تو ان کے اختلاف کی شدت اور بڑھ جائے گی۔ غرض یہ کہ جس پہلو سے بھی سوچیے اختلاف کرنے والوں کو گالیاں دینا نہ کوئی معقول بات ہے، نہ مفید۔

کسی کے الزامات و اتہامات اور غلط دعاوی و دلائل کے جواب کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اگر لکھنے اور بولنے کی صلاحیت ہو تو سنجیدگی کے ساتھ اس کے الزامات و اتہامات کو دفع کیا جائے، اس کے دعاوی و دلائل کی معقول تردید کی جائے اور اس کا غلط طرزِ عمل اس پر واضح کر دیا جائے اور صلاحیت نہ ہو تو خاموشی اختیار کی جائے اور ہر دو حال میں خدا سے دعا کی جائے کہ اللہ تعالیٰ اقامت دین کی راہ کے موانع کو دور فرمائے اور ہمیں ثابت قدم رکھے۔

شرائطِ ایجنسی

۱۔ ایجنسی کم سے کم ۵ رسائل پر دی جائے گی۔

۲۔ -/5 ایڈوانس جمع کرنے ہوں گے

۳۔ ۵ سے ۵۰ پرچوں تک ٪25 کمیشن دیا جائے گا البتہ ۵۰ سے زائد رسائل پر ٪33 کمیشن دیا جائے گا

۴۔ رسائل کی روانگی کا خرچ دفتر برداشت کرے گا۔ رجسٹری اور وی پی کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمے ہوگا۔

۵۔ ہر مہینے کا بل باقاعدگی سے ادا کرنا چاہیے۔

منیجر رسالہ زندگی رامپور۔ یوپی

زبان وقلم کی نگہداشت

سید احمد قادری

(۱)

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ اَنَّہٗ سَمِعَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَا یَرْمِیْ رَجُلٌ رَجُلًا بِالْفُسُوْقِ وَلَا یَرْمِیْہِ بِالْکُفْرِ اِلَّا ارْتَدَّتْ عَلَیْہِ اِنْ لَمْ یَکُنْ صَاحِبُہٗ کَذَالِکَ

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔ کوئی شخص کسی شخص پر فسق یا کفر کا اتہام لگائے اور وہ فی الواقع ویسا نہ ہو تو یہ اتہام اسی اتہام لگانے والے کی طرف پلٹ آتا ہے۔ (بخاری)

یہ حدیث مومن کو اپنی زبان وقلم کی نگہداشت پر ابھارتی ہے اور تنبیہ کرتی ہے کہ کسی کی طرف فسق وکفر کا انتساب بڑا خطرناک کام ہے۔ کسی مسلمان کی طرف فسق یا کفر کے انتساب کی تین صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس کی طرف کفر یا فسق منسوب کیا گیا ہے اس کے اقوال واعمال میں واضح طور پر ایسی چیزیں پائی جارہی ہیں جن پر شریعت اسلامیہ کفر یا فسق کا حکم لگاتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ انتساب صحیح ہوگا ـــــ دوسری صورت یہ کہ تہمت جوڑنے والا جانتا ہے کہ وہ جس پر اتہام لگا رہا ہے اس میں کفر یا فسق نہیں پایا جاتا ایسی صورت میں وہ اتہام اسی کی طرف پلٹ آئے گا اور خود وہ اللہ کی نظر میں کافر یا فاسق قرار پائے گا۔ تیسری صورت یہ کہ اس کو کسی کے کفر یا فسق میں شبہہ ہے اور تاویل کی گنجائش بھی موجود ہے لیکن وہ تحقیق وتاویل کے بغیر محض اس شخص کو بدنام وبے وقعت کرنے کے لیے اتہام لگاتا ہے حالانکہ فی الواقع اس شخص میں کفر یا فسق نہیں پایا جاتا۔ ایسی صورت میں اتہام لگانے والا شبہے کی وجہ سے خود کافر یا فاسق تو نہیں ہوگا لیکن اس اتہام کے گناہ اور وبال سے نہیں بچ سکے گا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ کسی فرد واحد کو بھی کافر یا فاسق قرار دینا کس قدر نازک اور خطرناک کام ہے

(باقی صفحہ ۶ پر ملاحظہ ہو)

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

(سید جلال الدین عمری)

حدود و شرائط امر بالمعروف و نہی عن المنکر جتنا اہم کام ہے اس میں اتنی ہی نزاکت بھی ہے۔ اس کے خاص حدود و شرائط بھی ہیں۔ ان کی رعایت کے بغیر اس کا ٹھیک ٹھیک انجام دینا بہت دشوار ہے، بلکہ ان حدود کو توڑنے کے بعد اس کا بھی امکان ہے کہ معروف کو قائم کرنے کی فکر میں منکر کا ارتکاب ہونے لگے اور تغیر منکر کی کوشش میں معروف مٹنے لگے۔ ذیل میں ہم ان حدود کو کسی قدر تفصیل سے پیش کرتے ہیں۔

مسلمانوں کے ساتھ نصح و خیر خواہی، ان کی تعلیم و تربیت، مہمات دین میں ان کی ہدایت و رہنمائی ان کے ساتھ لطف و محبت کا سلوک، مشکلات میں ان کی دست گیری اور تعاون، یہ اور اس نوعیت کے سارے کام 'امر بالمعروف' کے تحت آتے ہیں۔ ان میں سے ہر کام کا انجام دینا حقیقت میں 'امر بالمعروف' پر عمل کرنا ہے اس کے لیے سوائے اس کے اور کوئی شرط نہیں ہے کہ ماحول مناسب ہو اور حالات سازگار ہوں۔ 'امر بالمعروف' کی قانونی حیثیت کے بارے میں البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی مسلمان پر کب وہ واجب ہوتا ہے اور کب اس کی حیثیت محض جواز اور استحباب کی رہ جاتی ہے؟ اس کا جواب علماء نے یہ دیا ہے کہ:-

الامر بالمعروف تابع للمامور	امر بالمعروف (کا وجوب و عدم وجوب)
به فان كان واجبا فالامر	اس چیز کے تابع ہے جس کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اگر
به واجب وان كان ندبا	وہ چیز واجب ہے تو اس کا حکم دینا بھی واجب ہے
فندب [1]	اور اگر وہ مندوب ہے تو اس کا حکم دینا بھی مندوب ہے

منکر کا وجود تغیر منکر کا سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ فی الواقع منکر موجود ہو۔ بعض لوگ منکر اور معصیت کو ایک سمجھتے ہیں حالانکہ ان دونوں میں فرق ہے۔ امام غزالی فرماتے ہیں کہ

---

[1] مبارق الازہار شرح مشارق الانوار [illegible]

منکر کا مفہوم بہت وسیع ہے، اس میں جو وسعت ہے وہ معصیت کے لفظ میں نہیں ہے منکر ہر ناپسندیدہ عمل کو کہا جائے گا قطع نظر اس سے کہ وہ کسی مکلف سے صادر ہوا ہے یا غیر مکلف سے لیکن معصیت کا اطلاق کسی عمل پر اس وقت ہوگا جب کہ اس کا ارتکاب کرنے والا شریعت کی نظر میں گنہگار قرار پائے۔ فرض کیجیے کوئی بچہ شراب پی رہا ہے تو وہ قطعاً معصیت کا ارتکاب نہیں کر رہا ہے کیونکہ اس میں اس کا کوئی گناہ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہ منکر کا مرتکب ہے۔ اس لیے اس سے منع کرنا ضروری ہے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ کوئی پاگل کسی پاگل عورت سے یا کسی جانور سے زنا کرے تو اس سے بھی منع کیا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس عمل کی ہیئت ناپسندیدہ ہے اور نہ وہ کھلے عام ہو رہا ہے بلکہ فی نفسہٖ اس کا وقوع ناپسندیدہ ہے اس لیے اگر وہ تنہائی میں ہو تو بھی اس سے منع کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح نہی عن المنکر کے سلسلے میں چھوٹے اور بڑے منکر کے درمیان بھی فرق نہیں کیا جائے گا، بلکہ ہر ایک منکر سے منع کیا جائے گا۔ زنا بہت بڑا منکر ہے اس کے مقابلے میں اجنبی عورت کو دیکھنا اور تنہائی میں اس سے بات چیت کرنا چھوٹا منکر ہے، لیکن اس کے باوجود دونوں سے منع کرنا ضروری ہے۔[1]

عدم تجسس شریعت نے تجسس سے منع کیا ہے۔ اس لیے کسی کی برائیوں کی ٹوہ میں رہنا صحیح نہیں ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَا تَجَسَّسُوْا (الحجرات:) — ایک دوسرے کے بھید نہ ٹٹولو

نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

ان الامیر اذا ابتغی الریبۃ فی الناس افسدھم[2] — جب امیر لوگوں میں شکوک تلاش کرے (یعنی شک کی بنیاد پر ان سے بدگمانی کرے) تو ان کو بگاڑ دے گا۔

ایک دوسری روایت میں ہے:۔

انک ان اتبعت عورات الناس افسدتھم[3] — اگر تم لوگوں کے عیوب کا پیچھا کرو گے تو ان کو خراب کر دو گے۔

منکر پر گرفت کا حق کسی کو اس وقت حاصل ہوتا ہے جب کہ کوئی شخص کھلم کھلا برائی کا ارتکاب کرتا ہو

[1] احیاء العلوم جلد ۲ صفحہ ۳۱۲ [2] ابو داؤد، کتاب الادب، باب فی التجسس [3] ابو داؤد کتاب الادب باب فی التجسس۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے کہا گیا کہ فلاں شخص کی داڑھی سے شراب ٹپک رہی ہے تو انھوں نے جواب دیا۔

انا قد نہینا عن التجسس ولکن ان یظہر لنا شیٔ ناخذ بہٖ[1]

ہم کو تجسس سے منع کیا گیا ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص ہمارے سامنے اظہار کیے تو ہم اس پر گرفت کریں گے۔

شریعت کا حکم ہے کہ کسی سے معصیت کا صدور ہو جائے تو اس کا اعلان نہ کرتا پھرے بلکہ اس کو چھپائے تاکہ پورے ماحول میں اس کے چرچے نہ ہوں اور برائی جن حدود میں ہے، اُن سے آگے نہ پھیلے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

من اصاب من ھذہ القاذورات شیئاً فلیستتر بستر اللہ فانہ من یبدلنا صفحتہ نقم علیہ کتاب اللہ[2]

جو شخص ان گندگیوں میں سے کسی گندگی میں ملوث ہو جائے تو اللہ نے اس پر جو پردہ ڈال رکھا ہے اسے ڈالے رہے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص اپنے جرم کو ہمارے سامنے ظاہر کرے گا تو ہم خدا کا قانون اس پر نافذ کریں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اپنے جرم کو چھپا رہا ہے وہ شریعت کی ہدایت پر عمل کر رہا ہے اور جو اسے نمایاں کرنے اور رکھنے کی فکر میں ہے وہ ایک دوسری برائی کا ارتکاب کر رہا ہے۔ اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی غرض سے یہ جاننے کی کوشش کرنا کہ لوگوں کی پرائیویٹ صحبتوں میں کیا ہو رہا ہے صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح کسی کی معصیت کی تلاش میں اس کے مکان میں اچانک گھس پڑنا، یا باہر سے تانک جھانک کرنا، یا اس کے ہمسایوں سے معلومات حاصل کرنا غلط ہے۔ کیونکہ اگر فی الواقع کوئی شخص اپنے مکان میں کوئی غلط کام کر بھی رہا ہے تو خدا کے نزدیک اس کے لیے جواب دہ ہوگا۔ جب تک اس کی معصیت گھر کی چہار دیواری میں محصور ہے کسی کو اس سے تعرض کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس سلسلے میں حضرت عمرؓ کا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ ایک مکان میں جھانک کے دیکھا تو صاحب مکان کو کسی منکر کا ارتکاب کرتے پایا۔ حضرت عمرؓ نے اس پر تنقید کی تو اس نے جواب دیا۔ "امیر المومنین! میں نے تو خدا کی ایک نافرمانی کی تھی اور آپ نے اس کی تین نافرمانیاں کی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا۔ وہ کیسے؟ اس نے جواب دیا۔ اللہ کا حکم ہے

---

[1] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی التجسس [2] موطا امام مالک، کتاب الحدود، باب الاعتراف علی النفس بالزنا

کہ تجسس نہ کرو، آپ نے تجسس کیا۔ اللہ کا حکم ہے کہ گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو اور آپ چھت سے جھانک کے دیکھا۔ اسی طرح اس کا فرمان ہے کہ کسی کے گھر میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک کہ ان سے اجازت نہ حاصل کر لو اور سلام کر کے داخل ہو۔ آپ بغیر اجازت داخل بھی ہوئے اور سلام بھی نہیں کیا۔ اس کا یہ جواب سن کر حضرت عمرؓ نے اسے چھوڑ دیا اور توبہ کا حکم دیا۔[۱]

اگر منکر کے علامات بہت ہی واضح ہوں مثال کے طور پر کسی مکان سے گانے بجانے کی آواز آ رہی ہے یا شرابیوں کا شور و غل سنائی دے رہا ہے تو بھی علامہ ابوالحسن ماوردی کہتے ہیں کہ مکان میں داخل نہیں ہونا چاہیے بلکہ باہر سے اس پر نکیر کرنا چاہیے۔ کیونکہ ایک برائی تو صاف ظاہر ہو چکی ہے اور اندر جانے میں جو برائیاں چھپی ہوئی ہیں ان کے بھی سامنے آنے کا امکان ہے۔ نہی عن المنکر کے لیے چھپی ہوئی برائیوں کا کھولنا صحیح نہیں ہے۔[۲]

امام غزالی کو اس سے اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک مذکورہ بالا صورت میں گھر میں داخل ہونے اور لہو و لعب کے سامان کو توڑنے اور شراب کے بہا دینے کی اجازت ہے۔ اسی سلسلے میں مزید وہ فرماتے ہیں کہ کسی کے کپڑوں کی تلاشی لینا کہ کہیں اس میں شراب کی بوتل یا گانے بجانے کا سامان تو نہیں ہے، ناجائز ہے خواہ وہ شخص فاسق ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص کھلے بازار میں ستار یا شراب اس طرح لیے جا رہا ہے کہ پتلا سا کپڑا اس پر پڑا ہوا ہے اور وہ پوشیدہ ہونے کے باوجود نمایاں ہے تو نہی عن المنکر کا فرض انجام دینا چاہیے۔[۳]

اس معاملہ میں امام غزالی ہی کی رائے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کسی کی نجی زندگی میں مداخلت صحیح نہیں ہے لیکن جب کوئی عمل اپنے واضح علامات کے ذریعہ نجی نہ رہے اور عوام کے علم و اطلاع میں آ جائے تو اس پر اقدام کرنا ضروری ہے۔ ورنہ تغییر منکر کا فرض پوری طرح ادا نہ ہو سکے گا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے نظام کے باوجود بہت سے منکرات پرورش پاتے رہیں گے۔

اگر منکر کی نوعیت ایسی ہو کہ بعد میں اس کی تلافی ممکن نہ ہو تو علامہ ماوردی تجسس [illegible] اور فوری اقدام کی اجازت دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی قابل اعتماد آدمی یہ اطلاع دے کہ ایک شخص زنا کرنے جا رہا ہے، یا فلاں آدمی کو قتل کے ارادے سے آبادی سے باہر لے جا رہا ہے تو ایسی صورت کے

۱۔ احیاء علوم الدین ج ۲ ص [illegible] ۲۔ الاحکام السلطانیہ ص [illegible] ۳۔ احیاء علوم الدین ج ۲ ص [illegible] ۴۔ الاحکام السلطانیہ [illegible]

کہ اس میں غفلت نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ اس میں زنا، عصمت دری اور خون ناحق کا اندیشہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ عدم تجسس امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سلسلے کی ایک اہم شرط ہے۔ البتہ بعض ناگزیر حالات میں تجسس کی بھی اجازت ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں:۔

وقد امرنا ان نستر ما ستر الله وننکر علی من ابدی لنا صفحتہ	ہم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جس چیز کو اللہ نے پوشیدہ رکھا ہے اسے پوشیدہ ہی رکھیں اور جو شخص ہمارے سامنے اپنے جرم کا اظہار کرے اس پر نکیر کریں۔

اسی سلسلے میں مزید فرماتے ہیں:۔

معنی التجسس طلب الامارات المعرفۃ فالامارۃ المعرفۃ ان حصلت واورثت المعرفۃ جاز العمل بمقتضاھا فاما طلب الامارۃ المعرفۃ فلا رخصۃ فیہ اصلا[1]	تجسس کے معنی ہیں علم عطا کرنے والے علامات کی تلاش۔ اگر یہ علامات خود بخود حاصل ہوں اور ان سے (منکر کا) علم ہو جائے تو اس کے مطابق عمل کرنا جائز ہے لیکن ان علامتوں کو تلاش کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔

امام غزالی کے ان الفاظ کو اس باب میں قاعدہ کلیہ کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔

اختلافی منکرات پر احتساب

صرف اسی منکر پر احتساب کیا جا سکتا ہے جس کا منکر ہونا غیر اختلافی اور متفق علیہ ہو۔ اجتہادی امور میں احتساب کرنا صحیح نہیں ہے۔ امام غزالیؒ احتساب کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بیان کرتے ہیں

ان یکون کونہ منکرا معلوما بغیر اجتہاد فکل ما ھو فی محل الاجتہاد فلا حسبۃ فیہ[2]	کہ اس کا منکر ہونا اجتہاد کے بغیر معلوم ہو پس ہر وہ چیز جس کے لیے اجتہاد کی ضرورت پڑے اس پر احتساب نہیں ہوگا۔

اس سلسلے میں امام موصوف نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

کوئی حنفی کسی شافعی پر اس بات پر تنقید نہیں کر سکتا کہ وہ امام شافعی کی پیروی کر رہا ہے اور نہ کسی شافعی

---

[1] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۳۰۴	[2] ایضاً ص ۳۰۳

کو یہ حق ہے کہ وہ حنفی پر اس لیے احتساب کرے کہ وہ امام ابوحنیفہ کا اتباع کر رہا ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص اپنے مسلک ہی کے خلاف عمل کر رہا ہو تو اس پر اس پہلو سے احتساب کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنی تسلیم شدہ فقہ کی خلاف ورزی کی۔ اسی نوعیت کے احتساب کا حق ہر شخص کو حاصل ہے خواہ وہ خود اس مسلک پر عمل کر رہا ہو یا نہ کر رہا ہو۔ کیونکہ کسی مقلد کے لیے یہ بات صحیح نہیں ہے کہ وہ وقت ضرورت محض سہولت کی خاطر اپنے امام کی پیروی چھوڑ دے اور دوسرے امام کی تقلید شروع کر دے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص مجتہد ہے اور وہ اپنے اجتہاد کے خلاف عمل کر رہا ہے تو اس پر بھی احتساب کیا جائے گا۔ کیونکہ مجتہد کو اپنے اجتہاد ہی پر عمل کرنا چاہیے۔ اپنے اجتہاد کو چھوڑ کر دوسرے کے اجتہاد پر عمل کرنا اس کے لیے صحیح نہیں ہے [1]

جو شخص حکومت کی طرف سے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فرض پر مامور ہو اس کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اختلافی امور میں کیا وہ دوسروں کو اپنی رائے اور اجتہاد پر عمل کے لیے مجبور کر سکتا ہے یا نہیں؟ اس معاملے میں اس کی حیثیت احتساب کرنے والے عام افراد ہی کی ہے یا اس سے مختلف؟ علامہ ابوالحسن ماوردی لکھتے ہیں کہ شافعی فقہاء نے اس سلسلے میں دونوں طرح کی رائیں ظاہر کی ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ وہ اپنی رائے اور اجتہاد پر عمل کے لیے دوسروں کو مجبور کر سکتا ہے لیکن بعض دوسرے اصحاب کی رائے ہے کہ اختلافی امور میں اجتہاد کرنے کا حق سب کو حاصل ہے اس لیے احتساب کرنے والا اپنے اجتہاد پر دوسروں کو مجبور نہیں کر سکتا [2]

ہمارے خیال میں یہی دوسری رائے زیادہ صحیح اور معقول ہے۔ اجتہادی امور میں ایک سے زیادہ رایوں کی گنجائش شریعت نے دی ہے۔ ان میں سے جس رائے کو جو شخص صحیح سمجھے اس پر خود تو عمل کر سکتا ہے لیکن دوسروں کو مجبور نہیں کر سکتا۔ اس طرح کے معاملات میں کسی ایک رائے کو دوسروں پر مسلط کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ شریعت نے ان میں جو وسعت اور گنجائش رکھی ہے وہ ختم ہو جائے۔ اور افراد غیر ضروری تنگی میں مبتلا ہو جائیں۔ ملا علی قاری نے اس سلسلے میں بہت ہی معقول اور روح شریعت سے قریب تر بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں۔

لا انکار فی المختلف فیہ	اختلافی امور میں احتساب نہیں ہوگا اس
بناء علی ان کل مجتہد مصیب او	بناء پر کہ ہر مجتہد راہ راست پر ہے یا یہ کہا جا سکتا
المصیب واحد الا ان المخطی غیر	ہے کہ راہ راست پر تو ایک ہی ہے لیکن غلطی کرنے
متعین لنا مع ان الاثم موضوع عنہ	والا ہمارے لیے غیر متعین ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہے

[1] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۲۸۹ [2] الاحکام السلطانیہ ص ۲۳۲-۲۳۱

وهمن تبعه | کہ گناہ اس سے اور اس کی اتباع کرنیوالوں سے ساقط ہے۔

اسی سلسلے میں مزید لکھتے ہیں :۔

ليس له على الاصح ان يحمل	زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ محتسب کو اس کا حق
الناس على من هبه سواء كان	نہیں ہے کہ لوگوں کو اپنے مسلک پر مجبور کرے خواہ
مجتهدا او مقلدا فلم يزل	وہ مجتہد ہو یا مقلد (بلکہ ان کو اپنے اپنے مسلک پر
الخلاف بين الصحابة	عمل کرنے دے اس لیے کہ) صحابہ اور تابعین کے
والتابعين له	درمیان بھی اختلاف رہا ہے۔

بدعت پر احتساب ضروری ہے

اجتہاد کا تعلق شریعت کے تفصیلی احکام سے ہے۔ اصول دین اور اساسات شرع میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص دین کے بنیادی عقائد ہی کو چیلنج کرے تو اسے اجتہادی معاملہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا' بلکہ اس پر لازماً احتساب کرنا ہوگا۔ اس طرح کے اصولی اور بنیادی اختلاف کو امام غزالی بدعت سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کے بارے میں فرماتے ہیں :۔

البدع كلها ينبغي ان تحسم	تمام بدعتوں کے دروازوں کو بند کرنا اور
ابوابها وتنكر على المبتدعين بدعهم	بدعتیوں کی بدعت پر نکیر کرنا چاہیے خواہ وہ ان کے
وان اعتقدوا انها الحق له	حق ہونے ہی کا عقیدہ کیوں نہ رکھتے ہوں۔

امام ابن قیم فرماتے ہیں کہ قرآن و سنت کے خلاف کسی کتاب کا لکھنا جائز نہیں ہے اور اس طرح کی جو کتابیں تصنیف ہوں' شریعت کی طرف سے اجازت ہے کہ ان کو مٹایا اور تلف کر دیا جائے۔

الكتب المتضمنة لمخالفة	ایسی کتابیں جو سنت کی مخالفت پر مشتمل ہوں
السنة غير ماذون فيها بل ماذون	ان کی تصنیف کی اجازت نہیں ہے بلکہ ان کے مٹانے
في محقها واتلافها وما على الامة	اور ان کے تلف کرنے کی اجازت ہے۔ کیونکہ امت کے
اضر منها له	لیے ان سے زیادہ نقصان دہ کوئی چیز نہیں ہے۔

اس سے آگے وہ فرماتے ہیں :۔

له المبين المعين لفهم الاربعين صفحہ ۱۹   له احیاء علوم الدین ج ۲ صفحہ ۳۰۸   له الطرق الحکمیہ فی السیاسۃ الشرعیہ صفحہ ۲۵۴

الكتب المشتملة على الكذب	وہ کتابیں جو جھوٹ اور بدعت پر مشتمل ہوں ان
والبدعة يجب اتلافها واعدامها	کا تلف کرنا اور مٹانا ضروری ہے وہ اس کی زیادہ
وهي اولى بذالك من اتلاف	مستحق ہیں اس کے مقابلے میں کہ لہو ولعب اور گانے
آلات اللهو والمعازف واتلاف	بجانے کے آلات اور شراب کے برتن تلف کیے جائیں
آنية الخمر فان ضررها	کیونکہ ان کا نقصان ان سب چیزوں سے زیادہ
اعظم من هذه[1]	بڑا ہے ۔

مزید فرماتے ہیں کہ ان کتابوں کو تلف کرنے سے کوئی تاوان واجب نہیں ہوتا ۔

لا ضمان فى تحريق الكتب	گمراہ کن کتابوں کے جلانے اور تلف کرنے پر
المضلة واتلافها[2]	کوئی تاوان نہیں ہے ۔

آج کل علم کا جو تصور ہے اس کے لحاظ سے کتابوں کے بارے میں یہ رویہ سخت متعصبانہ معلوم ہوگا لیکن امت مسلمہ کے مفاد کے پہلو سے آپ اس پر غور کریں تو اس کو غلط نہیں کہیں گے ۔ امت مسلمہ ایک متحد الفکر گروہ کا نام ہے اسلام اس امت سے جو کام لینا چاہتا ہے وہ اتحاد کے بغیر ممکن نہیں ہے ۔ اس لیے وہ نہیں چاہتا کہ امت کا فکری اتحاد ختم ہو اور وہ کسی ذہنی ارتداد اور انتشار فکر میں گرفتار ہو جائے ۔ کیونکہ جب تک امت کو اپنے فلسفہ حیات پر پختہ یقین نہ ہو اور اس کی فکری بنیادیں مستحکم نہ ہوں علم وفن میں وہ مخالف قوتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی ۔ بلکہ تاریخ کا تجربہ ہے کہ جب بھی اس کا اساسی فکر متزلزل ہوا غیر اسلامی فلسفوں نے اس کو اپنے اندر جذب کرنا شروع کر دیا اور وہ امت جس میں خدا اور رسول کے فدائی پیدا ہوتے تھے کفر والحاد کے علم بردار پیدا ہونے لگے ۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امت کے اندر جب بھی فکری اختلافات پیدا ہوں تو اسے افہام وتفہیم کے بجائے سختی سے ختم کرنا چاہیے بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ جو کتابیں قرآن وسنت کے خلاف ہوں ان کے بارے میں امت اگر سخت رویہ اختیار کرے تو وہ ناجائز نہ ہوگا ۔ اس میں اس بات کی ممانعت نہیں ہے کہ فکر کا مقابلہ فکر سے کیا جائے اور علمی وفکری مباحث کا اسی رنگ میں جواب دیا جائے ۔ جو کتابیں قرآن وسنت سے ٹکرا رہی ہوں ان کے بارے میں امام ابن قیم کا نقطۂ نظر ہم نے ابھی پیش کیا ہے ۔ وہ بھی ان کی علمی تردید

---

[1] الطرق الحكمية فى السياسة الشرعية ص۲۵٦ [2] ایضاً ص۲۵۰ [3] ایضاً ص۲۵٦

کو نہ صرف مباح بلکہ حسب ضرورت مستحب اور واجب قرار دیتے ہیں :۔

اما کتب ابطال الآراء والمذاہب	ایسی کتابیں جو کتاب و سنت کے مخالف
المخالفة لهما فلا باس بها وقد	مذاہب و آراء کے ابطال میں ہوں تو ان میں کوئی
تکون واجبة ومستحبة ومباحة	حرج نہیں ہے۔ وہ کبھی واجب کبھی مستحب اور
بحسب اقتضاء الحال [1]	کبھی مباح، حالات کے تقاضے کے تحت ہوتی ہیں

قوت کے ذریعہ تغییر منکر کا حق عام افراد کو حاصل ہے لیکن وہ قوت کا استعمال صرف اسی وقت کر سکتے ہیں جب کہ عملاً منکر کا ارتکاب ہو رہا ہو۔ اگر کسی جگہ مستقبل میں ارتکاب منکر کا خطرہ ہو تو عوام کے لیے طاقت کا استعمال صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح منکر کے وجود میں آچکنے کے بعد وہ مجرم کو نصیحت تو کر سکتے ہیں لیکن اس کے خلاف طاقت کو کام میں نہیں لا سکتے۔ امام غزالی فرماتے ہیں :۔

"معصیت کے تین احوال ہیں۔ ایک تو یہ کہ معصیت واقع ہو چکی ہو، اس پر حد جاری کرنا، یا تعزیر کرنا حکام کا کام ہے، عام افراد کا نہیں۔ دوسری حالت یہ کہ معصیت فی الحال موجود ہو اور اس کا ارتکاب کرنے والا اس میں ملوث ہو۔ اس حالت میں بہر طور معصیت کا مٹانا واجب ہے بشرطیکہ اس کی وجہ سے اس سے بڑی یا اس جیسی کوئی معصیت نہ پیدا ہو جائے۔ اس کا حق عام افراد کو حاصل ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ منکر متوقع ہو جیسے کوئی شخص مے نوشی کے لیے مجلس آراستہ کر رہا ہو لیکن ابھی وہاں شراب موجود نہ ہو۔ اس میں اس بات کا بھی امکان ہے کہ کوئی ایسی رکاوٹ پیدا ہو جائے کہ وہ شراب استعمال نہ کر سکے۔ اس حالت میں اسے صرف نصیحت کی جا سکتی ہے۔ طاقت کے استعمال کا حق نہ عوام کو ہے اور نہ حکومت کو۔ الا یہ کہ کوئی شخص عادی مجرم ہو اور وہ اسباب کی فراہمی کے بعد ارتکاب جرم کے لیے محض وقت اور موقع کے انتظار میں ہو تو اس پر سختی سے احتساب جائز ہوگا۔"[2]

علامہ ابن نجیم تعزیر کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

قالوا لكل مسلم اقامته حال	فقہاء نے کہا ہے کہ معصیت کے ارتکاب کے
مباشرة المعصية واما بعد الفراغ	وقت ہر مسلمان کو تعزیر کا حق ہے لیکن معصیت سے
منها فليس ذالك لغير الحاكم	فارغ ہونے کے بعد سوائے حاکم کے کسی کو یہ حق نہیں

اس کی جو توجیہ فقہاء نے کی ہے وہ یہ ہے :۔

[1] الطرق الحکمیة فی السیاسة الشرعیة صفحہ ۲۸۲ [2] احیاء علوم الدین ج ۲ صفحہ ۳۲۲

لو عزره حال كونه مشغولا بالفاحشة فله ذلك وانه حسن لان ذلك نهي عن المنكر وكل واحد مامور به وبعد الفراغ ليس بنهي عن المنكر لان النهي عما مضى لا يتصور فيتمحض تعزيرا وذلك الى الامام[1]

گناہ کا ارتکاب کرنے والے کی تعزیر اگر کوئی شخص اس وقت کرے جب کہ وہ اس میں مشغول ہے تو اس کا اسے حق ہے بلکہ یہ پسندیدہ ہے۔ کیونکہ یہ نہی عن المنکر ہے، جس کا ہر ایک کو حکم ہے۔ رہا گناہ سے فارغ ہونے کے بعد تو اس وقت منکر سے منع نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ جو چیز گزر چکی اس سے روکنے کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خالص تعزیر ہو گی جو امام سے متعلق ہو گی۔

کسی شخص کے ارتکاب منکر کے بعد اس کے خلاف طاقت کا استعمال قابل مواخذہ جرم ہے۔

للمحتسب ان يعزر المعزر ان عزره بعد الفراغ منها[2]

حکومت کی طرف سے جو شخص احتساب پر مامور ہے اسے یہ حق ہے کہ وہ تعزیر کرنے والے کو سزا دے اگر وہ کسی شخص کی معصیت سے فارغ ہونے کے بعد اس کی تعزیر کرے۔

ایک مثال کے ذریعہ ہم اس کی وضاحت کریں گے۔ اگر کوئی شخص کسی پر حملہ کرے اور وہ اپنی جان کے تحفظ میں یا کوئی دوسرا شخص اس کی مدافعت میں حملہ آور کو قتل کر دے تو شریعت ان میں سے کسی سے مواخذہ نہیں کرے گی یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تغیر منکر کے لیے قوت کا استعمال اس وقت جائز ہے جب کہ منکر کا ارتکاب ہو رہا ہو۔ اب ایک دوسری صورت فرض کیجیے۔ وہ یہ کہ حملہ آور حملے کے بعد اس طرح پلٹ جاتا ہے کہ بظاہر اس کا ارادہ دوبارہ حملہ کا نہیں ہے۔ اس حالت میں اگر حملہ آور کو قتل کر دیا جائے تو قاتل سے قصاص لیا جائے گا[3] یہ اس دعوی کا ثبوت ہے کہ ارتکاب منکر کے بعد طاقت کے استعمال کی اجازت نہیں ہے۔

ضرورت کی حد تک طاقت کا استعمال

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لیے عام افراد بالکل ناگزیر حد تک طاقت کا استعمال کر سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کی انہیں اجازت نہیں ہے۔ امام غزالی تغیر بالید کا ایک ادب یہ بیان کرتے ہیں:۔

۱؎ البحر الرائق شرح کنز الدقائق ج ۵ ص ۴۲ ۲؎ ایضاً ۳؎ تکملہ بحر الرائق ص ۳۸۵

الا یقتصر فی طریق التغییر علی القدر المحتاج — تغییر منکر کے طریقے میں اسی مقدار پر اکتفا کرے جس کا وہ محتاج ہے۔

مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی کی زمین پر غاصبانہ قبضہ جمائے بیٹھا ہے اور اسے ہاتھ پکڑ کر وہاں سے لا جا سکتا ہے تو ڈاڑھی یا ٹانگ پکڑ کر گھسیٹنا صحیح نہیں ہے[1]

ضرورت سے زیادہ طاقت کا استعمال ایک جرم ہے جس پر شریعت کی طرف سے احتساب ہوگا۔ فرض کیجئے اگر کوئی شخص شراب کے بہانے کے لیے اس کا ظرف توڑ دے تو اسے تاوان ادا کرنا ہوگا۔ کیونکہ شراب بہانے کے لیے ظرف کا توڑنا ضروری نہیں ہے۔ ہاں اگر شراب کا برتن توڑے بغیر اس کا بہانا ممکن نہ ہو تو شکست وریخت کی اسے اجازت ہے[2]

اسی طرح اگر چور کسی مکان میں گھس جائے اور صاحب مکان یہ جانتے ہوئے کہ چیخ پکار سے وہ بھاگ جائے گا اسے قتل کر دے تو اس پر قصاص واجب ہوگا لیکن اگر اسے یقین ہو کہ وہ چیخ پکار سے نہیں بھاگے گا تو اسے قتل کر سکتا ہے[3]

امام غزالی نے اس سلسلے میں اصولی بات یہ فرمائی ہے:۔

لیس الی احاد الرعیۃ الا الدفع وھو اعدام المنکر فما زاد علی قدر الاعدام فھو اما عقوبۃ علی جریمۃ سابقۃ او زجر عن لاحق وذالک الی الولاۃ	عام رعایا کو صرف منکر کے مٹانے کا حق ہے جو چیز اس سے زیادہ ہو وہ یا تو کسی سابق جرم کی سزا ہوگی یا ہونے والے جرم پر زجر و تو بیخ ہوگی۔ اس کا حق حکام کو ہے رعایا کو نہیں ہے۔

[1] احیاء ج ۲ ص ۲۹۱ [2] ایضاً ص ۲۹۱ [3] تکملہ بحر ص ۳۰۹ [4] احیاء ج ۲ ص ۲۹۱

مذہب اور سائنس

جناب وحیدالدین خاں صاحب

نئی دہلی میں مختلف مذاہب کے اشتراک سے ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے جس کا نام ہے مذاہب کی عالمی انجمن (World Fellowship of Religions) اس انجمن کے تحت ۱۹۵۷ء میں پہلی عالمی مذاہب کانفرنس نئی دہلی میں ہوئی تھی۔ دوسری کانفرنس کلکتہ میں ۱۹۶۰ء میں ہوئی اور تیسری بار فروری ۱۹۶۵ء میں نئی دہلی میں اس کا اجلاس ہوا جس میں ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں سے مختلف مذاہب کے نمائندے شریک ہوئے۔ ذیل کی تقریر اسی موقع پر اس کے ۷، ۸ فروری کے اجلاس میں پیش کرنے کے لیے لکھی گئی۔

اس وقت مجھے جس عنوان پر اپنے خیالات پیش کرنے کی اجازت ملی ہے، وہ ہے مذہب اور سائنس — مذہب اور سائنس دونوں بہت وسیع الفاظ ہیں۔ مذہب، زندگی کا ایک تصور اور اس تصور پر بننے وا ایک ہمہ گیر طرز عمل کا نام ہے جو زندگی کے تمام پہلوؤں کے بارے میں اپنے کچھ مطالبات اور تقاضے رکھتا ہے اور سائنس، اس وسیع دنیا کے مطالعہ کا نام ہے جو ہمارے مشاہدے اور تجربے میں آتی ہے یا آسکتی ہے۔ ا اعتبار سے دونوں نہایت وسیع موضوعات ہیں اور ان کے دائرے بہت سے پہلوؤں سے ایک دوسرے — الگ الگ ہیں مجھے اس مقالے میں دونوں کی تفصیلات پر کوئی بحث نہیں کرنی ہے۔ اس مقالے کا موضوع صرف: فرضی یا حقیقی تصادم ہے جو سائنس اور مذہب کے درمیان علمی حیثیت سے واقع ہوا اور جس کے کچھ نتائج برآمد ہوئے میں مختصر طور پر صرف اس دعوے سے بحث کرنا چاہتا ہوں جس میں دہرایا گیا ہے کہ سائنس کی دریافتوں نے مذ کو بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔

سائنس اور مذہب کا روایتی ٹکراؤ خاص طور پر اٹھارھویں اور انیسویں صدی کی پیداوار ہے۔یہی وہ زمانہ ہے جبکہ جدید سائنس کا ظہور ہوا۔سائنسی دریافتوں کے سامنے آنے کے بعد بہت سے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ اب خدا کو ماننے کی کوئی ضرورت نہیں۔خدا کو ماننے کی ایک بہت بڑی وجہ، دوسری وجہوں کے ساتھ، یہ بھی کہ اس کو مانے بغیر کائنات کی توجیہہ نہیں بنتی۔مخالفینِ مذہب نے کہا کہ اب اس مقصد کے لیے ہم کو خدا کی مفروضے کی کوئی ضرورت نہیں۔کیونکہ جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں ہم آسانی کے ساتھ پوری کائنات کی اس طرح تشریح کر سکتے ہیں کہ کسی بھی مرحلے میں خدا کو ماننے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔اس طرح خدا کا خیال ان کی نظر میں ایک بے ضرورت چیز بن گیا اور جو خیال بے ضرورت ہو جائے اس کا بے بنیاد ہونا لازمی ہے۔

یہ دعویٰ جب کیا گیا، اس وقت بھی اگرچہ وہ علمی حیثیت سے نہایت کمزور تھا۔مگر اب تو خود سائنس نے براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اس بات کا اعتراف کر لیا ہے کہ اس کے پاس اس قسم کا دعویٰ کرنے کے لیے اطمینان بخش دلائل موجود نہیں ہیں۔

سائنس کی وہ کیا دریافت تھی جس میں لوگوں کو نظر آیا کہ اب خدا کی ضرورت ختم ہو گئی ہے۔وہ خاص طور پر یہ تھا کہ سائنس نے معلوم کیا کہ کائنات کچھ خاص قوانین کی تابع ہے۔قدیم زمانے کا انسان سادہ طور پر یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا کرنے والا خدا ہے۔مگر جدید ذرائع اور جدید طرز تحقیق کی روشنی میں دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ ہر واقعہ کے پیچھے ایک ایسا سبب موجود ہے جس کو تجربہ کر کے معلوم کیا جا سکتا ہے۔مثلاً نیوٹن کے مشاہدے میں نظر آیا کہ آسمان کے تمام ستارے اور سیارے کچھ ناقابلِ تغیر قوانین میں بندھے ہوئے ہیں اور انھیں کے تحت حرکت کرتے ہیں۔ڈاروِن کی تحقیق نے اسے بتایا کہ انسان کسی خاص تخلیقی حکم کے تحت وجود میں نہیں آیا بلکہ ابتدائی زمانے کے کیڑے مکوڑے عام مادی قوانین کے تحت ترقی کرتے کرتے انسان بن گئے ہیں۔

اسی طرح مطالعہ اور تجربے کے بعد زمین سے لے کر آسمان تک سارے واقعات ایک معلوم نظام کے تحت ظاہر ہوتے ہوئے نظر آئے جس کو قانونِ فطرت (Law of Nature) کا نام دیا گیا۔قانونِ فطرت کا یہ عمل اس درجہ موثر تھا کہ اس کے بارے میں پیشگی خبر دی جا سکتی تھی۔

اس دریافت کا مطلب یہ تھا کہ جس کائنات کو ہم سمجھتے تھے کہ وہاں خدا کی کارفرمائی ہے، وہ کچھ مادی اور طبیعیاتی قوانین کی کارفرمائیوں کے تابع تھی۔جب ان قوانین کو استعمال کیا گیا اور اس کے کچھ نتائج بھی برآمد ہوئے

تو انسان کا یقین اور زیادہ بڑھ گیا۔ جرمن فلسفی کانٹ نے کہا — "مجھے مادہ مہیا کرو اور میں تم کو بتادوں گا کہ دنیا اس مادے سے کس طرح بنائی جاتی ہے"۔ ہیکل (Haeckel) نے دعویٰ کیا کہ "پانی، کیمیاوی اجزاء اور وقت ملے تو وہ ایک انسان کی تخلیق کر سکتا ہے"۔ نیٹشے نے اعلان کر دیا کہ "اب خدا مر چکا ہے"۔ اس طرح یہ یقین کر لیا گیا کہ اس کائنات کا خالق اور مالک کوئی زندہ اور صاحب ذہن و ارادہ ہستی نہیں ہے۔ بلکہ کائنات ازاول تا آخر ایک مادی کائنات ہے۔ کائنات کی ساری حرکتیں اور اس کے تمام مظاہر خواہ وہ ذی روح اشیاء سے متعلق ہوں یا بے روح اشیاء کے بارے میں ہوں، اندھے مادی عمل کے سوا اور کچھ نہیں۔ سائنس نے جس دنیا کو دریافت کیا اس میں کہیں اس خدا کی کارفرمائی نظر نہیں آتی تھی جو تمام مذاہب کی بنیاد ہے۔ پھر خدا کو مانا جائے تو کس لیے مانا جائے۔

اگرچہ اس دریافت کے ابتدائی تمام ہیرو خدا کو ماننے والے لوگ تھے، مگر دوسرے لوگوں کے سامنے جب یہ تحقیق آئی تو انھوں نے پایا کہ اس دریافت نے سرے سے خدا کے وجود ہی کو بے معنی ثابت کر دیا ہے۔ کیونکہ واقعات کی توجیہ کے لیے جب خود مادی دنیا کے اندر اسباب و قوانین مل رہے ہوں تو پھر اس کے لیے مادی دنیا سے باہر ایک خدا کو فرض کرنے کی کیا ضرورت۔ انھوں نے کہا کہ جب تک دوربین نہیں بنی تھی اور ریاضیات نے ترقی نہیں کی تھی اس وقت انسان نہیں جان سکتا تھا کہ سورج کیسے نکلتا ہے اور کیسے ڈوبتا ہے۔ چنانچہ اپنی لاعلمی کی وجہ سے اس نے یہ فرض کر لیا کہ کوئی خدائی طاقت ہے جو ایسا کرتی ہے۔ مگر اب فلکیات کے مطالعہ سے ثابت ہو گیا ہے کہ جذب و کشش کا ایک عالمی نظام ہے جس کے تحت سورج، چاند اور تمام ستارے اور سیارے حرکت کر رہے ہیں۔ اس لیے اب خدا کو ماننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسی طرح وہ تمام چیزیں جن کے متعلق پہلے سمجھا جاتا تھا کہ ان کے پیچھے کوئی ان دیکھی طاقت کام کر رہی ہے، وہ سب جدید مطالعہ کے بعد ہماری جانی پہچانی فطری طاقتوں کے عمل اور ردعمل کا نتیجہ نظر آیا۔ گویا واقعہ کے فطری اسباب معلوم ہونے کے بعد وہ ضرورت آپ سے آپ ختم ہو گئی جس کے لیے پچھلے لوگوں نے ایک خدا یا مافوق الفطری طاقت کا وجود فرض کر لیا تھا۔ "اگر قوس قزح گرتی ہوئی بارش پر سورج کی شعاعوں کے انعطاف (Refraction) سے پیدا ہوتی ہے تو یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ وہ آسمان کے اوپر خدا کا نشان ہے"۔ — ہکسلے اس قسم کے بعد واقعات پیش کرتا ہوا کس قدر یقین کے ساتھ کہتا ہے:۔

If events are due to natural causes, they are not due to supernatural causes.

یعنی واقعات اگر فطری اسباب کے تحت صادر ہوتے ہیں تو وہ مافوق الفطری اسباب کے پیدا کیے ہوئے نہیں ہو سکتے۔ اور ظاہر ہے کہ جب واقعات کے پیچھے مافوق الفطری اسباب موجود نہ ہوں تو کسی مافوق الفطرت ہستی کے وجود پر کیسے یقین کیا جا سکتا ہے۔

مخالفین مذہب کے اس استدلال میں کیا کمزوری ہے، اس کو ایک مثال سے سمجھیے۔ ایک شخص ریلوے انجن کو دیکھتا ہے کہ اس کے پہیے گھوم رہے ہیں اور وہ پٹری پر بھاگا چلا جا رہا ہے۔ اس کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پہیے کیسے گھوم رہے ہیں۔ تحقیق کرنے کے بعد اس کی رسائی انجن کے پرزوں تک ہوتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ پرزوں کی حرکت سے پہیے گھوم رہے ہیں۔ کیا اس دریافت کے بعد وہ یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوگا کہ انجن اپنے پرزوں کے ساتھ بذات خود ٹرین کی حرکت کا سبب ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ انجن سے پہلے انجینیر اور ڈرائیور کو ماننا ضروری ہے۔ انجینیر اور ڈرائیور کے بغیر انجن کا نہ تو کوئی وجود ہے اور نہ اس میں کسی قسم کی حرکت کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ گویا انجن یا اس کا پرزہ آخری حقیقت نہیں۔ آخری حقیقت وہ ذہن ہے جو انجن کو وجود میں لایا ہے اور اپنے ارادہ سے اس کو چلا رہا ہے۔ ایک عیسائی عالم نے بہت صحیح کہا کہ فطرت کائنات کی توجیہ نہیں کرتی، وہ خود اپنے لیے ایک توجیہ کی طالب ہے:

Natu.e does not explain, she is herself in need of an explanation.

کیونکہ، اس کے الفاظ میں فطرت کا قانون تو کائنات کا ایک واقعہ ہے، اس کو کائنات کی توجیہ نہیں کہا جا سکتا

Natu.e is a fact, not an explanation.

مرغی کا بچہ انڈے کے مضبوط خول کے اندر پرورش پاتا ہے اور اس کے ٹوٹنے سے باہر آ جاتا ہے۔ یہ واقعہ کیوں کر ہوتا ہے کہ خول ٹوٹے اور بچہ جو گوشت کے لوتھڑے سے زیادہ نہیں ہوتا، وہ باہر نکل آئے۔ پہلے کا انسان اس کا جواب یہ دیتا تھا کہ —— "خدا ایسا کرتا ہے"۔ مگر اب خوردبینی مشاہدہ کے بعد معلوم ہوا کہ جب ۲۱ روز کی مدت پوری ہونے والی ہوتی ہے، اس وقت انڈے کے اندر ننھے بچے کی چونچ پر ایک چھوٹی سی سخت سینگ ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی مدد سے وہ اپنے خول کو توڑ کر باہر آ جاتا ہے۔ سینگ اپنا کام پورا کر کے بچے کی پیدائش کے چند دن بعد خود بخود جھڑ جاتی ہے۔

مخالفین مذہب کے نظریے کے مطابق یہ مشاہدہ اس پرانے خیال کو غلط ثابت کر دیتا ہے کہ بچہ کو باہر نکالنے والا خدا ہے۔ کیونکہ خوردبین کی آنکھ ہم کو صاف طور پر دکھا رہی ہے کہ ایک ۲۱ روزہ قانون ہے جس کے تحت وہ

صورتیں پیدا ہوتی ہیں جو بچہ کو خول سے باہر لاتی ہیں۔ مگر یہ مغالطہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ جدید مشاہدہ نے جو کچھ ہمیں بتایا ہے وہ صرف واقعہ کی چند مزید کڑیاں ہیں۔ اس نے واقعہ کا اصلی اور آخری سبب نہیں بتایا۔ اس مشاہدہ کے بعد صورت حال میں جو فرق ہوا ہے وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ پہلے جو سوال خول ٹوٹنے کے بارے میں تھا، وہ سینگ کے اوپر جاکر ٹھہر گیا۔ بچہ کا اپنی سینگ سے خول کو توڑنا، واقعہ کی صرف ایک درمیانی کڑی ہے۔ اس لحاظ سے وہ اصل واقعہ ہی کا ایک جزو ہے، وہ واقعہ کی تشریح نہیں ہے۔ واقعہ کی تشریح تو اس وقت معلوم ہوگی جب ہم جان لیں کہ وہ آخری اسباب کیا ہیں جن کے نتیجے میں بچہ کی چونچ پر سینگ نمودار ہوئی۔ اس آخری سبب کو جاننے سے پہلے سینگ کا ظہور خود ایک سوال ہے، نہ کہ اسے اصل سوال کا جواب قرار دیا جائے۔ کیونکہ پہلے اگر یہ سوال تھا کہ "خول کیسے ٹوٹتا ہے" تو اب یہ سوال ہو گیا کہ "سینگ کیسے بنتی ہے؟" ظاہر ہے کہ دونوں حالتوں میں کوئی نوعی فرق نہیں۔ اس کو زیادہ سے زیادہ فطرت کا وسیع تر مشاہدہ کہہ سکتے ہیں۔ فطرت کی توجیہ کا نام نہیں دے سکتے۔

مخالفین مذہب جس انکشاف کو فطرت کی توجیہ کا نام دے کر اس کو خدا کا بدل ٹھہرا رہے ہیں، اس کو ہم نہایت آسانی سے فطرت کا طریق کار کہہ سکتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدا ان قوانین کے ذریعہ کائنات میں اپنا عمل کرتا ہے جس کے بعض اجزاء کو سائنس نے دریافت کیا ہے۔ فرض کیجیے، مذہبی لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ سمندروں میں جوار بھاٹا لانے والا خدا ہے۔ اب جدید دور کا ایک سائنس داں اٹھتا ہے اور ہم کو بتاتا ہے کہ جوار بھاٹا درحقیقت چاند کی کشش (Gravity-pull of the moon) اور دنیا کے سمندروں اور خشکی کے ٹکڑوں کی جغرافی وضع وہیئت (Geographical Configuration) کے سبب سے ہوتا ہے۔ سائنس داں کے اس مشاہدے کو ہمیں رد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بہت خوشی کے ساتھ ہم اسے قبول کر سکتے ہیں۔ مگر اس سے ہمارے عقیدے کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ صحیح ہے کہ طوفان۔ قوت کشش اور زمین کی جغرافی بناوٹ کے ذریعہ عمل کرتا ہے۔ مگر قوت کشش اور جغرافی بناوٹ کیا ہیں۔ وہ بھی خدا ہی کی مخلوق ہیں۔ وہ خدا ہی ہے جو ان ذرائع سے اپنا عمل انجام دیتا ہے۔ خدا آج بھی طوفان کا حقیقی سبب ہے۔

This doesn't destroy my belief: it is still God, working through these things, who is responsible for the tides.

اسی طرح حیاتیات کے میدان میں نظریۂ ارتقاء کے حوالے سے یہ بات باربار دہرائی گئی ہے کہ حیاتیاتی عمل اب کسی ماورائے فطرت ذریعہ کی موجودگی کا تقاضا نہیں کرتا۔ دوسرے لفظوں میں زندگی کے مسئلے کو سمجھنے کے لیے کسی باشعور خدا کو ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ جدید مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ زندگی صرف چند مادی طاقتوں سے خود بخود حاصل ہونے والا ایک نتیجہ ہے جو خاص طور پر تین ہیں:

Reproduction, Variation, and Differential Survival.

یعنی توالد و تناسل کے ذریعہ مزید زندگیوں کا پیدا ہونا، پیدا شدہ نسل کے بعض افراد میں کچھ فرقوں کا ظہور اور پھر ان فروق کا پشت ہا پشت میں ترقی کرکے مکمل ہو جانا ــــ اس طرح مخالفین مذہب کے نقطہ نظر کے مطابق، ڈارون کے انتخاب طبعی کے اصول کا حیاتیاتی مظاہر پر انطباق اس کو ممکن اور ضروری بنا دیتا ہے کہ زندگی کی نشو و نما پر خدا کی کارفرمائی کے تصور کو بالکل ترک کر دیا جائے۔

اگرچہ ابھی تک بذات خود یہ بات غیر ثابت شدہ ہے کہ انواع حیات فی الواقع اسی طرح وجود میں آئی ہیں جیسا کہ ارتقا پسند علما ءبتاتے ہیں۔ تاہم اگر اس کو بلابحث مان لیا جائے جب بھی اس سے مذہبی عقیدے کے تزلزل کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ انواع حیات اگر بالفرض ارتقائی عمل کے تحت وجود میں آئی ہوں جب بھی یکساں درجہ کی قوت کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ خدائی تخلیق کا طریقہ ہے، نہ کہ اندھے مادی عمل کا خود بخود نتیجہ۔ حقیقت یہ ہے کہ مشینی ارتقاء (Mechanical Evolution) کو نہایت آسانی کے ساتھ تخلیقی ارتقاء (Creational Evolution) ثابت کیا جا سکتا ہے اور سائنس کے حوالے سے مذہب کی مخالفت کرنے والوں کے پاس اس کی تردید کی کوئی واقعی بنیاد نہیں ہوگی۔

یہ تو خالص علمی حیثیت سے اصل دعوے کی حقیقت تھی۔ مگر اب سائنس نے بیسویں صدی میں پہنچ کر اپنے سابقہ یقین کو کھو دیا ہے۔ آج جبکہ نیوٹن کی جگہ آئن سٹائن نے لے لی ہے اور پلانک اور ہیزن برگ نے لاپلاس کے نظریات کو منسوخ کر دیا ہے، اب مخالفین مذہب کے لیے، کم از کم علمی بنیاد پر اس قسم کا دعویٰ کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ نظریہ اضافیت (Relativity) اور کوانٹم تھیوری نے خود سائنس دانوں کو اس نتیجہ تک پہنچا دیا ہے کہ وہ اس بات کا اعتراف کر لیں کہ یہ ناممکن ہے کہ سائنس میں مشاہد (Observer) کو مشاہدہ (Observed) سے الگ کیا جا سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی چیز کے صرف چند خارجی مظاہر کو دیکھ سکتے ہیں، اس کی اصل حقیقت کا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ بیسویں صدی میں سائنس کے اندر جو انقلاب ہوا ہے اس نے

خود سائنسی نقطۂ نظر سے مذہب کی اہمیت ثابت کر دی ہے۔
سائنس میں جو چیز جدید انقلاب کہی جاتی ہے، وہ اس واقعہ پر مشتمل ہے کہ نیوٹن کا نظریہ جو دو سو سال تک سائنس کی دنیا پر حکمراں رہا، وہ اب جدید مطالعہ کے بعد ناقص پایا گیا ہے۔ اگرچہ سابقہ فکر کی جگہ ابھی تک کوئی مکمل نظریہ نہیں آسکا ہے مگر یہ واضح ہے کہ نئے رجحان کے فلسفیانہ تقاضے اس سے بالکل مختلف ہیں جو پچھلے نظریے کے تھے۔ اب یہ دعویٰ نہیں رہا کہ سائنٹفک طریق مطالعہ ہی حقیقت کو معلوم کرنے کا واحد صحیح طریقہ ہے۔ سائنس کے ممتاز علماء حیرت انگیز طور پر اصرار کر رہے ہیں کہ:

Science gives us but a partial knowledge of reality.

سائنس ہم کو صداقت کا صرف جزئی علم دیتی ہے۔

سائنسی رجحان میں یہ تبدیلی اچانک پیدا ہوئی ہے۔ سو برس بھی نہیں گزرے جب ٹنڈل **(Tyndall)** نے اپنے خطبۂ بلفاسٹ **(Belfast Address)** میں اعلان کیا تھا کہ سائنس تنہا انسان کے تمام اہم معاملات سے بحث **(deal)** کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس قسم کے خیالات اس مفروضہ یقین کی بنیاد پر قائم کیے گئے تھے کہ حقیقت تمام کی تمام صرف مادہ اور حرکت **(Matter and Motion)** پر مشتمل ہے۔ مگر فطرت کو مادہ اور حرکت کی اصطلاحوں میں بیان کرنے کی ساری کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں یہ کوشش اپنے عروج پر تھی جب لاپلاس **(Laplace)**, نے یہ کہنے کی جرأت کی کہ ایک عظیم ریاضی داں جو ابتدائی سحابیہ **(Nebula)** میں ذرات کے انتشار کو جانتا ہو، وہ دنیا کے مستقبل کی پوری تاریخ کو پیشگی بتا سکتا تھا۔ اس وقت یہ یقین کر لیا گیا تھا کہ نیوٹن کا نظریہ سارے علوم کی کنجی ہے۔

نیوٹن کے نظریے کی غلطی پہلی بار اس وقت ظاہر ہوئی جب علماء نے روشنی کی مادی تشریح کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش انھیں ایتھر **(Ether)** کے عقیدے تک لے گئی جو بالکل مجہول اور ناقابل بیان عنصر تھا۔ کچھ نسلوں تک یہ عجیب و غریب عقیدہ چلتا رہا۔ روشنی کی مادی تعبیر کے حق میں ریاضیات کے خوب خوب معجزے دکھائے گئے۔ لیکن میکسویل **(Maxwell)** کے تجربات کی اشاعت کے بعد یہ مشکل ناقابل عبور نظر آنے لگی۔ کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ روشنی ایک برقی مقناطیسی مظہر **(Electromagnetic Phenomenon)** ہے۔ یہ خلا بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ دن آیا جب علمائے سائنس پر واضح ہوا کہ نیوٹن

کے نظریات میں کوئی چیز مقدس نہیں ہے۔ بہت دنوں کے تذبذب اور بجلی کو مادی (Mechanical) ثابت کرنے کی آخری کوششوں کے بعد بالآخر بجلی کو ناقابل تحویل عناصر Irreducible Elements کی فہرست میں شامل کر دیا گیا۔

یہ بظاہر ایک سادہ سی بات ہے۔ مگر حقیقت یہ بہت معنی خیز فیصلہ ہے۔ نیوٹن کے تصور میں ہم سب کچھ اچھی طرح معلوم تھا۔ اس کے مطابق ایک جسم کی کمیت اس کی مقدار مادہ تھی، طاقت کا مسئلہ حرکت سے سمجھ میں آجاتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح یقین کر لیا گیا تھا کہ ہم اس فطرت کو جانتے ہیں جس کے متعلق ہم کلام کر رہے ہیں مگر بجلی کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اس کی فطرت (Nature) ایسی ہے جس کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے اس کو معلوم اصطلاحوں میں تعبیر کرنے کی ساری کوششیں ناکام ہو گئیں۔ وہ سب کچھ جو ہم بجلی کے متعلق جانتے ہیں وہ صرف وہ طریقہ ہے جس سے وہ ہمارے پیمائشی آلات کو متاثر کرتی ہے —— اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بات کس قدر اہم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسے وجود Entity کو طبیعیات میں تسلیم کر لیا گیا جس کے متعلق ہم اس کے ریاضیاتی ڈھانچے کے سوا اور کچھ نہیں جانتے۔

اس کے بعد اس نہج پر اس قسم کے اور بھی وجود تسلیم کیے گئے اور یہ مان لیا گیا کہ یہ لامعلوم ہستیاں بھی سائنسی نظریات کے بنانے میں وہی حصہ ادا کرتی ہیں جیسے قدیم معلوم مادہ ادا کرتا تھا۔ یہ حقیقت قرار پا گیا کہ جہاں تک علم طبیعیات کا تعلق ہے، ہم کسی چیز کے اصلی وجود کو نہیں جان سکتے۔ بلکہ صرف اس کے ریاضیاتی ڈھانچے (Mathematical Structure) کو جاننے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اب اعلیٰ ترین سطح پر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ہمارا یہ خیال کہ ہم اشیاء کو ان کی آخری صورت میں دیکھ سکتے ہیں، محض فریب تھا۔

پروفیسر ایڈنگٹن (Eddington) کے نزدیک ریاضیاتی ڈھانچہ کا علم ہی وہ واحد علم ہے جو طبیعیاتی سائنس ہمیں دے سکتی ہے:

> "جمالیاتی، اخلاقی اور روحانی پہلوؤں سے قطع نظر، کمیت، مادہ، جوہر، وسعت اور مدت وغیرہ جو خالص طبیعیات کے دائرے کی چیزیں سمجھی جاتی ہیں، ان کی کیفیت کو جاننا بھی ہمارے لیے ویسا ہی مشکل ہو گیا ہے جیسے غیر مادی چیزوں کی حقیقت کو جاننا۔ موجودہ طبیعیات اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ وہ ان چیزوں سے براہ راست واقف ہو سکے، ان کی حقیقت ادراک سے باہر ہے۔ ہم ذہنی خاکوں کی مدد سے اندازہ کرتے ہیں، مگر ذہن کا کوئی عکس ایک ایسی چیز کی بعینہٖ نقل نہیں ہو سکتا جو خود ذہن کے اندر

موجود نہ ہو۔ اس طرح اپنے حقیقی طریق مطالعہ کے اعتبار سے طبیعیات ان خارج از ادراک خصوصیتوں کا مطالعہ نہیں کرتی بلکہ وہ صرف مطالعہ بر آلہ (Pointer-Reading) ہے جو ہمارے علم میں آتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ مطالعہ عمل کائنات کی بعض خصوصیات کو منعکس کرتا ہے، مگر ہماری اصل معلومات آلاتی مطالعہ سے متعلق ہیں نہ کہ وہ خصوصیات کے بارے میں ہیں۔ آلاتی مطالعہ کو اشیاء کی حقیقی خصوصیات سے وہی نسبت ہے جو ٹیلی فون نمبر کو اس شخص سے جس کا وہ فون نمبر ہے[1]

یہ واقعہ کہ سائنس صرف ڈھانچہ کی معلومات تک محدود ہے، بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت ابھی پورے طور پر معلوم شدہ نہیں ہے۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمارے احساسات یا خدا سے اتصال کا عارفانہ تجربہ اپنا کوئی خارجی جواب (Objective Counterpart) نہیں رکھتا۔ یہ قطعی ممکن ہے کہ ایسا کوئی جواب خارج میں موجود ہو۔ ہمارے مذہبی اور جمالیاتی احساسات اب محض مظاہر فریب (Illusory Phenomenon) نہیں کہے جا سکتے جیسا کہ پہلے سمجھا جاتا تھا۔ نئی سائنسی دنیا میں مذہبی عارف بھی ایک حقیقت کے طور پر رہ سکتا ہے۔

The Limitations of Science, 138—42

سائنٹفک فلاسفہ نے اس قسم کی تشریحات شروع کر دی ہیں۔ مارٹن وائٹ (Morton White) کے الفاظ میں —— "بیسویں صدی میں فلسفیانہ ذہن رکھنے والے سائنس دانوں نے ایک نئی جنگ (Crusade) کا آغاز کر دیا ہے جس میں وہائٹ ہیڈ، ایڈنگٹن اور جینز کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں"[2] ان علماء کا فکر صریح طور پر کائنات کی مادی تعبیر کی نفی کرتا ہے۔ مگر ان کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے خود جدید طبیعیات اور ریاضیات کے نتائج کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے بارے میں وہی الفاظ صحیح ہیں جو مارٹن وائٹ نے وائٹ ہیڈ کے متعلق لکھے ہیں:

> He is a heroic thinker who tries to beard the lions of Intellectualism, Materialism and Positivism in their own bristling den. (P. 84)

---

[1] *'The Domain of Physical Science'*--Essay in Science Religion and Reality

[2] The Age of Analysis, P. 84

یعنی وہ ایک بلند ہمت مفکر ہے جس نے مادہ پرستی کے شیروں کو عین ان کے بھٹ میں للکارا ہے۔

انگریز ماہر ریاضیات اور فلسفی الفرڈ نارتھ وائٹ ہیڈ (۱۸۶۱ - ۱۹۴۷) کے نزدیک جدید معلومات یہ ثابت کرتی ہیں کہ: Nature is Alive

(P. 84)

یعنی فطرت بے روح مادہ نہیں، بلکہ زندہ فطرت ہے۔

انگریز ماہر فلکیات سر آرتھر اڈنگٹن (۱۸۸۲ - ۱۹۴۴) نے موجودہ سائنس کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ:

The stuff of the world is mind-stuff. (146)

یعنی کائنات کا مادہ ایک شئے ذہنی ہے۔

ریاضیاتی طبیعیات کا انگریز عالم سر جیمز جینز (۱۸۷۷ - ۱۹۴۶) جدید تحقیقات کی تعبیر ان الفاظ میں کرتا ہے:

The universe is a universe of thought. (P. 134)

یعنی کائنات، مادی کائنات نہیں بلکہ تصوراتی کائنات ہے۔

یہ انتہائی مستند سائنس دانوں کے خیالات ہیں جن کا خلاصہ جے۔ ڈبلیو۔ این سولیون کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

The ultimate nature of the universe is mental (P. 145)

کائنات کی آخری ماہیت ذہن ہے [1]

[1] آخری حقیقت ذہن ہے یا مادہ۔ یہ فلسفیانہ الفاظ میں دراصل یہ سوال ہے کہ کائنات محض مادہ کے ذاتی عمل کے طور پر خود بخود بن گئی ہے یا کوئی غیر مادی ہستی ہے جس نے بالارادہ اسے تخلیق کیا ہے جیسے کسی مشین کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ اپنے آخری تجزیے میں محض لوہے اور پیٹرول کا ایک اتفاقی مرکب ہے۔ گویا یہ کہنا ہے کہ مشین سے پہلے صرف لوہا اور پیٹرول تھا اور اس نے خود ہی کسی اندھے عمل کے ذریعہ محض اتفاق سے مشین کی صورت اختیار کرلی ہے۔ اس کے برعکس اگر یہ کہا جائے کہ مشین اپنے آخری تجزیے میں انجنیر کا ذہن ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مشین سے پہلے ایک ذہن تھا جس نے مادہ سے الگ اس کے ڈزائن کو سوچا اور بالارادہ اسے تیار کیا۔

"ذہن" کے تعین میں اختلاف سے ذہن کو آخری حقیقت ماننے والوں میں مختلف گروہ ہوسکتے ہیں۔ جیسے خدا کو ماننے والے خدا کو ماننے کے باوجود مختلف ٹولیوں کی شکل میں پائے جاتے ہیں۔ مگر علمی مطالعہ کا یہ نتیجہ کہ کائنات کی آخری حقیقت ذہن ہے، یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے مذہب کی تصدیق ہے اور الحاد کی تردید۔

یہ ایک عظیم تبدیلی ہے جو پچھلی نصف صدی کے دوران میں سائنس کے اندر ہوئی ہے۔ اس تبدیلی کا اہم ترین پہلو ہے۔ ڈبلیو این سولیون کے الفاظ میں: یہ نہیں ہے کہ تمدنی ترقی کے لیے زیادہ طاقت حاصل ہوگئی ہے۔ بلکہ یہ تبدیلی وہ ہے جو اس کی مابعد الطبیعیاتی بنیادوں Metaphysical Foundation میں واقع ہوئی ہے۔

The Limitations of Science, 138-50

برطانیہ کے مشہور ماہر فلکیات اور ریاضی داں سر جیمز جینز Sir James Jeans کی کتاب "پُراسرار کائنات"[1] غالباً اس سلسلے میں موجودہ زمانے کا سب سے زیادہ قیمتی مواد ہے۔ اس کتاب میں موصوف خالص سائنسی بحث کے ذریعہ اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ:

"جدید طبیعیات کی روشنی میں کائنات مادی تشریح (Material Representation) کو قبول نہیں کرتی۔ اور اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ اب وہ محض ایک ذہنی تصور (Mental Concept) ہو کر رہ گئی ہے"

The Mysterious Universe (1948) P. 169

جینز کے الفاظ میں:

If the universe is a universe of thought, then its creation must have been an act of thought. (P. 134)

یعنی جب کائنات ایک تصوراتی کائنات ہے تو اس کی تخلیق بھی ایک تصوراتی عمل سے ہونی چاہیے۔ وہ کہتا ہے کہ مادہ کو امواج برق سے تعبیر کرنے کا جدید نظریہ انسانی تخیل کے لیے بالکل ناقابل ادراک ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ لہریں محض امکان کی لہریں (Waves of Probabilities) ہوں جن کا کوئی وجود نہ ہو —— یہ اور اس طرح کے دوسرے وجوہ سے سر جیمز جینز اس نتیجہ تک پہنچا ہے کہ کائنات کی حقیقت مادہ نہیں، بلکہ تصور ہے۔ یہ تصور کہاں واقع ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ایک عظیم کائناتی ریاضی داں کے ذہن میں ہے۔ کیونکہ اس کا ڈھانچہ جو ہمارے علم میں آتا ہے، وہ مکمل طور پر ریاضیاتی ڈھانچہ ہے۔ یہاں میں اس کا ایک اقتباس نقل کروں گا:

"یہ کہنا صحیح ہوگا کہ علم کا دریا پچھلے چند سالوں میں ایک نئے رخ پر مڑا ہے۔ تیس سال پہلے

[1] یہ کتاب پہلی بار ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔

ہم نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ہم ایک ایسی حقیقت کے سامنے ہیں جو اپنی نوعیت میں مشینی (Mechanical) قسم کی ہے۔ ایسا نظر آتا تھا کہ کائنات ایٹموں کے ایک ایسے بے ترتیب انبار پر مشتمل ہے جو اتفاقی طور پر اکٹھا ہو گئے ہیں اور جن کا کام یہ ہے کہ بے مقصد اور اندھی طاقتوں کے عمل کے تحت، جو کوئی شعور نہیں رکھتیں، کچھ زمانے کے لیے ایک بے معنی رقص کریں جس کے ختم ہونے پر محض ایک مردہ کائنات باقی رہ جائے۔ اس خالص میکانکی دنیا میں، مذکورہ بالا اندھی طاقتوں کے عمل کے دوران میں، زندگی محض اتفاق سے وجود میں آگئی۔ کائنات کا ایک بہت ہی چھوٹا گوشہ یا امکان کے طور پر اس طرح کے کئی گوشے کچھ عرصے کے لیے اتفاقی طور پر ذی شعور ہو گئے ہیں اور یہ بھی ایک بے روح دنیا کو چھوڑ کر بالآخر ایک روز ختم ہو جائیں گے۔ آج ایسے قوی دلائل موجود ہیں جو طبیعی سائنس کو یہ ماننے پر مجبور کرتے ہیں کہ علم کا دریا ایک غیر مشینی حقیقت (Non-Mechanical Reality) کی طرف چلا جا رہا ہے۔ کائنات ایک بہت بڑی مشین کے بجائے ایک بہت بڑے خیال Great Thought سے زیادہ مشابہ معلوم ہوتی ہے۔ ذہن (Mind) اتفاقاً محض اجنبی کی حیثیت سے اس مادی دنیا میں وارد نہیں ہو گیا ہے۔ اب ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ رہے ہیں کہ ذہن کا عالم مادی کے خالق اور حکمراں کی حیثیت سے استقبال کریں۔ یہ ذہن بلاشبہ ہمارے شخصی ذہن کی طرح نہیں ہے۔ بلکہ ایک ایسا ذہن ہے جس نے مادی ایٹم سے انسانی دماغ کی تخلیق کی۔ اور یہ سب کچھ ایک اسکیم کی شکل میں پہلے سے اس کے ذہن میں موجود تھا۔۔۔ جدید علم ہم کو مجبور کرتا ہے کہ ہم دنیا کے بارے میں اپنے ان خیالات پر نظر ثانی کریں جو ہم نے جلدی میں قائم کر لیے تھے .... ہم نے دریافت کر لیا ہے کہ کائنات ایک منصوبہ ساز یا حکمراں Designing or Controlling Power کی شہادت دے رہی ہے جو ہمارے شخصی ذہن سے بہت کچھ مشابہ ہے۔ جذبات و احساسات کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس طرز پر سوچنے کے اعتبار سے جس کو ہم ریاضیاتی ذہن کے الفاظ میں ادا کر سکتے ہیں۔"

The Mysterious Universe, 136 — 38

سائنس کے اندر علمی حیثیت سے اس تبدیلی کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ عملی طور پر انکار خدا کے ذہن میں کوئی نمایاں فرق پیدا نہیں ہوا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس انکار خدا کے وکیل نئے نئے ڈھنگ سے اپنے دلائل کو ترتیب دینے لگے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ کوئی علمی دریافت نہیں بلکہ محض تعصب ہے۔ تاریخ بے شمار مثالوں سے بھری ہوئی

ہے کہ حقیقت کے ظاہر ہو جانے کے باوجود انسان نے محض اس لیے اس کو قبول نہیں کیا کہ تعصب اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ یہی تعصب تھا جب چار سو برس پہلے اٹلی کے علماء نے ارسطو کے مقابلے میں گلیلیو کے نظریے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ لینگ ٹاور سے گرنے والے گولے اس کے نظریے کو آنکھوں دیکھی حقیقت بنا چکے تھے۔ پھر یہی تعصب تھا کہ جب انیسویں صدی کے آخر میں برلن کے پروفیسر ماکس پلانک (Max Planck) نے روشنی کے متعلق بعض ایسی تشریحات پیش کیں جو کائنات کے نیوٹنی تصور کو غلط ثابت کر رہی تھیں تو وقت کے ماہرین نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور عرصہ تک اس کا مذاق اڑاتے رہے۔ حالانکہ آج وہ کوانٹم تھیوری کی صورت میں علم طبیعیات کے اہم اصولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اگر کسی کا یہ خیال ہو کہ تعصب دوسرے لوگوں میں تو ہو سکتا ہے، مگر سائنس دانوں میں نہیں ہوتا، تو اس کو میں ایک سائنس داں کا قول یاد دلاؤں گا۔ ڈاکٹر ہلز (A. V. Hills) نے کہا ہے:

> **I should be the last to claim that we, scientific men, are less liable to prejudice than other educated men.**
>
> **Qouted by A. N. Gilkes,**
> **Faith for Modern Man, P. 109**

یعنی میں آخری شخص ہوں گا جو اس بات کا دعوے کرے کہ ہم سائنس داں دوسرے تعلیم یافتہ لوگوں کے مقابلے میں کم تعصب رکھنے والے ہوتے ہیں۔

اب ایک ایسی دنیا میں جہاں تعصب کی کارفرمائی ہو، یہ امید کیسے کی جا سکتی ہے کہ کوئی تصور محض اس لیے قبول کر لیا جائے گا کہ وہ علمی طور پر ثابت ہو گیا ہے۔ تاریخ کا طویل تجربہ ہے کہ انسان کے رہنما اس کے جذبات رہے ہیں، نہ کہ اس کی عقل۔ اگرچہ علمی اور منطقی طور پر عقل ہی کو بلند مقام حاصل ہے۔ مگر زیادہ تر ایسا ہی ہوا ہے کہ عقل خود جذبات کی آلہ کار رہی ہے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ وہ جذبات کو اپنے قابو میں کر سکی ہو۔ عقل نے ہمیشہ جذبات کے حق میں دلائل تراشے ہیں اور اس طرح اپنے جذباتی رویے کو عقلی رویہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتی رہی ہے، خواہ حقیقت واقعہ انسان کا ساتھ نہ دے مگر جذبات سے لپٹا رہنا وہ اپنے لیے ضروری سمجھتا ہے۔ ہم کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارا معاملہ کسی مشین سے نہیں ہے جو بٹن دبانے کے بعد لازماً اس کے مطابق اپنا ردعمل ظاہر کرتی ہو، بلکہ ہمارا مخاطب انسان ہے اور انسان اسی وقت کسی بات کو مانتا ہے جبکہ وہ خود بھی ماننا چاہے۔ اگر وہ خود ماننا نہ چاہتا ہو تو کوئی دلیل محض دلیل ہونے کی حیثیت سے اسے قائل نہیں کر سکتی۔ دلیل کو بٹن کا قائم مقام نہیں بنایا جا سکتا۔ اور بلاشبہ انسانی تاریخ کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔

انسان ۔ بتا تیری قیمت کیا ہے

جناب شہاب ۔ مدراس

امریکہ میں ایک یونیورسٹی کے طلبہ سے وہاں کے آرک بشپ خطاب کر رہے تھے۔ ایک صالح معاشرے کو وجود میں لانے کے لیے "خدا اور مذہب کی ضرورت" مذاکرے کا عنوان تھا۔

ایک ذہین طالب علم اٹھا اور اسس نے سوال کیا۔ جناب! سیکولر ہیومانزم پر میرا یقین ہے۔ میں نوع انسانی کی بھلائی چاہتا ہوں، ہر قسم کی برائیوں سے باز رہتا ہوں۔ کسی کو تکلیف نہیں دیتا۔ دغا نہیں کرتا۔ جھوٹ نہیں بولتا۔ چوری نہیں کرتا۔ دوسروں کی حتی الامکان مدد کرتا ہوں، کمزوروں کی مدد کرتا ہوں۔ مختصراً نیکی مجھے عزیز ہے، اور برائی سے نفرت۔ اچھے کام کرنے، برائی سے روکنے، افراد کو بلند کردار کا حامل بنانے کے لیے، اچھے معاشرے کو وجود میں لانے کے لیے میرا طرز عمل ہی کافی ہے۔ اس کے لیے ایک بلند و برتر خدا پر ایمان لانے کی آخر ضرورت کیا ہے؟

بشپ نے وہاں کے حالات کی مناسبت سے اپنے رنگ میں، خدا کے وجود اور اس پر یقین و ایمان کی ضرورت پر بہت سے دلائل پیش کیے۔ ان میں سے ایک تمثیل آبنائے پناما پر متعین افسر کی روش سے متعلق تھی۔ یہ تمثیل کافی دل چسپ ہے۔ آج کی صحبت میں غور و فکر کے لیے میں نے اسی کا انتخاب کیا ہے۔ جنگ عالمگیر کے دوران حکومت امریکہ نے پابندی لگائی کہ شمال سے آبنائے پناما کے جنوب میں کپاس نہ بھیجا جائے۔ وہاں جنگی سے افسر اور سپاہی متعین کر دیے گئے۔ تاکہ کوئی قانون نہ توڑ سکے۔ جنوبی علاقہ میں کپاس کی آمد یک لخت رک گئی۔ کپاس کی قیمت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ پناما کے دونوں جانب کپاس کی قیمت میں اتنا بڑا فرق دیکھ کر بعض تاجروں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ انھوں نے چوری چھپے کپاس کو دریا کے اس پار لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اگر حکومت کے افسر اور سپاہی رکاوٹ ڈالیں تو انہیں رشوت دے کر خرید لینے کا ارادہ تھا۔ اس پروگرام کے

۔ست تاجروں کی ایک ٹولی کشتیوں میں کپاس لاد کر شمال سے جنوب کی طرف چل پڑی۔ یہ قافلہ چک پوسٹ کے قریب آکر رکا۔ افسر سے معاملہ طے کرنے تاجر اس کے دفتر میں داخل ہوئے۔ ان دنوں چک پوسٹ کا افسر نہایت مخلص اور قانون کا پابند انسان تھا۔ تاجروں نے نگراں افسر سے پہلے منت سماجت کی اور پھر پیش کش شروع ہوئی ان کی کوشش کامیاب ہوتی نہ دکھائی دی تو۔ بولی بڑھنے لگی "ہم پانچ ہزار ڈالر دیں گے" ہمیں جانے کی اجازت دی جائے۔ افسر نے نفی میں سر ہلایا۔ چھ ہزار۔ دس ہزار۔ بیس ہزار۔ چالیس ہزار۔ افسر کی سختی اور انکار پر ہر پانچ دس منٹ کے بعد بولی بڑھ رہی تھی۔ پچاس ہزار ڈالر۔ ساٹھ ہزار ڈالر۔ ایک تاجر آگے بڑھا اور اس نے ایک ہی جست میں ایک لاکھ ڈالر کی بولی لگا دی۔

اتنی بڑی رقم کی پیش کش نے افسر کے جذبات وخیالات میں ایک آگ سی لگا دی اور طوفان مچا دیا۔ وہ زندگی بھر راستی پر قائم تھا۔ قانون کا پابند تھا۔ کیا آج وہ اپنی روش کو بدل دے؟ یہ اس کے ضمیر کی آواز تھی۔ ادھر نفس شیطان زور لگا رہے تھے۔ دیکھ تیری تنخواہ ہی آخر کیا ہے تجھے یہاں کوئی اعلیٰ افسر بھی نہیں دیکھ رہا ہے۔ "ہاں" کہہ دے اور ایک لاکھ ڈالر کا مالک بن جا ابھی نہیں کل یہ پھر آئیں گے مزید کشتیاں کپاس لادے آئیں گی تو اپنی جیب اور اپنی ملکیت کا اندازہ کر۔ تیرے وہم وگمان بھی اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ تیری عمر بھر کی تنخواہ سے کئی گنا بڑھ کر یہ رقمیں چند لمحوں میں تیرے ہاتھ ہوں گی۔ نادان! اس سنہرے موقع کو کہیں گنوا نہ دینا ضمیر اور نفس کی جنگ اس کے اندر ہی اندر جاری تھی۔ اس کی سانس پھول رہی تھی وہ ایک دم دہاڑا۔ ظالمو! تم میری قیمت کے بہت قریب آگئے ہو۔ ان تاجروں کو کمرے سے باہر دھکیل کر اس نے کواڑ بند کر لیے۔

بشپ نے اپنے سیکولر ہیومانسٹ سامع کو بتلایا۔ راست باز اصولوں کے پابند افسر کے الفاظ تھے "تم میری قیمت کے بہت قریب آگئے ہو" چاہے انسان کتنا ہی پاکیزہ فکر وکردار کا حامل ہو۔ کسی نہ کسی حد پر اس کی قیمت لگ ہی جاتی ہے۔ خصوصاً قیمت جب کہ اس کی حیثیت سے زیادہ ہو جائے تو اس کے جذبات میں ہیجان پیدا ہی جاتا ہے اس کا سر چکرانے لگتا ہے۔ اس کے برعکس خدا پر ایمان ویقین کے بعد انسان خدا کی رضا وخوشنودی کو اپنی قیمت بنا لیتا ہے۔ یہ اتنی بڑی قیمت ہوتی ہے کہ خالق کے ماسوا ساری مخلوق جمع ہو کر بھی اتنی بڑی قیمت نہیں ادا کر سکتی۔ خدا پر یقین رکھنے والے انسان کی قیمت لگانے سے مخلوق عاجز ہوتی ہے بندۂ مومن کبھی بک نہیں پاتا۔ کبھی کرپٹ نہیں ہوتا۔ راستی ونیکی پر استقامت اور ثابت قدمی کے لیے مخلوق سے برتر تنہا قدر اعلیٰ اوصاف سے متصف ہستی پر ایمان ویقین ناگزیر ہے۔

اس واقعہ کے سارے پہلو ذہن میں رکھیے اور اس کے پس منظر میں قرآن حکیم کی اس تعلیم پر غور فرمایئے۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ — پس اے نبی صبر کیجیے۔ اللہ کا وعدہ سچا

لَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ — ہے اور بے یقین لوگ آپ کو بے وزن اور

(الروم: ۶۰) — حقیر نہ پائیں۔

رزمگاہ حیات میں حق و باطل اور خیر و شر کی آویزش مسلسل رہی ہے۔ حق اور خیر کی قوتیں جب بھی دو قدم آگے بڑھتی ہیں، شر و باطل کے پرستار بے چین ہو جاتے ہیں، تلملا جاتے ہیں۔ حق کی راہ میں رکاوٹ بننا، اس کو جادۂ حق سے پھیرنے کی کوشش کرنا، سبز باغ دکھا کر حق کو ابھرنے سے روکنا اور مختلف زاویوں سے حق کے داعی کی قیمت لگانا ازل سے تا امروز وقت کے دجالوں کا شیوہ رہا ہے۔ قرآن حکیم اپنے پرشکوہ انداز میں اپنے پیروؤں کو ہدایت کرتا ہے ـــ بالفاظ صاحب تفہیم ـــ

"صبر و سکون اور اللہ کے وعدوں اور اس کی نصرت پر کامل یقین رکھ کر اپنی روش کو اتنا وزن دار بناؤ، اپنی شخصیت کو اتنا اونچا اٹھاؤ کہ باطل تمہاری قیمت ادا کرنے سے خود کو عاجز پائے۔ حق کے دشمن تم کو ایسا کمزور نہ پائیں کہ ان کے شور و غوغا سے تم دب جاؤ یا تم ان کے بہتانوں اور افترا کی مہم سے مرعوب ہو جاؤ، یا ان کی پھبتیوں طعنوں اور تضحیک و استہزاء سے تم پست ہمت ہو جاؤ، یا ان کی دھمکیوں اور طاقت کے مظاہروں اور ظلم و ستم سے ڈر جاؤ، یا ان کے دیے ہوئے لالچوں سے تم پھسل جاؤ یا قومی مفاد کے نام پر اپیلیں تم کو ان سے مصالحت کر لینے پر آمادہ کر دیں۔ اس کے بجائے وہ تم کو اپنے مقصد کے شعور میں اتنا پختہ اور اپنے کیرکٹر میں اتنا مضبوط پائیں کہ نہ کسی خوف سے تمہیں ڈرایا جا سکے نہ کسی قیمت پر تمہیں خریدا جا سکے، نہ کسی فریب سے تم کو پھسلایا جا سکے، نہ کوئی خطرہ، یا نقصان یا تکلیف تمہیں اپنی راہ سے ہٹا سکے اور نہ دین کے معاملے میں کسی لین دین کا سودا تم سے چکایا جا سکے۔ یہ سارا مضمون اللہ تعالیٰ کے کلام بلاغت نظام نے اس ذرا سے فقرے میں سمیٹ لیا ہے۔ یہ بے یقین لوگ تم کو بے وزن نہ پائیں۔"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی، قرآن حکیم کی اس مجمل آیت کی مفصل تفسیر ہے۔ جب آپ نے جزیرۃ العرب کی تاریکیوں میں حق کا چراغ روشن کیا، حق کی دعوت شروع کی تو باطل بوکھلا اٹھا۔ اس نے اپنے ایک قابل اور ہوشیار سردار عتبہ کو اپنا سفیر بنا کر دربار رسالت میں بھیجا کہ کسی طرح آپ کی قیمت لگائے کسی طرح آپ کو دعوت حق

سے روکنے آپ کے ارادوں اور عزائم کو کھوکھلا کر دے۔ کفر و باطل کے ہونہار سفیر عتبہ نے ہر زاویے سے آپ کی قیمت لگانی چاہی۔ کہنے لگا۔ "عزیزم! تم کیوں یہ سب حرکتیں کرتے ہو؟ کیوں ہمارے معبودوں کو نہیں مانتے۔ ان کے بجائے ایک ان دیکھے، ان جانے خدا کے وکیل بنے ہو۔ اگر ان تمام باتوں سے تمہارا مقصد مال و دولت جمع کرنا ہے تو ہم تمہیں تمہاری خواہشوں سے زیادہ مالا مال کر دیں گے۔ اگر تم قریش کے باعزت گھرانے کی حسین و جمیل دوشیزہ چاہتے ہو تو عرب کی حسین ترین دوشیزہ ہم تمہیں فراہم کر دیں گے۔ اگر عزت چاہتے ہو تو ہم اپنا رئیس و سردار مان لیں گے۔ اگر حکومت چاہتے ہو تو عرب کا تمہیں بادشاہ ماننے کو ہم تیار ہیں اور اگر تمہارا یہ سب دھندا خرابیِ دماغ کا نتیجہ ہے تو ہم تمہارے علاج کا بہترین انتظام کر دیں گے"

باطل کے ایلچی کو کیا خبر کہ جس کی قیمت خالقِ کائنات کی خوشنودی و رضا کا حصول ہو وہ اتنے سستے داموں خریدا نہیں جا سکتا۔ حق و صداقت کے مجسم نبیِ خاتم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت نرمی لیکن یقین و وثوق کے ساتھ جواب دیا۔ تمہارا خیال صحیح نہیں ہے۔ مجھے نہ مال و دولت چاہیے نہ کوئی حسین عورت نہ دنیاوی حکومت و عزت نہ میرے دماغ میں کوئی خلل ہے، میں تو خدا کا سیدھا سادا اللہ کا سچا پیغام لے کر آیا ہوں۔ اس میں اس کے ماننے والوں کے لیے بشارت اور انکار کرنے والوں کے لیے تنبیہ ہے۔ میں بھی تم سب کی طرح خدا کا ایک بندہ ہوں، بس اتنی بات ہے کہ مجھ پر اس نے اپنی رحمت سے وحی کے ذریعہ سچائی کو واضح کر دیا ہے۔ میں جانتا ہوں تمام انسانوں کا معبود ایک خدا ہے، اسی سے لو لگانی چاہیے، اسی سے گناہوں کی معافی مانگنی چاہیے۔ جو لوگ شرک کرتے ہیں، خیرات نہیں دیتے، آخرت پر یقین نہیں رکھتے گھاٹے میں ہیں۔ اس کے برخلاف جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں ان کے لیے آخرت میں بڑا اجر ہے۔ عتبہ کی زبان سے لالچ کی بولیاں اور تحریص کے مہرے کارگر ثابت نہ ہوئے تو سرداران قریش نے اس کے ساتھ خوف اور دھمکی بھی شامل کی۔ دوبارہ ابوطالب کے ذریعے انھوں نے داعیِ حق کو خریدنا چاہا۔ ایک طرف لالچ اور طمع کی یہ قیمتیں۔ دوسری طرف جان لینے کی دھمکی تیسری طرف ابوطالب کی محبت بھری زبان سان سب کے ملے جلے سہ آتشے پر سرداران قریش کو یقین تھا کہ وہ اس انسان کو خرید لیں گے۔ اپنے مشفق چچا کی زبانی لالچ اور خوف، اور اپنی روش کی ذمہ داری اور نتائج پر سوچ لینے کا مشورہ سن کر ہادیِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جواب انسانی فضیلت کی تاریخ میں اپنا خاص مقام رکھتا ہے۔ اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند لا کر رکھ دیں تب بھی میں اپنے کام سے باز نہ آؤں گا۔ اور خدا کے کلام میں ایک حرف کی کمی بیشی نہ کروں گا خواہ اس کوشش میں میری جان

جاتی رہے۔ قرآن حکیم کا حکم ہے "صبر کیجیے' بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے' بے یقین لوگ آپ کو بے وزن نہ پائیں" اس مقصد و منشا کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح پورا کیا اس کی ایک جھلک میں نے آپ کی سیرت سے پیش کی۔ ویسے آپ کی ساری ہی زندگی اس آیت کریمہ کی تفسیر ہے۔ تاریخ اس کی بے لاگ شہادت دیتی ہے کہ آپ دنیا پر اسی طرح وزن دار ثابت ہوئے جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے آخری نبی کو بھاری بھرکم دیکھنا چاہتا تھا۔ آپ سے جس نے جس میدان میں زور آزمائی کی اس نے اسی میدان میں مات کھائی۔ آخر اس عظیم شخصیت نے وہ انقلاب برپا کرکے دکھلا دیا جس کو روکنے کے لیے عرب کے کفر و شرک نے اپنی ساری کی ساری طاقت صرف کردی اور اپنے سارے حربے استعمال کر ڈالے۔ حق اور احکام الٰہی کے نفاذ کے لیے رہبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں جو ۲۳ سالہ جد و جہد ہوئی اس کا ہر دن تاریخ نے محفوظ رکھا ہے۔ آپ گہری نظر سے اس کا لفظ لفظ پڑھ جائیے آپ کہیں ایک واقعہ پر بھی انگلی نہیں رکھ سکیں گے۔ جہاں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم بوکھلا گئے ہوں' یا امریکی راست باز کی طرح کہا ہو "ظالمو! تم میری قیمت کے قریب آگئے ہو" (العیاذ باللہ)

انسانی کردار کی دونوں تصویریں آپ کے روبرو ہیں' دونوں راست باز ہیں' دونوں حق کا ساتھ دینے کا عزم کیے ہوئے ہیں۔ پھر بھی دونوں میں کتنا عظیم فرق ہے؟ خدا پرستی انسان کو کتنے بلند مقام تک لیجاتی ہے؟ کتنا اونچا اٹھاتی ہے؟ اس کا اندازہ آپ نے ان دونوں تصاویر کے موازنے سے کرلیا۔ وضاحت کے لیے چلیے خدا پرست انسانوں کی زندگیوں کی مزید چند جھلکیاں دیکھ لیں۔

عراق کی سرزمین ایک پاکیزہ سیرت نوجوان کی صداؤں سے گونج رہی تھی۔ میں ڈوبنے والوں کی پرستش نہیں کرتا' اور نہ ان بتوں کی جن کو خود انسان نے گھڑا ہو' جو نہ سن سکتے ہوں' نہ بول سکتے ہوں۔ میں ہر طرف سے کٹ کر اپنا رخ خالق ارض و سماوات کی طرف کرتا ہوں' میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ اس کی صدا سے کفر و شرک کے ایوانوں میں زلزلے پڑ گئے۔ باطل کے سرداروں کو حیرت تھی' اس نوجوان میں اتنی قوت کہاں سے آگئی کہ وقت کے اقتدار کو چیلنج کر بیٹھا۔ خصوصاً جب وہ اس پہلو سے غور کرتے کہ نوجوان پجاریوں کے خاندان سے ہے۔ نذرانے' تحائف' مفت کے حلوے مانڈے آسانی سے میسر آتے۔ سوسائٹی میں اس کو عزت بھی ملتی' ان سب کو لات مار کر خدائے واحد کا نعرہ لگانے سے اس کو کیا حاصل۔ ان لوگوں کا دماغ اس کی شخصیت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ پہلے تو انھوں نے خاندانی روایات اور ملکی حالات کا حوالہ دیا۔ اس کو

سمجھایا اور پھسلایا کہ وہ اپنے مشن سے باز آجائے لیکن یہ خدا پرست ان کی باتوں میں نہیں آیا۔ ان کے اندازے سے بڑھ کر وزن دار ثابت ہوا تو انھوں نے فیصلہ کرلیا کہ اس کو بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونک دیا جائے۔ باطل کے سرداروں کو یقین تھا کہ وہ اتنی بڑی آزمائش کی تاب نہ لاسکے گا اور وہ اس کو خرید سکیں گے۔ قربان جائیے سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس شانِ عزیمت پر آپ نے صبر و سکون کے ساتھ خود کو اتنا وزن دار بنایا اپنی شخصیت کو اتنا اونچا اٹھایا کہ باطل کی ساری قوت آپ کو خریدنے سے قاصر رہی اور آپ اپنے امتحان سے کامیاب گزر گئے۔ تو دوسری طرف آپ انسانی عظمت کے وہ اَن مٹ نقوش تاریخ عالم پر ثبت کر گئے کہ رہتی دنیا تک حق پرستوں کی ہمت افزائی کے لیے روشنی کا مینار قرار پائے جو انہیں یہ سبق دیتے رہیں گے کہ اگر اخلاص کامل ہو تو پروردگارِ عالم اشیاء کی خاصیت بدل کر داعیِ حق کی امداد کرتا ہے۔

یہ قدیم مصر ہے۔ شاہی محلات کا ایک وسیع کمرہ پُر تکلف سجایا ہوا۔ ایک طرف خدا پرست جوان ہے اس کی ابھرتی ہوئی جوانی اور ابلتا ہوا خون ہے، وہ خریدا ہوا غلام ہے۔ دوسری طرف شیطان، محل کی با اقتدار ملکہ زلیخا کے حسن کا سہارا لیے ہوئے۔ اس حق پرست کی بولی لگا رہا ہے۔ تصور کیجیے۔ جوانیٔ عمر کے تقاضے، دوسری طرف حسن خود سپردگی کے عالم میں، اور اقتدار کا دباؤ سایہ فگن ہے۔ اگر نوجوان "ہاں" کہہ دے نفس کی لذت بھی ہے اور ملکہ کے عنایات و التفات بھی ـــ مگر اس میں خطرہ ہے کہ پیدا کرنے والا ناراض ہوگا اور اخلاقی اقدار پامال ہوں گے۔ اور اگر انکار کرتا ہے تو صرف یہی نہیں کہ انعامات و آرام کی زندگی سے محروم کردیا جائے گا بلکہ الٹا الزامات اور سنگین سزا کا ہدف بھی بنے گا۔ مگر خالق خوش ہوگا اور اخلاقی اقدار بحال ہوں گے۔ ایک منٹ کے تردد کے بغیر صبر اور اللہ پر توکل کیے ہوئے وہ اپنی شخصیت اور کردار کا مظاہرہ کرتا ہے، اپنے خالق کے احکام کی خلاف ورزی مجھ سے نہ ہوسکے گی "میں سارے مظالم سہہ لوں گا مگر" سیدنا یوسف علیہ السلام کا یہ استقلال، یہ صبر و ضبط ڈھونڈھنے سے بھی سیکولر ہیومانزم کے اکابرین میں نہیں مل سکتی

آج سے ۱۴۰۰ سو قبل کا عرب، حق و باطل کی رزمگاہ بنا ہوا ہے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ ہجرت کرچکے ہیں مگر ابھی چند نفوس قدسیہ کا قیام مکہ میں ہے انہیں میں سے ایک صہیب رومی رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ روم سے آکر مکہ میں مقیم ہوگئے تھے۔ زیورات بنانا آپ کا ذریعہ معاش تھا۔ مکہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر اصحاب کے چلے جانے کے بعد کفر کے اس ظلمت کدے میں رہنا آپ کے لیے دوبھر ہوجاتا ہے ہر لمحہ اضطراب بڑھتا ہی جارہا ہے معاشرہ کے مروج اقدار اور ان کے خیالات سے ہم آہنگی کا فقدان مزید سوا!

بنا ہوا ہے اس لیے آپ مکہ سے ہجرت کر جانے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ مکہ کے سردار خبر پا کر آپ کے پاس آتے ہیں کیا تم بھی جا رہے ہو؟ سوال کرتے ہیں ـــ ہاں ـــ "کیوں؟" مجھے یہاں کا ماحول پسند نہیں ہے۔ جہاں پیدا کرنے والے کی بندگی کی اجازت نہ ہو' جہاں شرکت و معصیت کی بھرمار ہو۔ جہاں سے اللہ کے رسول کو نکالا جا چکا ہو' وہاں رہنا میرے لیے ناممکن ہے۔ آپ کے پختہ ارادوں کو دیکھ کر کفر کے قاصد رکاوٹ کی بولی آزماتے ہیں کیا تمہارے پاس زیورات بنوانے کے لیے دیا ہوا سونا اور چاندی نہیں ہیں۔ انہیں لے کر تم کیسے جا سکتے ہو۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ " ہاں میرے ذمے قرض ہے۔ میں اس کا انتظام کر چکا ہوں۔ جس کا جتنا مال ہے وہ آئے اور مجھ سے لے لے۔ میں ادا کرنے کے بعد ہی جاؤں گا۔ ادھر کفر اپنی قیمت اور بڑھاتا ہے۔ ہم اس پر راضی نہیں ہیں' تم غیر عرب ہو۔ روم سے آ کر یہاں بسے تھے۔ یہاں تم نے جو کچھ کمایا ہے وہ سب مال عرب ہی کا ہے۔ تمہیں جانا ہے تو اپنی پوری پونجی اور سرمایہ یہیں چھوڑ کر جانا ہوگا۔ البتہ تم یہاں رہو گے تو یہ سب تمہاری ملکیت ہوگی اور ہم مزید سہولتیں تمہیں فراہم کریں گے۔ ادھر کفر بضد تھا۔ ادھر آپ کے ایمان کا تقاضا تھا کہ ظلمت کدے کو خیر باد کہہ دیا جائے۔ مادی حیثیت سے بے سروسامان ہو کر ایمان کی طرف بڑھا جائے یا مادی وسائل عیش و راحت حاصل کر کے کفر کے معاشرے میں ایمان کو مضمحل کر لیا جائے ـــ یہ دو سوال آپ کے روبرو تھے۔ آپ نے ان حالات میں صبر کیا۔ اللہ پر کامل اعتماد کے ساتھ اپنی عمر بھر کی کمائی مکہ میں چھوڑ کر مدینہ روانہ ہو گئے۔ کفر اس سے بڑھ کر مزید قیمت اور کیا لاتا۔ آپ وزن دار ثابت ہوئے کفر کی طاقت سے بھی زیادہ وزن دار۔ کفر ہکا بکا منہ دیکھتا رہ گیا۔

غزوۂ تبوک سے واپسی پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں تشریف لائے۔ منافقین آپ کی خدمت میں آتے اور غزوے میں عدم شرکت کا عذر پیش کرتے۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ظاہر کو معاف فرماتے تھے اور ان کے باطن کو خدا کے سپرد کر رہے تھے۔ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نہایت مخلص صحابی تھے کاہلی سے آپ بھی شریک غزوہ نہ ہو سکے تھے' اس پر ان کا ضمیر ملامت کر رہا تھا۔ آج مسجد نبوی میں وہ بھی حاضر تھے۔ ان کی باری آئی' نہ عذر پیش کیا اور نہ باتیں بنائیں۔ صاف الفاظ میں اللہ کے رسول سے کہا۔ میں کاہلی کے باعث غزوے میں شریک نہ ہوا' کسی قسم کی مجبوری نہ تھی۔ ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ سارے مومنین کعب بن مالک سے قطع تعلق کر لیں۔ مسلم معاشرے نے کعب بن مالک سے قطع تعلق کر لیا۔ نہ ان سے کوئی بولتا تھا' نہ کوئی ان کی سنتا تھا۔ نظریں تک صحابہ ملاتے نہ تھے۔ آپ کی نظر سے کسی کی نظر مل جاتی تو وہ

اپنی نظریں ان کی طرف سے پھیر لیتا۔ آپ کے سلام کا بھی کوئی جواب نہ دیتا تھا۔ اس کے بعد مزید حکم ہوتا ہے کہ اپنی بیوی کو بھی الگ کر دیں۔ وہ میکے بھیج دی جاتی ہیں۔ اسی حال میں چالیس دن گزر جاتے ہیں۔

ذرا سوچیے! ایک حساس اور صاحب شعور انسان پر یہ تنہائی کس قدر کٹھن معلوم ہوتی ہوگی۔ ایک دن دو دن نہیں مسلسل چالیس دن تک۔ نفس و شیطان کتنے قسم کے خیالات و وسوسے اٹھاتے ہوں گے۔ اور منافقین کس قسم سے بغلیں بجاتے رہے ہوں گے۔ باطل نے سوچا کعب بن مالک یہی سنہرا موقع ہے۔ شاید بائیکاٹ کا چالیسواں دن تھا۔ آپ خدا کے حضور اپنی غلطیوں پر ندامت کے آنسو بہا رہے تھے کہ ایک قاصد آیا۔ شاہ غسان کا خط لایا اور خدمت میں پیش کیا۔ شاہ نے لکھا تھا ــــ ہم سنتے ہیں آپ کے صاحب آپ سے بگڑ گئے ہیں۔ آپ کا بائیکاٹ کر چکے ہیں۔ آپ کے ساتھ یہ تو بڑی رذیل اور نامناسب برتاؤ ہو رہا ہے۔ آپ ہمارے یہاں آجائیں تو ہم آپ کو اپنا مصاحب بنالیں گے۔ انعامات اور اعزازات سے نوازیں گے۔ موقع کی نزاکت کا اندازہ کیجیے سارا معاشرہ مقاطعہ کر چکا ہے حتیٰ کہ بیوی علیحدہ ہو گئی ہے۔ دوسری طرف ایک حکمراں کا خط کتنے میٹھے الفاظ میں آپ کے ہاتھ میں ہے۔ کتنا بھیانک نفس و ضمیر کا ٹکراؤ رہا ہوگا' لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نہ بوکھلائے اور نہ اپنی قیمت سے قریب آنے کا شکوہ کیا۔ بھلا جس کی قیمت خدا اور اس کی رضا ہو اس کی نظر میں شاہ غسان کی عنایتیں کیا جچتیں۔ خط پڑھ کر آپ پورے وقار و سکون کے ساتھ قاصد پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں۔ اس کو ہمہ تن شوق جواب کا منتظر پاتے ہیں۔ پاس ہی انگیٹھی میں آگ سلگ رہی تھی۔ آپ نے خط کو انگیٹھی میں ڈال دیا اور قاصد سے کہا یہی میرا جواب ہے۔ کفر کے قاصد کی آنکھیں حیرت استعجاب سے پھٹی کی پھٹی ہی رہ گئیں۔

اور یہ ہے جمال عبد الناصر کا مصر جہاں عبد القادر عودہ؟ اور ان کے چھ سات رفیقوں کو صدائے حق بلند کرنے کے جرم میں شہید کر دیا جاتا ہے۔ سید رمضان اور سیکڑوں اخوانیوں کو شہر بدر کر دیا جاتا ہے۔ بہتیرے خوش کے نصیب میں قید اور نظر بندی آتی ہے۔ انہیں میں کے ایک بطل جلیل استاد سید قطب ہیں۔ موصوف آج بھی قاہرہ سے کچھ فاصلے پر ایک دیہات میں نظر بند ہیں۔ ہر طرح کی اذیتیں موصوف جھیل رہے ہیں اور بار بار آپ کو حکومت مصر پیش کش کرتی ہے۔ ہم آپ کو وزارت تعلیم کے بلند مقام پر فائز کریں گے۔ اس کے لیے ہماری طرف سے صرف ایک شرط ہے۔ تحریک اسلامی کے تصورات کو چھوڑ کر عرب قوم پرستی کو اپنا لیجیے جواب میں یہ مرد مومن ہر دفعہ اسی طرح کی پیش کش کو ٹھکرا دیتا ہے اور کہتا ہے اسلامی تخیلات کو چھوڑ کر میں زندہ کیسے رہ سکتا ہوں مجھے اسلام

تصورات کی قید و بند والی ہی زندگی پیاری ہے۔ حکومت کے منصب وزارت پر فائز غیر اسلامی زندگی منظور نہیں۔ حکومت معراس عظیم انسان کی قیمت لگانے سے عاجز ہے۔

اور یہ ہے سرزمین پاکستان بھاٹی گیٹ کا میدان۔ ملک کے کونے کونے سے حق کے سپاہی جمع ہوئے ہیں۔ انہیں کسی ایک جگہ سکون سے مل بیٹھنے کی اجازت نہیں ملتی۔ آج اس میدان میں اجتماع ممنوع ہے تو کل وہاں جمع نہیں ہو سکتے۔ رکاوٹوں کے بعد بھی ایک عظیم الشان تنظیم کا فقید المثال اجتماع دیکھ کر باطل حسد سے جل بھن کر پیچ و تاب کھا جاتا ہے۔ دلائل کے میدان میں مات کھا کر، سازشوں کے میدان میں اتر رہا ہے۔ اب یہ اجتماع گاہ میں شراب سے چور بدمستوں کو ہنکالاتا ہے۔ وہ اپنی بدمستی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بک اسٹال سے کتابیں اور قرآن مجید کے نسخے نکال کر چاک کر دیتے ہیں۔ پیروں تلے روندتے ہیں، گالیاں بکتے ہیں۔ اس پر بھی صبر و سکون ضبط و استقلال ہی اہل اجتماع کا شعار نظر آتا ہے۔ لیکن بات اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتی۔ اب تو اجتماع گاہ میں اہلِ حق پر گولیاں چلتی نظر آ رہی ہیں جس کے نتیجے میں اہلِ حق کا ایک سپاہی اللہ بخش شہید ہو جاتا ہے پھر بھی استقلال اور نظم کا یہ عالم کہ یہ اجتماع پورے سکون و وقار کے ساتھ اپنی کارروائی جاری رکھتا ہے۔ حق و باطل کی جب کش مکش ہوتی ہے تو ابتداءً حق کے ساتھی قلیل تعداد میں ہوتے ہیں اور باطل کی کثرت ہوتی ہے لیکن کش مکش کے نتیجے میں حق کی چھپی ہوئی چنگاری جب مشتعل ہوتی ہے تو اس روشنی کے اجالے میں بہت سے افراد پر حق کی تجلی منعکس ہو جاتی ہے۔ یہی حق کی سب سے بڑی فتح ہوتی ہے۔ بھاٹی گیٹ کے میدان میں حق کی فتح بہت نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ دنیا نے دیکھا کہ فوجِ حق کا یہ سپاہی اللہ بخش جام شہادت نوش کرتا ہے۔ تو ۵۰۰ افراد کے دلوں میں حق کی حمایت کے جذبے کو ابھار دیتا ہے۔ اللہ بخش کے دم توڑنے پر باطل نے سمجھا کہ حق کا دیا بجھ گیا لیکن بجھتے ہوئے اس دیا نے ۵۰۰ افراد کو نورِ حق سے منور کر دیا۔ اس طرح سے دائرۂ نور وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ فوجِ حق کا سپہ سالار اپنی اس فتح پر اپنے رب کی اس عنایت پر صبر و سکون کے ساتھ شکر کے کلمات کہتا ہوا اپنی ان خداداد قوتوں کو ساتھ لے کر سبک خرامی کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا اور باطل اپنی آگ میں خود جلتا ہی رہا۔

کیا ہی کیاریوں سے چنے ہوئے پھولوں کا یہ گلدستہ میں نے آپ کے روبرو پیش کیا ہے۔ اس کے ہر پھول پر غور کیجیے تو خداوند کی اس کائنات پر قادر و متکفل ہونے کا یقین پیدا ہوتا ہے۔ ہر لمحہ اس کے علیم و بصیر ہونے کا احساس اور اس کی تربیت کا اس یقین کا شعور کہ خدا کا پیغام اور اس کے وعدے لاریب سچے اور برحق ہیں

ہم حق کا ساتھ دیں گے تو وہ اپنی طاقتوں کے ساتھ ہماری پشت پناہی کرے گا اور ہماری مخالفت میں ساری مخلوق بھی ایکا کرے تو ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکے گی لیکن خدانخواستہ اگر ہم حق سے بے وفائی کر جائیں، راستی سے منہ موڑ لیں خالق کائنات کی گرفت سے ساری مخلوق مل کر بھی نہیں بچا سکتی۔ اس نظریے کے انسان کے دل و دماغ میں رچ بس جانے کا نام خدا پرستی ہے۔ اسی یقین کی بدولت صبر و سکون نصیب ہوتا ہے۔ قرآن حکیم کے مطلوبہ معیار تک انسان خود کو اونچا اٹھا سکتا ہے۔ خدا پرستی کے اس تقاضے کو ذہن نشین کر لینے کے بعد آئیے۔ ذرا ہم اپنے معاشرے کا جائزہ لیں۔ ہم بھی خدا پرستی کا دعویٰ کرتے ہیں مگر کیا ہمارا برتاؤ ہمارا طرز زندگی ان حق پرستوں کے نمونہ زندگی سے کچھ میل کھاتا ہے۔ کیا ہم بھی باطل کی نگاہ میں اتنے ہی وزن دار ہیں؟ کیا آج بھی باطل ہمیں دیکھ کر چیں بجبیں ہوتا دکھائی دیتا ہے؟ نہیں آج تو کفر و شرک ہم کو اتنا خفیف اور حقیر پاتا ہے کہ کسی بھی جگہ اسے اپنی بولی اور قیمت بڑھانے کی ضرورت ہی نہیں پیش آتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ معمولی معمولی قیمت پر، چند سکوں پر خدا پرستی کے دعوے لوگ بھول جاتے ہیں اور بک جاتے ہیں۔ زر پرستی مادہ پرستی نے اس قدر غلبہ پا لیا ہے کہ ہمارے ذہن و دماغ پر خدا اور رسول کے وعدوں کا کوئی وزن ہی محسوس نہیں ہوتا۔ ایک ذرا سا فائدے کی امید پر حق کا ساتھ چھوڑنے کو ہم تیار ہو جاتے ہیں۔

سامنے مسجد ہے۔ قد قامت الصلوٰۃ کی آواز آتی ہے۔ ادھر مقالہ سنایا جاتا ہے۔ مسائل پر بحث جاری ہے اپنے زعم میں ہم دین کی خدمت کر رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہوتی ہے کہ واہ واہ کے چند جملوں سے ہمیں راہ حق سے ہٹانے میں باطل کامیاب ہو جاتا ہے۔ کتنا مضمحل اور ناتواں ہے ہمارا ایمان؟

نفس و شیطان سستی و کاہلی کے ہزار حربے لیکر بڑھتے ہیں ہم کہیں ان کا مقابلہ نہیں کرتے بلکہ الٹا۔ اہلاً وسہلاً یا حبیبی کہہ کر انہیں گلے لگا لیتے ہیں اور پھر وہ جس طرف موڑنا چاہتے ہم بآسانی اس طرف مڑ جاتے ہیں۔ ہم قرآن حکیم میں پڑھتے ہیں۔ اسراف نہ کرو۔ اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔

ہمارے گھر رسم ہوتی ہے شادی بیاہ کی، بسم اللہ خوانی کی، نام رکھائی کی، ضمیر کہیں اللہ تعالیٰ کی آیت یاد دلاتا ہے، اللہ کے احکام کی پیروی پر متوجہ کرتا ہے۔ باطل، خاندان کے رواج، علاج اور خاندان کی ناک رکھ لینے کی بولی لے کر آگے بڑھتا ہے۔ ہم میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ پلٹ کر اس سے پوچھتے۔ بھئی وہ ناک ہی کیا جو معاشرے کے تعفن کو نہ سونگھ سکے۔ خوشبو و بدبو میں تمیز نہ کر سکے۔ ایسی ناک کو تو کٹ جانا چاہیے اس کے برعکس ہماری ساری قوتیں اس بے مقصد اور بے کار ناک کی حفاظت میں صرف ہوتی ہیں۔ کتنی آسانی سے

باطل ہم کو خرید لیتا ہے؟ باطل اقتدار کی ناراضی سے ہمیں ڈراتا ہے۔ قومی دھارے میں ضم ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔ ہم اس پر ایک تنقیدی نظر بھی ڈالنا گوارا نہیں کرتے اور دوڑ کر اپنے پرسنل لا' وقف ایکٹ کو لاکر نیشنلزم کے استھان پر بھینٹ چڑھانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ ہمارے راہنما تو گالیوں اور گولیوں کی کڑک چمک سے کبھی نہ گھبرائے اور کبھی بھی صبر و سکون نظم و ضبط کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ جادۂ حق سے نہ مڑے۔ ادھر ہماری کمزوری اور بے صبری کا یہ عالم کہ کسی جانب سے خلاف مزاج ایک لفظ کا سن لینا ہمارے چراغ پا ہونے کے لیے کافی ہے۔ کتنی آسانی سے ہمیں حق کے میدان سے اچک لے جاتا ہے۔ ذرا موازنہ فرمایا جائے کہ اس قسم کی بے جان بودی خدا پرستی اور سیکولر ہیومانزم کے درمیان فرق ہی کیا رہ جاتا ہے۔ دونوں کی قیمت یکساں سے لگ جاتی ہے۔

کیا اس ماحول کو ان حالات کو اسی طرح رہنا چاہیے۔

یاد رکھیے یہ زندگی جو ہمیں عطا ہوئی ہے بہت ہی مختصر اور نہایت قیمتی ہے۔ اس کا مصرف یہ نہیں ہے کہ آپ کسی کی تقریر یا مقالہ سن کر واہ واہ کی صدا سے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیں یا کسی شاعر کی غزل پر جھوم جائیں۔ یا کسی کے خیال کی پرواز پر سر دھننے لگ جائیں' یا کسی ڈرامے کے تماشہ بین بنے رہیں اور اس کے کردار پر تنقید کرنے میں مصروف ہو جائیں۔ نہیں نہیں۔ زندگی کا یہ مصرف ہرگز نہیں بلکہ حق و باطل کے ڈرامے جو آج زمین کے اس خطہ پر کھیلے جا رہے ہیں۔ اس میں آپ حق کا کردار ادا کر رہے ہیں اور آپ پر فرض ہے کہ آپ اپنے ہادی اعظم کی ہدایات کے مطابق اخلاص کے ساتھ حق کا پارٹ ادا کریں۔ انسانی دماغ کے تراشے ہوئے نظریات و تخیلات کی حکمرانی کے خلاف حق کی راہ میں آپ اہل حق سے منسوب ہیں جن کے تصورات کی حکمرانی کو وجود میں لانے کے لیے سکون و راحت کی تمنا کیے بغیر مسلسل جد و جہد آپ پر لازم۔ ویسے بھی زمین کی اس زندگی میں دوڑ دھوپ کرنے سے آرام و سکون کس کو میسر ہے؟ ہمیں تو فکر آخرت کی کرنی چاہیے اور ہماری ساری کوششوں کا سارا زور جنت میں پوشیدہ راحت و سکون کے حصول کے لیے صرف ہونا چاہیے۔ ہم دامن کوہ میں کھڑے ہیں اور جنت پہاڑ کی چوٹی پر ہے۔ دامن کوہ آرام و سکون کی جگہ تو نہیں ہے؟ تو پھر کیوں نہ ہم ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پہاڑ پر چڑھنے کی تیاری کرتے۔ ہمیں تو آگے ہی بڑھتا رہنا ہے۔ راہ میں الحاد کے طوفان آئیں گے کفر و شرک کی گھن گرج کے ساتھ کالے کالے بادل منڈلائیں گے۔ نفاق کے کوندے بھی جا بجا ہمارا استقبال کریں گے۔ خدا اور رسول کی عطا کی ہوئی روشنی میں ان سب دشمنوں سے بچ کر اپنی راہ پر گامزن رہنا ہے۔ قرآن حکیم آپ کو آواز دیتا ہے فاصبر

إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۔ صبر کرو۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے جو لوگ یقین نہیں رکھتے وہ تمہیں بے وزن نہ پائیں۔ یہ قرآن عظیم کی پکار ہے۔ اس کی پکار پر لبیک ہمیں ہی کہنا ہے۔ ہمیں اپنے تمام اعمال کو قرآن و حدیث کے پیمانوں سے ناپنا چاہیے۔ فکر کی تطہیر اور کردار کی تعمیر سے نفس و باطل کی شرارت لالچ اور دھمکیوں پر صبر و سکون کے ساتھ اللہ کے وعدوں پر کامل یقین رکھ کر ہم اپنی خودی کو اتنا بلند اٹھا لے جائیں اتنا وزن دار بنائیں کہ باطل مات کھا جائے۔ یہ سوال شعلے کی طرح ہم سب کی نگاہوں کے سامنے لہرا رہا ہے کہ

آج کفر و شرک کے پیمانوں میں
نفاق کی میزانوں میں
الحاد کے ایوانوں میں
باطل کے بازاروں میں
اے انسان! بتا تیری قیمت کیا ہے؟

آخرت کے حریف عقائد

(قسط ۴)

(جناب سلطان مبین صاحب ایم اے سنسکرت)

پتری لوک اور پتری پوجا (عالم اجداد و اجداد پرستی) سے عقیدۂ تناسخ کی تردید

انسان نے جس طرح سورج آگ آندھی پانی سے رعب کھا کر، وہم میں پڑ کر ان کی پرستش کی ہے ٹھیک اس کے متوازی مرے ہوئے رشتہ داروں کو خواب میں دیکھ کر ان سے باتیں کر کے مردہ پرستی کا ارتکاب کیا ہے۔ وید انسان کی ان دونوں غلطیوں کی مستند شہادت ہیں ہر چند کہ پتروں کی ستائش میں دو چار ہی ترانے ویدوں میں ملتے ہیں مگر "بزرگ پرستی" کے دین نے دیوتا پرستی کے روبرو اپنا پورا پورا حصہ وصول کیا ہے۔ دیوتاؤں کی نذر کے لیے اگر پورب کی طرف آگ روشن کی جاتی ہے تو پتروں کے لیے دکھن کی طرف آگ جلائی جاتی ہے۔ دیوتاؤں کے لیے "سوا ہا! سوا ہا" کہا جاتا ہے تو پتروں کے لیے سودھا سودھا کہا جاتا ہے۔ اگر رگ وید دیوتاؤں کی طرف منسوب کریں تو سام وید کو پتروں کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ غرضیکہ دیوتا پوجا اور پتری پوجا دونوں ویدک مذہب کی تعمیر و تشکیل میں برابر شریک و سہیم ہیں۔ ویدک رشیوں کے ذہن میں سورگ یا نرک کا اگر تھوڑا بہت شعور تھا تو اس کو اسی پتری پوجا نے غارت کر دیا ہے کیونکہ نذر و نیاز نے پتروں کے کھانے پینے کا مسئلہ بالکل حل کر دیا گیا ہے۔ "یم" داروغہ مردگان کو بھی نذر کی رشوت دینے کا التزام کیا گیا ہے۔ پس سزا و جزا کے تصور کو اس نذر و نذرانہ نے یک لخت تباہ کر دیا۔

رگ وید کے ترانوں میں رشیوں نے اپنے نام یا اپنے خاندانی نام کا جابجا ذکر کیا ہے اور اسی وجہ سے رگ وید کے سات ([illegible] گرتسمد، وشوامتر، بام دیو، اتری، بھردواج، وسشٹھ اور کنو کی طرف منسوب ہیں [illegible] بزرگوں سے حفاظت، اولاد، دھن و دولت کی درخواست

تی ہے۔ یہ لوگ انسان کی غلطیوں کی معافی کے بھی مختار ہیں۔ پتر لوگ مختلف گریڈ کے ہیں۔ یہ لوگ دیوتاؤں کے ہم نشین و رفیق سفر ہیں۔ یہ لوگ یم راج داندر کے ساتھ زمین پر تشریف لا کر نذر و نیاز کھاتے پیتے ہیں جیسا کہ رگ وید کے منتروں سے ظاہر ہے: رگ وید: ۱۰: ۱۵: ۱۔۔۔ ۲، ۵

(۱) سوم کے شوقین اعلیٰ ادنیٰ اور اوسط پتر (اجداد) اٹھیں اٹھیں جو زندہ جاوید ہیں۔ یہ بے ضرر ت دان، اجداد تقریبوں میں ہماری حفاظت کریں۔ (۲) پتروں (اجداد) کے لیے ۔ جو متقدمین ہیں، جو متاخرین یا جو آسمان میں جاگزیں ہیں یا جو ملا ء اعلیٰ میں ہیں۔ یہ نمسکار آج مقبول ہو۔ (۵) پیاری پیاری دکھی ہوئی کش گھاس پر سوم کے شوقین پتر (اجداد) بلائے جا رہے ہیں۔ وے یہاں کہیں اور نہیں۔ وے ہماری حفاظت کریں ۶) جنوب کی طرف گھٹنا ٹیک کر بیٹھ کر سب اس یگیہ کو قبول کریں۔ اے بزرگو! جو گناہ ہم نے آدمی ہونے کی وجہ سے کیا ہے ان کے سبب سے ہم کو مت ستائیے۔ (۸) سوم کے بزرگ ہمارے قدیم بزرگ، بزم سوم میں (یم کے) پس رو وسشٹھ ان کا ساتھ دیتے ہوئے (نذر کا مشتاق) یم راج مشتاقین کے ساتھ سیر ہو کر چڑھاوا کھاوے۔ (۱۰) جو حق (ہیں) نذر کھانے والے (ہیں) اندرا ور دیوتاؤں کے ساتھ ہم نشینی سے بہرہ ور ہیں۔ ان دھوپ میں بیٹھنے والے، دیوتاؤں کی ستائش کرنے والے، دور دراز کے پتروں (اجداد) کے ساتھ۔ اے اگنی! آجا (۱۱) آگ کے ذریعہ کھائے ہوئے پتر (اجداد) یہاں آجائیں۔ اچھی رہبری میں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جاویں ۔ کش گھاس پر لگائے ہوئے چڑھاویں کو کھاویں اور دولت اور بہادر لڑکے دیں۔ (۱۳) جو پتر (اجداد) یہاں ہیں اور جو یہاں نہیں ہیں، جن کو ہم جانتے ہیں اور جن کو ہم نہیں جانتے۔ اے جات وید اگنی! وے جتنے ہیں۔ تو جانتا ہے۔ اچھی طرح ترتیب دیے ہوئے یگیہ سے مبارک بادیوں (سودھا) کے ساتھ لطف اندوز ہوں (۱۴) جو پتر آگ سے جلائے گئے ہیں اور جو آگ سے نہیں جلائے گئے ہیں۔ سمار وسطیٰ میں جو "سودھا" سے لطف اندوز ہوتے ہیں مالک! (سوراٹ بادشاہ یم) ان پتروں کے ساتھ اس روح کی رہبری کے لیے بااختیار جسم بخش دے۔ رگ وید ۱۰: ۱۵: ۱۴ دیگر) جو گاڑے گئے ہیں جو دور پھینکے گئے ہیں۔ جو اونچائی پر رکھ دیے گئے ہیں ۔ ان سب پتروں کو ۔ اے اگنی! نذر کھانے کے لیے آ۔ اتھروید: ۱۸: ۲: ۳۴ ۔ (۱۵) کنو ککشی وان، پرومیڈ اگستیہ، شیاواشو، سوبھری، ارچ نانا، وشوامتر، یہ جمدگنی، اتری کشیپ، وام دیو، ہماری حفاظت کریں ساتھ: دیو ۱۸: ۳: ۱۵ (۱۶) وشوامتر! جمدگنی! بھردواج! گوتم! بام دیو! نمسکاروں کی وجہ سے اتری نے ہماری تائید

لہ یگیہ میں زنار پوش دیوتا دایاں گھٹنا موڑ کر بیٹھتے ہیں جب کہ پتر لوگ بشمول بزرگ بایاں گھٹنا موڑ کر بیٹھتے ہیں۔ شت پتھ: ۲: ۴: ۲: ۱، ۴

کی ہے۔ قابلِ ستائش پتر (بزرگ) ہم پر رحم فرمادیں۔ اتھروید: ۱۸: ۳: ۱۶

فی الجملہ وشوامتر، جمدگنی، بھردواج، گوتم وغیرہ بزرگ اور جلائے وغیر جلائے ہوئے مردے گرہستوں کے گھر آکر نذر و نیاز کھاتے پیتے ہیں اور صاحب نذر کو مال و دولت اور آل اولاد سے نوازتے ہیں۔ ذیل کے حوالے سے یہ بات واضح ہوگی کہ یہاں کی نذر وہاں پتروں کو کن کن شکل میں ملتی ہے۔ ناظرین یہ بات بھی مدنظر رکھیں کہ یہ جملہ شہادتیں ویدک ادب (منتر برہمن اور سوتر) سے لی گئی ہیں۔ پرانوں کے شواہد کہیں آگے چل کر نقل کیے جائیں گے۔

اتھروید: ۱۸: ۴: ۲۶ (۲۶) نیاز (سودھا) والے تل سے ملے ہوئے۔ جن دانوں کو تیرے (مردہ) کے لیے بکھیرتا ہوں۔ وے تیرے لیے ترقی اور توانائی کے لیے ہوں۔ یم راج ان کو تیرے لیے ابدیت زاہدہ کے واسطے منظور کریں۔ (۳۲) دانے تل ہوگئے، تل گائے کا بچھڑا ہوگیا۔ وہ اس (گائے) کے سہارے یم کی مملکت میں ابد تک زندہ رہتا ہے۔ (۳۳) تیری یہ گائیں مرادوں کا دودھ دیں۔ تل کے بچھڑے والی چتلی، سفید، یک رنگی اور بہت رنگوں والی گائیں تیرے پاس کھڑی ہیں۔ (۳۴) ہرے دانے سفید و چتلی گائیں ہوجائیں اور سیاہ دانے تیری سرخ (لوہی) گائے بن جائیں۔ تل کے بچھڑے والی گائیں ہمیشہ اس کو قوت کا دودھ دیں اور دودھ نہ توڑیں (۳۵) میں آگ میں چڑھاوا ہون کر رہا ہوں۔ یہ (چڑھاوا) سودھا روالا ہزار چشمہ ہے۔ یہ سیل رواں باپ دادوں کو آسودہ کرتا ہے اور پر دادوں کو آسودہ کرتا ہے۔ (۳۶) پانی کی سطح تک پھیلے ہوئے لازوال، قوت دینے والے، نہ سوکھنے والے سو نہروں اور ہزار نہروں والے (نذر کے) چشمہ کے کنارے پتر (اجداد) سودھا (نیاز) (کے سبب) سے تشریف رکھتے ہیں۔ (۳۷) پانی کی سطح تک پھیلے ہوئے لازوال، قوت دینے والے، نہ سوکھنے والے سو نہروں اور ہزار نہروں والے (نذر کے) چشمہ کے کنارے پتر (اجداد) سودھا (نیاز) (کے سبب) سے تشریف رکھتے ہیں۔ (۳۷) یہ لکڑی کا انبار جس کو چتا کے لیے چنا گیا ہے اس کو (مرے ہوئے) رشتہ دار زیر نظر رکھیں۔ یہ (مردہ) فنا سے بقا کی طرف جارہا ہے۔ جتنے (مرے ہوئے) بھائی بند ہیں ان (مردہ) کے لیے گھروں کی تعمیر کریں۔ (۴۲) میں تیرے (مردہ) کے لیے جو میٹھا، جو بھات، جو حلیہ نذر گزار رہا ہوں، وہ سب تیرے لیے سودھا (نذر، غذا) سے لبریز، پر شہد اور روغن بیز ہوجائیں۔ (۴۳) نیاز (سودھا) والے تل سے ملے ہوئے، جن دانوں کو تیرے (مردہ) کے لیے بکھیرتا ہوں وہ تیری ترقی اور توانائی کے لیے ہوں۔ یم راجہ تیرے لیے (اس کو) منظور کریں۔[1]

[1] یہ منتر [illegible] اتھروید [illegible] ۱۸: ۴: ۴۳ میں برائے نام کمی بیشی کے ساتھ۔

نذر (چڑھاوا) پتروں کی توانائی و سیری کا موجب ہوتی ہیں۔ ذیل میں "تلاوت" ـ دیوتاؤں اور پتروں کے
ہیں دودھ، شہد اور گھی کی نہریں بن جاتی ہیں کے حوالے دیے جا رہے ہیں۔

(۴) جو رگ وید کے منتر ہیں وہ دیوتاؤں کے لیے دودھ کی آہوتیاں :۱۱:۵:۶:۴ ـ ۸
ہوتی ـ ایک مرتبہ آگ میں ڈالا ہوا گھی (دعوت کا ایک پلیٹ) ہیں۔ جو اس طرح جانتا ہوا روز بروز رگ وید
روت کرتا ہے وہ دیوتاؤں کو دودھ کی نذر سے آسودہ کرتا ہے۔ وے آسودہ ہو کر اس شخص کو ـ خیر و عافیت
ندگی، جوانی، پوری جان، سب ثوابوں، دولتوں سے ـ آسودہ رکھتے ہیں۔ گھی کی نہر، شہد کی نہر کی نذر (سودھا)
و پتروں تک پہنچاتے ہیں۔ (۵) جو یجر وید کے منتر ہیں وہ دیوتاؤں کے لیے گھی کی آہوتیاں (چڑھاوے) ہیں
اس طرح جانتا ہوا روز بروز یجر وید کی تلاوت کرتا ہے۔ وہ دیوتاؤں کو گھی کی نذر سے آسودہ کرتا ہے۔ وے
سودہ ہو کر اس شخص کو ـ خیر و عافیت زندگی، جوانی، پوری جان، سب ثوابوں، دولتوں سے آسودہ رکھتے
یں۔ گھی کی نہر کی۔ شہد کی نہر کی ـ نذر کو پتروں تک پہنچاتے ہیں۔ (۶) جو سام وید کے منتر ہیں وہ دیوتاؤں
کے لیے سوم کی آہوتیاں (چڑھاوے) ہیں۔ جو اس طرح جانتا ہو روز بروز سام وید کی تلاوت کرتا ہے وہ دیوتاؤں
کو سوم کی نذر سے آسودہ کرتا ہے۔ وے آسودہ ہو کر اس شخص کو۔ خیر و عافیت، زندگی، جوانی، پوری جان،
سب ثوابوں سے دولتوں سے ـ آسودہ کرتے ہیں۔ گھی کی نہر کی، شہد کی نہر کی ـ نذر ـ کو پتروں تک پہنچاتے
ہیں۔ (۷) جو اتھر وید کے منتر ہیں وہ دیوتاؤں کے لیے چربی کی آہوتیاں (چڑھاوے) ہیں۔ جو اس طرح جانتا ہوا
روز بروز اتھر وید کی تلاوت کرتا ہے وہ دیوتاؤں کو چربی کی نذر سے آسودہ کرتا ہے۔ وے آسودہ ہو کر اس
شخص کو خیر و عافیت زندگی، جوانی، پوری جان، سب ثوابوں اور دولتوں سے آسودہ رکھتے ہیں۔ گھی کی نہر کی
نذر کو۔ پتروں تک پہنچاتے ہیں۔ (۸) جو احکام، علوم، مکالمے، اتہاس، پوران، گاتھا، مناقب ہیں وہ دیوتاؤں
کے لیے شہد کی نہریں ہیں۔ اس طرح جانتا ہوا روز بروز جو احکام، علوم، مکالمے، اتہاس، پوران، گاتھا، مناقب کی
تلاوت کرتا ہے وہ دیوتاؤں کو شہد کی نذر سے آسودہ رکھتا ہے۔ وے آسودہ ہو کر اس شخص کو خیر و عافیت،
زندگی، جوانی، پوری جان، سب ثوابوں، دولتوں سے آسودہ رکھتے ہیں۔ گھی کی نہر کی۔ شہد کی نہر کی۔ نذر کو پتروں
تک پہنچاتے ہیں۔ شت پتھ برہمن: ۱۱:۵:۶:۴ ـ ۸ وغیرہ

○ اگر رگ وید کی تلاوت کرتا ہے تو سودھا (غذا) کے لیے دودھ کی نہریں اس کے پتروں (اجداد) کے پاس بہتی
ہیں۔ اگر یجر وید تو گھی کی نہر، اگر سام وید تو شہد کی نہر۔ اگر اتھر وید تو سوم کی نہر۔ اگر برہمن گرنتھ کلپ (یگیہ کے

ضوابط و قواعد) کا تھا، مناقب، اتہاس، پران تو امرت کی نہر ـــ آشولاین گرہ سوتر: ۳:۳:۲-۱ وغیرہ
(۲) نشترچی، مادھیم، گرتسمد وشوامتر، وام دیو، اتری، بھردواج، بشسٹھ..... (ہماری تلاوت سے) آسودہ
ہوں۔ آشولاین گرہ سوتر: ۳:۴:۲ (۴) سومنتو، جےمنی، ویشم پاین، پیل، سوتر بھاشیہ، بھارت، مہا بھارت، دھرم
آچاریہ، جانتی، باہوی، گارگیہ، گوتم، شاکلیہ، وابھریہ، مانڈویہ، گرگیو، بڈوا پراتی تے ای۔ سو بھامیترے ای، کہو با
کوشی تک، مہاکوشی تک، پینگیہ، سوگیہ، سانکھاین، ایترے، مہا ایترے، شاکل، واشکل، سوجات وکتر، اودواہی،
مہودواہی، سوجامی، شونک، آشولاین، گرگیو، بڈوا پراتی ہیں وہ سب آسودہ ہیں۔ آشولاین گرہ سوتر: ۳:۴:۴

پتری لوک اور پتری پوجا کے مبحث کو ختم کرنے کے لیے ذیل میں پرانک حوالہ جات دیے جا رہے ہیں
ورثاء ـــ متوفی سے محبت کی وجہ سے ـــ اس کے ترکہ کو بے خوف و خطر امن و چین سے بھوگنے کے لیے متوفی کا کریا
کرم نہایت التزام و پابندی سے کرتے تھے۔ بسا اوقات استحقاق کے ثبوت کے لیے ورثاء میں "کام کرنے" کے لیے
مسابقت ہوتی تھی۔ چنانچہ روز بروز کی دیوتاؤں کی پوجا کی طرف سے بے پروائی کے باوجود مردوں کی نذر و نیاز "
زر و دھن و گھاٹ" کی تقریب دلچسپی اور توجہ سے پوری کی جاتی تھی اور یہ مذہب کا بہت بڑا المیہ ہوا کہ انسان خدا سے
ڈرنے کے بجائے مردوں، بھوت، پرتیوں سے ڈرنے لگا۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ ایسے قصص وضع کیے گئے جس سے
دیوتاؤں پر رشیوں کی افضلیت مترشح ہوتی ہے۔ بس کیا تھا پتروں کی نذر "شرادھ" کے مخصوص آداب و اہتمام کی ایک
فہرست تیار ہو گئی۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ حرکت "چراغی " بزرگوں نے جان بوجھ کر کیا یا شدہ شدہ بات بگڑتی چلی
گئی۔ بہرحال دیوتاؤں کی پوجا کی طرح " پتری پوجا" بھی ہندو مذہب کا ایک عنصر ہو گیا۔ آج تک آواگون کا نقارخانہ
پتروں کی طوطی کی آواز کو نہ دبا سکا اور ہم واضح طور پر کنوار کے اندھیرے پاکھ میں پتروں کو مانی دینے، نذر چڑھانے
اور ان کی رخصتی کی تقریبوں کو دیکھ پا رہے ہیں جو زبانِ حال سے تناسخ کی تکذیب کر رہے ہیں۔ دوسرے خداوندوں
نے کلینڈر کے ایک آدھ دن کا حصہ پایا ہے۔ کسی کو پھاگن کی پورن ماسی دی گئی ہے۔ کسی کو کنوار کی دشمی ملی ہے
کوئی چیت کی رام نومی کا حق دار ہے۔ مگر پتروں کو مسلسل کنوار کے شروع کے دو ہفتے ملے ہیں۔ کیا یہ بات ہمارے
دعوے کی سب سے بڑی دلیل نہیں ہے کہ پتروں کا مرتبہ خداوندوں سے بڑھ گیا تھا۔ اس بات کو علم ادیان کا
ایک عجوبہ شمار کرنا چاہیے کہ ایک امت سال بہ سال پندرہ پندرہ دن تک بزرگوں کے لیے نذر و نیاز چڑھاتی ہے
اور ان کی صحبت میں رہنے کی مدعی بھی ہے اور پھر وہی تناسخ کی پرزور وکالت بھی کرتی ہے۔

شرادھ، تن اور بھکشت برہمنوں کی تخصیص ہے۔ سوتراد ب (تن دنب) بڑی حد تک برہمنوں کی طلالت سے بچنے کے لیے وجود پذیر ہوئے

بزرگوں کی نذر و نیاز کے پورانک حوالہ جات

مہابھارت: انوشاسن: ۸۷: ۳ – ۱۹ (۳) اے راجہ! مردوں (بزرگوں یا پتروں) کی نذر کے پاکیزہ طریقہ کو توجہ سے سنو۔
اے دشمن کش (راجہ)! مردوں کی نذر دولت دینے والی اور لڑکا نصیب والی ہے۔ (۴) پتر حضرات دیوتاؤں، اسروں،
انسانوں، گندھرووں، ناگوں، راکششوں اور پشاچوں کے خداوند ہیں۔ (۵) لوگ پہلے بزرگوں (پتروں) کو پوج کر
دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہیں اس لیے انسان ہمیشہ ہر طریقے سے ان پتروں کو پوجے۔ (۶) مہاراج! پتروں کی نذر شرادھ
کہلاتی ہے۔ اس لیے خاص طور سے اس طریقے کو مرتب کیا گیا ہے۔ (۷) شرادھ کرنے سے دادا پردادا خوش
رہتے ہیں۔ میں تجھ سے تاریخ وار زندگی گزارنے کی اچھائی و برائی بتاؤں گا۔ (۸) جن جن تاریخوں میں دی
ہوئی نذر سے جو جو ثواب ملتا ہے۔ اے بے گناہ! (راجہ!) اس سب کو میں ٹھیک ٹھیک کہوں گا، وہ مجھ سے
سنو۔ (۹) پہلی تاریخ کو پتروں کی پوجا کرنے سے انسان اچھے گھر میں مقبول صورت، بچے جننے والی، قابل دید،
کثیر الولد عورتیں پاتا ہے۔ (۱۰) دوسری تاریخ کو (پتروں کی پوجا) کرنے سے عورتیں صاحب اولاد ہوتی ہیں
تیسری تاریخ کو (پتروں کی پوجا کرنے سے) گھوڑے ملتے ہیں اور چوتھی تاریخ کو (پتروں کی پوجا کرنے سے) گھر
میں بھیڑ بکریوں کی کثرت ہو جاتی ہے۔ (۱۱) پانچویں تاریخ کو (پتروں کی) پوجا کرنے سے پوجا کرنے والے کے یہاں
بہت سے لڑکے پیدا ہوتے ہیں اے راجہ! (۱۲) چھٹی تاریخ کو (پوجا) کرنے والے انسان روشنی پاتے ہیں۔
ساتویں کو "شرادھ" کرنے والا شخص کھیتی کا مالک ہوتا ہے۔ (۱۳) نویں کا شرادھ کرنے والے شخص کے گھوڑوں اور
خچروں میں بڑھتی ہوتی ہے اور دسویں کو شرادھ کرنے والے کی گائیں بڑھتی ہیں۔ (۱۴) گیارھویں کو شرادھ کرنے والا دولت
کا مالک ہوتا ہے۔ اس کے گھر میں نورانی لڑکے پیدا ہوتے ہیں۔ (۱۵) بارھویں کو شرادھ کرنے والے کے یہاں ہمیشہ
اچھی چاندی، سونا اور بڑی دولت دیکھی جاتی ہے۔ (۱۶) تیرھویں کو شرادھ کرنے والا برادری میں بڑا ہو جاتا ہے، اس
کے گھر کے جوان لوگ بزرگ مانے جاتے ہیں۔ (۱۷) چودھویں کو شرادھ کرنے والا جنگ میں شہید ہو جاتا ہے اور
پندرھویں (اماوسیا) کو شرادھ کرنے والا سب مرادوں کو پا لیتا ہے۔ (۱۸) اندھیرے پاکھ میں دسویں اور چودھویں
کو چھوڑ کر (بقیہ) تاریخیں شرادھ کرنے کے لیے اچھے دن ہیں۔ دوسرے (اجالے دن) ایسے نہیں ہیں۔ (۱۹) جس
طرح اجالے پاکھ سے اندھیرا پاکھ شرادھ کے لیے اچھا ہے۔ اسی طرح دوپہر کے بعد کا وقت دوپہر کے پہلے کے وقت
سے شرادھ کے لیے اچھا ہے۔ مہابھارت: انوشاسن: ۸۷: ۳–۱۹

پاکستان کا صدارتی انتخاب اور عورت کی سربراہی کا مسئلہ

جناب ڈاکٹر عبدالحق، انصاری

جن اصحاب علم و قلم نے مس فاطمہ جناح کی صدارت کے خلاف کہا یا لکھا ہے ان کی تعداد بھی بہت کم نہیں ہے۔ ان میں پاکستان اور ہندوستان دونوں ہی جگہ کے افراد شامل ہیں۔ ان حضرات میں سے بعض نے سرسری تنقید یا اظہار رائے پر اکتفا کیا ہے۔ ان میں بعض نے بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ جن حضرات نے تفصیل سے لکھا ہے ان میں ماہنامہ میثاق لاہور کے مدیر محترم مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے میثاق کی چار اشاعتوں میں اس مسئلہ پر کلام کیا ہے۔ اکتوبر ۶۴ء کے اداریے میں جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کی قرارداد سے ایک مختصر سا اقتباس نقل کرکے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ دس صفحات میں پھیلا ہوا ہے لیکن ان صفحات میں طنز زیادہ اور استدلال کم ہے۔ طنز و تعریض والی عبارتوں کا تذکرہ ہمارے جائزے میں داخل نہیں ہے۔ جہاں تک استدلال یا استدلال جیسی چیز کا تعلق ہے وہ قرارداد کی اس عبارت سے متعلق ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "شریعت میں جو چیزیں حرام ٹھیرائی گئی ہیں ان میں سے بعض کی حرمت تو ابدی اور قطعی ہے جو کسی حالت میں حلت سے تبدیل نہیں ہوتی اور بعض کی حرمت ایسی ہے جو شدید ضرورت کے موقع پر ضرورت کی حد تک جواز میں تبدیل ہو جاتی ہے۔" اس عبارت میں جو سقم اور نقص ہے اس کی نشان دہی ہم نے خود اوپر کی ہے۔ مولانا اصلاحی صاحب نے بجا طور پر اس عبارت پر گرفت کی ہے مگر جب وہ اس عبارت کی بنیاد پر جماعت اسلامی کی طرف ایک نئے نظریے کو منسوب کرتے ہیں تو اس کی کوئی گنجائش پوری قرارداد کی روشنی میں ہمیں نکلتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔ وہ نظریہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی شریعت کے محرمات کو دو قسموں میں تقسیم کر رہی ہے۔ ایک وہ جو ابدی ہیں جن کی حرمت تا قیامت باقی رہے گی۔ دوسرے وہ جن کی حرمت ایک مقررہ زمانہ یا وقت کے بعد منسوخ ہو جاتی ہے اور وہ ساری حلال چیزوں کی طرح حلال

وہ طیب ہو جاتی ہیں۔ اس نظریے کو جماعت اسلامی کی طرف منسوب کر کے وہ اس جماعت اور اس کے ناقدین کو کراچی کے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب اور غلام احمد پرویز صاحب کے صف میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ مولانا اصلاحی صاحب نے اس کام کے لیے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے قرار داد کی زیر بحث عبارت کو اس کے سیاق و سباق سے نکال کر ایک مستقل اکائی سمجھ کر اس پر بحث کی ہے قرار داد کے مختلف جملے جن کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے نہ تو ان کا نقل کرنا انھوں نے پسند کیا اور نہ ہی ان کا لحاظ کرنا اس بحث میں ضروری سمجھا۔ اگر ان عبارتوں کو تھوڑی دیر کے لیے نظر انداز بھی کر دیا جائے تو بھی میرا خیال ہے کہ قرار داد کی زیر بحث عبارت سے وہ بات نہیں نکلتی جو مولانا اصلاحی صاحب اس سے نکال رہے ہیں ——

زیر بحث عبارت میں دو جملے ہیں۔ ان پر غور کیجیے۔ ایک جملہ ہے۔

"شریعت میں جو چیزیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں ان میں سے بعض کی حرمت تو ابدی اور قطعی ہے جو کسی حالت میں حلت سے تبدیل نہیں ہوتی۔"

ظاہر ہے کہ اس سے مولانا اصلاحی صاحب کا نظریہ نہیں نکلتا۔ دوسرا جملہ ہے:-

"اور بعض کی حرمت ایسی ہے جو شدید ضرورت کے موقع پر ضرورت کی حد تک جواز میں تبدیل ہو جاتی ہے۔"

مولانا اصلاحی کا نظریہ اگر نکلتا تو اس جملہ سے نکلتا، مگر اس سے بھی نہیں نکلتا۔ ان کا نظریہ اس وقت نکلتا جبکہ یہ جملہ کچھ اس طرح ہوتا "اور بعض کی حرمت ایسی ہے جو ایک دور کے بعد ہمیشہ کے لیے جواز سے تبدیل ہو جاتی ہے" ہر شخص ان دونوں جملوں کا موازنہ کر کے دیکھے کہ ان میں کس قدر بعد ہے۔ قرار داد کے جملے میں "شدید ضرورت کے موقع پر اور" ضرورت کی حد تک جواز" کے الفاظ لانے کی کیا ضرورت تھی اگر مجلس شوریٰ وہی کہنا چاہتی جو مولانا اصلاحی صاحب اس کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ اس وضاحت کے بعد ایک بار پھر زیر نظر مقالے کا ابتدائی حصہ دیکھ لینا بہتر ہوگا جس میں اس عبارت سے ہم نے اوپر خود بحث کی ہے۔

اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مولانا اصلاحی صاحب جماعت کے ناقدین میں اس نظریے کو جماعت کی طرف منسوب کرنے میں تنہا ہیں کسی اور کے نزدیک اس انتساب کی گنجائش نظر نہیں آئی۔

دسمبر ۱۹۶۳ء کے اداریے میں مولانا اصلاحی صاحب کی تنقید کا آغاز "شدید ضرورت" کے لفظ سے ہوتا ہے جو قرار داد کے اس جملہ میں آیا ہے اور بعض کی حرمت ایسی ہے جو شدید ضرورت" کے لفظ پر ضرورت کی حد تک جواز میں تبدیل ہو سکتی ہے" ان کے خیال میں قرآن و سنت میں ایسے مواقع کے لیے اکراہ یا اضطرار یا اس کے مشتقات

آئے ہیں۔ اردو زبان میں "شدید ضرورت" کا لفظ ان اصطلاحات کے صحیح مفہوم کو پوری طرح ادا نہیں کرتا۔ اور شدید غلط فہمی کا باعث ہوتا ہے۔ مولانا اصلاحی صاحب کی رائے صحیح ہے یا "شدید ضرورت" کا لفظ درست ہے اس بحث کے لیے زندگی رام پور کی جنوری کی اشاعت کے صفحہ ۴۹ کی بحث ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

مولانا اصلاحی صاحب نے اس بحث کے ضمن میں شریعت کا وہ ضابطہ تفصیل سے بیان کیا ہے جو ایک حرام کو دوسرے حرام کے مقابلے میں اختیار کرنے کے متعلق ہے۔ ان کے الفاظ میں وہ ضابطہ یہ ہے:-

"شریعت میں جو بات کہی گئی ہے وہ تو یہ ہے کہ ہر حرام سے بچو اگر اکراہ و اضطرار کی حالت پیش آجائے تو اس صورت میں آدمی کو اس بات کی رخصت ہے کہ کسی حرام سے فائدہ اٹھائے بشرطیکہ نہ اس حرام کا خواہشمند ہو نہ اس حد سے آگے بڑھے جو دفعِ ضرورت کے لیے ناگزیر ہے۔ ص[illegible]

اکراہ یا اضطرار کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی کو بے بسی کی ایسی حالت پیش آجائے کہ دو حرام چیزوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کے سوا کوئی اور مفر باقی نہ رہ جائے۔ اس صورت میں شریعت بلاشبہ اس بات کی رخصت دیتی ہے کہ دونوں دونوں حراموں میں سے اس حرام سے فائدہ اٹھائے جو نسبتاً اور مقابلتاً اہون ہو۔ (ص[illegible])

پھر مجلس شوریٰ کی قرارداد پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

ان حضرات نے یہ بات سمجھنے میں بھی ٹھوکر کھائی ہے کہ شریعت کی کوئی حرمت "شدید ضرورت" کی حالت میں "حلت میں تبدیل ہوجاتی ہے"۔ حرمت حلت میں تبدیل ہوجاتی تو قرآن کو غیر باغ ولا عاد کی شرط لگانے کی کیا ضرورت تھی؟ حرمت حلت میں تبدیل نہیں ہوجاتی وہ بدستور باقی رہتی ہے البتہ بقدر سد رمق اس سے جان بچا لینے کی رخصت حاصل ہوجاتی ہے۔ یہ رخصت بہرحال رخصت ہے عزیمت نہیں ہے۔ اس وجہ سے اگر کوئی شخص اضطرار میں کسی حرام سے فائدہ اٹھانا چاہے تو فائدہ اٹھائے لیکن اس کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ اس حرام کا ایک ہوٹل کھول کر ساری دنیا کو دعوت دینا شروع کردے کہ آؤ لوگو اضطرار پیش آگیا ہے اس حرام کے لیے اپنا تن من دھن قربان کردو اور اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ (صفحہ ۴ و ۵)

مولانا اصلاحی کے ان اقتباسات سے ذیل کی باتیں نکلتی ہیں:-

۱- ایک کم تر حرام کو دوسرے شدید تر حرام کے مقابلے میں اسی وقت اختیار کیا جاسکتا ہے جب کہ اس کم تر حرام کو اختیار کرنے کے سوا کوئی اور مفر نہ ہو۔

۲- اس کم تر حرام کو اتنا ہی اختیار کرنا چاہیے جتنا کہ ناگزیر ہو اور اس کو اختیار کرنا بھی خوشی سے نہ ہو

بلکہ کراہت کے ساتھ ہو۔

۳۔ جب کبھی کم تر حرام کو شدید تر حرام کے مقابلے میں اختیار کیا جاتا ہے تو کم تر حرام کی حرمت بدستور باقی رہتی ہے حلت سے تبدیل نہیں ہوتی۔

۴۔ کم تر حرام کو اختیار کرنے کا فعل ہمیشہ رخصت کے حکم میں ہوگا اور کبھی عزیمت نہیں بن سکتا۔

۵۔ جو کم تر حرام چیز شدید تر حرام کے مقابلے میں اختیار کی جائے اس سے خود تو فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے لیکن دوسروں کو اس کی طرف دعوت نہیں دی جاسکتی۔

ان پانچ نکات میں سے پہلے دو نکات سے قرآن و سنت کے ہر طالب علم کو پورا اتفاق ہوگا۔ ہمیں بھی اس سے اتفاق ہے اور جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کو بھی۔ قرارداد میں شدید ضرورت کے موقع پر اور ضرورت کی حد تک کے فقرے ان دونوں نکات کے پیش نظر ہی لائے گئے ہیں۔ قرارداد کا یہ جملہ بھی اس کی تائید کرتا ہے "لیکن حالات کی غیر معمولی نوعیت دیکھتے ہوئے جماعت نے پورے غور و خوض کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ ان خاص حالات میں اس انتخاب کو قبول کرنا شرعاً ناجائز نہ ہوگا۔" ان دو نکات کے علاوہ باقی تین نکات سے ہمیں اختلاف ہے۔

تیسرے نکتہ کو لیجیے۔ یہ نکتہ اس سوال کا ایک جواب ہے کہ جب کم تر حرام کو شدید حرام کے مقابلے میں اختیار کیا جاتا ہے تو کم تر حرام کی حرمت جس کا کرنا فاعل کے لیے اس وقت جائز ہوتا ہے اس فعل کی حد تک بدستور باقی رہتی ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ بنیادی طور پر کلامی مسئلہ ہے اور اس کا تعلق حسن و قبح کے نظریے سے ہے۔ اس کلامی مسئلہ میں علمائے کلام و اصول میں دو مشہور نقاط نظر رائج رہے ہیں۔ ایک نقطۂ نظر کے حامل معتزلہ اور علمائے احناف[1] کا ایک بڑا گروہ رہا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ بھی اس گروہ سے متفق ہیں۔ مولانا اصلاحی صاحب نے اس گروہ کے فکر کی نمائندگی کی ہے۔ دوسرا گروہ ان علمائے کلام و اصول پر مشتمل ہے جو امام ابوالحسن اشعری کے متبع ہیں۔ پہلا گروہ اشیاء اور افعال کے حسن و قبح کو ذاتی سمجھتا ہے اور اس کے علم کو عقلی قرار دیتا ہے لیکن وہ سارے ہی اشیاء و افعال کے بارے میں یہ حکم نہیں لگاتا بعض افعال کو یہ گروہ بھی جس میں معتزلہ بھی شامل ہیں اس حکم سے خارج قرار دیتا ہے اور ان کے حسن و قبح کے علم کو محض شرعی سمجھتا ہے۔ اشاعرہ سارے ہی اشیاء و افعال کے حسن و قبح کے علم کو غیر عقلی اور محض شرعی قرار دیتے ہیں ان کے خیال میں شرع کی توقیف سے پہلے کوئی شے یا فعل بذاتہ نہ حسن ہوتا ہے نہ قبیح اور نہ شرع کی توقیف کے بعد یہ صفات صفات ذاتیہ بن جاتی ہیں۔ ایک مشہور مثال کو لیجیے جس میں ایک عالم سنگ

[1] فقہ حنفی کا مفتی بہ قول یہ ہے کہ جان لیوا بھوک کی حالت میں حرام غذا مباح ہو جاتی ہے اور جان بچانے کے لیے [illegible] کا استعمال واجب ہو جاتا ہے۔ (مدیر)

قتل کرنے کے ارادے سے ایک بے گناہ آدمی کا پیچھا کر رہا ہے اور ایک فرد سے جو اس بے گناہ کو دیکھ رہا ہے اس کے بھاگنے کی سمت پوچھتا ہے۔ اس مشہور مثال میں جمہور امت کا اتفاق ہے کہ اس بے گناہ کی جان بچانے کے لیے اگر جھوٹ بولنے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ ہو تو اس وقت جھوٹ بولنے کو اس بے گناہ کے قتل کی طرف رہنمائی کرنے کے مقابلے میں ترجیح دینی چاہیے۔ اس مثال میں جھوٹ بولنے کی تاویل معتزلہ اور علمائے احناف یہ کرتے ہیں کہ چونکہ جھوٹ بولنا بذاتہٖ قبیح ہے اس لیے اس صورت میں بھی بدستور قبیح ہے لیکن ایک بے گناہ کی جان لینے میں معاونت اس سے شدید تر قباحت کا حامل ہے۔ اس لیے جھوٹ بولنے کو اہون سمجھ کر اختیار کرنا چاہیے۔ مولانا اصلاحی صاحب کی تعبیر اسی مکتب فکر سے مطابقت رکھتی ہے۔ اشاعرہ کہتے ہیں کہ جھوٹ بولنے میں کوئی ذاتی قباحت ہے ہی نہیں اس لیے یہ مسئلہ ہی نہیں پیدا ہوتا کہ جھوٹ بولنے کی قباحت اس مثال میں بھی بدستور باقی رہتی ہے یا نہیں۔ ان حالات میں وہ ویسے ہی حلال ہے جیسا کہ سچ بولنا عام صورتوں میں حلال ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں شریعت کا ہر حکم اضافی ہے۔ شریعت میں کوئی چیز حالات و ظروف سے قطع نظر کر کے فی نفسہٖ حرام یا حلال نہیں ہوتی بلکہ قیود و شرائط کے ساتھ ہوتی ہے اور جب ان قیود و شرائط میں کوئی اہم تبدیلی ہوتی ہے تو حلت اور حرمت بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔

ہمیں اس سے بحث کرنا نہیں ہے کہ اشاعرہ کا نقطۂ نظر صحیح ہے یا احناف و معتزلہ کا ہمیں تو صرف اس بات کی طرف توجہ دلانی ہے کہ مجلس شوریٰ کی قرارداد میں اگر یہ کہا گیا ہے کہ بعض حرمتیں بعض حالات میں حلت سے تبدیل ہو جاتی ہیں تو یہ تعبیر ایسی نہیں ہے کہ جس کے بارے میں مجلس شوریٰ کے افراد منفرد ہوں یا جسے کہا جائے کہ جماعت اسلامی کے ذہن کی اختراع ہے یا یہ کہ یہ تعبیر علمائے شریعت کے نزدیک بالاتفاق غلط ہے۔

مولانا اصلاحی صاحب کے چوتھے نکتے کو لیجیے جس میں کہا گیا ہے کہ جب بھی ایک کم تر حرام کو شدید تر حرام کے مقابلے میں اختیار کیا جاتا ہے تو کم تر حرام کو اختیار کرنے کا فعل ہمیشہ رخصت کے حکم میں ہوتا ہے عزیمت کبھی نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں شریعت کا صحیح موقف یہ ہے کہ اس فعل کا حکم مختلف وجوہ کی بنا پر بدلتا رہتا ہے۔ کبھی تو اس حرام کا اختیار کرنا ایسا ہوتا ہے کہ اس کے فعل پر کوئی مواخذہ آخرت میں نہیں ہوگا۔ اصلاحی صاحب کی کلمۂ کفر کہنے کی مثال اسی نوعیت کی ہے اور یہاں وہ جمہور امت کی صحیح ترجمانی کر رہے ہیں[1]۔ کہیں اس حرام کو اختیار کرنے کا عمل افضل ہوتا ہے۔ مثلاً بعض اوقات میدان جنگ میں دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے رمضان کے روزے افطار کرنا۔ بعض اوقات اختیار کرنا واجب اور فرض ہو جاتا ہے مثلاً جان بچانے کے لیے مرے ہوئے جانور کا گوشت

---

[1] الموافقات شاطبی۔ جلد ۱ صفحہ [illegible]

کھانا جس کے علاوہ کوئی اور چیز جان بچانے کے لیے موجود نہ ہو[1] اور اوپر کی مثال میں تو کثیر علما متفق ہیں کہ اگر وہ بے گناہ شخص کوئی نبی ہو تو اس کی جان بچانے کے لیے جھوٹ بولنا واجب اور فرض ہے۔

مولانا اصلاحی صاحب کا پانچواں نکتہ بھی صحیح نہیں ہے کہ شدید حرام کے مقابلہ میں کم تر حرام کے ارتکاب کی اجازت صرف انفرادی معاملات تک محدود ہے اس سے ایک فرد تو فائدہ اٹھا سکتا ہے لیکن دوسروں کو جو اسی حالت میں گرفتار ہوں اس کے اختیار کرنے کی دعوت نہیں دے سکتا۔ مولانا اصلاحی صاحب یہ تفریق کیوں کر رہے ہیں اس کی وجہ انھوں نے بیان نہیں کی۔ فرض کیجیے کہ ایک مصیبت عام ہو اور اس میں گرفتار ایک فرد کے لیے اگر یہ جائز ہو کہ وہ ایک کم تر حرام کو اختیار کر کے اس بڑی مصیبت سے نکل سکے تو اس بات کا دوسروں کو مشورہ دینا یا ان سے اپیل کرنا کیوں ناجائز ہوگا۔ جنوری کے میثاق کے صفحہ ۱۶ پر انھوں نے خود اجتماعی اضطرار کا ذکر کیا ہے اور فقہاء کے درمیان اس اضطرار کی ایک متفقہ مثال بھی پیش کی ہے مگر حیرت ہے کہ یہاں پر وہ اجتماعی اضطرار کی تردید کر رہے ہیں۔ اس تردید سے غالباً وہ جماعت اسلامی کو عوام سے یہ اپیل کرنے سے منع کرنا چاہتے ہیں کہ وہ مس فاطمہ جناح کے حق میں ووٹ دیں۔

میثاق کے زیر بحث اداریہ میں مولانا اصلاحی صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں کہ اگر "شدید ضرورت" کے لفظ سے اضطرار اور اکراہ ہی کو مراد لیا گیا ہے تو سوال یہ ہے کہ وہ کیا اضطرار ہے جو جماعت اسلامی کو پیش آیا پھر وہ اپنی طرف سے اس اضطرار کی تین ممکن تشریحات پیش کرتے ہیں۔

پہلی تشریح یہ ہے:۔ جماعت اسلامی کی رائے کا لحاظ کیے بغیر متحدہ محاذ نے عورت کی صدارت کا فیصلہ کر دیا اور جماعت اسلامی کے نزدیک متحدہ محاذ کی شرکت ایک وجوب شرعی کی حیثیت رکھتی ہے جس سے محروم ہونے کے مقابلے میں شریعت کے ایک حرام کو حلت میں تبدیل کرنا جماعت اسلامی کے لیے جائز ہو گیا۔ ملاحظہ ہو ص ۸

دوسری تشریح یہ ہے:۔ متحدہ محاذ کے اندر سرے سے کوئی مرد ہی نہ ہوا اس وجہ سے مس فاطمہ جناح کو اس محاذ کے باہر سے تلاش کر کے لانا پڑا۔ اگر یہ اضطرار ہے تو اس سے بہتر تھا کہ صدر ایوب ہی کو گوارا کر لیا جاتا آخر وہ گنہگار تھے کافر تو نہ تھے۔ ملاحظہ ہو ص ۸

تیسری تشریح یہ ہے:۔ مس فاطمہ جناح کے سوا کوئی دوسری شخصیت ایسی نہیں تھی جس کو اگر صدارت کے لیے نامزد کیا جاتا تو اس کے منتخب ہو جانے کی توقع کی جا سکتی۔ اس لیے ان کو منتخب کیا گیا۔ (ملاحظہ ہو ص ۹)

---

[1] الموافقات للشاطبی جلد ۱ - ص ۳۲۱، ۳۲۲

مجلس شوریٰ کی قرارداد اور ترجمان القرآن کے اداریے میں جماعت اسلامی کی جو مجبوری بیان کی گئی ہے اسے پڑھ کر کوئی اس سے متفق ہو یا نہ ہو لیکن ہر شخص کو اس سے اتفاق ہوگا کہ مولانا اصلاحی صاحب نے یہاں جو تین تشریحیں جماعت اسلامی کی مجبوری کی پیش کی ہیں ان میں سے کوئی بھی جماعت اسلامی کی پیش کردہ تشریح نہیں ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر مولانا اصلاحی صاحب سے سوال کیا جاسکتا ہے۔ یہ کیا طریقۂ بحث ہے کہ آپ جماعت اسلامی کی تشریح کو چھوڑ کر خود سے مختلف تشریحات پیش کرتے ہیں اور ان پر تنقید کرکے یہ خیال کررہے ہیں کہ آپ نے جماعت اسلامی کے موقف پر تنقید کردی۔ آپ کے لیے ان تشریحات کو پیش کرنے کا موقع اس وقت تھا جب آپ جماعت کی تشریح پر تنقید کرکے یہ ثابت کرچکے ہوتے کہ حقیقی تشریح وہ نہیں ہے بلکہ وہ ہے جو میں پیش کررہا ہوں مگر یہ کام مولانا اصلاحی صاحب نے کہیں انجام نہیں دیا ہے۔

مولانا اصلاحی صاحب نے ص۸ سے شروع کرکے چند صفحات تک لوگوں کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ متحدہ محاذ کے نمائندے مس فاطمہ جناح اور صدر ایوب کے درمیان میں جو جنگ ہے اس کا کوئی تعلق اسلام سے نہیں ہے۔ ان کے خیال میں یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ یہ جنگ جمہوریت اور استبدادی نظام کی جنگ ہے حقیقت میں تو یہ جنگ جمہوریت کے دو طریقوں پارلیمانی اور صدارتی کے درمیان ہے اس کے بعد وہ سوال کرتے ہیں کہ جب حقیقت یہ ہو تو جماعت اسلامی کے لیے مس فاطمہ جناح کی تائید میں مضمر حرمت کے جواز کی کیا وجہ باقی رہ جاتی ہے۔

اس دلیل کا پہلا جز یہ ہے۔ اس انتخابی جنگ کا کوئی تعلق اسلام سے نہیں ہے۔ اگر اس جملہ کا مطلب یہ ہو کہ متحدہ محاذ کی بعض یا بیشتر پارٹیاں اسلام کی خاطر اس انتخابی جنگ میں شریک نہیں ہورہی ہیں بلکہ ان کے مقاصد دوسرے ہیں تو یہ بات صحیح ہے اور جماعت اسلامی پاکستان کو بھی اس کے تسلیم کرنے میں تامل نہیں۔ لیکن کم از کم جماعت اسلامی پر یہ بات منطبق نہیں ہوتی۔ جماعت اسلامی اس انتخابی جنگ کو پاکستان میں اسلام کے مستقبل سے بے حد متعلق سمجھتی ہے۔ اور اگر اس جملے کا مفہوم یہ ہو کہ بعض لوگوں کے سمجھنے کے علی الرغم اس انتخابی جنگ کا کوئی تعلق فی الواقع اسلام سے نہیں ہے۔ اس میں جو بھی کامیاب ہو پاکستان کی اسلامی نظام زندگی پر اس کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوگا تو یہ ایسا دعویٰ ہے جس کے لیے مولانا اصلاحی صاحب کو دلائل دینے چاہیں اور بالخصوص جماعت اسلامی نے صدر ایوب کی کامیابی کی صورت میں جن شدید اندیشوں کا اظہار کیا ہے اس پر تنقید کرنی چاہیے۔

اس دلیل کا دوسرا جز یہ ہے کہ یہ جنگ جمہوریت کے دو طریقوں پارلیمانی اور صدارتی کے درمیان ہے

اور جب مسئلہ صرف جمہوریت کی ایک شکل کو دوسری شکل پر ترجیح دینے کا ہو تو اس شرعی حرمت کے جواز کی کیا وجہ جماعت اسلامی کے پاس رہ جاتی ہے جو مس فاطمہ جناح کی تائید میں مضمر ہے۔ اس سلسلے میں یہ عرض ہے کہ جماعت اسلامی اور متحدہ محاذ کی دوسری پارٹیاں صدر ایوب کے نظام کو جمہوریت نہیں بلکہ استبدادی نظام قرار دیتی ہیں۔ دستور میں صدر کے جو اختیارات ہیں اور بنیادی حقوق کے بارے میں جو ضوابط ہیں اور صدر ایوب نے گزشتہ چھ سال میں جس طرح اپنے اختیارات کو استعمال کرکے پریس، اجتماع، تقریر اور نقل و حرکت پر پابندی عائد کی ہے اور جو قوانین اس کے لیے بنائے ہیں، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے اور جس طرح وہ اپوزیشن کو ملک میں ابھرنے کی راہ میں مانع ہوتے رہے ہیں اور الکشن میں اپنی کامیابی کے لیے جو طریقے اور ہتھکنڈے انھوں نے استعمال کیے ہیں الکشن کے درمیان اور اس کے بعد کراچی اور دوسرے مقامات پر جو ہنگامے ہوئے ہیں جس طرح سے بے گناہوں کا خون بہایا گیا ہے، عورتوں کو جس طرح رسوا کیا گیا ہے جن کی تفصیلات پاکستان کے اخبارات کے علاوہ ہندوستان کے رسائل و اخبارات میں بھی آئی ہے۔ کیا اس سب کی موجودگی میں صدر ایوب کے نظام کو فی الواقع جمہوری نظام کہنا صحیح ہوگا؟ اگر مولانا اصلاحی صاحب اس نظام کو جمہوری نظام قرار ہی دیتے ہیں تو ان کو متحدہ محاذ اور جماعت اسلامی کے بیان کردہ حقائق پر تنقید کرنی چاہیے تھی جو بدقسمتی سے انھوں نے کی نہیں۔

دسمبر کے "میثاق" میں مولانا اصلاحی صاحب نے آنے والے صدارتی انتخاب میں بنیادی جمہوریتوں کے ارکین کو مخاطب کرکے وہ وجوہ گنائے ہیں جن کی بنا پر صدر ایوب کو کامیاب بنانا چاہیے۔ یہ پورا اداریہ اس مفروضے پر لکھا گیا ہے کہ آنے والے انتخاب کا کوئی تعلق اسلام سے نہیں ہے۔ اس لیے کہ اسلام نہ صدر ایوب کے ہاتھوں آئے گا اور نہ مس فاطمہ جناح کے ہاتھوں۔ "صفحہ ۳ — چنانچہ جو وجوہ صدر ایوب کی موافقت میں گنائے گئے ہیں ان میں اسلام کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ مثال کے طور پر" بنیادی جمہوریتوں کے ارکین کو جو باتیں پیش نظر رکھنی چاہیں ان میں سب سے پہلی بات جو مولانا اصلاحی صاحب نے پیش کی ہے ایک مستحکم حکومت کا قیام ہے۔ صدر ایوب کو اس لیے ووٹ دینا چاہیے تاکہ پاکستان مضبوط ہو۔ صدر ایوب کی جمہوریت ایک حقیقی جمہوریت ہے۔ متحدہ محاذ والے جس جمہوریت کے داعی ہیں وہ انگریزوں کا پیدا کردہ نظام ہے اور بالکل غیر فطری اور غیر عقلی ہے (صفحہ ۵) مس فاطمہ جناح کو ووٹ دینے کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کا مزاج فاعلانہ کے بجائے منفعلانہ اور مردانہ کے بجائے زنانہ ہو جائے (صفحہ ۶) ملک کے سامنے مختلف گتھیاں حل طلب ہیں جن کو کسی عورت کا ناخن کھول نہیں سکتا (صفحہ متحدہ محاذ کے رہنماؤں اور مس فاطمہ جناح پر تبصرہ ہے اور جماعت اسلامی کے بارے میں ارشاد ہے کہ "اس سے زیادہ

اسلام کے لیے مضر کوئی جماعت نہیں ہے۔ (صفحہ ۴) اور دوسری ہر جماعت کے مقابلے میں یہ جماعت عقل و دین سے سب سے زیادہ دور ہے (صفحہ ۶) مگر صدر ایوب کے بارے میں ان کا خیال یہ ہے " وہ اسلام سے ناواقف ضرور ہیں لیکن اسلام سے بیزار نہیں ہیں"۔ (صفحہ ۴)

جنوری کے اداریے میں مولانا نے صدر ایوب کی کامیابی پر انہیں جو مبارکباد پیش کی ہے اور الکشن میں مخالفین کے ساتھ ان کے رویے کو جن الفاظ میں سراہا ہے اور الکشن کے اندر ضبط و نظم، عدل و انصاف اور امن و سکون کی جو تعریف انھوں نے کی ہے اس نے ان کے دوستوں اور معتقدین کو بھی مایوس کر دیا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

" پولنگ کے لیے جو قواعد و ضوابط اختیار کیے گئے وہ ہمارے ملک میں پہلی مرتبہ اختیار کیے گئے ان قواعد و ضوابط نے ممکن حد تک دھاندلی اور دھونس کے امکانات کا سد باب کر دیا۔ انسانی کاموں میں جو احتیاط ممکن تھی وہ اختیار کی گئی۔ اگر اس کے باوجود اکا دکا واقعہ قابل اعتراض پیش آیا تو اس وجہ سے نہیں پیش آیا کہ اس کے پیش آنے کے لیے کوئی رخنہ قصداً کھلا چھوڑ دیا گیا تھا بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ الکشن کے کیس میں ان رخنوں کے سد باب کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔

ہمارا اندازہ ہے کہ الکشن کمیشن اور حکومت نے انتہائی کوشش اس بات کے لیے کی ہے کہ لوگوں کے لیے اپنے ووٹ استعمال کرنے کا موقع فراہم کیا جائے اور ووٹر اپنے ووٹ کی اخلاقی و سیاسی قدر و قیمت سمجھیں۔ (صفحہ ۳)

اگر صدر ایوب کی اس کامیابی کو بھی کچھ لوگ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں اور وہ انتخابات کو نامنصفانہ سمجھتے ہیں تو وہ جا کے کسی قبرستان میں الکشن کرائیں تاکہ انہیں کسی مزاحمت سے سابقہ پیش نہ آئے اور سو فی صدی کامیابی انہیں کی رہے۔ (صفحہ ۴)

حالانکہ پاکستانی اخباروں کی اطلاع کے مطابق انتخابات کے دس دنوں میں صرف مغربی پاکستان میں ۳۴ افراد ہلاک اور پانچ سو زخمی ہوئے۔ (فاران، دسمبر ۱۹۶۴ء صفحہ) بعض اطلاعات کے مطابق کراچی میں انتخابات کے بعد ہنگامے میں سیکڑوں جانیں ضائع ہوئی ہیں۔ کراچی میں انتخابات میں جو بدعنوانیاں ہوئی ہیں اور جس طرح کے ہتھکنڈے حکومت نے استعمال کیے ہیں ان پر جماعت اسلامی کراچی نے ایک قرطاس ابیض (وہائٹ پیپر) شائع کیا ہے

(ملاحظہ ہو آئین لاہور۔ ۵ دسمبر ۶۴)

قرطاس ابیض میں انتخابی ضابطوں کی تشکیل، انتخابی فہرستوں کی تیاری، حلقوں کی حد بندی، انتخابی عملے کے تقرر

اور انتخابی مناظلوں پر عمل درآمد میں سیکڑوں طرح کی بدعنوانیوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے ۔ حکومت کے عملہ اور پولیس کی مداخلت اور کارگزاری کو نمایاں کیا گیا ہے ۔ اور ر گس دوٹنگ کے اعداد و شمار اور غنڈہ گردی کے مختلف واقعات بتائے گئے ہیں ۔ جماعت اسلامی پورے ملک کے انتخابات پر ایک دوسرا قرطاس ابیض شائع کرنے والی ہے جس سے، اندازہ ہو سکے گا کہ پاکستان کا وہ قلیل گروہ جس کے ہاتھ میں آج زمام کار ہے کس طرح اپنی قوت اور ذرائع و وسائل سے کام لے کر لالچ اور خوف کے ہتھیار استعمال کر کے عوام پر اپنا اقتدار مستحکم کر رہا ہے ۔

(بقیہ ارشادات رسول)

تو اس سے اندازہ کیجیے کہ کسی مسلمان جماعت کی طرف کفر یا فسق منسوب کرنے کی نزاکت اور خطرناکی کس درجہ بڑھ جائے گی ۔ اس کے ساتھ شریعت کی تعلیم یہ بھی ہے کہ اگر کسی شخص کا کفر یا فسق دوسروں سے مخفی ہے تو اس سے اس کو بچانے کا صحیح طریقہ صرف یہ ہے کہ تنہائی میں اس کو سمجھایا جائے اور اس سے بچنے کی تلقین کی جائے ہاں اگر کوئی شخص علانیہ کسی کفر یا فسق میں مبتلا ہوا اور دوسرے مسلمانوں کو اس کے اثر سے بچانے کی ضرورت پیش آجائے تو صرف اس صورت میں اس کے ثابت شدہ کفر یا فسق کو دوسروں کے سامنے واضح کرنا چاہیے ۔

(۲)

(النعمان بن مقرن) سَبَّ رَجُلٌ رَجُلاً عِنْدَ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فَجَعَلَ المسبوب يَقُولُ عَلَيْكَ السَّلَامُ فقال له صلی اللہ علیہ وسلم اَمَا اِنَّ مَلَكًا بَيْنَكُمَا يَذُبُّ عَنْكَ كُلَّمَا شَتَمَكَ هٰذَا قَالَ لَهُ بَلْ اَنْتَ وَاَنْتَ اَحَقُّ بِهِ وَاِذَا قُلْتَ لَهُ عَلَيْكَ السَّلَامُ قَالَ لَا بَلْ اَنْتَ وَاَنْتَ اَحَقُّ بِهِ

ترجمہ :- نعمان بن مقرن سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص نے دوسرے شخص کو گالیاں دینا شروع کیں پس گالیاں کھانے والے نے جواب میں اس شخص کو علیک السلام (تم پر سلامتی) کہنا شروع کیا جب یہ ہنگامہ ختم ہوا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے علیک السلام کہنے والے سے مخاطب ہو کر فرمایا تم دونوں کے درمیان ایک فرشتہ موجود تھا جو تمہاری طرف سے مدافعت کر رہا تھا ۔ جب جب اس شخص نے تمہیں گالی دی تو فرشتے نے کہا بلکہ تو ایسا ہے اور تو ہی اس کا زیادہ مستحق ہے اور جب تم نے اس کے

جواب میں علیک السلام کہا تو فرشتے نے کہا۔ نہیں! بلکہ تم پر سلامتی ہو اور تم ہی اس کے زیادہ مستحق ہو۔

(جمع الفوائد بحوالہ مسند امام احمد)

سب وشتم کسی انسان کی طرف کوئی عیب منسوب کرنے کو کہتے ہیں۔ (اَلسَّبُّ وَهُوَ الشَّتْمُ وَهُوَ نِسْبَةُ الْاِنْسَانِ اِلٰی عَیْبٍ مَّا۔ فتح الباری) خواہ وہ عیب نسب وحسب کی جہت سے ہو یا دین واخلاق کی جہت سے۔

گالیوں کے مقابلے میں مومن کا بہترین رویہ کیا ہے؟ یہ حدیث اس کی طرف بڑی خوبی سے رہنمائی کرتی اور قرآن کی تعلیم کو مشاہدہ بنا دیتی ہے جن کو گالیاں دی گئیں انھوں نے گالیاں دینے والے کو نہ صرف یہ کہ معاف کیا بلکہ اس کو دعا دے کر اس پر احسان بھی کیا۔

اس کے علاوہ اس حدیث میں گالیاں دینے والے مسلمان کے لیے سخت تنبیہ اور جواب میں بہتر رویہ اختیار کرنے والے مسلمان کے لیے بڑی ترغیب موجود ہے۔ تنبیہ یہ ہے کہ گالیاں دینے والا یہ یاد رکھے کہ اس کی ہر گالی ہر الزام اور ہر بددعا کسی انسان کی زبان سے نہیں بلکہ اللہ کے مقرر کردہ فرشتے کی زبان سے اسی کی طرف پلٹ رہی ہے۔ ترغیب یہ ہے کہ گالیاں کھانے والا یہ اطمینان رکھے کہ اس کے بہترین رویے کے صلے میں خود اللہ تعالیٰ اس کی مدافعت کا انتظام فرمائے گا اور جواب میں کہا ہوا اس کا ہر کلمۂ خیر اسی کی طرف واپس ہوگا اور خدا کے نزدیک وہی اس کا مستحق قرار پائے گا۔ بہتر رویہ اختیار کرنے کے لیے اس سے بہتر ترغیب اور کیا ہو سکتی ہے۔

(۳)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُسْتَبَّانِ مَا قَالَا فَعَلَی الْبَادِیْ مَا لَمْ یَعْتَدِ الْمَظْلُوْمُ (مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دو گالی گلوج کرنے والوں نے جو کچھ کہا اس کا گناہ اور وبال ابتدا کرنے والے پر ہوگا جب تک کہ مظلوم زیادتی نہ کرے۔ (مسلم)

اس حدیث سے گالیوں کا بدلہ لینے کی رخصت نکلتی ہے۔ گالیوں کی ابتدا کرنے والا ظالم ہے اور جواب دینے والا مظلوم لیکن بدلہ لینے کی رخصت دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے ایک کا ذکر خود اس حدیث میں ہے وہ یہ کہ جتنا کچھ ظالم نے کہا ہے مظلوم اس سے تجاوز نہ کرے یعنی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی رخصت نہیں

ہے۔ دوسری شرط جس کا ذکر اس حدیث میں نہیں ہے۔ وہ یہ کہ مظلوم ظالم کے جواب میں جھوٹ نہ بولے۔ یعنی ابتدا کرنے والے کی طرف ایسے عیوب منسوب نہ کرے جو اس میں موجود نہ ہوں۔ مثال کے طور پر کوئی شخص کسی کو بدکار کہے تو جواب میں ظالم کو بدکار کہنا صحیح نہ ہوگا اگر وہ واقع میں بدکار نہیں۔ ان دو شرطوں پر اگر مظلوم کا جواب پورا اتر جائے تو سب وشتم کا سارا گناہ اور وبال صرف ابتدا کرنے والے پر پڑے گا اور اگر ان دو شرطوں میں سے کوئی ایک شرط بھی غائب ہو گئی تو ظالم و مظلوم دونوں ہی گناہ میں برابر کے شریک ہوں گے البتہ ظالم کے حصے میں ابتدا کرنے کی ملامت و مذمت پھر بھی زیادہ رہے گی ——— مظلوم کو ظالم کا جواب دینے کی رخصت قرآن کی آیات اور دوسری احادیث سے بھی ثابت ہے لیکن عفو و درگزر زیادہ بہتر ہے اور اسی کی ترغیب قرآن میں بھی دی گئی ہے اور احادیث میں بھی۔ اس لیے اختیار کرنے کے لائق یہی بات ہے کہ گالیوں کا جواب گالیوں سے نہ دیا جائے اس وجہ سے بھی کہ مظلوم کی مدافعت کا انتظام خود اللہ تعالےٰ کرے گا اور اس وجہ سے بھی کہ رخصت کی شرطوں کو نباہنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

(بقیہ صفحہ ۶۴) اسں حکومت نے "گوری نسل" کی حمایت میں جو رویہ اختیار کر رکھا ہے' وہی رویہ ان لوگوں کو "ہندی زبان" کی حمایت میں پسند آگیا ہے۔ ہم ہندی کے پرجوش حامیوں سے عرض کریں گے کہ اس رویے کی وجہ سے جنوبی افریقہ کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اگر آپ نے اس کی نقل پر اصرار کیا تو بھارت کو اس سے بہت زیادہ نقصان پہنچ جائے گا۔

اگر آپ زبان کے مسئلے کو حل کرنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ آپ قول و عمل کے تضاد کو بھی دور کریں اور اپنی ذہنیت بھی بدلیں ورنہ یہ مسئلہ کبھی حل نہ ہوگا اور یہ ملک انتشار کا شکار رہے گا۔ یہ مشورہ آپ کو صرف مسلمان ہی نہیں دے رہے ہیں بلکہ آپ کے انصاف پسند اور ہوش مند ہندو بھائی بھی دے رہے ہیں۔ سب کے مشوروں کو ٹھکرا کر اپنی بات پر اڑے رہنا اس ملک کی خیر خواہی نہیں ہے۔

مدیر

اپنی ذہنیت بدلیے

ابھی زیادہ دن نہیں گزرے کہ پنجاب کے سابق گورنر مسٹر این۔ وی گیڈگل نے ارشاد فرمایا تھا کہ ہندی کسی ایک مخصوص علاقہ کی زبان نہیں ہے بلکہ پورے ملک کی زبان ہے ہندی قومی زبان ہے اور اس کو ۵۴ کروڑ افراد بولتے ہیں۔ انھوں نے کہا اگر ہندی کے پریمی اور اس کے حامی کوشش کریں تو اس کو بین الاقوامی زبان بنایا جاسکتا ہے —— انھوں نے جنوب میں ہندی دشمن فسادات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ حکومت کی کمزور پالیسی کا نتیجہ ہیں۔ انھوں نے مرکزی حکومت پر زور دیا کہ قومی زبان کے سلسلے میں سخت پالیسی اختیار کرے۔ انھوں نے اس افواہ کی تردید کی کہ آئین ساز اسمبلی اور کانگریس پارلیمانی پارٹی نے ہندی کو قومی زبان بنانے کا فیصلہ صرف ایک ووٹ کی اکثریت سے کیا تھا انھوں نے بتایا کہ پارٹی کے جس جلسے میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا اس کی صدارت خود انھوں نے ہی کی تھی۔

موجودہ صورت حال میں مسٹر گیڈ گل کی اس تقریر کو ہوشمندانہ اور مدبرانہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ہاں ان کی تقریر سے لسانی فسادات کا ایک بڑا عامل ضرور سامنے آجاتا ہے جس ذہنیت کا مظاہرہ مسٹر گیڈ گل نے کیا ہے اسی نے زبان کے مسئلے کو آتش فشاں پہاڑ بنا دیا ہے۔ اس تقریر سے ان کی لیڈری کو تقویت پہنچی ہوگی لیکن زبان کے مسئلے کو حل کرنے میں اس سے نہ صرف یہ کہ کوئی مدد نہیں ملے گی بلکہ اس سے قومی اتحاد کی بنیاد اور کمزور ہوگی۔ قومی زبان کے سلسلے میں سخت پالیسی اختیار کرنے کا مشورہ مزید اشتعال پیدا کرسکتا ہے۔

ان کی یہ بات تو صحیح ہے کہ ہندی قومی زبان ہے لیکن یہ کہنا کہ اس کو ۵۴ کروڑ افراد بولتے ہیں عجیب و غریب ہے۔ ممکن ہے ان کے اصل الفاظ کا ترجمہ غلط چھپا ہو ورنہ خلاف واقعہ بات ہی کہنی ہو تو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہندی دنیا کے تمام باشندوں کی مادری زبان ہے۔

ہندی کو بین الاقوامی زبان بنانے کیلئے جس حوصلے کا انھوں نے اظہار کیا ہے وہ قابل تعریف ہے ہندی [illegible] پریمیوں اور حامیوں کو اس کی کوشش ضرور کرنی چاہیے ۔

ہندی کو صرف ایک ووٹ کی اکثریت سے قومی زبان بنانے کی افواہ کو انھوں نے رد کیا ہے صرف تردید کافی نہیں ان کو بتانا چاہیے تھا کہ کتنے ووٹوں کی اکثریت سے ہندی قومی زبان بنائی گئی تھی؟ ان کی خاموشی غماز ہے کہ بہر حال بہت کم ووٹوں کی اکثریت سے اس کو قومی زبان بنایا گیا تھا ۔ ہندی کے پریمی اور حامی اگر ان کے دانا دوست ہوتے تو اس ذہنیت کا مظاہرہ نہ کرتے جس کی نمائندگی مسٹر گیڈ نگل جیسے لیڈر کرتے رہتے ہیں اور نہ آج انہیں مرکزی حکومت کو سخت پالیسی اختیار کرنے کا مشورہ دینے کی ضرورت پڑتی ۔

اصل میں زبان کے مسئلے کو ناقابل حل دو چیزوں نے بنایا ہے ۔ پہلی چیز ریاستی حکومتوں کے قول و عمل کا تضاد ہے اور دوسری چیز شمالی ہند کی آریائی تہذیب کو تمام ہندوستان پر مسلط کرنے کا خبط ہے ۔ ریاستی حکومتوں کے قول و عمل کا تضاد اگر دیکھنا ہو تو بھارت کی سب سے زیادہ مظلوم زبان اردو کو اپنے سامنے رکھ لیجیے ۔

ابھی حال کا واقعہ ہے کہ یوپی کے وزیر اعلیٰ نے دو باتیں فرمائیں ۔ ایک تو یہ کہ اردو زبان بولنے پر کوئی پابندی نہیں ہے اور دوسری یہ کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے بلکہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترک زبان ہے لیکن اس کا عملی ثبوت یہ دیا گیا کہ یوپی کونسل میں ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی صاحب کو اردو میں تقریر کرنے کی اجازت نہیں دی گئی ۔ زبانی طور پر مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں کے ذمہ دار ہمیشہ بہلاوے دیتے رہے اور دیتے رہتے ہیں لیکن عمل کا حال یہ ہے کہ اگر یہ صورت حال نہ بدلی تو بھارت میں یہ زبان ختم ہو کر رہ جائے گی ۔

آریائی تہذیب کو مسلط کرنے کے خبط کا عالم یہ ہے کہ ہندی زبان کے مسئلے کو علی الاعلان مذہب اور تہذیب کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے ۔ حد یہ ہے کہ الہ آباد کے ہندی کنونشن نے زبان کے مسئلے کی بھڑکتی ہوئی آگ پر اپنی قرارداد کا یہ تیل پھینکا :۔

"ہندی کو اس لیے قومی زبان بنایا گیا ہے تاکہ قومی اتحاد کو تقویت پہنچے اور یہ اتحاد نہ صرف جغرافیائی اور سیاسی ہے بلکہ تاریخی اور تہذیبی بھی ہے "

سوال یہ ہے کہ جنوبی ہند والے قرارداد کے ان الفاظ کو پڑھ کر مسرت سے جھوم اٹھیں گے یا غصے سے تلملا جائیں گے؟ واقعہ یہ ہے کہ ہندی زبان کی وہ جس بنیاد پر مخالفت کر رہے ہیں یہ قرارداد اس کا مزید ثبوت بہم پہنچا رہی ہے ۔ ہندی کے حامیوں کا یہ رویہ دیکھ کر جنوبی افریقہ کی حکومت یاد آجاتی ہے —— (باقی صفحہ ۲۲ پر ملاحظہ ہو)

خلافت کے خلیفہ اول حضرت

کی مکمل سوانح حیات

● حضرت ابوبکر ●

— مرتبہ —

کوثر یزدانی

قیمت — 90 روپے

ابتدائی اسلامی تاریخ سمجھنے کے لئے مسلمانوں اور غیر مسلموں

کے لیے مفید اور کارآمد کتاب ۔

م ★ موثر انداز بیان ★ بہتر ک

[illegible]

✽ تفہیم القرآن ✽

از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

- ★ دور حاضر کے استدلالی ذہن کو زیادہ سے زیادہ مطمئن کرنے
- ★ مغربی افکار سے مرعوبیت کو دور کرنے
- ★ قرآن کی مرکزی دعوت اور تمام اہم مسائل حیات سے اس کے تعلق کی توضیح واضح کرنے
- ★ اسلام کے جامع نظام حیات کی طرف صحیح اور رہنمائی کرنے
- ★ قرآن کی انقلابی دعوت کو دلنشین انداز میں پیش کرنے کیلئے

تفہیم القرآن جیسی معرکۃ الآرا تفسیر کا مطالعہ نہایت ضروری ہے -

جلد اول

الفاتحہ ـــــــــــــــــــــــ الانعام

ہدیہ مع پلاسٹک کور -/Rs. 12

جلد دوم

اعراف ـــــــــــــــــــــــ بنی اسرائیل

ہدیہ مع پلاسٹک کور -/Rs. 15

جلد سوم

کہف ـــــــــــــــــــــــ روم

ہدیہ مع پلاسٹک کور -/Rs. 17

ـــــــ

— ملنے کا پتہ —

منیجر: مکتبہ زندگی و کاملی - رامپور - یو - پی

Only Title printed at Shauker Press, Rampur

ماہنامہ

زندگی

رام پور، یوپی

فی پرچہ ۶۰ پیسے

سالانہ چھ روپئے

ماہنامہ

زندگی رامپور

صفر ۱۳۸۵ھ
جون ۱۹۶۵ء

جلد :- ۳۴
شمارہ :- ۶

مدیر :- سید احمد قادری

• خط وکتابت وارسال زر کا پتہ — منیجر رسالہ زندگی، رام پور۔ یوپی
• زرِ سالانہ: چھ روپیہ — ششماہی: تین روپیہ — فی پرچہ: ۶۰ پیسے
• ——— ممالک غیر سے بارہ شلنگ بذریعہ پوسٹل آرڈر

مالک: جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر: سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر: [illegible] مطبع: [illegible] پرنٹنگ [illegible]
مقام اشاعت دفتر زندگی رامپور یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(مارچ ۱۹۶۵ء کے اشارات سے پیوستہ)

(سید احمد قادری)

امت مسلمہ کا مقصد وجود

امت مسلمہ کے مقصد وجود اور اس کے نصب العین کو متعین کرنے والی تیسری اور چوتھی آیتیں یہ ہیں:-

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

(آل عمران: ۱۰۴)

اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے کہ (دوسروں کو بھی) خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک کام کے کرنے کو کہا کریں اور برے کاموں سے روکا کریں اور ایسے لوگ (آخرت میں) پورے کامیاب ہوں گے۔

(مولانا تھانوی)

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ

(آل عمران ۱۱۰)

(اے امت محمدیہ) تم لوگ اچھی جماعت ہو کہ وہ جماعت (عام) لوگوں کے لیے ظاہر کی گئی ہے تم لوگ نیک کاموں کو بتلاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور (خود بھی) اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

(مولانا تھانویؒ)

یہ دونوں آیتیں مل کر ایک دوسرے کی تکمیل و توضیح کرتی ہیں اور دوسری آیت میں اُخرجت للناس کا ٹکڑا اس بات پر دلیل ہے کہ اس کا تعلق صرف مسلم معاشرے سے نہیں ہے بلکہ امت مسلمہ کا مقصد وجود ہی یہ ہے کہ وہ دنیا کے تمام انسانوں کو معروف کا حکم دے اور انہیں منکر سے روکے۔ اس امت کا کام صرف یہی نہیں ہے

کہ وہ اپنے آپ کو درست رکھے بلکہ اس کا فریضہ یہ بھی ہے کہ ان تمام انسانوں کی صلاح و فلاح کی فکر کرے جو بھی دائرۂ اسلام سے باہر ہیں ـــــ علمائے امت ایک طرف تو اس آیت کو امت مسلمہ کے مقصدِ حیات کے ثبوت میں پیش کرتے رہے ہیں اور دوسری طرف اس کے عموم کے قائل رہے ہیں کیونکہ ان میں سے کسی کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ " اُخرجت للناس " کے ایک پورے ٹکڑے کو اپنی نگاہوں سے اوجھل کر دے لیکن اب اس زمانے میں، یہ ممکن ہو گیا ہے کہ اس کو حذف کر کے آیت پر گفتگو کی جائے اور ثابت کر دکھایا جائے کہ اس آیت کا تعلق صرف مسلم معاشرے سے ہے اور اس کو امت مسلمہ کے مقصدِ وجود اور نصب العین کی ترجمانی کے لیے اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس دعوے کی بنیاد یہ ہے کہ امر و نہی کے معنی کسی کو کسی فعل کا بزور پابند کرنے یا کسی فعل سے بزور روک دینے کے ہیں اور اس کے دائرے میں صرف اعمال ہی نہیں بلکہ عقائد تک داخل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آیت کا تعلق غیر مسلموں سے نہیں ہو سکتا کیونکہ انہیں بزور ایمان لانے پر مجبور کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ اگر اس آیت سے " اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ " کے ٹکڑے کو حذف کر دیا جائے اور امر و نہی کے معانی اور ان کے استعمالات کو نظر انداز کر کے ان الفاظ کو صرف بزور پابند کرنے یا روک دینے کے معنی میں لیا جائے تو پھر یہ آیت پورے مسلم معاشرے تک بھی وسیع نہ ہو گی بلکہ اسلامی حکومت کے صرف امراء و حکام تک محدود ہو کر رہ جائے گی لیکن ظاہر ہے کہ کسی آیت کو سمجھنے اور سمجھانے کا یہ طریقہ بالکل غلط ہے ـــــ آیت کی توضیح کے سلسلے میں سب سے پہلی بات سمجھ لینے کی یہ ہے کہ بزور و قوت کی بات تو الگ رہی، عربی زبان میں امر کا لفظ صرف حکم دینے ہی کے معنی میں نہیں آتا بلکہ ترغیب، مشورہ، اظہارِ رائے، دعوت، تعلیم اور نصیحت کے معانی میں بھی بکثرت استعمال ہوتا ہے اور یہ استعمالات عربی زبان اور قرآن و حدیث کے طالب علم کے لیے اس قدر مشہور ہیں کہ ان پر لغت اور قرآن و حدیث سے دلیلیں پیش کرنے کی بھی ضرورت نہیں لیکن اس زمانے میں نئے نئے دعوے غیر ضروری کام کرنے پر بھی مجبور کر دیتے ہیں اس لیے محض اختصار سے لفظ امر کے چند استعمالات بیان کیے جا رہے ہیں :-

(۱) لسان العرب میں ہے -

ورجرب خماص ـــ یامرن — لطیف جسم والی نیل گاؤں کا ریوڑ کہتی

باقتناص انما ادا نهن یشوقن — ہیں کہ آؤ ہمیں شکار کرو۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے

من رأى منكن الى تعصيتهما واقتنا	کرو خیال کا ئیں اپنے نہ بچنے والوں کو شکار کا شوق
والا فليس لهن امر	دلاتی ہیں ورنہ فی الواقع ان کا کوئی حکم نہیں ہوتا -

اس سند سے واضح ہوا کہ شاعر نے اس شعر میں امر کا لفظ تشویق و ترغیب کے لیے استعمال کیا ہے -

(۲) مفردات امام راغب میں ہے -

قال الشاعر	شاعر نے کہا
امرت نفسی ای امرا فعل	میں نے اپنے نفس سے مشورہ کیا کہ کون سا کام کروں

اس مصرع میں شاعر نے امر کا لفظ مشورہ کے معنی میں استعمال کیا ہے -

(۳) حماسہ میں ہے : قال درید بن الصمۃ

امرتهم امری بمنعرج اللوی	فلم یستبینوا الرشد الا ضحی الغد

علامہ تبریزی نے اس شعر کا معنی یہ بیان کیا ہے -

والمعنی ابدیت لهم رأیی بمنعرج	شعر کا معنی یہ ہے کہ میں نے منعرج اللوی (مقام
اللوی لیکونوا علی حذر	کا نام) میں ان کے سامنے اپنی رائے پیش کر دی تھی
فلم یظهر لهم رشد قولی الا حین دهمهم	تاکہ وہ چوکنا رہیں لیکن ان پر میرے قول کی صحت اس
العدو فی الضحی	وقت واضح ہوئی جب بوقت چاشت دشمن ان پر چھا گئے

معلوم ہوا کہ درید نے اس شعر میں امر کا لفظ اظہار رائے، مشورہ اور راپنے کہے ہوئے قول کے معنی میں استعمال کیا ہے -

(۴) قاموس میں ہے -

الامیر: الملک وقائد الاعمی	امیر بادشاہ کو کہتے ہیں اور اندھے کے رہنما
والجار والمشاور	کو اور پڑوسی کو اور اس کو جس سے مشورہ کیا جائے

ان چاروں پر لفظ امیر کا اطلاق اس بات پر دلیل ہے کہ لفظ امر میں اقتدار، رہنمائی، تعاون اور مشورہ کے معانی پائے جاتے ہیں -

(۵) سورۂ شعراء میں ہے :-

قَالَ لِلْمَلَإِ حَوْلَهُ إِنَّ هٰذَا	فرعون نے اپنے درباریوں سے جو اس کے گرد تھے کہا کہ

لَسَاحِرٌ عَلِيمٌ ۝ يُرِيدُ أَنْ يُخْرِجَكُمْ بِسِحْرِهِ فَمَاذَا تَأْمُرُونَ ۝ قَالُوا أَرْجِهْ وَأَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَائِنِ حَاشِرِينَ ۝ (۳۶)

سمجھتے تھے کہا بلاشبہ یہ کوئی بڑا ماہر جادوگر ہے اور چاہتا ہے کہ اپنے جادو سے تم کو تمہارے ملک سے نکال باہر کرے تو اب تم لوگ کیا صلاح دیتے ہو۔ انھوں نے کہا موسیٰ اور ان کے بھائی کے معاملے کو چند روز ملتوی رکھیں اور شہروں میں جادوگروں کے جمع کرنے کو ہرکارے روانہ فرمائیں۔

کون اس سے ناواقف ہوگا کہ فَمَاذَا تَأْمُرُونَ میں امر کا لفظ صلاح و مشورہ کے معنی میں مستعمل ہوا ہے اسی طرح ارجہ اور ابعث کے امر کے صیغے حکم دینے کے لیے نہیں بلکہ اظہار رائے اور مشورے کے لیے استعمال ہوئے ہیں

(۶) سورۂ طور میں ہے :۔

أَمْ تَأْمُرُهُمْ أَحْلَامُهُمْ بِهَٰذَا أَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ (۳۲)

کیا ان کی عقلیں ان کو ان باتوں کی تعلیم کرتی ہیں یا یہ ہے کہ یہ شریر لوگ ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس آیت میں امر کا لفظ سکھانے اور بتلانے کے معنی میں آیا ہے۔

(۷) مکے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس طاقت نہ تھی اس کے باوجود آپ لوگوں کو نیکی کی جو باتیں بتلاتے تھے اس کے لیے قرآن نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے الفاظ استعمال کیے ہیں اس کے علاوہ وحی الٰہی نے آپ کو تعلیم معروف کی جو ہدایت کی اس کے لیے بھی امر کا لفظ استعمال کیا۔

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ (اعراف ۱۵۷)

وہ ان کو نیک باتوں کا حکم فرماتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں۔

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ ۝ (اعراف ۱۹۹)

عفو و درگزر کی عادت ڈالیے اور نیک کام کی تعلیم کرتے رہیے اور جاہلوں سے اعراض کیجیے۔

ان آیتوں سے بھی معلوم ہوا کہ امر و نہی کے الفاظ صرف بزور قوت پابند کرنے یا روک دینے کے معنی میں نہیں آتے بلکہ دعوت و تبلیغ، تبشیر و انذار اور تعلیم و ارشاد کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے بڑے معروف کی دعوت دی وہ توحید ہے اور جس سب سے بڑے منکر کے انجام سے ڈرایا وہ شرک ہے۔ حافظ ابن کثیر يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

ومن اھم ذالک واعظمہ مما	سب سے اہم اور سب سے بڑا امر بالمعروف
بعثہ اللہ بہ من الامر بعبادۃ توحیدہ	وہ ہے جس کے ساتھ اللہ نے آپ کو مبعوث کیا کہ لوگوں
لا شریک لہ والنہی عن عبادۃ	کو صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہ کی عبادت کا حکم دیں
ما سواہ کما ارسل بہ جمیع	اور اس کے ماسوا کی عبادت سے منع کریں جیسا کہ اس
الرسل کما قال ولقد بعثنا فی کل امۃ	نے اسی دعوت کے ساتھ تمام رسولوں کو بھیجا۔ اللہ فرماتا
رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا	ہے: اور بے شک ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا
الطاغوت (تفسیر ابن کثیر)	کہ اے لوگو! اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت سے بچو

صاحب تفسیر مدارک لکھتے ہیں۔

بخلع الاوثان والانصاف العباد	وہ شرکا سے ترک تعلق اور بندگان خدا
وعن عبادۃ الاصنام وقطیعۃ	کے ساتھ انصاف کا حکم دیتے ہیں اور بتوں کی
الارحام (مدارک التنزیل)	پوجا اور قطع رحم سے منع کرتے ہیں۔

اگر کوئی شخص آپ کی یا کسی بھی نبیؑ کی دعوت توحید کو امر بالمعروف کے دائرے سے باہر نکالنے کی بات کہتا ہے تو قطعاً ایک بے دلیل بات کہتا ہے۔

(۸) يَابُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ	بیٹا نماز پڑھا کر اور لوگوں کو اچھے کاموں
بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ	کی نصیحت کیا کرو اور برے کاموں سے منع کیا کر
عَلٰى مَا اَصَابَكَ	اور (اس میں یا کسی اور حالت میں) تجھ پر جو مصیبت
(لقمٰن ۲۰)	واقع ہو اس پر صبر کیا کر۔

حضرت لقمٰن نے اپنے بیٹے کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتے رہنے کی جو نصیحت کی ہے اس سے کون شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو طاقت وقوت کے ذریعہ معروف کا حکم دینے اور منکر سے روکنے کا سبق پڑھا رہے ہیں وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ ہے کہ صرف اپنی اصلاح پر اکتفا نہ کرو بلکہ دوسروں کو بھی نیک بننے کی نصیحت کیا کرو اور برائیوں سے انہیں منع کیا کرو اور اس راہ میں جو اذیت اور مصیبت بھی آئے اس پر صبر کرو۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف کی اصطلاح نصیحت اور تلقین خیر کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔

(۹) نہایۃ میں ہے:-

وفی الحدیث امیری من الملٰئکۃ جبریل ای صاحب امری وولیی وکل من فزعت الی مشاورتہ ومؤامرتہ فھو امیرک

اور حدیث میں ہے (حضورؐ نے فرمایا) فرشتوں میں میرے امیر جبریل ہیں یعنی میرے خاص دوست اور صاحب مشورہ۔ اور ہر وہ شخص جس کے مشورے کا تمہیں ناگزیر ضرورت ہو وہ تمہارا امیر ہے۔

(۱۰) تفسیر المنار میں ہے:۔

وفی حدیث جابر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم: قال سید الشھداء حمزۃ بن عبد المطلب ثم رجل قام الی امام فامرہ ونھاہ فی ذات اللہ تعالی فقتلہ علی ذالک (رواہ الحاکم والدیلمی والضیاء المقدسی)

حدیث جابر میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شہداء کے سردار حمزہ بن عبد المطلب ہیں پھر وہ شخص جو کسی حاکم کے پاس گیا اور اس کو اللہ کے معاملہ میں حکم دیا اور منع کیا تو اس نے اس کو اس امر ونہی کی پاداش میں قتل کر دیا۔

یہ حدیث بھی اس بات پر نص صریح ہے کہ امر ونہی کے معنی کسی کو حکمًا پابند کرنے یا روک دینے ہی کے نہیں ہیں بلکہ کسی حکمراں تک اپنی بات پہنچا دینے کے بھی ہیں خواہ امر ونہی کرنے والے کی کمزوری و بےبسی اس درجہ کی ہو کہ وہ اس کی پاداش میں قتل کر دیا جائے اور کسی تک کلمۂ حق پہنچا دینے ہی کا نام تبلیغ وا بلاغ ہے۔ آپ انبیاء کرام علیہم السلام کی تبلیغ کا قرآن میں مطالعہ کریں تو پائیں گے کہ انھوں نے اپنی قوم کو اکثر وبیشتر اوقات حق کی تبلیغ صیغۂ امر ہی سے کی ہے۔

لغت اور قرآن و حدیث کے ان چند دلائل سے بھی یہ معلوم ہو گیا کہ امر ونہی کے لیے اقتدار و قوت نہ لغوی استعمال کے لحاظ سے ضروری ہے اور نہ شرعی اصطلاح کی جہت سے لازمی ہے بلکہ ایک کمزور شہری اپنے اوپر چلائے ہوئے ظالم اقتدار کو بھی امر ونہی کرتا ہے، کر سکتا ہے اور کرتا رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ قوت نہ ہونے کے باوجود ظالم اقتدار کے سامنے کلمۂ حق ادا کرنا افضل جہاد ہے اور اس کی پاداش میں قتل کیا جانا اعلیٰ درجے کی شہادت۔

مزید اطمینان کے لیے یہاں امام رازی کی تفسیر کا ایک اقتباس دے دینا بھی مفید ہے۔ وہ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۴ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

اس آیت نے تین چیزوں کا مکلف قرار دیا ہے سب سے پہلی چیز دعوت الی الخیر۔ پھر امر بالمعروف پھر نہی عن المنکر اور عطف کی وجہ سے ضروری ہے کہ یہ تینوں چیزیں ایک دوسرے سے متغائر ہوں لیکن ہم کہتے

ہیں کہ دعوت الی الخیر میں سب سے افضل اللہ کی ذات و صفات کے اثبات اور ممکنات کی مشابہت سے اس کی تنزیہ و تقدیس کی دعوت ہے۔ دعوت الی الخیر کے اس مذکورہ چیز پر مشتمل ہونے کی دلیل اللہ کا یہ قول ہے ادع الی ربك بالحكمة نیز یہ آیت قل هذه سبيلي ادعوا الى الله على بصيرة انا ومن اتبعني

اس کے بعد امام رازی نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے الفاظ میں یہ ہے:۔

اذا عرفت هذا فنقول الدعوة	جب تم نے یہ جان لیا تو ہم کہتے ہیں کہ دعوت
الى الخير جنس تحته نوعان احدهما	الی الخیر جنس ہے اور اس کے تحت دو نوعیں ہیں
الترغيب في فعل ما ينبغي وهو الامر	ان میں سے ایک کرنے کے لائق فعل کی ترغیب ہے
بالمعروف والثاني الترغيب في ترك	اور وہ امر بالمعروف ہے اور دوسری نہ کرنے کے
ما لا ينبغي وهو النهي عن المنكر	لائق فعل کو چھوڑ دینے کی ترغیب ہے اور وہ نہی
فذكر الجنس اولا ثم اتبعه بنوعيه	عن المنکر ہے پس اللہ نے پہلے جنس کا ذکر کیا پھر اس
مبالغة في البيان واما شرائط الامر	کے بعد اس کی دو نوعوں کا ذکر کیا۔ بیان میں مبالغہ
بالمعروف والنهي عن المنكر فمذكورة	کرنے کے لیے، باقی رہیں امر بالمعروف اور نہی عن
في كتب الكلام (تفسیر کبیر ج ۳)	المنکر کی شرطیں تو وہ کتب عقائد میں مذکور ہیں۔

اس عبارت سے دو باتیں بصراحت معلوم ہوئیں ایک یہ کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر دعوت الی الخیر ہی کی دو نوعیں ہیں اور جاننے والے جانتے ہیں کہ جنس کا اس کی ہر نوع میں پایا جانا ضروری ہے بلکہ اس کا خارجی وجود انواع کا محتاج ہوتا ہے۔ مجرد جنس کا خارجی وجود ممکن نہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ دعوت الی الخیر یا تو امر بالمعروف کی صورت میں پائی جائے گی یا نہی عن المنکر کی صورت میں۔ اسی بات کو دوسرے مفسرین نے عام خاص کی اصطلاح میں بیان کیا ہے وہ دعوت الی الخیر کو عام اور ان دونوں کو خاص قرار دیتے ہیں۔ مسئلے کی اس نوعیت کو سمجھیے اور پھر اس جدید دعوے پر غور کیجیے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دعوت الی الخیر سے خالی ہے۔

آیت کنتم خیر امۃ کی مختصر توضیح

اوپر کے دلائل اثبات مدعا کے لیے بالکل کافی ہیں لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خاص اس آیت کی بھی مختصر توضیح پیش کی جائے۔

سوال یہ ہے کہ: کیا اس آیت میں امر و نہی کے الفاظ صرف کسی شخص کو خود کسی فعل کا پابند کرنے یا اس کو

کسی فعل سے روک دینے کے معنی میں لیے جاسکتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ان الفاظ کو صرف اس معنی میں محدود کر دینے کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ میں اختصار کے ساتھ ذیل میں اس کے وجوہ عرض کرتا ہوں ۔

(۱) اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کا ٹکڑا اس بات پر دلیل ہے کہ امت مسلمہ کے امر و نہی کا سلسلہ اپنے دائرے سے باہر تک دراز ہے بلکہ یہ آیت بتاتی ہے کہ امت مسلمہ کا مقصد وجود ہی یہ ہے کہ اپنے ساتھ ساتھ وہ دوسرے انسانوں کی بھی اصلاح کرے ۔

مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کی تفسیر میں خیر امت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

وہ کسی خاص قوم و نسب یا مخصوص ملک و اقلیم میں محصور نہ ہوگی بلکہ اس کا دائرۂ عمل سارے عالم کو اور انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا گویا اس کا وجود ہی اس لیے ہوگا کہ دوسروں کی خیر خواہی کرے اور جہاں تک ممکن ہو انہیں جنت کے دروازے پر لا کھڑا کر دے ۔ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ میں اسی طرف اشارہ ہے ۔ (حاشیہ بر ترجمہ شیخ الہند)

جلالین کے شارح شیخ سلیمان الجمل لکھتے ہیں :-

اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ - ای لنفعھم و مصالحھم - یعنی یہ امت لوگوں کے مصالح و منافع کے لیے ظاہر کی گئی ہے ۔

(۲) دائرۂ اسلام سے باہر جو لوگ ہیں ان کی صلاح و فلاح اور ان کے منافع و مصالح کی اساس یہ ہے کہ وہ اسلام قبول کرلیں اور دائرۂ ایمان و اسلام میں داخل ہو جائیں اور یہ بات ثابت شدہ ہے کہ کسی کو مومن بنانے کے لیے طاقت کا استعمال اور جبر و اکراہ صحیح نہیں ہے اس لیے ان کو سب سے بڑے معروف توحید کا حکم دینے اور سب سے بڑے منکر شرک سے منع کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ان کے سامنے قولاً و عملاً حق کی شہادت دے کر ان پر توحید کی خوبیاں اور شرک کی برائیاں واضح کی جائیں ۔

(۳) تامرون اور تنھون کے صیغے پوری امت مسلمہ کے لیے آئے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ امر و نہی پوری امت مسلمہ کا فریضہ ہے۔ مسلمان ایک دوسرے کو نیکی کا جو حکم دیں گے اس کا مفہوم وہی ہے جو تواصی بالحق کا ہے جیسا کہ سورۂ والعصر میں کہا گیا ہے۔ ان کو یہ حق نہیں ہے کہ کسی معروف پر عمل کرانے کے لیے ایک دوسرے پر طاقت کا استعمال کریں۔ یہ حق صرف امراء و حکام کو حاصل ہے ۔ مثال کے طور پر اگر کوئی مکلف مسلمان بتانے

سکھانے اور ترغیب دینے کے باوجود نماز نہیں پڑھتا تو کسی عام شہری کو اس کا حق نہیں ہے کہ اس کو قید کر دے یا کوئی اور جسمانی سزا دے کیونکہ اس معاملے میں سزا دینا حکومت کا کام ہے۔

(۴) کسی منکر کے وقوع سے پہلے اس سے منع کرنے کو نہی عن المنکر کہتے ہیں اور جو منکر ابھی سامنے نہیں آیا اس کو روکنے کی ابتدا طاقت سے کرنا صحیح نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی مسلمان کسی دوسرے پر حملہ کر کے اس کو زخمی یا قتل کرنے کا ارادہ کر رہا ہو تو اس کو اس منکر سے روکنے کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے کہ فوراً طاقت استعمال کر دی جائے بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کو نصیحت کی جائے، سمجھایا جائے اور جب وہ نہ سمجھے اور حملے پر تُل ہی جائے تو پھر اس ظالم کا ہاتھ پکڑ لیا جائے اور طاقت استعمال کر کے اس کو اس منکر سے روکا جائے۔ قرآن نے دو لڑنے والے مسلمان گروہوں میں پہلے صلح کرانے کا حکم دیا ہے اور جب ان میں کا کوئی گروہ اس کو نظر انداز کر کے دوسرے گروہ کے ساتھ زیادتی پر مصر ہو تو پھر اس سے جنگ کرنے کی تعلیم دی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ نہی عن المنکر میں بھی شریعت کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ ابتدا زور و قوت کے ساتھ کی جائے۔

(۵) عام شہریوں کو بھی بعض مواقع پر طاقت کے استعمال کا جو حق شریعت نے دیا ہے وہ نہی عن المنکر کے لیے نہیں بلکہ تغییر منکر کے لیے دیا ہے اور ان دونوں میں فرق ہے (اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔)

(۶) علماء حق کا اس مسئلے پر اجماع ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر امراء و حکام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ شریعت نے یہ ذمہ داری ان آحاد مسلمین پر بھی ڈالی ہے جن کے پاس قوت نہیں ہوتی اور مسلمان ہمیشہ یہ کام کرتے اور اس راہ میں سخت سے سخت مصیبت سہتے چلے آ رہے ہیں۔

اختصار کے ساتھ جو یہ چند وجوہ عرض کیے گئے ان سے بھی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ:-

(الف) اس آیت میں امر و نہی کے الفاظ کو قوت کے ذریعہ کسی کو کسی فعل کا مکلف کرنے یا کسی فعل سے روکنے کے معنی میں محدود کرنا۔

(ب) اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو صرف مسلم معاشرے کے ساتھ خاص کرنا بالکل غلط ہے۔

ایک شبہے کا ازالہ

ایک معروف و مشہور حدیث یہ ہے:-

مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا	تم میں سے جو شخص کسی منکر کو دیکھے تو وہ اس کو
فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ	اپنے ہاتھ سے بدل دے اور اگر قدرت نہ ہو تو اپنی
فَبِلِسَانِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ	زبان سے اور اس کی بھی قدرت نہ ہو تو اپنے دل

وَ ذَالِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ (مسلم شریف) سے اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے۔

اس حدیث کو پیش کر کے اگر کوئی شخص یہ شبہہ پیدا کرے کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر عمل کے سلسلے میں شریعت کا اولین تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کو بزور اس کا پابند کیا جائے تو اس کا جواب کیا ہوگا؟ اس شبہے کا پہلا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں صرف تغییر منکر کے لیے ہاتھ استعمال کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس میں کسی معروف کا پابند بنانے کے لیے قوت کے استعمال کی اجازت بالکل نہیں ہے اس لیے استعمال قوت میں امر و نہی دونوں کو یکساں قرار دینا حدیث کا تقاضا نہیں ہے بلکہ شبہہ پیدا کرنے والے کے ذہن کا تقاضا ہے شریعت نے معروف پر عمل کرانے کے لیے عوام میں سے کسی شخص کو بھی عام لوگوں پر طاقت کے استعمال کی اجازت نہیں دی ہے۔ یہ حق اس نے صرف امراء و حکام کو دیا ہے۔ تفسیر المنار میں ہے:-

وقال الاستاذ فی الدرس هنا یخلطون بین النهی عن المنکر و تغییر المنکر الذی جاء فی حدیث (من رای منکم منکرا فلیغیره) و هذا شیئ اخر غیر النهی لان النهی عن الشیئ انما یکون قبل فعله والا کان رفعا للواقع او تحصیلا للحاصل

اور استاذ نے درس میں یہاں پر فرمایا: لوگ نہی عن المنکر اور تغییر منکر کو جس کا حکم حدیث مَنْ رَأَى منکم منکرا فلیغیرہ میں آیا ہے، خلط ملط کر دیتے ہیں تغییر منکر، نہی عن المنکر سے قطعاً ایک علیحدہ شے ہے اس لیے کہ کسی شے سے نہی اس کے وقوع میں آجانے سے پہلے ہوتی ہے ورنہ واقع کو غیر واقع ماننا پڑے گا یا اس کو تحصیل حاصل کہیں گے۔

اس بات کو انھوں نے ایک مثال دے کر سمجھایا ہے، کہتے ہیں:-

مثال کے طور پر تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ گھی میں آمیزش کر رہا ہے تو تم پر واجب ہے کہ اس منکر کو بالفعل مٹا دو یا ہاتھ سے اس کو روک دو [illegible] ہے کہ تم کو ایسا کرنے کی قدرت ہو۔ استطاعت کو یہاں نص حدیث ہی نے شرط قرار دیا ہے اور اگر تم کو قدرت نہ ہو تو تم پر زبان سے اس منکر کی تغییر واجب ہے اور یہ زبانی تغییر منکر اس کو زبان سے منع کرنے اور نصیحت کرنے کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اس میں یہ بات بھی داخل ہے کہ تم [illegible]

[illegible] اولاد کو نماز کا پابند بنانے کے لیے یا شوہر اپنی بیویوں کو سرکشی سے باز رکھنے کے لیے جسمانی سزا دے سکتے ہیں لیکن [illegible] جاہل کو سزا دینا بھی شریعت کا اولین تقاضا نہیں بلکہ جسمانی سزا [illegible] کی اجازت دی گئی ہے۔

کا معاملہ حاکم تک پہنچا؛ جو تمہاری قدرت — بڑھی ہوئی قدرت کے ساتھ اس کو روکے گا باقی رہی دل سے تغییر
تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس مرتکب منکر سے نفرت کرو اور اس کے فعل سے راضی نہ ہو اور نہی عن المنکر کے طرق
کثیر اور اس کے اسالیب متعدد ہیں اور ہر مقام کے لیے بات یکساں نہیں ہوتی۔
الشیخ محمد عبدہ کی اس توضیح سے معلوم ہوا کہ نہی عن المنکر کا موقع کسی منکر کے وقوع میں آجانے سے پہلے تک ہے
رجب کسی منکر کا ارتکاب شروع ہو چکا ہو یا بعض حالات میں اس کی تکمیل ہو چکی ہو تو ایسی صورت میں بشرط قدرت تغییر
منکر کا حکم ہے نہ کہ نہی عن المنکر کا۔ اور بعض حالات میں جب کوئی مسلمان کسی منکر کا ارتکاب کر کے فارغ ہو چکا ہو
و نہ اس منکر سے نہی کا موقع باقی رہتا ہے اور تغییر بالید کا بلکہ صرف تعزیر باقی رہتی ہے جو حکومت کا حق
ہے مثلاً اگر کوئی مسلمان شراب پی کر فارغ ہو چکا ہو تو اب نہ نہی کا موقع ہے اور نہ طاقت کے ذریعہ تغییر کا بلکہ صرف
سزا دی جا سکتی ہے جس کا حق کسی عامی کو نہیں بلکہ حاکم کو ہے۔ نہی عن المنکر اور تغییر منکر کے مواقع الگ الگ ہیں اور
دونوں کا حکم بھی الگ الگ ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ نہی عن المنکر کے عمل کے لیے طاقت کے استعمال کو
شریعت کا اولین تقاضا قرار دینا صحیح نہیں اور نہی کی حقیقت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔
حاصل کلام یہ ہے کہ سورۂ آلِ عمران کی یہ دونوں آیتیں امت مسلمہ کے مقصدِ وجود اور اساسی کام
کی بصراحت تعیین کرتی ہیں اور علماءِ امت ہمیشہ سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو امت مسلمہ کا اہم ترین فریضہ قرار
دیتے آرہے ہیں۔ جماعت اسلامی نے کوئی نئی بات نہیں کہی ہے بلکہ اس کے خلاف کہی ہوئی بات ایک نئے دعوے
کی حیثیت رکھتی ہے۔

(باقی)

ایک بڑا اعجوبہ

دنیا کے عجائبات میں ایک بڑا اعجوبہ یہ ہے کہ ظالم اپنی مظلومیت کے ڈھول پیٹتا ہے۔

اور پھر

مظلوم سے نفرت رکھنے والے لوگ ظالم کی شان میں تعریف و تحسین کے ڈنکے بجاتے ہیں۔

تحریکیں اور افراد کی قوتِ ارادی

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

ضعفِ ارادہ کی حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک تحریک کی دعوت سن کر اسے صدقِ دل سے لبیک کہتا ہے اور اوّل اوّل خاصا جوش بھی رکھتا ہے مگر وقت گزرنے کے ساتھ اس کی دلچسپی کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اسے نہ اس مقصد سے کوئی حقیقی لگن باقی رہتی ہے جس کے لیے وہ آگے بڑھا تھا اور نہ اس جماعت سے کوئی عملی وابستگی باقی رہتی ہے جس میں وہ دلی رغبت کے ساتھ شامل ہوا تھا۔ اس کا دماغ بدستور ان دلائل پر مطمئن رہتا ہے جن کی بنا پر اس تحریک کو اس نے برحق مانا تھا۔ اس کی زبان بدستور اس کے برحق ہونے کا اقرار کرتی رہتی ہے۔ اس کی دل کی شہادت بھی یہی رہتی ہے کہ یہ کام کرنے کا ہے اور ضرور ہونا چاہیے لیکن اس کے جذبات سرد پڑ جاتے ہیں اور قوائے عمل کی حرکت سست ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس میں کسی بدنیتی کا ذرہ برابر دخل نہیں ہوتا۔ مقصد سے انحراف بھی نہیں ہوتا۔ نظریے کی تبدیلی بھی قطعاً واقع نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے آدمی جماعت کو چھوڑنے کا خیال نہیں کرتا۔ مگر بس وہ ارادے کی کمزوری ہوتی ہے جو ابتدائی جوش ٹھنڈا ہو جانے کے بعد مختلف شکلوں میں اپنے کرشمے دکھانے شروع کر دیتی ہے۔

کام چوری

ضعفِ ارادہ کا ظہور کام چوری کی صورت میں ہوتا ہے۔ آدمی ذمہ داریاں قبول کرنے سے جی چرانے لگتا ہے۔ مقصد کی راہ میں وقت اور محنت اور مال خرچ کرنے سے گریز کرنے لگتا ہے۔ دنیا کے ہر دوسرے کام کو اس کام پر ترجیح دینے لگتا ہے جسے وہ زندگی کا نصب العین قرار دے کر آیا تھا۔ اس کے اوقات میں اس کی محنتوں میں اس کے مال میں اس کے نام نہاد مقصدِ حیات کا حصہ کم سے کم ہوتا چلا جاتا ہے اور جس جماعت کو برحق مان کر اس سے وابستہ ہوا تھا اس کے ساتھ بھی وہ صرف نظم و ضبط کا تعلق باقی رکھتا ہے۔ اس کے بھلے اور برے سے کوئی غرض نہیں رکھتا۔ نہ اس کے معاملات میں کسی قسم کی دلچسپی لیتا ہے۔

یہ حالت کچھ اس قدر بتدریج طاری ہوتی ہے۔ جیسے جوانی پر بڑھاپا آتا ہے۔ اگر آدمی اپنی اس کیفیت پر نہ خود متنبہ ہو، نہ کوئی اسے متنبہ کرے تو کسی وقت بھی وہ یہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ جس چیز کو میں اپنا مقصد زندگی قرار دے کر جان و مال کی بازی لگانے کے لیے اٹھا تھا اس کے ساتھ اب یہ کیا معاملہ کرنے لگا ہوں۔ یوں محض غفلت اور بے خبری کے عالم میں آدمی کی دلچسپی و وابستگی بے جان ہوتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ کسی روز بے خبری ہی میں اس کی طبعی موت واقع ہو جاتی ہے۔

مرض متعدی اجتماعی زندگی میں اگر پہلے آدمی کے اندر اس کیفیت کے ظہور کا نوٹس نہ لیا جائے اور اس کے نشوونما کو روکنے کی فکر نہ کی جائے تو ایک ضعیف الارادہ شخص کی چھوت دوسرے تمام ان لوگوں کو لگنی شروع ہو جاتی ہے جن کے اندر ضعف ارادہ پیدا ہو رہا ہو۔ اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ مل جاتا ہے۔ اچھے خاصے سرگرم آدمی دوسروں کو کام نہ کرتے دیکھ کر خود بھی کام چھوڑ بیٹھتے ہیں اور کوئی اللہ کا بندہ یہ نہیں سوچتا کہ میں کسی اور کے نہیں، خود اپنے مقصد حیات کی خدمت ہی کے لیے آیا تھا۔ اگر دوسرا اپنا مقصد چھوڑ چکے ہیں تو میں اپنے مقصد سے کیوں دست بردار ہو جاؤں۔ ان لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہوتی ہے جو صرف اس لیے جنت کے راستے پر چلنا چھوڑ دے کہ دوسرے ساتھیوں نے چھوڑ دیا ہے۔ گویا جنت اس کی اپنی منزل مقصود نہ تھی۔ یا وہ اس شرط کے ساتھ جنت جانا چاہتا تھا کہ دوسرے بھی وہاں جائیں اور شاید دوسروں ہی کے ساتھ وہ جہنم جانے کا ارادہ بھی کرے اگر انہیں اس طرف جاتے دیکھے۔ کیونکہ اس کا اپنا مقصد کوئی نہیں ہے جو کچھ دوسروں کا مقصد ہے وہی اس کا بھی ہے۔ اس ذہنی کیفیت میں مبتلا ہو جانے والے لوگ ہمیشہ کام نہ کرنے والوں کو مثال بناتے ہیں۔ کام کرنے والوں میں انہیں کوئی قابل تقلید مثال نہیں ملتی۔

یکے بعد دیگرے تاہم یہ بسا غنیمت ہے کہ کوئی شخص بس سیدھے سادے طریقے پر ضعف ارادہ کی بنا پر سست پڑ جائے اور سست ہی پڑ کر رہ جائے لیکن انسانی فطرت جب ایک دفعہ کمزوری میں مبتلا ہو جاتی ہے تو دوسری کمزوریاں ابھرنے لگتی ہیں اور کم ہی لوگ اس پر قادر ہوتے ہیں کہ اپنی ایک کمزوری کی مدد پر دوسری کمزوریوں کو نہ آنے دیں۔ بالعموم آدمی کو اس میں شرم محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک کمزور انسان کی حیثیت سے ظاہر کرے یا اسے برداشت کرے جائے کہ لوگ اسے کمزور سمجھیں۔ وہ کسی طرح اس کا اعتراف نہیں کرتا کہ ضعف ارادہ نے اسے سست کر دیا ہے۔ اس کے بجائے وہ اس پر پردہ ڈالنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے جن میں سے ہر طریقہ دوسرے [illegible] ہوتا ہے

مثلاً کام نہ کرنے کے لیے طرح طرح کے بہانے کرتا ہے اور آئے دن کوئی نہ کوئی عذر لنگ پیش کر کے ساتھیوں کو یہ فریب دینے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کام کے نہ کرنے کا اصل سبب مقصد سے لگاؤ اور دلچسپی میں کمی نہیں ہے بلکہ واقعی رکاوٹیں اس کی راہ میں حائل ہیں۔ یہ گویا سستی کی مدد پر جھوٹ کو بلاتا ہے اور یہاں سے اس آدمی کا اخلاقی تنزل شروع ہوتا ہے جس نے اول اول صرف ترقی کی بلندیوں پر چڑھنا چھوڑ دیا تھا۔

یہ حیلہ جب پرانا ہو کر بے کار ثابت ہونے لگتا ہے اور آدمی کو خطرہ ہوتا ہے کہ اب اصل کمزوری کا راز فاش ہوا چاہتا ہے تو یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ دراصل اپنی کمزوری کی وجہ سے سست نہیں ہوا ہے۔ بلکہ جماعت کی کچھ خرابیوں نے اسے بد دل کر دیا ہے۔ گویا آپ خود تو بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں مگر کیا کریں، ساتھیوں کے بگاڑ نے دل توڑ کے رکھ دیا۔ اس طرح یہ گرتا ہوا انسان جب ایک جگہ قدم نہیں جما سکتا تو اور زیادہ نیچے اتر جاتا ہے اور اپنی کمزوری کو چھپانے کی کوشش اسے یہ مظلمہ اپنی گردن پر لینے کے لیے آمادہ کر دیتی ہے کہ جس کام کو بنانے کے قابل وہ نہ رہا تھا اسے اب بگاڑنے کی کوشش شروع کر دے۔

٩ **الٹا الزام** ابتدائی مرحلے میں بد دلی کا معاملہ مہمل رہتا ہے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ حضرت کیوں بد دل ہیں خرابیوں کی مبہم شکایتیں دبی زبان سے ظاہر ہوتی ہیں۔ مگر ان کی کوئی تفصیل معلوم نہیں ہوتی۔ ساتھی اگر حکمت سے کام لیں اور اصل مرض کو سمجھ کر اس کا مداوا کرنے کی فکر کریں تو یہ گرتا ہوا شخص مزید گرنے سے رک بھی سکتا ہے اور اوپر اٹھایا بھی جا سکتا ہے۔ لیکن اکثر نادان دوست کچھ بے جا جوش کی وجہ سے اور کچھ اپنے جذبۂ استعجاب کی تسکین کی خاطر کھوج کرید شروع کر دیتے ہیں اور اسے اجمال کی تفصیل بیان کرنے پر مجبور کرتے ہیں اس کے بعد وہ اپنی بد دلی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے ہر طرف نظر دوڑاتا ہے۔ مختلف افراد کی انفرادی کمزوریاں چن چن کر جمع کرتا ہے۔ جماعت کے نظام اور اس کے کام میں نقائص ڈھونڈھتا ہے اور ایک فہرست بنا کر سامنے رکھتا ہے کہ یہ ہیں وہ خرابیاں جنہیں دیکھ دیکھ کر آخر کار یہ خاکسار بد دل ہو گیا ہے۔ یعنی اس کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ مجھ جیسا مرد کامل جو سب کمزوریوں سے پاک تھا ان کمزور ساتھیوں اور اس نقائص سے لبریز جماعت کے ساتھ بھلا کس طرح لگ کے چل سکتا ہے؟ اور یہ طرز استدلال اختیار کرتے وقت شیطان اسے یہ بات بھلا دیتا ہے کہ اگر واقعی یہ حالات تھے تو ہمت ہٹنے کی بجائے یہ تو اور زیادہ سرگرم ہونے کا متقاضی تھا جس کام کو آپ اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے کر انجام دینے کے لیے اٹھے تھے اسے اگر دوسرے اپنی خامیوں سے بگاڑ رہے تھے تو

[illegible] کی خامی [illegible]

تدارک فرماتے۔ آپ کے گھر میں آگ لگی ہوا اور گھر کے دوسرے لوگ اسے بجھانے میں کوتاہی برتیں تو آپ بددل ہو کر بیٹھ جائیں گے یا جلتے ہوئے گھر کو بجھانے کے لیے ان کوتاہ دوستوں سے بڑھ کر چابک دستی دکھائیں گے۔

اس معاملہ کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے اور اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش میں خود اپنے نامۂ اعمال کا سارا حساب دوسروں کے نامۂ اعمال میں درج کر ڈالتا ہے۔ اور بھول جاتا ہے کہ نامہ ہائے اعمال کا کوئی ریکارڈ ایسا بھی ہے جس میں کسی کی مکاری سے ایک شوشہ بھی نہیں بدل سکتا۔ وہ دوسروں کے نامۂ اعمال میں بہت سی وہ کمزوریاں گنا تا ہے جن میں وہ خود مبتلا ہوتا ہے۔ وہ جماعت کے کردار میں بہت سی ان خرابیوں کی نشان دہی کرتا ہے جن کے پیدا کرنے میں اس کا اپنا حصہ دوسروں سے کم نہیں کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ وہ ان کاموں پر سراپا شکایت بنا ہوا نظر آتا ہے جو اس کے اپنے کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور جب وہ کہتا ہے کہ یہ کچھ دیکھ کر اس کا دل ٹوٹ گیا۔ تو اس کے معنی صاف یہ ہوتے ہیں کہ ان سب چیزوں سے وہ خود بری الذمہ ہے۔

شیطانی وسوسہ

کوئی انسانی جماعت کمزوریوں سے خالی نہیں ہوتی نہ کوئی انسانی کام نقائص سے پاک ہوتا ہے۔ دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہوا اور نہیں ہو سکتا کہ انسانی معاشرے کی اصلاح و تعمیر کے لیے فرشتے فراہم ہوں اور سارا کام معیار کمال کے مطابق کریں۔ کمزوریاں ڈھونڈھیے تو کہاں نہ مل جائیں گی نقائص تلاش کیجیے تو کس جگہ وہ نہ پائے جائیں گے۔ انسانی کام کمزوریوں اور خامیوں کے ساتھ ہی ہوا کرتے ہیں، اور معیار کمال پر پہنچنے کی ساری کوششوں کے باوجود کسی ایسی حالت پر پہنچنے کی کم از کم اس دنیا میں امید نہیں کی جاسکتی جہاں انسان اور اس کا کام سبوح و قدوس ہو جائے۔

اس حالت میں اگر کمزوریوں اور خامیوں کی نشان دہی اس غرض کے لیے ہو کہ انہیں رفع کر کے اور معیار کمال کی طرف بڑھنے کے لیے مزید جد و جہد کی جائے تو اس سے زیادہ مبارک کام کوئی نہیں۔ انسانی کاموں میں جو اصلاح و ترقی بھی ممکن ہے اسی طریقے سے ممکن ہے اور اس سے غفلت تباہ کن ہے لیکن اگر انفرادی کمزوریاں اور اجتماعی خامیاں اس لیے تلاش کی جائیں کہ انہیں کام نہ کرنے اور بددل ہو کر بیٹھ جانے کے لیے بہانہ بنانا ہو۔ تو یہ خالص شیطانی وسوسہ اور نفس امارہ کا مکر ہے۔ یہ بہانہ بہتر سے بہتر ممکن حالات میں بھی ہر حیلہ جو انسان کو مل سکتا ہے اس بہانے کا سد باب اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک فرشتوں کی کوئی ٹولی انسانی جماعتوں کی جگہ لینے کے لیے نہ آجائے اور اس بہانے کو پیش کرنا ہی ایسے شخص کو زیب نہیں دیتا ...

کے پاک ہونے کا ثبوت مہیا نہ کر دے ۔ اس طرح کی باتوں کا حاصل کبھی یہ نہیں ہوتا کہ کوئی کمزوری دور ہو یا کوئی خامی رفع ہو جائے بلکہ یہ کمزوریوں اور خامیوں کو بڑھانے کا مجرب نسخہ ہے ۔ اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص یہ راہ اختیار کر کے اپنے گرد و پیش کے دوسرے تمام ضعیف الارادہ لوگوں کے لیے ایک غلط مثال بن جاتا ہے وہ ان سب کو راہ دکھا دیتا ہے کہ اپنے ضعف کا اعتراف کر کے نکو بننے سے بچیں اور خود اپنے نفس کو بھی فریب دے کر مطمئن کر لیں اس کی پیروی میں ہر بے عمل آدمی بد دلی کا ڈھونگ رچانے لگتا ہے اور اس بد دلی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے ساتھیوں کی کمزوریاں اور جماعت کی خامیاں ثابت کرنے کے لیے ساتھیوں کی کمزوریاں اور جماعت کی خامیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایک فہرست تیار کرنا شروع کر دیتا ہے ۔ پھر اس سے بدی کا ایک چکر چل پڑتا ہے ۔ ایک طرف جماعت میں عیب چینی و خوردہ گیری اور الزام وجواب الالزام کی ایک وبا پھوٹ پڑتی ہے جو اس کے اخلاقی مزاج کا ستیاناس کر دیتی ہے ۔ دوسری طرف اچھے خاصے سرگرم اور مخلص آدمی جو کسی ضعف ارادہ میں مبتلا نہ تھے ۔ کمزوریوں اور خامیوں کے اس چرچے سے متاثر ہو کر بد دلی کا شکار ہو جاتے ہیں اور جب اس مرض کی روک تھام کے لیے کچھ کیا جاتا ہے تو بد دلوں کا ایک بلاک بننے لگتا ہے ۔ بد دلی ایک مسلک اور ایک تحریک کی شکل اختیار کرتی ہے ۔ بد دل ہونا، بد دل کرنا اور بد دلی کے حق میں دلائل فراہم کرنا بجائے خود ایک کام بن جاتا ہے اور جو لوگ اصل مقصد کے لیے کام کرنے میں سست ہو چکے تھے ۔ اس کام میں خوب دلچسپی دکھانے لگتے ہیں ۔ یوں ان کی مری ہوئی دلچسپی زندہ ہوتی ہے مگر اس شان کے ساتھ کہ اس کا زندہ ہونا اس کی موت سے زیادہ افسوسناک ہوتا ہے ۔

آخرت کے حریف عقائد

(قسط ۵)

(جناب سلطان مبین صاحب ایم اے)

پتروں کے نذر و نیاز کے آداب کی تفصیل بڑی طویل ہے۔ اس کے کسی جزو کی نقل و حکایت کی طوالت یہ مقالہ برداشت نہیں کرسکتا۔ تاہم تتمہ کے طور پر شرادھ کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالنی ضروری ہے تاکہ یہ بات پوری واضح ہو جائے کہ کس طرح پتروں کی سرزمین پر اجنبی تناسخ نے غاصبانہ قبضہ جما لیا ہے۔ برہمن متکلمین نے تناسخ کی وکالت کرکے اپنی مرعوبیت و مفاد پرستی کا ثبوت خود ہی فراہم کر دیا ہے۔ مردوں کے طفیل میں کھانے کے لیے جن برہمنوں کو مدعو کیا جاتا تھا، ان کے بارے میں یہ عقیدہ تھا کہ ان پر پتروں کا سایہ ہے ان کو پتروں کی معیت و تقرب حاصل ہے۔ ان کا کھانا دراصل پتروں کا تناول فرمانا ہے۔

اجداد (پتر) ان مدعو برہمنوں میں سکونت پذیر رہتے ہیں۔ ہوا کی طرح سے وہ ان (برہمنوں) کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں اور ان کے بیٹھنے پر بیٹھتے ہیں۔ منوسمرتی : ۳ : ۱۸۹

غاو کلٹ" رسم مردہ پرستی میں اتنی پختگی آگئی تھی کہ کھلے بندوں یہ کہا جاتا تھا کہ "پنڈوں" کی نذر ہی سے مردہ دوبارہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر پنڈ نہیں دیا گیا تو روح بے دست و پا رہتی ہے۔ چنانچہ (۱۵) پہلے دن کے پنڈ سے سر پیدا ہوتا ہے۔ (۱۶) آنکھ کان ناک دوسرے دن کے پنڈ سے پیدا ہوتا ہے۔ کنپٹی منہ اور گردن اسی طرح تیسرے دن (کے پنڈ سے پیدا ہوتے ہیں) (۲۰) دل پہلو اور پیٹ چوتھے دن (کے پنڈ سے) پیدا ہوتا ہے۔ کمر پیٹھ اور زیر پانچویں دن پیدا ہوتا ہے۔ (۱۸) چھٹے سے دونوں رانیں اور ساتویں سے گھٹنا جاننا چاہیے اور گھٹنوں کے نیچے دونوں پنڈلیاں ہوتی ہیں۔ (۱۹) نویں دن دونوں قدم جانے جاتے ہیں اور دسویں دن بھوک معلوم پڑتی ہے

گرڑپران : پریت کلپ : ۲۳ : ۱۶ – ۱۹ وغیرہ

(۲) پہلے دن کے پنڈ سے سر پیدا ہوتا ہے، دوسرے دن گردن اور تیسرے دن دل پیدا ہوتا ہے۔ (۳۳) چوتھے دن پیٹھ پانچویں دن ناف کی پیدائش ہے چھٹے دن کمر ساتویں دن شرم گاہ اور آٹھویں دن ران (پیدا ہوتی ہے۔ ۳۴) نویں پنڈ سے پنڈلی اور قدم پیدا ہوتے ہیں اور دسویں پنڈ سے بھوک کی پیدائش ہوتی ہے اور بھوک سے پریشان ہو کر کھانے کے لیے (اپنے) دروازے کو دیکھتا ہے۔ گرڈ پران: پریت: ۲: ۳۲-۳۴ اور مُردوں کو "نذر و نیاز" کا انتظار رہتا ہے جیسا کہ: جس طرح کسان اچھی بارش کا منتظر رہتا ہے اسی طرح مردے (پتر) بھی امید رکھتے ہیں کہ ہمارا لڑکا یا پوتا کھانے کو دے گا۔ مہابھارت: انوشاسن: ۶۳: ۲۰ دیگر زمین پر رہنے والے سب جاندار جس طرح بارش کا انتظار کرتے ہیں اسی طرح خیر اندیشی کی دنیا میں رہنے والے پتر (مردگان) پتر میدھ (نیاز مردگان) کا انتظار کرتے ہیں۔ مہابھارت: انوشاسن: ۴۵: ۱ ۱۳۶ مطبوعہ گنیا پریس طبع اول

اور اگر مردوں کے لیے نذر نہیں گزاری تو وے بد روح ہو کر فضا میں روتے چلاتے، چکراتے پھرتے ہیں گرڈ پران: پریت کلپ: ۲۵: ۱۴ غرضیکہ مردوں کی زندگی کا انحصار بڑی حد تک وارثوں کی نذر و نیاز پر ہے یہاں کی داد و دہش پر پتر اور دیوتا زندہ رہتے ہیں۔ مہابھارت: انوشاسن: ۹: ۲۷ جب یہ خیال پیدا ہو گیا کہ مردے بھوک و پیاس سے پریشان ہوتے ہیں اور ان کو بھی کھانے پینے کی احتیاج ہے تو یہ بات لازما ماننی پڑی کہ اچھی غذا سے ان کو زیادہ سیری ہوگی اور تنگ دستی و افلاس کے بنا پر مجبوراً خشک پانی ہی پر گذر اوقات کرنی ہوگی پس مردوں کی آسودگی کے لیے ایک رات گوشت وغیرہ کا انتظام کیا گیا تو دوسری رات پانی محض پہ قناعت کرنی پڑی۔ (۲۶۷) آدمی کے ذریعے دیے گئے تل دھان جو، ارد، پانی، کند (جڑ) یا پھل سے مردے ایک ماہ تک آسودہ رہتے ہیں۔ (۲۶۸) مردے مچھلی کے گوشت سے دو مہینے، ہرن کے گوشت سے چار مہینے چڑیا کے گوشت سے پانچ مہینے۔ (۲۶۹) بکرے کے گوشت سے چھ مہینے۔ چتلے مرگ کے گوشت سے سات مہینے این مرگ کے گوشت سے آٹھ مہینے اور رورو مرگ کے گوشت سے نو مہینے۔ (۲۷۰) سور اور بھینسے کے گوشت سے مردے دس مہینے آسودہ رہتے ہیں کچھوے اور خرگوش کے گوشت سے گیارہ مہینے۔ (۲۷۱) گائے کے دودھ اور کھیر سے ایک سال اور لمبے کان کے خصی کے گوشت سے بارہ برس کی آسودگی ہوتی ہے۔ (۲۷۲) موسم کے ساگ بڑے سنبھالو (درخت) مچھلی گینڈا، لوہا بکرا، شہد رشیوں کا اناج ہمیشہ ابدی آسودگی دیتا ہے۔ منوسمرتی: ۳: ۲۶۷-۲۷۲ دیگر

(۱) مچھلی خرگوش، نیولا، سور، بکرا، این مرگ، رورو مرگ، گو یو مرگ۔ (۲) بھیڑ کے گوشت سے گائے کے

وہ سے مرے ہوئے باپ دادا مہینوں مہینوں آسودہ رہتے ہیں۔ وہ دراز گوش خصی کے گوشت سے ہمیشہ آسودہ رہتے ہیں۔ (۳) گینڈے کا گوشت، موسم کی سبزی، شہد مستحسن ہیں اور ابدی آسودگی دینے والے ہیں۔ بشنو پران: ۳: ۱۶: ۱-۳

اب آب محض کی نذر کی کیفیت سنیے۔ (۲۴) پریت لوک (عالم اجداد) میں خاص طور سے پانی کی روشن خوبیاں ہیں۔ یہ عالم بالا میں آرام دہ اور کم خرچ بالانشین ہو۔ (۲۵) وہاں ان پانیوں سے "پنیا ودکا" پاکاب نام کی ندی بنتی ہے۔ اس کا پانی امرت کی طرح شیریں، ٹھنڈا اور نہ گھٹنے والا ہوتا ہے۔ (۲۶) جو یہاں پانی دیتا ہے وہ وہاں پیئے گا۔ مہابھارت: انوشاسن: ۱۳: ۲۴-۲۶ دیگر

(۵۷) پریت لوک میں آرام دینے والی پانی کی روشن خوبیاں ہیں۔ (۵۸) وہاں ان پانیوں سے "پشپ اودکا" گل آب کی ندی بنتی ہے۔ وہاں مردے امرت کی طرح ٹھنڈا پانی پیتے ہیں۔ مہابھارت میں ۲۰۰، ۵۷، ۵۸

پہلے کے حوالہ (منوسمرتی: ۳: ۱۸۹) میں یہ بات مذکور ہو چکی ہے کہ نذر کے لیے مدعو برہمنوں پر پتروں کا سایہ ہوتا ہے یا کم از کم ان مدعو برہمنوں کو پتروں کی معیت کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ پس پتروں کی معیت کے نباہ کے لیے یا پتروں کے بار خاطر اور ناگواری کو دور کرنے کے لیے پرہیز، احتراز کے سیکڑوں آداب وجود میں آ گئے۔ نیاز کی مجلس کی مجلس سے اندھوں، کانوں، شودروں، کتوں، سوروں، مرغیوں، ہجڑوں، حائضہ، لولے لنگڑوں کو دور رکھا جاتا تھا اور مردوں، بزرگوں کی معیت و قربت کے شرف کا مستحق وہی برہمن ہو سکتا تھا جو عالم باعمل ہو، پاکباز ہو، حلال خور ہو۔ چنانچہ نذر کھلانے کے لیے پاک باز و عالم برہمن کو مدعو کیا جاتا تھا۔

پس مردوں کی دعوت، معیت، قربت، ان کا کھانا پینا قطعی طور پر "پتری لوک" عالم اجداد کی خبر دیتا ہے تناسخ کے کولھو میں جتی ہوئی روحیں بھلا خصی کے قلیہ اور "پشپ اودکا" ندی کے پانی سے کیا آسودہ و سیراب ہوں گی

عالم برزخ

یم راج کے سپاہی مردے کو کس طرح گھسیٹ کر لے جاتے ہیں؟ مردہ کس طرح روتا بلبلاتا ہوا جاتا ہے؟ تفصیل ہذا گرڈ پران کا لفظ بہ لفظ ترجمہ ہے۔ گرڈ پران کا جزو "پریت کلپ" بالعموم مردے کی بھلائی کے لیے اکثر ہندو گھروں میں مرنے کے بعد پڑھا اور سنا جاتا ہے۔

(۴۶) دسویں پنڈ سے جہاں کو کھا جانے والی بھوک لگتی ہے جس سے مردہ گیارھویں اور بارھویں کی نذر کو دو دن تک کھاتا ہے۔ (۴۴) تیرھویں تاریخ کو یم راج کے سپاہی مردے کو پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ وہ پکڑے ہوئے بندر کی طرح اس راستہ میں چلتا جاتا ہے۔ (۴۵) مردہ اس طرح راستہ میں چلتا ہوا ہائے ہائے! اے پوترے! کہتا ہے

آہ آہ کرکے وہ ہر وقت روتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے کیا کیا؟ (۴۶) خوش قسمت ہی بھارت کی سرزمین میں انسان ہو کر پیدا ہوتا ہے۔ اس (آدمی کے جنم) کو اور آرام دہ گھر پاکر میں نے دان نہیں دیا۔ (۴۷) اور وہ (گھر) دوسرے کی ملکیت ہو گیا۔ مجھ مجبور کا سب بے کار ہو گیا۔ یم راج کے سپاہیوں سے پیٹا جاتا ہوا پہلے کے جسم کی باتوں کو سوچتا ہوا کہتا ہے۔ (۴۸) میں نے نہ دان کیا نہ آگ میں ہون کیا۔ نہ تپ کیا۔ نہ خداوندوں کی پوجا کی۔ نہ جنت کی (گنگا) ندی میں غسل کیا۔ میں جسمانی راحتوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ (۴۹) میں نے خشک علاقوں میں آدمیوں، جانوروں، چڑیوں کے لیے تالاب نہیں بنوایا، گایوں کے لیے چراگاہ نہیں بنوایا۔ میں جسمانی راحتوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ (۵۰) نہ نذرانہ خیرات کیا، نہ گائے وغیرہ کی پوجا کی۔ نہ علم پڑھا، نہ مذہبی کتابوں کی تعظیم کی، نہ خوف زدہ جانور کی حفاظت کی۔ میں جسمانی راحتوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ گرڈ پران: پریت کلپ: ۲: ۴۴: ۵۰

باب ۳ (۱) فضا میں اڑنے والے سپاہی اس طرح روتے چلاتے بھوکے (مردہ) کو اس طرح گھسیٹ کر لے جاتے ہیں۔ (۲) تب وہ سترہ دن تک فضا میں چلا جاتا ہے اور اٹھارویں دن سومیہ پور پہنچ جاتا ہے۔ (۳) اس جگہ میں مردوں کی جماعت رہتی ہے وہاں پشپ بھدرا نام کی ندی اور خوبصورت برگد کا درخت ہے۔ (۴) یم راج کے سپاہی اس (مردہ) کو وہاں سستانے دیتے ہیں۔ وہاں وہ دکھی ہو کر بال بچوں اور دھن دولت کی یاد کرتا ہے (۵) وہ پیاس سے پریشان اور تھکا ہوا پُر درد لہجہ میں روتا ہے۔ اور اپنی دولت اپنی بیویاں گھر اور بیٹے کے بارے میں سوچتا ہے۔ (۶) خادم دوست مشیر کار سبھی اب پرائے ہو جاتے ہیں۔ سپاہی اس بھوکے (مردہ شخص) سے کہتے ہیں۔ (۷) دولت کہاں؟ لڑکے اور بیوی خادم اور دوست ایسے ہی ہیں۔ دھرم سے کمایا ہوا زاد راہ کہاں ہے؟ اے جاہل! راستہ میں دور تک چلا چل۔ (۸) تو نے یم راج کے راہ (کی مشکلات) کو نہیں سمجھا۔ آخرت میں کامیابی کے لیے زاد راہ لیکر نہیں آیا۔ تم کو تو چلنا ہی پڑے گا۔ (۹) تم نے "یم گیتا" کی باتوں کو توجہ سے نہیں سنا تب یہ کہہ کر سپاہی اس کو موگریوں سے پیٹتے ہیں۔ (۱۰) اگر یہاں (مردہ کے) لڑکے نے موہ سے، محبت سے، یا مہربانی سے ماہواری پنڈ (کی نذر) دیا تو مردہ اس کو کھاتا ہے اور وہاں سے "سوری پور" کو چل پڑتا ہے۔ (۱۱) وہاں کا بادشاہ جنگم نام کا کال کی شباہت کا ہے۔ مردہ ان کو دیکھ کر کانپ اٹھتا ہے۔ (۱۲) اس (سوری پور) شہر میں مردہ رشتہ داروں کے ذریعہ گزاری گئی ہوئی "ڈیڑھ مہینہ" کی نذر کے آب و دانہ کو کھاتا ہے۔ پھر وہاں سے چل پڑتا ہے (۱۳) مردے شب و روز چل کر "نریندر نگر" کو پہنچ جاتے ہیں۔ مردہ پر خطر جنگلات کو دیکھ دیکھ کر ہر وقت روتا

چلاتا ہے۔ (۱۴) ڈراونوں (سپاہیوں، دمندوں) سے ستایا جاتا ہوا وہ بار بار گریہ وزاری کرتا ہے۔ دو مہینہ گزر جانے
پر مردہ اس ترینید نگر کو پار کر جاتا ہے۔ (۱۵) یہاں رشتہ داروں کے ذریعہ دیے گئے ہوئے آب و دانہ اور کپڑے
کو کھا پہن کر کھاتا ہوا ایک مہینہ یم راج کے سپاہیوں کے ذریعہ آگے گھسیٹا جاتا ہے۔ (۱۶) تین مہینہ گزر جانے
پر وہ خوبصورت گندھرو نگر میں پہنچ جاتا ہے اور وہ ہاں سہ ماہی نذر کے پنڈ کو کھا کر آگے بڑھتا ہے۔ (۱۷) چار مہینے
پورا ہو جانے پر مردہ ناگ پور میں پہنچ جاتا ہے۔ وہاں مردہ کے اوپر تکلیف دینے والے پتھر برستے ہیں۔ (۱۸) چہار
ماہی نذر کے پنڈ کو کھا کر مردہ کچھ سکون پاتا ہے۔ (۱۹) پانچ مہینہ پورا ہونے پر مردہ کرور پور میں آجاتا ہے اور اس
شہر میں رشتہ داروں کے ذریعہ دی ہوئی نذر کو کھا کر بے اختیار پڑا رہتا ہے۔ (۲۰) پھر چھٹے مہینے کے شروع ہونے
پر کرونچ نگر کو چھوڑ دینے کا حکم دیتے ہیں۔ (۲۲) مردہ پھر چتر نگر کو جاتا ہے۔ جہاں چتر نام کا راجہ ہے۔
سورج کا لڑکا یم راج کا چھوٹا بھائی یہاں راج کرتا ہے۔ (۲۳) وہاں یم راج کے سپاہی شش ماہی نذر کے پنڈ سے
سیر و آسودہ ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ مردہ راہ میں بھوک اور پیاس سے بار بار تکلیف جھیلتا ہے۔ (۲۴) وہ مردہ
سوچتا ہے کہ کاش میرے رشتہ دار نذر دیتے کہ غم کے سمندر میں ڈوبتے ہوئے کچھ آرام ملتا۔ (۲۵) اس طرح راستہ
میں سپاہیوں سے رنج کے جانے پر بھی روتا ہوا مردہ ہزاروں کشتیبانوں کے سامنے آپہنچتا ہے۔ (۲۶) ملاح اس پار
اترنے کا ارادہ کرنے والے مردے کو مہا بیترنی ندی کے کنارے لے جاتے ہیں۔ جو چار سو کوس (سو یوجن) چوڑی
ہے اور پیپ و خون سے بھری ہوئی ہے۔ (۲۷) جس نے برہمن کو گئو دان دیا ہے وہ آسانی سے پار
کر جائے گا۔ آدمیوں کی بھلائی کے لیے بیترنی کے (پار کرنے کے لیے) دان کا حکم دیا گیا ہے۔ (۲۸) (گائے) دان
دینے سے گئو سب گناہ کو دور کرکے مردہ کو وشنولوک میں لے جاتی ہے۔ گرڈ پران: پریت کلپ ۴: ۱-۲۸

جبکہ: (۱) جسم کے تندرست رہتے ہوئے بیترنی کے برت کو رکھ لینا چاہیے اور اس ندی کو پار کرنے کے
خواہشمند کو عالم برہمن کے لیے گئو خیرات کرنی چاہیے۔ (۲) اگر گئو دان نہیں کیا ہے تو وہ اپنے تئیں آپ کو کوستا
ہوا ڈوبتا ہے اور کہتا ہے کہ اچھے مستحق برہمن کو صدقہ گئو نہیں دیا۔ (۴) بدحواس ہو کر ہائے دیو ہائے دیو
کہتا ہے اور مسلسل زور زور سے مارا جاتا ہے اور بیترنی کی مصیبت کو جھیلتا ہے اور لڑکوں کے ذریعہ
دی ہوئی نیاز کو کھاتا ہے۔ (۵) شش ماہی شرادھ (کھانا) کو کھا کر مردہ آگے کھسکتا ہے۔ (۶) پھر وہ مردہ
کھینچے ہوئے ہم ہگتہ میں ۲۴۷ یوجن چلتا ہے۔۔۔۔ (۷) سات مہینے ہو جانے پر مردہ بہت آنت نام کے

شہر میں پہنچ جاتا ہے۔ وہاں ہفت ماہی نذر کو کھا کر۔ (۸) اس شہر کو پار کر کے "تکلیف دہ" شہر میں جا پہنچتا ہے۔ زیادہ دکھ جھیل کر آسمانی راستہ سے پھر آگے بڑھتا ہے۔ (۹) وہاں ششماہی نذر کو کھا کر وہ چلتا ہے اور شہر نالہ و گریہ میں پہنچ کر نوماہی نذر کو کھاتا ہے۔ (۱۰) نالہ و گریہ کے شہر میں پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر وہ خود بدحواس ہو کر زار زار روتا ہے۔ (۱۱) مردہ اس شہر کو چھوڑ کر شہر تپیدہ کو پہنچ جاتا ہے۔ سوتپت 'شہر تپیدہ' کو پہنچ کر وہ دہ ماہی نذر کو کھاتا ہے۔ (۱۲) یہاں رشتہ داروں کے ذریعہ برہمن کی دعوت اور پنڈ دان کی وجہ سے مردہ وہاں ذرا جھکی دیتا ہے۔ گیارہ مہینے پورا ہونے پر وہ شہر 'نالہ کناں' کو پہنچ جاتا ہے۔ (۱۳) مردہ یازدہ ماہی نذر کو کھا کر آرام سے چلتا رہتا ہے۔ مردوں کو تکلیف دینے والے بادل وہاں برستے ہیں۔ (۱۴) مردہ وہاں برسنے سے پہلے کی نذر دکھ کے ساتھ کھا کر اور پورا سال ہونے پر وہ شیت پور' سرد آباد کو پہنچ جاتا ہے۔ (۱۵) وہاں شہر بہت سرد ہے وہ راستہ میں سردی سے بہت دکھ جھیلتا ہے اور بھوک سے پریشان ہو کر دسوں رات دیکھتا ہے۔ (۱۶) کہ میرا کوئی رشتہ دار ہے جو میرے دکھ کو دور کرے۔ سپاہی اس سے کہتے ہیں کہ تم نے کیا کیا نیکی کی ہے۔ (۱۷) ان کی اس بات کو سن کر مردہ خداوندا! خداوندا! کہتا ہے۔ میں نے زادِ راہ کے لیے نیکی کیا ہے۔ (۱۸) مردہ اس طرح سوچتا ہوا اپنے کو بہت سنبھالتا ہوا ۴۴ یوجن لمبے ۴۴ یوجن چوڑے دھرم راج پور' میں پہنچ جاتا ہے۔ (۱۹) چمکتا ہوا نورانی 'دھرم راج پور' (یم راج کا شہر) مطربوں اور پریوں (اپسراؤں) سے بھرا ہوا ہے اور چوراسی لاکھ[1] جہنم وہاں موجود ہیں۔ (۲۰) اور تیرہ پہرہ دار یم راج کے آگے کھڑے رہتے ہیں۔ وہ سمجھ سمجھ کر باریکی اور بدی کو (۲۱) اور آدمیوں کے اعمال کو یم راج کے آگے پیش کرتے ہیں۔ آدمی جس کو نہ کسی سے کہے رہتا نہ جس کام کو کسی کے سامنے کیے رہتا۔ (۲۲) ان سب کو "چترگپت" خازن اعمال، یم راج کو بتاتے ہیں۔ چترگپت دور دور کی سنتے ہیں اور دور دور کی دیکھتے ہیں۔ گرڑ پران: پریت کلپ: ۴: ۱: ۲۲

ہر چند کہ گرڑ پران کے اخبار دلوں کے کپکپا دینے کے لیے کافی تھے مگر قدم قدم پر نذر و نیاز کی تاکید نے سارے انذار و تنذیر کو بے تاثیر بنا ڈالا ہے۔ برزخ[2] کی شہادت کو قوی تر بنانے کے لیے ذیل میں مہابھارت کا حوالہ دیا

---

[1] ہندو مذہب میں چوراسی لاکھ یونی جنم یا نوع مشہور ہے مگر یہاں چوراسی لاکھ جہنم مراد ہے جیسا کہ آگے اسی گرڑ پران میں آیا ہے۔ ۱۹ کسی دن جنمنے پر جھنڈ والے یم راج نے ہزاروں نالہ و شیون سے پر دوزخوں کو دیکھا۔ ۲۰۔ وہ چوراسی لاکھ دوزخوں کے خداوند ہیں۔ ان دوزخوں میں اکیس بڑے نمایاں ہیں۔ ۲۱۔ ۱۔ تاریک۔ ۲۔ سرخ مرغا والا۔ جابیرو۔ شاملی۔ رورو کنٹلی وغیرہ۔ گرڑ پران، پریت کلپ: ۵: ۱۹-۲۲

[2] یہاں برزخ سے دنیا اور آخرت کے درمیان کی کیفیت و ساعت مراد ہے۔

جا رہا ہے۔ (شری کرشن نے کہا) ○ اے یدھشٹر! دنیائے یم راج اور دنیائے انسانی کے درمیان ۸۶ ہزار یوجن کا فاصلہ ہے۔ ○ اس فاصلہ میں نہ درخت کا سایہ ہے، نہ تالاب اور جھیل ہے، نہ باولیاں اور پوکھریاں ہیں نہ کنواں ہے۔ اے یدھی شٹھرا! نہ جھونپڑا ہے، نہ بیٹھک ہے۔ نہ پیاؤ ہے۔ نہ آرام خانہ ہے نہ پہاڑ ہے نہ ندی ہے۔ نہ زمین پر کوئی ماندیا بل ہے ○ نہ گاؤں ہے نہ آشرم ہے نہ باغ ہے نہ جنگل۔ اس راستہ میں کوئی منزل بھی نہیں ہے۔ اے یدھی شٹھر! درد سے تڑپتے ہوئے، قریب المرگ کسی سبب سے مرنے والے جاں بلب انسان کے ○ جسم سے جان ہوا کے دھکے سے مجبوراً نکل پڑتی ہے۔ چھ خانہ والے جسم سے نکل کر وہ روح اپنے رنگ، قد کے مطابق دوسرے غیر مرئی جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس روح کو کوئی دیکھ نہیں سکتا ○ وہ آٹھ عضو والی روح باطنی جو کہ متحرک رہتی ہے وہ قطع و برید، سوخت و کوفت سے فنا نہیں ہوتی ○ اس کو مختلف صورت کے خوفناک، غضبناک ڈراونے ہتھیار والے شدید البطش یم راج کے سپاہی۔ یم راج کے حکم سے گرفتار کر کے لے جاتے ہیں ○ اس کو بیوی بچہ کے پھندے روکتے ہیں مگر وہ جبراً و قہراً چلا جاتا ہے۔ اس کی کمائی ہوئی نیکی و بدی اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہیں ○ غم زدہ رشتہ داروں سے رویا جاتا ہوا انسان اپنے سب رشتہ داروں کو چھوڑ کر بے غرض و بے نیاز ہو کر چلا جاتا ہے ○ روتے ہوئے ماں باپ بھائی، ماموں، بیویاں، لڑکے، دوست چھوڑ دیے جاتے ہیں ○ آنکھ میں اور رخسار پہ آنسو بھرے ہوئے یہ لوگ اس (روح) کو نہیں دیکھتے ہیں اور وہ ہوا ہو کر اپنے جسم کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ ○ وہ گنہگاروں کے اس پرخطر، ناقابل گذر، دشوار گزار، بدانجام، تیرہ و تاریک، بے پایاں اندھیرے کو چلا جاتا ہے ○ یم راج کے زیر حکم جملہ دیوتا اسر (جن و خبیث) انسان، مرد، عورت، خلق زمین کے جان دار ○ ادھیڑ، جوان، بچے، بوڑھے، نوزائیدہ جنین کو اس بڑے راستے کو طے کرنا پڑے گا ○ غضبناک درشتی سے حکم دینے والے شدید البطش موت کے فرشتے جو کھینچتے ہوئے لوگوں کو یم راج کے گھر لے جاتے ہیں ○ کہیں ڈرتے ہوئے، کہیں بدحواس ہوتے ہوئے کہیں لڑکھڑاتے ہوئے کہیں روتے ہوئے اور کہیں درد سے کراہتے ہوئے یم راج کے گھر جاتے ہیں ○ ڈانٹے جاتے ہوئے، گھبرائے ہوئے کانپتے ہوئے، خوف زدہ دھمکائے جاتے ہوئے اور جسم پر مارے جاتے ہوئے لوگ (یم راج کے گھر) جاتے ہیں ○ لکڑی، پتھر، چٹان، ڈنڈے، انگارے، کوڑے، انکش سے مارے جاتے ہوئے گنہگار یم پور، شہر جہنم کو جاتے ہیں۔ ..... گنہگار لوگ وہاں پہنچ کر پاخانہ کے کنوئیں (سنڈاس) میں جیتے ہوئے کروڑوں سال تک درد سے تکلیف اٹھاتے ہیں۔ مہابھارت: انوشاسن: ص ٤٣، جلد اول گیتا پریس گورکھپور۔ دیگر

مبارک دیوی! جو تم (پوچھنا) چاہتی ہو وہ سب سنو۔ جنوب طرف یم راج کا بڑا مکان ہے ○ بڑا گول

پرتیوں اور یم راج کے سپاہیوں سے پر طرح طرح کی چیزوں سے بھرا ہوا' بارونق' پر عجب (مکان) ہے۔٥ اعمال کے سبب سے پکڑے گئے ہوئے بہتیرے انسانوں سے بھرا ہوا (مکان) ہے۔ وہاں یم راج مخلوق کی بھلائی میں لگے ہوئے ہمیشہ سزا دیتے رہتے ہیں۔٥ وہ (یم راج) انسان کے نیک و بد کو مایا (حکمت) سے جانتے ہیں۔ اور مایا سے ہی ادھر ادھر سے انسان کو موت کے گھاٹ اتارتے ہیں٥ ان کے مایا (فریب) کے پھندے کو سر (دیوتا) اور اسر (شیطان) بھی نہیں جانتے ہیں۔ پھر بے چارے انسان کی کیا حقیقت ہے۔ خداوند (یم) کی قدرت عظیم ہے٥ اس طرح جلوہ نشین اس یم راج کے سپاہی عمل کو ختم کرنے والے انسان کو گرفتار کر کے لے جاتے ہیں٥ دنیا میں انسان از روئے عمل اعلیٰ' ادنیٰ اور اوسط ہوتے ہیں۔ حیلہ ساز (یم) کے کسی حیلہ سے (گرفتار کر کے) ان کو حسب مراتب لیکر یم راج کے گھر پہنچاتے ہیں۔٥ سبھی مرنے والوں کے راستے تین قسم کے دیکھے گئے ہیں۔ ان کے نام آرام بخش اور پُرخطر ہیں۔٥ جو آرام بخش راستہ ہے وہ جھنڈے، جھنڈیوں سے سجا ہوا۔ بجز رسے پُر' پانی کا چھڑکاؤ کیا ہوا' اور پھولوں کی مالاؤں سے آراستہ رہتا ہے۔٥ جانے والوں کے لیے یہ راستہ دل کش اور آرام دہ ہے۔ بے خطر راستہ درست اور حسب ضرورت روشن ہے۔ تیسرا' پرخطر" راستہ بدبودار' تاریکی سے ڈھکا ہوا' کنکریلا' سر کنڈوں سے روندھا ہوا' خطرناک اور درندوں سے بھرا ہوا ہے۔٥ کیڑوں مکوڑوں سے پُر' جانے والوں کے لیے دشوار گزار ہے۔ اس طرح کے تین راستے اعلیٰ ادنیٰ اور اوسط درجہ کے انسانوں کے لیے ہیں۔٥ پاکیزہ مسکراہٹ والی! کس طرح مرنے پر (مردہ کو) یم راج کے سپاہی لے جاتے ہیں وہ سنو۔ یم راج کے سپاہی خوش پوش ہو کر اچھے (اعلیٰ) لوگوں کو آرام بخش راستے سے عزت کے ساتھ لے جاتے ہیں٥ یم راج کے دوت (سپاہی) کی وردی میں اوسط درجے کے لوگوں کو — بیچ والے (بے خطر) راستے سے لے جاتے ہیں۔ یم راج کے سپاہی چنڈال (چوہڑوں) کی پوشش میں ملبوس ہو کر۔ ادنیٰ (برے) لوگوں کو گرفتار کر کے' جھڑکتے ہوئے' پھندوں سے گھسیٹتے ہوئے' پرخطر راستہ سے لے جاتے ہیں۔٥ (سپاہی) اسی طرح سے تینوں طرح کے آدمیوں کو لیکر لے جاتے ہیں٥ سپاہی اس شخص کو — انصاف کی مسند پر بیٹھے ہوئے' مدبر اپنے نور سے جلوہ افگن' میر مجلس دربار میں بیٹھے ہوئے جہانبان (یم راج) کو دکھلاتے ہیں اور عرض احوال کرتے ہیں۔ یم راج ہمیشہ کسی کی تکریم کرتے ہیں' کسی کو سزا دیتے ہیں اور ان کی نیکی و بدی کو سنتے ہیں۔ ہزاروں مصاحب ان کو گھیرے رہتے ہیں۔٥ یم راج آئے ہوئے نیکوکاروں کی تعظیم کرتے ہیں۔ ان کو گلے لگا کر خوش آمدید کہتے اور مزاج پرسی کرتے ہیں۔٥ ان کی نیکیوں کی تعریف کر کے یم ان کو ان کے مسکن کو بتاتے ہیں۔ نیکوکار یم راج کی اجازت پا کر جنت کو چلے جاتے ہیں۔ مہا بھارت انوشاسن ۳۰ — ۲۲۶، ۲۲۷ طبع اول مطبوعہ گیتا پریس گورکھپور

گرڑ پران اور مہابھارت کے یہ دونوں حوالے اس لوک اور پرلوک کے بیچ کے فاصلہ سفر اور خطروں کی باتوں کو بتاتا ہے۔ اب ذیل میں جہنم جنت کی تفصیل سپرد قلم کی جائے گی۔ پہلے جنت و جہنم کی ویدک شہادت گزرے گی۔ پھر پرانوں میں بیان کی ہوئی پرلوک کی تفصیل نقل کی جائے گی۔ اس نقل و حکایت کے لیے تو ایک دفتر بھی ناکافی ہے۔ مگر یہاں دو ایک باب نقل کرنا ناگزیر ہے تاکہ پرلوک کا تصور و نقشہ خوب اچھی طرح ذہن میں کھنچ جائے۔

(باقی)

دارالعلوم دیوبند سے عربی زبان میں

سہ ماہی مجلہ "دعوۃ الحق" کا اجراء

مدت سے اس بات کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ دارالعلوم دیوبند کی آواز عالم اسلام تک پہنچائی جائے اور اس کے فکر و مسلک کو اس کی اپنی روایات کی روشنی میں عرب ممالک سے متعارف کرایا جائے۔

چنانچہ اس علمی و دینی اور ثقافتی ضرورت کے پیش نظر دارالعلوم سے عربی کے ایک سہ ماہی مجلہ کا اجرا کیا گیا ہے جس میں اکابر دیوبند کے علوم اور ان کی تحقیقات عربی زبان کے قالب میں پیش کی جائیں گی، نیز وقت کے اہم موضوعات پر بصیرت افروز مضامین کے علاوہ ابنائے اسلام کے اہل قلم کے علمی و دینی مقالات بھی شامل اشاعت ہوں گے۔

شوال ۱۳۸۳ھ میں پہلا شمارہ چھپ چکا ہے جس نے اپنی طرز کتابت، حسن طباعت، ترتیب مضامین اور جاذب نظر سرورق کی بنا پر ملک کے ارباب علم اہل ذوق سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔

سال کے چار شماروں کے لیے زر اشتراک مبلغ چار روپے اس پتے پر روانہ فرمائیں۔

منیجر مجلہ "دعوۃ الحق" دارالعلوم دیوبند

خلوص اور للّٰہیت

(مولانا سلیمان، فرخ آبادی)

زندگی نام ہے عمل پیہم اور جہدِ مسلسل کا زندگی کا بننا بگڑنا، کامیاب و کامراں ہونا یا ناکام و نامراد ہونا بھی کسی نہ کسی حیثیت سے انسان کی اپنی سعی و کوشش پر ہی موقوف ہے۔ انسانی کوشش اور اعمال یوں تو بے شمار قسم کے ہوتے ہیں۔ لاتعداد رنگ و روپ میں ظاہر ہوتے ہیں لیکن درحقیقت وہ دو ہی قسم کے ہیں۔

(۱) اعمال نیک۔ (۲) اعمال بد۔ اعمال خیر اور اعمال شر، اچھے کام اور برے کام — معروفات اور منکرات کا نام آتے ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کسی عمل کو خیر یا شر، نیک یا بد، معروف یا منکر قرار دینے کے لیے میزان، کسوٹی اور معیار کیا ہے؟ وہ کون سا تھرمامیٹر ہے جس سے ہم کسی عمل میں خیر کی حرارت یا شر کی برودت معلوم کر سکیں نیکی کی گرمی یا برائی کی سردی جانچ کر دیکھ سکیں۔

خیر محض اور خالص نیک اعمال وہ ہیں جو ظاہر اور باطن دونوں میں نیک ہوں، شر محض اور خالص بد وہ اعمال ہیں جو ظاہر اور باطن دونوں میں بد ہوں لیکن کسی عمل کا ظاہر و باطن کے اعتبار سے خیر یا شر ہونا تین شرطوں پر موقوف ہے

(۱) عمل کرنے والا اللہ تعالیٰ کا وفادار ہو یعنی اس کے عقائد درست ہوں وہ ملحد، مشرک اور کافر نہ ہو، خالص خدا پرست موحد اور بندۂ مومن ہو۔

(۲) عمل کی ظاہری شکل و صورت اور اس کا ڈھانچہ شریعت کے مطابق ہو یعنی اس کے انجام دینے میں حدودِ شریعت کا پورا پورا پاس و لحاظ کیا گیا ہو۔

(۳) عمل کرنے والا مخلص ہو اس میں للّٰہیت ہو خوشنودیٔ رب اور رضاء باری تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور چیز اس کا اصل مقصود نہ ہو۔

اخلاص و للّٰہیت کو ہم نے تیسرے نمبر پر ذکر کیا ہے مگر اپنی اہمیت کے اعتبار سے یہ پہلی

دونوں شرطوں پر مقدم ہے۔ کیونکہ خلوص نیت کے بغیر آدمی اللہ کا وفادار ہو سکتا ہے اور نہ حدود شریعت کی
پابندی کر سکتا ہے۔ غرض کہ کسی عمل کی مقبولیت تین شرطوں پر موقوف ہے۔ صحتِ عقیدہ، حدود شریعت کی
پاسداری اور خلوص نیت۔

عقائد کا درست اور صحیح ہونا اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر آدمی کی پوزیشن ایک باغی اور سرکش
کی پوزیشن ہوتی ہے وہ وفاداروں کے زمرے میں نہیں ہوتا اس لیے اس کا کوئی عمل خواہ وہ بظاہر کتنا ہی اچھا
اور اپنی شکل وصورت کے لحاظ سے کتنا ہی درست اور حسین ہی کیوں نہ ہو مقبول نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک کافر،
مشرک یا ملحد اللہ کے بندوں کی خواہ کتنی ہی خدمت اپنی جان ومال سے کرے اور خواہ بالفرض اس کی کوئی
دنیاوی غرض بھی نہ ہو مگر اس کا یہ عمل اللہ کے ہاں مقبول نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ اللہ کا باغی ہے اور دنیا کے سارے
عقلاء باغی کے ہر اچھے سے اچھے کارنامہ کو اس کی بغاوت کے مقابلہ میں کالعدم قرار دیتے ہیں
عمل کی مقبولیت کے لیے اس کی ظاہری شکل وصورت میں حدود شریعت کی پاسداری اس لیے ضروری
ہے کہ اس کے بغیر عمل کی اصل غرض وغایت ہی فوت ہو جاتی ہے کیونکہ ہر شخص اپنی طبیعت ومزاج اور مرضی و
خواہش کے مطابق شکل وصورت بدلتا رہے گا اور ظاہر کی تبدیلیوں سے وہ شگاف کھلیں گے کہ عمل کچھ سے کچھ
ہو جائے گا اور حال ٹھوکریں کھاتا ہوا کہیں سے کہیں پہنچ جائے گا۔ مثلاً ایک مومن خلوص سے نماز پڑھے اور
تمام قرأت اور رکوع وسجود کی ترتیب الٹ دے فرض نمازوں کی تعداد رکعات اپنی مرضی سے گھٹا بڑھا دے
ظاہر ہے کہ اس کی ایسی نماز اس کے منہ پر مار دی جائے گی اور اس سے سخت باز پرس ہوگی کہ ایک بندہ اور
غلام ہوتے ہوئے اس نے شارع کی تجویز کردہ صورت اور حیثیت میں تبدیلی کیوں کی؟
آپ کسی حاکم کا تصور کر سکتے ہیں جس کے اپنے تجویز کردہ نقشہ کار کے بالکل خلاف عمل اس کی آنکھوں کے
سامنے کیا جاتا ہے اور وہ اپنے ایسے وفادار اور مخلص کارندوں سے باز پرس کے بجائے ان کی پیٹھ ٹھونک کر
انہیں شاباش دے اور انعام واکرام سے نوازے؟
نیت کا خالص ہونا اس لیے ضروری ہے کہ آدمی دل وجان سے پوری فداکاری اور جاں نثاری کے ساتھ
کوئی عمل خلوص کے بغیر کر ہی نہیں سکتا۔ اور جب تک فداکاری وجاں نثاری سے کام نہ کیا جائے کامیابی سے
ہمکنار ہونا۔ ع این خیال است ومحال است وجنوں
کا مصداق ہے۔ مثلاً ایک مومن بالکل مسنون طریقے پر نماز پڑھے لیکن اس سے دو ایسے کہ [illegible]

اور لوگوں سے خراج تحسین وصول کرنا چاہتا ہو تو ظاہر ہے کہ اس کی یہ نماز باعث اجر و ثواب ہونے کے بجائے ذریعہ وزر و عقاب ہوگی اور اس کا نتیجہ فوز و فلاح کے بجائے ناکامی و خسران ہوگا۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا اخلاص نیت پہلی دونوں شرطوں کے مقابلہ میں نسبتاً اس لیے اہم ہے کہ ان دونوں کا وجود بھی گویا اسی (خلوص نیت) پر موقوف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن و حدیث میں اخلاص کی طرف بار بار مختلف انداز میں توجہ دلائی گئی ہے۔

اخلاص کا حکم	وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ (البینہ)	اور ان کو صرف یہ حکم دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں اس حال میں کہ وہ دین (اطاعت) کو اس کے لیے خالص کرنے والے ہوں۔
تقویٰ مطلوب ہے	لَنْ يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَٰكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ	اللہ تعالیٰ کو ان (قربانیوں) کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ (مطلوب نہیں) البتہ تمہارا تقویٰ اس کو پہنچتا ہے۔ (مطلوب ہے)
اللہ دلوں کا حال جانتا ہے	إِنْ تُخْفُوا مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْدُوهُ يَعْلَمْهُ اللَّهُ	تمہارے سینوں میں جو کچھ ہے اسے تم چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ کو بہرحال اس کا علم ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید کے ان تینوں ٹکڑوں سے صاف ظاہر ہے کہ اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے۔ اللہ کی عبادت کا جو حکم دیا گیا ہے وہ سادہ نہیں ہے بلکہ یہ بھی حکم ہے کہ بندگی اور اطاعت پر خلوص کا گہرا رنگ چڑھا ہوا ہونا چاہیے قربانیوں کا گوشت اور خون اللہ کو مطلوب نہیں ہے بلکہ ان اعمال کے پیچھے جو جذبات رجحانات اور محرکات ہوتے ہیں اور اعمال خیر کے نتیجہ میں روح کو جو بالیدگی اور قلب کو جو پاکیزگی حاصل ہوتی ہے وہ مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ صرف اعمال ظاہرہ ہی پر نگاہ نہیں رکھتا بلکہ دواخلوں کے تصورات اور خیالات دلوں کے ارادوں اور امنگوں کا بھی اسے علم ہے اور جزا و سزا دینے میں وہ اپنے اس علم سے یقیناً کام لے گا۔

اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے (مشکوٰۃ المصابیح)	إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِامْرِئٍ مَا نَوَىٰ (متفق علیہ)	اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے اور آدمی کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی۔

اللہ دلوں کو دیکھتا ہے

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلٰى صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلٰى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ (مسلم)

اللہ تعالےٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں اور عملوں کو دیکھتا ہے

نیت پر اجر و ثواب

(۱) لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ وَلٰكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ

فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے البتہ جہاد اور نیت باقی ہے

(۲) إِنَّ أَقْوَامًا خَلْفَنَا بِالْمَدِينَةِ مَا سَلَكْنَا شِعْبًا وَلَا وَادِيًا إِلَّا وَهُمْ مَعَنَا حَبَسَهُمُ الْعُذْرُ (بخاری)

بہت سے لوگ مدینہ میں ہم سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ ہم نے کوئی وادی اور گھاٹی طے نہیں کی مگر وہ ہمارے ساتھ رہے ان کو عذر نے روک رکھا ہے۔

پہلی حدیث تو منہ سے بول رہی ہے کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پہ ہے۔ جیسی نیت ہوگی ویسا ہی پھل ملے گا دوسری حدیث بھی بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالےٰ دلوں کو دیکھتا ہے' ارادوں اور نیتوں پر نظر رکھتا ہے۔ تمہارے اعمال کے پیچھے جس قدر خلوص ہوگا تمہاری کوششوں میں جس قدر للہیت ہوگی' اتنا ہی زیادہ تمہارے اعمال مقبول ہوں گے اور اتنے ہی اچھے اجر سے تمہارا خدا تمہیں نوازے گا۔ تیسری حدیث کہہ رہی ہے کہ اگرچہ فتح مکہ کے بعد ہجرت باقی نہیں رہی کیونکہ مکہ دارالاسلام بن گیا مگر ثواب کمانے اور آخرت میں بلند مدارج حاصل کرنے کے ذرائع اور بھی ہیں جہاد اور ہجرت کی نیت باقی ہے۔ دین کو سربلند کرنے میں جس قدر جان توڑ کوشش کروگے اپنا مال اور جان کھپاؤ گے اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو صرف کروگے اور یہ نیت رکھو گے کہ دین کی خاطر اللہ و رسول کی خاطر وقت ضرورت ہم اپنا سب کچھ قربان کردیں گے گھر' مکان اور وطن تک چھوڑ دیں گے احباب اور اعزہ کی محبت کو بھی تج دیں گے اسی قدر بلند مراتب حاصل کرسکو گے۔ چوتھی حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ مبارکہ سے یہ ثابت کر رہی ہے کہ خلوص نیت اور للہیت اس قدر اہم ہے کہ اگر کوئی شخص عمل سے محروم بھی رہا ہو لیکن خلوص اور للہیت کے ساتھ نیت رکھتا ہو تو اجر و ثواب کا مستحق ہوگا اور انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔ نبی صلعم نے غزوہ تبوک سے واپس ہوتے ہوئے فرمایا۔ بہت سے لوگ مدینہ میں ہم سے پیچھے رہ گئے۔ مجبوریوں کی وجہ سے ہمارے ساتھ نہ آسکے مگر اپنے جذبات نیتوں اور ارادوں کے ذریعہ ہمارے ساتھ رہے اس لیے اجر میں بھی حصہ دار ہیں۔

حضرت یوسفؑ کا خریدار کون تھا

(جناب عبدالباری ایم اے)

مصر کے جس شخص نے حضرت یوسفؑ کو خریدا تھا اس کا نام اور منصب بائبل اور تالمود میں یکساں دیا ہوا ہے

"اور یوسف کو ۔۔۔۔ فوطیفار مصری نے جو فرعون کا ایک حاکم اور جلوداروں کا سردار تھا ۔۔۔۔ خرید لیا۔" (پیدائش ۳۹ : ۱)

قرآن کریم میں نام نہیں دیا ہوا ہے بلکہ سورہ یوسف میں اس کا لقب 'العزیز' ملتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے لقب و منصب ہی سے یوسفؑ کے قصہ پر کچھ روشنی پڑتی ہے نہ کہ نام سے۔ پہلے مختصراً اس بات کے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ قدیم مصر کا فرماں روا اُس وقت کون تھا اس لیے مختصر تاریخ بیان کی جاتی ہے۔ اس کے بعد 'العزیز' کی ماہیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔

قدیم مصر کی مختصر تاریخ

تقریباً چار ہزار برس قبل مسیح سے لیکر مسیح (عیسیٰؑ) کی پیدائش تک سلاطینِ مصر کے پایۂ تخت بار بار بدلتے رہے اور موجودہ زگازگ (Zagazig) سے لے کر جنوب کی طرف تقریباً تین سو میل کے اندر تھیبس (Thebes) تک قائم ہوتے رہے۔ ان متعدد دارالسلطنتوں میں خاص طور پر جن کا نام یاد کیا جاتا ہے وہ یہ تھے Thinis یا This یا Gergeh یا HERACLEOPOLIS یا منفس یا ممفس (Mempis) یا Gizeh — یا تھیبس یا تھیبا (Thebes) - Amarna (امرنا) (Bubastis) اور دخلہ (Dakhla) - انہیں مراکز میں سلاطین نے عیسیٰؑ سے قبل بادشاہت کی و تینتیس سلسلوں کے ہوئے اور چونتیسواں (۳۴ واں) سلسلہ شروع ہو کر ۳۰ سال رہا تھا کہ عیسیٰ کی پیدائش ہوئی۔ ان میں سے اکثر نے "فرعون" کا لقب اختیار کیا اور کچھ نے محض بادشاہ کا۔ کسی نے "شاہزادے" یا کاہن اعظم ہی پر قناعت کی۔ اور ایک تے تو

"شاہنشاہ مصر علی وعلیا" اختیار کیا:

"فرعون" کا لقب پانچویں سلسلے کے ایک بادشاہ سے شروع ہوا۔ اور چودھویں سلسلے تک کے بادشاہوں نے اسے قائم رکھا۔ پندرھویں سولھویں اور سترھویں سلسلوں (ہیکسس) نے (جو باہر سے آکر مصر پر قابض ہوئے تھے اور دوسرے خاندانوں اور چرواہے قبیلوں سے تھے) اس لقب کو چھوڑ دیا اور محض "بادشاہ" کہلانے لگے۔ ان کے بعد پھر اٹھارھویں سلسلے سے پرانا لقب "فرعون" اختیار کیا گیا۔

بائبل کی یہ غلطی ہے کہ یوسفؑ کے ہمعصر بادشاہ کو بھی فرعون کہہ کر پکارا ہے۔ برخلاف اس کے قرآن کریم نے صحیح طور پر یوسفؑ کے ہم عصر بادشاہ کو فرعون کے بجائے "ملک" (بادشاہ) کہا ہے اور جہاں جہاں "فرعون" کے نام سے پکارا ہے۔ تاریخ کی تحقیق سے بھی ان زمانوں میں "فرعون" ہی لقب تھا۔ ایک جگہ تو بائبل میں بھی یہ پردہ فاش ہو جاتا ہے جہاں شاہ (ملک) (King) کا نام لیا ہے مگر پھر جلدی سے "فرعون" بھی کہہ دیا مثلاً "ان باتوں کے بعد یوں ہوا کہ شاہ مصر کا ساقی اور نان بائی اپنے خداوند شاہ مصر کے مجرم ہوئے۔ اور فرعون اپنے دونوں حاکموں سے جن میں ایک ساقیوں اور دوسرا نان بائیوں کا سردار تھا۔ ناراض ہو گیا" (پیدائش ۴۰:۱،۲)

ہیکسس بادشاہوں کے متعلق یہاں تفصیل کا موقع نہیں۔ صرف اتنی بات جان لینا ضروری ہے کہ تیرھواں سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا کہ ہیکسس (چرواہوں) نے زور پکڑنا شروع کر دیا اور چودھویں سلسلہ کو ان ہیکسس نے نیل ڈیلٹا کے مغربی خطہ کی طرف ہٹا کر اپنی نئی سلطنت منفس یا ممفس میں قائم کر لی۔ ان کے تین سلسلوں (پندرھویں سولھویں اور سترھویں) کا زمانہ تقریباً ۱۹۰۵ قبل مسیح سے لے کر ۱۷۰۳ قبل مسیح تک کہا جا سکتا ہے۔ پندرھواں سلسلہ ہی ان کی اصل طاقت کا زمانہ تھا جس میں بڑے بڑے بادشاہ ہوئے جن کے نام یہ تھے۔ سلاطیس یا سالاتیس بنان، ایخنان، اپوفیس یا افوبیں، اناکس اور اسیتھ تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کے مصر میں داخلہ کے وقت اسی پندرھویں خاندان کا اپوفیس یا افوبیں بادشاہ حکمرانی کر رہا تھا جس کے افسر (العزیز) نے انہیں خریدا تھا۔ (بائبل کے علماء محققین کے مطابق حضرت یوسفؑ کی پیدائش کا سال ۱۹۰۲ قبل مسیح اور مصر میں داخلہ کا ۱۸۹۰ قبل مسیح سمجھا جاتا ہے) البتہ قاموس القرآن نے 'اپامیں' کو سولھویں سلسلہ کا پہلا بادشاہ بتایا ہے) فراعنہ قدیم کی طرح یہ بادشاہ بھی مصری اہل کاروں اور منشیوں کے ذریعہ حکومت کرتے تھے۔

العزیز کی ماہیت:۔ مصباح اللغات میں العزیز کے یہ معانی درج ہیں۔ شریف، قوی، نادر۔

معزز، بادشاہ بلند کہ اس کا حصول دشوار ہو اور وہ مغلوب نہ ہو اور کوئی اس کو عاجز نہ کر سکے اور اس کے مانند کوئی نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک نام یہ بھی ہے جو قرآن کریم میں اکثر مقامات پر آیا ہے۔ مگر سورۃ القمر میں العزیز کا واضح مفہوم اس طور پر عیاں کیا گیا ہے جسے کسی عزیز پر بھی چسپاں کیا جا سکتا ہے: "وَلَقَدْ جَاءَ آلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ۞ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كُلِّهَا فَأَخَذْنَاهُمْ أَخْذَ عَزِيزٍ مُّقْتَدِرٍ (اور تحقیق کے لوگوں کے پاس ڈراوے آئے۔ انھوں نے ہماری تمام نشانیوں کو جھٹلایا تو ہم نے ان کو ایسا سخت پکڑا جیسے زبردست صاحبِ قدرت پکڑا کرتا ہے۔) آلِ فرعون کی طرف اللہ تعالیٰ کی اس زبردست گرفت کو کسی عزیز کی گرفت کا حوالہ دینے میں ایک لطیف اشارہ موجود ہے کہ عزیز کے منصب سے فراعنہ خود اچھی طرح واقف تھے۔ اسی سورۃ کے آخر میں اس "مقتدر عزیز" سے تفریق کرانے کے لیے اللہ نے اپنے کو "ملیکِ مقتدر" کہا ہے: "إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَهَرٍ ۞ فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِندَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ" (یعنی بادشاہِ قادرِ مطلق کے پاس)

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے مصر کے عزیز کو 'مدار المہام' بتایا ہے — یعنی ایسا عہدہ دار یا صاحبِ منصب جس پر دشوار سے دشوار کام کا دارومدار ہو۔ جو مشکل سے مشکل ادارہ یا قلمدان سنبھالتا ہو۔

کتاب صناجۃ الطرب فی تقدمات العرب کے اردو ترجمہ آئینہ عرب میں (جو پہلی بار ۱۹۱۰ء میں چھپی) لکھا ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں جس کو شاعری، خوشنویسی، پیراکی و تیر اندازی میں دستگاہ ہوا سے 'کامل' کہتے تھے۔ مشہور جملہ ہے: 'مَنْ خَطَّ وَعَامَ وَضَرَبَ السِّهَامَ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ كُلَّ الْفَضْلِ' — جس طرح کی اصطلاح عرب میں تھی اسی طرح قدیم مصر میں بھی 'العزیز' کی اصطلاح تھی اور غالباً وہی شخص ایسے منصب پر فائز کیا جاتا تھا جو متعدد صفات کا حامل ہوتا۔

ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ میں (جو دنیا کی تاریخ پر بہت سی جلدوں کا مجموعہ ہے۔ قدیم مصر کے حالات کے تحت بارھویں سلسلہ (۲۴۶۶ ق م تا ۲۲۵۰ ق م) کے پہلے بادشاہ امنہمات اول ( ) کے عہد کے ایک قلمی ریکارڈ کا پتہ ملتا ہے جس میں اپنے بیٹے کو نصیحت Instruction to his son) زیادہ مشہور ہے۔

بارھویں سلسلہ کا زمانہ ادب و ہنر کا سنہرا زمانہ تھا جو مستقبل کے لیے نمونہ بنا۔ اس زمانہ کے قدیم مصری آثار اور صنعت و حرفت کی بحث ایک فرانسیسی مورخ سینوبس (Seignobos) نے کی ہے جس کا ترجمہ

پہلے فارسی میں ہوا پھر اردو میں بھی بشکل تاریخ ملل قدیمہ ہوا۔ (سنہ ۱۹۲۱ء) جس سے پتہ چلتا ہے کہ عمارات شاہی میں خدام ور ملازم اکثر اوقات فرعون کے ساتھ رہتے تھے۔ چند افراد میں زیادہ معزز تھے۔ وہ آدمی مکھیاں ہکانے کے لیے دائیں بائیں رہتے تھے اور محافظ اسلحہ وکمانڈنگ افسر باڈی گارڈ (رئیس محافظین بادشاہ) وخواجہ سرا و انجینیر و داروغہ مطبخ ومحرر شاہی ومہتمم مجلس موسیقی و ناظر ذخیرہ (ناظر انبار ہائے سلطنتی) داروغہ مویشیان شاہی خزانچی ___ فرعون کے یہ نوکر سب سے زیادہ معزز تھے۔

اسی کتاب میں بارھویں سلسلے کے عہد میں "اپنے بیٹے کی نصیحت" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک کتاب ہاتھ لگی ہے جو ایک منشی نے اپنے لڑکے کی تعلیم کے لیے لکھی ہے۔ اس میں وہ کاریگروں کی تکلیفوں کا ذکر کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ "اے فرزند میں تیرے لیے چند پیشوں کی حالت بیان کرتا ہوں تاکہ تجھے معلوم ہو کہ ان میں کیا تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں اور کن کن دقتوں کا سامنا ہوتا ہے" جس منشی نے یہ سب باتیں لکھی ہیں اسی نے صرف منشی گری کو پسند کیا ہے جس کے ذریعے سے اس نے شاہی ملازمت حاصل کی ہے۔ وہ اپنے لڑکے کو اس پیشہ کا شوق دلانے کی غرض سے کہتا ہے کہ "اے میرے بیٹے! میں نے جس قدر پیشے اور دستکاریاں دیکھیں ان میں سے کوئی کام منشی گری سے بہتر نہیں ہے۔ جو شخص بچپن سے اس میں مشغول ہو جاتا ہے وہ بہت عزت اور بڑا عہدہ حاصل کرتا ہے" ظاہر ہے جو عزت حاصل کرے گا کیا وہ عزیز نہ ہوگا اور بڑے منصب پر فائز نہ ہوگا۔

تاریخ ملل قدیمہ میں یہ بھی مذکور ہے کہ ایک اہل قلم (منشی) نے اپنے شاگرد کے لیے اہل فوج کے مصائب کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے: "تو سمجھتا ہے کہ سرداران فوج اہل قلم سے خوش قسمت ہیں۔۔۔۔۔۔ آؤ اب تم سے فوجی گاڑی والے افسروں (جنگی سواروں کے افسروں) کی پرمشقت وتکلیف زندگی کا حال بیان کریں" پھر دبیر مذکور بالا اپنے لڑکے کو مخاطب کر کے کہتا ہے

> "یہ فن یعنی دبیری سب فنون سے بہتر ہے۔ میں نے تجھ کو مدرسے میں بھیجا ہے تو اس دلی محبت کی وجہ سے ہے جو میں فطرتاً تجھ سے رکھتا ہوں۔ کیونکہ جو کام مدرسے میں کیے جاتے ہیں وہ ہمیشہ رہنے والے اور پہاڑ کی طرح مضبوط ہوتے ہیں۔

"اہل قلم" کے عنوان میں لکھا ہے کہ "بادشاہ کچھ ایسے لوگ بھی ضرور رکھتا تھا جو ملک کا انتظام کریں۔ کاشتکاروں کے حقوق مقرر کریں اور پہنچائیں۔ ان سے محاصل وصول کریں اور تمام معاملات عدل و انصاف [illegible] سے انجام دیں۔ ان اشخاص میں لکھنے پڑھنے اور حساب کتاب کی قابلیت ہونا ضروری تھا۔ ان لوگوں کو دبیر کہتے تھے

ایک حساب جاننے والا معزز دبیر انجینیر معمار حاکم اور کاہن بلکہ سردار ہو سکتا تھا۔ حاصل یہ کہ لائق آدمی ہر جگہ اور ہر عہدہ پر پہنچ سکتا تھا۔۔۔۔ معلوم ہوتا ہے " دبیر تو معزز سمجھا ہی جاتا تھا مگر اس سلسلے کا سب سے بڑا عہدہ کاہن اور سردار کا ہوتا تھا۔ دبیر سے ترقی کرتے کرتے 'سردار' اور مہتمم اعلیٰ قسم کا کوئی عہدہ تھا جس کے لیے قرآن کریم نے 'العزیز' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ بیسویں سلسلہ میں رعمسیس دوازدہم کے زمانہ سلطنت میں معبد آمن کے بڑے کاہن نے جس کا نام (ہیر ہور) تھا اپنے کو مصر علیا اور سفلی کا سب سے زیادہ معزز شخص اور کل فوج کا سردار اور دونوں سلطنتوں کا مالک قرار دیا " (بحوالہ تاریخ ملل قدیمہ)

آثار قدیمہ کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ بارھویں سلسلہ میں مصر کے بہادروں میں ایک شخص سینہات نے اپنی سرگذشت میں لکھا ہے کہ " میں پہلے پہل اس بڑی دیوار کے باہر ہوا جو مصر کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس طرح ولایت ادوم تک چلا گیا۔۔۔۔ اس شہر کے بادشاہ نے اپنی لڑکی کی میرے ساتھ شادی کر دی۔۔۔۔ بادشاہ نے مجھ کو اس ملک کے قبیلوں کا معزز رئیس کر دیا"۔۔۔ عجب نہیں 'معزز رئیس' کا وہی مفہوم ہو جس کو قرآن حکیم نے 'العزیز' کے لقب سے یاد کیا ہے۔

ان بیانات کی تائید میں دو نمونے دی بک آف دی ڈیڈ سے (مطبوعہ ۱۸۹۹ء جو برٹش میوزیم میں فروخت ہوتی ہے۔) پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ کتاب ایک بڑے غیر مانوس سائز میں ہے کہ کھول کر رکھنے کے لیے ایک میز کی ضرورت پڑے گی۔ اس کتاب میں قدیم مصریوں کے کچھ قلمی ریکارڈ کی ہو بہو تصویریں دی گئی ہیں جن میں مصری ہیروغلیفی خط میں لکھائی کے ساتھ ساتھ تلفظ و انگریزی ترجمہ مصری و اشوری آثار قدیمہ کے نگراں ای اے والس بج صاحب ایم اے لٹ ڈی، ڈی لٹ نے پیش کیا ہے۔

(۱) ترجمہ:- آمن حطب کے بیٹے نو محکمہ امور عامہ کے او ورسیر کا قلمی نسخہ۔ یہ نسخہ غالباً اٹھارہویں سلسلہ کے پہلے نصف تقریباً ۱۶۰۰ ق م کی تخلیق ہے۔ اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ نو اس افسر اعلیٰ کا مہتمم و رئیس تھا جو مصر کے محکمہ امور عامہ کا محافظ خاتم اور رہائیت کار تھا۔ اور یہ کہ اس کا والد آمن حطب بھی اسی عہدہ پر مامور تھا۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ باپ بیٹے دونوں صاحب علم و منصب رہے ہوں گے۔

(۲) ہونیفر کا قلمی نسخہ جو مصر کے بادشاہ سیتی اول کی ملازمت میں تقریباً ۱۳۷۰ ق م (انیسویں سلسلہ) میں شاہی محل کا اوورسیر عامہ و خصوصی شاہی خاص اور مہر شاہی تھا۔۔۔۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کے مطابق یہ زمانہ تقریباً

[illegible]

ان دونوں نسخوں میں اوورسیر کا لفظ تشریح طلب ہے ۔

اوورسیر — وہ ہے جو انتظام و نگرانی کرے ۔ ایک سپرنٹنڈنٹ ۔ وہ افسر جس کی نگرانی میں یا جس کے انتظام میں کوئی معاملہ ہو ۔ (دی کونسائز انگلش ڈکشنری)

بائبل کے بیان سے بھی اس لفظ پر روشنی پڑ رہی ہے ۔ فوطیفار بذات خود تو بادشاہ کا العزیز تھا اور یوسف کو اپنے گھر کا اوورسیر بناتا ہے ۔ لہذا اپنے منصب سے واقفیت کی بنا پر وہ یوسف کو اپنی عورت کے سپرد کرتے وقت جو خیالات و تفصیلات اس کے ذہن میں رہے ہوں گے بائبل انہی موزونیت کے الفاظ استعمال کر رہا ہے ۔

(اور اس نے اسے اپنے گھر کا مختار بنا کر اپنا سب کچھ اسے سونپ دیا اور جب اس نے اسے گھر کا اور سارے مال کا مختار بنایا تو ......) (پیدائش ۳۹ : ۴ — ۵)

غرضیکہ اس طرح 'العزیز' کا مفہوم صاف ہو جاتا ہے — کہ قدیم مصر میں یہ ایک نہایت اعلیٰ منصب تھا ۔ جس پر فائز ہو کر سلطنت کے سارے امور کی نگرانی اور ان کا اہتمام کرنا پڑتا تھا ۔ جب ہمیں بارھویں سلسلہ میں اس منصب کا ذکر ملتا ہے اور پھر آثارِ قدیمہ کے تحقیقی ثبوت بھی اسی تائید میں دی بک آف دی ڈیڈ (The book of The dead) سے اٹھارہویں اور انیسویں سلسلہ کے زمانوں میں بھی ملتے ہیں تو پھر یہ کیسے سمجھا جائے کہ بیچ کے سلسلوں میں بھی لوگ اس عہدے سے واقف نہ رہے ہوں گے ۔ چنانچہ پندرھویں سلسلہ کے بادشاہ اپوفیس یا افوبیس کا بھی مہتمم اعلیٰ فوطیفار (Potiphar) تھا جسے قرآن کریم نے محض العزیز کے لقب سے یاد کیا ہے ۔

مصر کے سارے قلمدان یوسف کی سپردگی میں آنے کے بعد جب ان کے بھائی پہلی بار مصر میں داخل ہوئے تو انہیں ملک کا کرتا دھرتا دیکھا ۔ رفتہ رفتہ ان کی یہ پوزیشن ملک کے سارے لوگوں پر عیاں ہو گئی اور چونکہ اس زمانہ کے عزیز کے منصب کا مفہوم لوگوں کے ذہن پر واضح تھا جب یوسف کے بھائی دوسری اور تیسری بار آئے تو وہ بھی بے ساختہ یوسف کو " یاایھا العزیز " کہہ کر ہی خطاب کرنے لگے ۔

حبشہ میں مُسلمانوں کی حالت

(ایک دردناک روداد)

ادیس ابابا (حبشہ کا دارالحکومت) کے تعلیم یافتہ مسلم نوجوانوں کی ایک انجمن نے یہ عبرتناک معلومات افزا اور مدلل دستاویز مرتب کی ہے۔ اس تفصیل سے حبشہ دربار کے مسلمانوں کی حالت ہم واقف نہ تھے اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس مقالے کا ترجمہ شائع کیا جائے تاکہ وہ مسلمان بھی جو انگریزی زبان نہیں جانتے اپنے حبشی مسلمان بھائیوں کے حالات سے واقف ہوں۔ یہ مقالہ اسلامک ریویو انگلینڈ، دسمبر ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا تھا۔ معاصر کے شکریے کے ساتھ ہم اس کا ترجمہ شائع کر رہے ہیں

(ادارہ)

گزشتہ صدی میں جب یورپ کی سامراجی طاقتیں افریقہ پر قبضہ جمانے کے لیے آپس میں کھینچا تانی کر رہی تھیں، ان میں سے چند معلوم و متعین طاقتوں نے حبشہ کے جاہ پسند و بوالہوس بادشاہ منلک سکنڈ کو جدید آلاتِ جنگ کی رشوت دی تاکہ اس کے بدلے میں مفتوحہ علاقوں کے اندر وہ انہیں اپنے لیے مخصوص حلقہ ہائے اثر قائم کرنے کی اجازت دے۔ اس طرح حبشے کے اس بادشاہ کو پڑوس کی کمزور مسلمان ریاستوں پر حربی قوت حاصل ہوگئی۔ اس کے بعد سے جو صدمہ لایا گیا کہ اچھی بڑی مسلمان ریاستوں کو ہڑپ کیا جائے اس نے پڑوسی ریاستوں کو بے دردانہ قتل عام، تباہ کن حملوں، لوٹ مار اور متشددانہ ڈکیتیوں کے ذریعہ فتح کرنا شروع کر دیا۔ مفتوحہ علاقوں کی جائدادیں فاتحین کے لیے مخصوص کر دی گئیں۔ منلک سکنڈ نے نئے مفتوحہ اسلامی علاقوں کے خلاف انتہائی جانبدارانہ پالیسی کا آغاز کیا اور اس نے وہاں کے مسلمانوں پر آہنی ڈنڈوں سے حکومت کی۔ ۱۹۱۳ء میں یہ بادشاہ جسے حبشیوں نے بانیِ سلطنتِ حبشہ کا خطاب دیا تھا — مر گیا اور اس نے اپنے پیچھے شرمناک مذہبی امتیاز کے شکار رعایا چھوڑی

ایک لمبی فہرست چھوڑی۔

تخت پر قبضہ کے لیے دس سالہ سخت مقابلہ کے بعد آخر کار ہیل سلاسی کے سر پر بادشاہت کا تاج رکھا گیا۔ چونکہ یہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان تھا اس لیے بڑی امید تھی کہ اس کے عہد میں انصاف اور امن کا ایک نیا دور شروع ہوگا لیکن یہ امید دہشت انگیزی اور جبر و تشدد کی اس روایتی پالیسی کی سخت گرمی میں بخار بن کر رہ گئی جسے اس نئے بادشاہ نے بھی اختیار کرلیا۔ یہ ارتھاڈوکس چرچ کے جال میں جا پھنسا جو اپنی عدم رواداری میں شہرت عام رکھتا ہے۔ نتیجۃً ایک کلیسائی اقتدار عالم وجود میں آیا۔ ایک بدترین سامراجی نظام حکومت جس کی بنیاد تفریق و امتیاز پر رکھی گئی ہے۔ امہرا قبیلے نے جو بادشاہ کا حکمراں قبیلہ ہے ملک کے تمام معاملات پر کنٹرول حاصل کرلیا

گلا، گریج، دناکل، ہراری اور دوسرے قبیلے جو زیادہ تر مسلمان ہیں اور جن کی تعداد حبشہ کی کل آبادی میں ستر فی صدی ہے، حکومت کے ذمہ دارانہ مناصب سے الگ کر دیے گئے ہیں اور انہیں تعلیم نیز دوسرے بنیادی حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ ایک واضح نمونہ یہ ہے کہ کبھی بھی کسی مسلمان کو منسٹر، گورنر، ڈائرکٹر یا کسی ذمہ دارانہ منصب کے لیے نامزد نہیں کیا گیا۔ معمولی کلرک بھی بہت کم مقرر کیے گئے ہیں۔ اندازاً ایک لاکھ چالیس ہزار طلبہ میں صرف دو ہزار مسلمان ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان علاقوں میں ان کے مناسب حال اسکولوں کا وجود ہی نہیں ہے۔

ہرار، جیما اور دوسرے مقامات میں مسلمانوں کی زراعتیں اور کافی کے باغات، امہرا زمینداروں کے لیے مخصوص کر دیے گئے ہیں اور ان کے اصل مالک اتنے گرا دیے گئے ہیں کہ وہ نیم غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اپنی زمینوں کو اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے مسلمانوں کی جائز کوششوں کو وحشیانہ قتل اور انتہائی تشدد کے ساتھ دبا دیا جاتا ہے۔ اس طرح ان کی خوش حالی افلاس و بدحالی میں بدل گئی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ حبشہ کو بھی ایک نیا جنوبی افریقہ بنا دیا گیا ہے جہاں ایک یہودی النسل اقلیت، افریقہ کی سیاہ رنگ اکثریت کو مسلسل ستا رہی ہے۔

اپنے گلا گھونٹنے والے نظام حکومت کو چھپانے اور دنیا کی رائے عامہ کو حبشہ کی موجودہ تباہ کن حالت سے پھیرنے کے لیے بادشاہ حبشہ نے یہ تدبیر نکالی ہے کہ وہ دنیائے عیسائیت کو متاثر کرنے

[illegible]

گھرا ہوا ہے۔

تمام بیانات کو پیش کرنا مقصود نہیں ۔ مثال کے طور پر دیکھیے۔ ۱۹۵۹ء میں اس نے متحدہ عرب جمہوریہ کا دورہ کیا جہاں اس کا گرم جوشانہ استقبال کیا گیا لیکن اس دورے کے چند دنوں کے بعد اس نے فوراً یہ اعلان کیا کہ اس کی حکومت، دشمن پڑوسیوں سے گھری ہوئی ہے۔ اس سے پہلے بھی جب اس نے ۱۹۵۰ء میں امریکہ کا سفر کیا تھا۔ اسی طرح کے بیانات دیتا رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کے اندیشے کی بنیاد کیا ہے؟

اس کے پڑوسی سوڈان، متحدہ عرب جمہوریہ اور دوسرے عرب ممالک، نوآبادیاتی نظام کے بدترین دشمن ہیں اس کے باوجود انھوں نے حبشہ کے امپرلزم کی قطعاً کوئی مذمت نہیں کی ہے محض اس اندیشے سے کہ کہیں ان پر افریقہ میں نیا مسئلہ ابھارنے کا الزام نہ لگ جائے۔ ۱۹۶۱ء میں سوڈانی فوجوں نے اپنا خون بہا کر ہیل سلاسی کے تخت کی حفاظت کی پھر دوبارہ انھوں نے اس وقت اس کی مدد کی جب اس کے باڈی گارڈ نے اس کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ ۱۹۵۰ء میں عرب ممالک نے جب اری ٹیریا اور حبشہ کے فیڈریشن کی موافقت میں ووٹ دیے تو اس کے معنی یہی تھے کہ وہ اری ٹیریا کی مسلمان حکومت پر بزور قبضہ کرنے کے لیے ہیل سلاسی کی مدد کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ صومالیہ بھی اپنے ایک علاقے اوگڈن کو حبشہ سے واپس لینے میں عرب حکومتوں کی مکمل حمایت حاصل نہ کر سکا۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ پڑوسی عرب حکومتوں کی دشمنی کا پروپیگنڈا ایک جھوٹے جذباتی کھیل کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اگرچہ اس بادشاہ نے شہنشاہیت و ملوکیت کی مذمت کی ہے اور ایسی متعدد افریقہ و ایشیائی مشترکہ کانفرنسوں میں شرکت کی ہے جو نوآبادیاتی حکومت کو تمام دنیا سے اکھاڑ پھینکنے کی تدابیر سوچنے کے لیے منعقد کی جاتی رہی ہیں لیکن ان کا عمل ان اصولوں کے بالکل خلاف ہے جو ان کانفرنسوں میں منظور کیے گئے ہیں۔ افریقن قوم پرستی کے پردے میں وہ اپنے نوآبادیاتی نظام حکومت کو جاری رکھنے کی تدبیریں کر رہے ہیں۔ اری ٹیریا پر قبضہ اور صومالیہ کو مسلسل پریشان کیے جانا اس کا واضح ثبوت ہے۔

نوآبادیت اپنے تمام اعلانات و حجابات کے اندر، خواہ وہ سیاہ ہو یا سفید، ایک برائی کو جنم دیتی ہے اور اس برائی کا دنیا سے بہت جلد خاتمہ ہونا چاہیے۔ قبائلی یا نسلی غلبہ و تسلط اور استحصال دراصل انکار ہے ان تمام بنیادی انسانی حقوق کا جو اقوام متحدہ کے چارٹر میں دیے گئے ہیں اور مخالف ہے اس عالمی اعلان کی جو انسانی حقوق کے بارے میں کیا گیا ہے۔ بانڈونگ کانفرنس نے جو اصول منظور کیے تھے ان میں بھی

نسانی حقوق کے عالمی منشور کی تصدیق و تاکید کی گئی ہے۔ بادشاہ حبشہ کی طرف سے ان تمام اصولوں کی خلاف ورزی عالمی امن کے لیے ایک خطرہ ہے

غیر جانبدارانہ ثبوت

ابھی قریب زمانہ میں بادشاہ حبشہ کے باڈی گارڈ نے جو ناکام بغاوت کی تھی اُس وقت اس نے اپنا ایک وضاحتی بیان براڈ کاسٹ کیا تھا اس میں صراحت کے ساتھ کہا گیا تھا۔

"حبشہ کے باشندے اپنی ایک بہادرانہ اور لمبی تاریخ رکھتے ہیں جس کا سلسلہ ماضی بعید میں تین ہزار سال تک جا پہنچتا ہے۔ اس کے باوجود باشندگانِ حبشہ آج بھی انھیں حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں جن میں ان کے آبا و اجداد بسر کرتے تھے۔ صابر و قانع باشندوں کو امید تھی کہ ان کی حالت روز بروز ترقی کرے گی لیکن اس امید کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا کسی میدان میں کوئی قابل ذکر ترقی نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ باشندگانِ حبشہ کے مقابلے میں نئے آزاد شدہ افریقی عوام زیادہ تیزی کے ساتھ شاہراہ ترقی پر قدم زن ہیں۔ حبشہ والوں نے بڑی رواداری اور قوت برداشت کا ثبوت دیا ہے۔ ایک قلیل تعداد محض پیدائشی حق کی بنیاد پر یا اپنی دولت کے ذریعہ حبشہ کے عوام کا صرف اپنے فائدے کے لیے استحصال کرتی رہی ہے۔ حبشہ کے عوام نے قریب زمانوں میں موجودہ حالات پر اپنی ناراضی کا اظہار کیا ہے اور متعدد بار عوام کے عام احساسات کو دبانے کی کوششیں کی گئی ہیں۔"

اوپر کا اقتباس واضح شہادت ہے ہیل سلاسی کی مطلق العنان بادشاہت اور اخلاقی اعتبار سے تباہ حال حکومت کی۔ اگرچہ آزادی کی یہ کوشش ناکام ہوگئی تاہم اس نے دنیا کے سامنے حکومت حبشہ کے انتشار و بدنظمی اور تنزل و انحطاط کو واضح کر دیا ہے۔ بادشاہ نے ایک پردہ کھینچ رکھا ہے جس کے پیچھے وہ مسلسل بنیادی انسانی حقوق کے لیے اپنے عوام کی جائز مانگ کی مزاحمت کر رہے ہیں۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ عہد توریت و انجیل سے حبشہ ایک آزاد قوم رہا ہے لیکن آزادی کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ کوئی قوم دوسروں کے سیاسی کنٹرول سے آزاد رہے بلکہ اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ:

قوم کو بہتر تعلیم، حصول صحت کی بہتر سہولتیں اور بہتر جائے پناہ بھی میسر ہو۔ مختصراً یوں کہنا چاہیے کہ آزادی کے معنی عوام کے لیے بلند معیار زندگی کا حصول ہے۔ حبشہ والوں کے لیے آج بھی کل کی طرح یہ حقوق خواب و خیال ہیں۔

حبشہ کے مسلمان نسلاً بعد نسل سے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ نقصانات اور سختیاں برداشت کر رہے ہیں اور جبر و تشدد کا یہ حصہ انہیں کی قسمت میں ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہاں کے دوسرے باشندے آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہیں بلکہ بحیثیت مجموعی تمام باشندے سخت گیر اور مطلق العنان ملوکیت کے پنجے میں گرفتار ہیں اور اس ملوکیت کو باہر کی نو آبادیاتی طاقتوں کی تائید حاصل ہے۔ ہم نے یہاں اختصار کے ساتھ اشاروں میں شاہ حبشہ کی غیر منظم، جانبدارانہ اور شخصی حکومت کے کچھ حالات بیان کیے ہیں

شاہ حبشہ افریقی نہیں ہیں

شاہ حبشہ کو بہت فخر ہے کہ ان کا نسلی تعلق ایک یہودی قبیلہ جودعا سے ہے۔ اس دعوے کی بنیاد ایک مشہور عام روایت پر ہے اور جو حبشہ میں آج بھی تازہ ہے۔ اس کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ موجودہ شاہی خاندان کی نسل اس شادی سے وجود میں آئی ہے جو حضرت سلیمان (علیہ السلام) اور ملکہ شیبا کے درمیان ہوئی تھی۔ ملکہ شیبا اور حبشہ کی ملکہ کیڈا کو ایک قرار دیا جاتا ہے۔ اس روایت کی اصل غرض یہ ہے کہ موجودہ حکمرانوں کو مذہبی تقدس و اقتدار عطا کیا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ شاہی خاندان اور حکمران قبیلہ اپنے افریقی النسل ہونے کا شدت سے انکار کرتا ہے اپنی کالی چمڑی کے باوجود یہ لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں کہ انہیں "سیاہ" کہا جائے۔ یہ حبشہ اور آس پاس کے افریقی باشندوں کو بنظر حقارت دیکھتے ہیں اور ان کو تحقیر آمیز لقب سے پکارتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بہت سے وجوہ میں یہ بھی ایک بڑی وجہ ہے ان کی سخت گیر پالیسی اور مطلق العنان بادشاہت کی۔ امہارا قبیلہ اقلیت میں ہونے کے باوجود حکمراں ہے۔ ان کی زبان پورے ملک کی سرکاری زبان ہے اور ان کا مذہب عیسائیت اسٹیٹ کا مذہب ہے۔

پارلیمنٹ اور دستور

حبشہ کی پارلیمنٹ ایک آرائشی کاغذی پھول کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ بادشاہ وجو ممبر خود بنا لیتے ہیں۔ یہ اس پر ربر کی مہر لگا دیتی ہے۔ کچھ ممبروں نے جب تنقید و مخالفت کی کوشش کی تو بادشاہ نے انہیں ممبری سے برطرف کر دیا۔ ایک ممبر نے جب اپوزیشن پارٹی بنانے کی درخواست کی تو پولیس اس کو پارلیمنٹ ہی سے گرفتار کر کے لے گئی اور وہ جیل میں ڈال دیا گیا۔ اس کی حیثیت صرف کٹھ پتلی کی ہے۔ اور تمام دنیا میں پروپیگنڈا یہ ہے کہ حبشہ میں "دستوری بادشاہت" ہے۔ ۴ نومبر ۱۹۵۵ء کو نظر ثانی کے بعد بادشاہ نے جس دستور کا اعلان کیا ہے۔ ہم اختصار کے ساتھ یہاں اس کا جائزہ لیں گے تاکہ حقیقت واضح ہو۔

اس دستور میں ۱۳۱ دفعات ہیں۔ تقریباً ہر دفعہ میں بادشاہ کے نام کا حوالہ دیا گیا ہے۔ تقریباً ۸۰ دفعات صرف بادشاہ اس کے اختیارات و امتیازات ان کے احتساب اور ان کے خاندان وغیرہ سے بحث کرتی ہیں۔ دفعہ ۲۶ بیان کرتی ہے کہ بادشاہ کو ملک کے تمام معاملات پر اقتدار اعلیٰ حاصل ہے۔ دفعہ ۲۷ تا ۳۶ میں ہے کہ بادشاہ بغیر کوئی وجہ بتائے ہوئے پارلیمنٹ کو ختم کر دینے کا اختیار حاصل ہے۔ اس کو اختیار ہے کہ وہ منسٹر اور جج کا تقرر کرے۔ جنگ یا قومی ایمرجنسی کا اعلان کرے۔ تمام خارجی معاملات میں بالادستی اسی کو حاصل ہے۔ معاہدات کی توثیق و منظوری کا حق ہے سکے وہی جاری کرے گا۔ ملک کے دفاع اور استحکام کے لیے تمام ضروری اقدامات وہی کرے گا۔ دفعہ ۸۸ کہتی ہے کہ تجویز کردہ قانون سازی صرف بادشاہ کی منظوری سے قانون بن سکے گا ورنہ بے کار تصور ہوگی۔ اس کے ووٹ کے خلاف کوئی قانون نہیں بن سکے گا۔

تعلیم کی حالت

پروپیگنڈے کے برخلاف حقیقت حال یہ ہے کہ باشندگان حبشہ اب تک جہالت اور ناخواندگی میں غرق ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۹۵ فی صد باشندے ناخواندہ ہیں۔ بادشاہ ہیل سلاسی عملاً ۱۹۱۷ء سے برسر اقتدار ہیں۔ یہ چالیس سال کی مدت ہے (اٹلی کے قبضے کے پانچ سال مستثنیٰ ہیں) کسی مصلح کے لیے یہ مدت اس بات کے لیے کافی ہے کہ وہ ملک کو اپنے ماہرین مہیا کرے لیکن واقعہ یہ ہے کہ بادشاہ کی حکومت ملک کو اعلیٰ تعلیم یافتہ کوئی ایک سول انجنیر یا ڈاکٹر مہیا کرنے میں بھی ناکام رہی ہے۔

غیر مزروعہ زمین

حبشہ میں بدترین قسم کا جاگیردارانہ نظام رائج ہے۔ کاشتکار نیم غلامی کی حالت میں بسر کر رہے ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ شاہی خاندان کلیسا اور دوسرے جاگیرداروں کی مملوکہ زمین کو جوتیں۔ یہ فصل کی ایک تہائی مالکوں کو دیتے ہیں اور ایک تہائی حکومت کے متعدد ٹیکسوں کی نذر ہو جاتی ہے۔ اس جاگیردارانہ نظام کے نتیجے میں اس ملک کی ۳۴ ملین ایکڑ زرخیز زمین بے کار پڑی ہوئی ہے۔

حبشے کا آرتھاڈوکس چرچ

ناقابل انکار طور پر چرچ عنصر کو حبشہ کی سیاسی ساخت میں سیاسی ساخت میں سب پر تفوق حاصل ہے۔ وہ وہاں کا آرتھاڈوکس چرچ ہے۔ اس کے باوجود کہ اس کے پیرو اقلیت میں ہیں لیکن چرچ ملک کی سیاسی طاقتوں سے وابستہ اور ان پر اثر انداز ہے۔ یہ تمام دوسرے مذہب والوں کے خلاف عدم رواداری میں اضافہ ہی کرتا رہتا ہے۔ عیسائیت حکومت کا مذہب ہے جیسا کہ ۱۹۵۵ء کے دستور میں اس کی صراحت کی گئی ہے۔ بادشاہ … سربراہ

ہے، بلکہ کلیسا کا بھی سکولر بنا ہے۔ دستور کی دفعہ ۱۲۶ میں یہ صراحت بھی ہے کہ حبشہ کا بادشاہ ہمیشہ آرتھوڈوکس عقیدہ رکھنے والا ہوگا۔ اس طرح کسی مسلمان یا کسی دوسرے مذہب والے کا سربراہ حکومت ہونا خارج از بحث ہے۔ اسی دفعہ میں ہے کہ تمام مذہبی تقریبات میں بادشاہ کے نام کا حوالہ دینا ہوگا۔ دفعہ ۱۲ میں بادشاہ کو یہ کہنے کا حق دیا گیا ہے کہ: ہم ہمیشہ آرتھوڈوکس عقیدہ رکھیں گے اور اس عقیدے کی حمایت و حفاظت کریں گے ۔۔۔ جان گنتھر نے اپنی کتاب (INSIDE AFRICA) میں اندازہ لگایا ہے کہ حبشے میں پادریوں کی تعداد عیسائی آبادی کا پانچواں حصہ ہے اور کلیساؤں اور عیسائی خانقاہوں کی تعداد پندرہ ہزار سے زیادہ ہے ۔۔۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہاں ملوکیت اس لیے رائج ہے کہ چرچ اس کا مددگار ہے اور چرچ اس لیے طاقتور ہے کہ جہالت اور ناخواندگی عام ہے۔ جب تک چرچ طاقتور ہے اس کی بہت کم امید ہے کہ ملک میں کوئی صحت مند تبدیلی ہوگی۔

حبشہ کے مسلمانوں کے سامنے صرف دو راستے ہیں۔ یا تو وہ اس جبر و تشدد کے شکار رہیں یا پھر اپنی باعزت زندگی کے لیے مقابلہ کریں۔

حبشہ میں مسلمانوں کی تعداد

مسٹر ارنسٹ لوتھر اپنی کتاب "آج کا حبشہ" میں اسلام کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں: باوجود اس کے کہ (بت پرست قبائل کو چھوڑ کر) مسلمان آبادی کی ایک تہائی ہیں لیکن ملک کی سیاست پر ان کا کوئی اثر نہیں ہے کیونکہ پورے ملک کا کنٹرول حکمران قبیلے کے ہاتھ میں ہے۔ آج حبشہ میں اسلام سیاسی لحاظ سے کوئی طاقت نہیں ہے۔

یہ ممکن نہیں ہے کہ حبشہ کی آبادی کی بالکل صحیح تعداد بتائی جاسکے کیونکہ آج تک حکومت کی طرف سے کوئی مردم شماری ہوئی ہی نہیں۔ ۱۹۶۰ء میں حکومت حبشہ نے ۰ ملین کا دعویٰ کیا ہے اس کے مقابلہ میں برطانیہ نے جنگ عظیم ثانی کے فوراً بعد ۰ ملین کا اندازہ کیا ہے۔ ان دونوں کو سامنے رکھتے ہوئے ۰ ملین کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ حکومت مدعی ہے کہ عیسائیوں کی تعداد ۶۰ فی صدی ہے لیکن مسلمانوں نے اس تعداد کو چیلنج کیا ہے اور ان کا دعویٰ ہے کہ مسلمان ۶۰ فی صدی ہیں۔ اطالیہ نے مسلمانوں اور عیسائیوں کو تعداد میں برابر قرار دیا تھا۔ اس طرح کے اور دوسرے اندازوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسلمان اگر زیادہ نہیں تو عیسائیوں سے کم بھی نہیں ہیں [illegible] کے برخلاف حکومت حبشہ میں مسلمانوں کے وجود کو بالکل نظر انداز کرتی ہے۔ خود شاہ حبشہ نے اقوام متحدہ میں امریکہ میں اور دوسری جگہوں پر بیانات دیے ہیں ان میں حبشہ کے اندر اسلام اور مسلمانوں کا

وجود تسلیم ہی نہیں کیا ہے اور ان کے بیانات میں ان کا ذکر تک نہیں آیا ہے۔ ان کی کوشش صرف یہ رہی ہے کہ عیسائی حکومتوں کو حبشے کی عیسائی حکومت کی تائید و حفاظت پر آمادہ کیا جائے جبشہ کے تھیوڈور نے بادشاہ کو عیسائیوں کا حامی اور محافظ قرار دیا ہے لیکن علاوہ اسلام کے دشمن اور مخالف بنے ہوئے ہیں۔

تاریخی دشمنی مسلمانوں پر موجودہ جبر و تشدد کے اسباب و وجوہ کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ہمیں اس مسئلے کے تاریخی پہلو کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ مملکت حبشہ اور اسلام کے درمیان تعلقات کا سرا ابتدائے ظہور اسلام سے جا ملتا ہے۔ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ستم رسیدہ صحابہ نے دو بار حبشہ میں پناہ لی۔ رسول اللہ اور بادشاہ حبشہ کے درمیان دوستانہ مراسلت ہوئی۔

پہلی صدی ہجری (ساتویں صدی عیسوی) میں عرب تاجروں اور انتقال مکانی کرنے والوں نے افریقہ کے موجودہ حصے ساریٹریا اور صومالیہ۔ میں اسلام کا پیغام پہنچایا۔ آہستگی کے ساتھ لیکن باقاعدہ طور پر حبشہ کے اندرونی علاقوں میں اسلام داخل ہو گیا۔ گیارہویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے اس ملک کے شمال شرق، شرق اور جنوب مشرق میں سات اسلامی حکومتیں قائم ہو گئیں ان ساتوں کے نام یہ تھے۔ افات۔ ہدیا ساربابین۔ شرخا۔ دوارو۔ دارا بالی ـــــ اس وقت عیسائی بادشاہوں نے مسلمانوں کے خلاف انتہائی ناروا داری کا ثبوت دیا انھوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک خوں ریز جنگ چھیڑ دی جو پانچ سو سال سے زیادہ تک لڑی جاتی رہی [1] دونوں طرف ہولناک اور ناقابل تلافی نقصانات پہنچے لیکن دونوں میں سے کسی نے بھی دوسرے کی ماتحتی قبول نہ کی۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اندرون ملک میں اسلام نے اپنا پر امن داخلہ جاری رکھا۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں جنوب اور جنوب مغرب کے بیشتر گلا قبائل کی اکثریت مسلمان ہو گئی [2] اسلام کے پرامن ارتقا نے عیسائی حکمرانوں میں غصہ بھڑکا دیا انھیں اندیشہ پیدا ہو گیا کہ اسلامی تعلیمات کے مقابلے میں کہیں عیسائیت دم نہ توڑ دے۔ نتیجۃً انھوں نے مسلمانوں پر شدید مظالم شروع کر دیے۔ کنگ تھیوڈر ایک دشمن اسلام بادشاہ تھا۔ اس نے مسلمانوں پر مصائب کے پہاڑ توڑ دیے اور ان کو زندہ جلا دیا لیکن اس کا جانشین کنگ جان اس سے

---

[1] مسٹر ٹرمنگھم نے ایک کتاب حبشہ میں اسلام لکھی ہے۔ جس میں ایک مفصل باب انھوں نے اسلام اور عیسائیت کے درمیان کشمکش [illegible]

[2] جیما کی [illegible] خوش حال حکومت گلا قبائل کی متعدد آزاد حکومتوں میں سے ایک تھی۔ [illegible] میں جبل سلاسی نے بزور اس کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور اب یہ حکومت حبشہ کا ایک صوبہ ہے جس کا نام کافا ہے۔

بھی برا ثابت ہوا۔ ۱۸۷۸ء میں اس نے اپنا مشہور فرمان جاری کیا جس کی رو سے تمام مسلمانوں کو بتسمہ دے کر عیسائی بنا لینا ضروری تھا۔ مسٹر آرنلڈ نے اپنی کتاب پریچنگ آف اسلام میں اندازہ لگایا ہے کہ اس فرمان کے تحت پچپن ہزار سے زیادہ مسلمان زبردستی عیسائی بنائے گئے اور دوسروں کو یا تو گھروں سے نکال دیا گیا یا انہیں بے رحمی کے ساتھ ختم کر دیا گیا۔ ۱۸۸۹ء میں کنگ یوحانس مہدی سوڈان سے لڑتا ہوا مارا گیا اور اس کی فوج منتشر کر دی گئی۔

کنگ منلک ثانی اور اسلامی حکومتوں کا زوال

اسی دور میں یوروپین طاقتوں کے درمیان افریقہ کو ہڑپ کر جانے کا مقابلہ اپنے نقطۂ کمال کو پہنچ گیا تھا۔ ۱۸۶۹ء میں نہر سوئز کے افتتاح نے افریقہ کے پورے مشرقی ساحل کو غیر محفوظ کر دیا تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ برطانیہ، فرانس، اٹلی اور پرتگال سبھی اس میدان میں آدھمکے۔ ان چاروں طاقتوں نے منلک ثانی کو جدید آلاتِ حرب کی رشوت دی تاکہ وہ اپنے مفتوحہ علاقوں میں ان طاقتوں کو اپنے اثرات قائم کرنے کی اجازت دے دے۔ اس طرح منلک کی جنگی پوزیشن بہت بلند ہو گئی۔ اس نے جدید آلاتِ جنگ کے بل پر ان کا آزاد اسلامی حکومتوں کو ہڑپ کرنا شروع کر دیا جو اس کی مملکت کے پڑوس میں تھیں۔ ہرار، اوسا، والو، جیا، اروسی، اوگڈن اور دوسری حکومتیں اس کا شکار بن گئیں۔ انھوں نے بہادری سے مقابلہ کیا لیکن تلواریں اور نیزے جدید آلات کے مقابلے میں کب تک ٹھہر سکتے تھے۔ منلک نے فتح کر کے ان کی بہادری کے بدلے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا اور انہیں تباہ و برباد کر دیا۔ اس کے علاوہ اس نے یہ کوشش بھی کی کہ ان علاقوں سے اسلام کی جڑیں اکھیڑ دے۔ اس نے قرآن کی تعلیم دینے والے مدرسے بند کر دیے اور ان کی جائدادوں پر قبضہ کر لیا۔ اس نے علماء و مشائخ کو جیلوں میں ڈال دیا اور انہیں سخت اذیتیں دیں تاکہ وہ اسلام کی تعلیم و تبلیغ ترک کر دیں۔

۱۹۰۶ء کے سہ حکومتی (انگلینڈ، فرانس، اٹلی) معاہدے کے ذریعہ اس نے ان حکومتوں کو نئے مفتوحہ علاقوں میں مخصوص رعایتیں عطا کیں۔ فرانس کو ڈیبوتی تک ریلوے بنانے کی۔ اٹلی کو زمین کی ایک لمبی پٹی عطا کی جو اس کی کالونی صومالی لینڈ اور اریٹریا کو ملاتی تھی اور باقی رعایتیں برطانیہ کو۔

بادشاہ لج یاسو

منلک ۱۹۱۳ء میں مر گیا اور اس کی ظالمانہ و بے رحمانہ حکومت ختم ہوئی آخر کار اس کا پوتا منصب جلیلہ پر بیٹھا۔ وہ اپنے پیچھے ایسے نظاموں کو چھوڑ گیا جو نیم مردہ تھے۔ اس نئے بادشاہ کے عہد میں مسلمانوں کو سانس لینے کا موقع ملا لیکن بدقسمتی سے اس بادشاہ کا عہدِ حکومت بہت مختصر

۔ یہ سلسلہ ۱۹۱۶ء میں برطرف کر دیا گیا۔ حکمراں قبیلے کے اعیانِ حکومت اور افسروں نے اس کو بے دخل کیا اور ...
... کی طرف بھاگ گیا۔ پھر ۱۹۲۱ء میں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا اور ... اسکو زہر دیا گیا اور وہ ... میں مر گیا

... فکری اور ... کے خلاف صلیبی جنگ

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ہیل سلاسی نے اپنے ... ہی کی پالیسی اختیار کر رکھی ہے انھوں نے اس بات کی سرگرم کوششیں کی ہیں کہ مسلمانوں کو عیسائی بنالیں۔ اسی مقصد سے انھوں نے ہرار، جیما، داوا، افات اور دوسرے ... ت میں اسلامی تہذیب کے تمام مراکز بند کر دیے۔ عربی زبان کی تعلیم روک دی جو اس ملک کی اسلامی ... کا واحد ذریعہ ہے اور اسلامی علاقوں کے ارد گرد ایک آہنی پردہ کھینچ دیا تاکہ انہیں بیرونی اسلامی ... وں سے علیحدہ رکھا جائے۔ کسی عالمِ دین کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ مسلم علاقوں میں داخل ہو سکے ...ء میں جامع ازہر کے ایک مشن کو چند گھنٹوں میں ادیس ابابا کو چھوڑ دینے پر مجبور کیا گیا۔ مسلمانوں کو ... کے ایک امدادی فنڈ میں حصہ لینے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ بادشاہ نے ہر اسلامی شہر اور گاؤں کے ... یلے عیسائی تعمیر کرنے میں حبشہ کے مختصر بجٹ کو انتہائی فضول خرچی کے ساتھ صرف کیا ہے۔ غرض یہ ہے کہ باہر کے والوں کو یہ غلط تاثر دیا جائے کہ ان مقامات میں عیسائیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

ان سب سے زیادہ بری حرکت یہ ہے کہ بادشاہ نے تمام ذہنی و عقلی مشغلوں، اداروں اور تحریکوں ... خلاف ایک گھناؤنی جنگ چھیڑ رکھی ہے۔ انیسویں صدی میں باہر سے آنے والوں نے لکھا ہے کہ اس ملک کی ... ی حکومتوں میں بکثرت تعلیمی ادبی تحریکیں کام کر رہی ہیں۔ آج ان میں سے ایک بھی موجود نہیں ہے سب حبشہ ... بادشاہوں کے غیظ و غضب کا شکار ہو کر ختم ہو گئیں۔

مسلمانوں کے خلاف پاجیانہ حرکتیں

مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی ظالمانہ کوششیں آج بھی جاری ہیں اور بت پرستوں کو اسلام قبول کرنے سے روکا جاتا ہے ... امو میں ایک بت پرست سردار نے اپنے قبیلے کے ساتھ اسلام قبول کر لیا، اس کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا ... اس کو ناقابلِ برداشت اذیتیں دی گئیں۔ یہاں تک کہ اس کو ارتھاڈوکس عقیدہ قبول کرنے پر مجبور کر دیا ... ما۔ اسی طرح ایک دوسرے سردار کو سات ماہ تک ستایا گیا۔ یہاں تک کہ وہ صومالیہ بھاگ گیا۔ بہت سے ... زا ... مشہور مسلمانوں کو ظلم سے تنگ آکر اپنا عقیدہ ترک کرنا پڑا ہے۔

سیکڑوں کو جھوٹے الزامات لگا کر گرفتار کیا گیا۔ ایک عالم پر الزام ہے کہ وہ شاہی حکومت کو ...

بدنام کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بغیر کسی مقدمے کے مسلمانوں کو گرفتار کرنا اور موت تک کی سزا دینا بکثرت رائج ہے۔ ایک سوڈانی ڈاکٹر جس نے حبشہ کے قید خانے کا معائنہ کیا تھا مرحوم مہدی سوڈانی (محمد احمد) [illegible] کے سامنے چار سو قیدیوں کا قصہ بیان کیا جن کی اکثریت عمر رسیدہ تھی۔ وہ چار چار چھ چھ سال سے جیل میں بغیر کسی مقدمے کے پڑے ہوئے تھے۔ یہ لوگ شاہی خاندان اور گورنر کے مقبوضہ کافی کے باغات سے گرفتار کیے گئے تھے اور ان پر الزام صرف یہ تھا کہ وہ "شاہیت" کو بدنام کرتے ہیں۔

پرسنل لا کا خاتمہ

پہلے مسلمانوں کے لیے خاص عدالتیں تھیں جن میں قاضی شریعت، شادی بیاہ، میراث اور دوسرے معاملات کا فیصلہ کیا کرتے تھے لیکن اب بادشاہ نے جو نیا سول لا بنایا ہے اور جس کا نفاذ ۱۹۶۱ء میں ہوا ہے اس کی وجہ سے یہ تمام عدالتیں عملاً ختم ہو گئی ہیں۔ اب جو سول لا رائج ہے وہ یہودیوں، عیسائیوں، قبطیوں اور حبشہ کے رسم و رواج کا ایک مخلوطہ ہے۔ نئے سول لا کی کتاب میں ۳۳۸۷ دفعات ہیں۔ یہ بات محتاج ثبوت نہیں کہ یہ قانون، اسلامی شریعت کے خلاف ایک حملہ ہے مثال کے طور پر اس کی دفعہ ۵۸۰ مرد و عورت کے ناجائز تعلق کو قانونی حیثیت دیتی ہے۔ اگر اس تعلق سے کوئی بچہ پیدا ہوا اور باپ تصدیق کر دے کہ یہ اس کا بچہ ہے تو وہ میراث کا مستحق ہوگا۔ اس قسم کا ملاپ اور تعلق حبشہ کے قبطی باشندوں میں عملاً رائج ہے۔

دفعات ۹۵۶-۹۲۶ ان ۳۰ دفعات میں میراث کے جو قوانین مرتب کیے گئے ہیں وہ اسلامی شریعت کے قوانین کے بالکل خلاف ہیں۔ ان میں اسلامی قوانین میراث کے احترام کا قطعاً انکار کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شرعی عدالتوں کو قانوناً بند کرنے کی ضرورت نہ پڑی اور وہ اپنی موت آپ مر گئیں۔ مسلمانوں نے اپنے مذہبی عقائد کے مستقبل سے مایوس اور دہشت زدہ ہو کر بادشاہ کے سامنے پرزور احتجاج کیا۔ پارلیمنٹ کے کچھ مسلمان ممبروں نے بادشاہ کو درخواست دی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا اور بادشاہ نے اس سول لا کی منظوری دے دی۔

وحشیانہ قتل عام

حکمران قبیلہ مسلمانوں کا وحشیانہ قتل عام کرتا رہتا ہے۔ مسلمانوں کی زرخیز زمینوں پر قبضہ کرنے کے لیے اس قبیلے کے لوگ مسلمانوں کے گاؤں میں بھیج دیے جاتے ہیں اور اگر مسلمان ان کے ناجائز قبضے کی جائز مزاحمت کرتے ہیں تو ان کو سختی سے کچل دیا جاتا ہے۔ بسا اوقات حکومت مسلمانوں کی اس مزاحمت کو کچلنے کے لیے فوجی مدد بھی دیتی ہے۔ کبھی کبھی ان وحشیانہ قتل سے پہلے وہ [illegible][1]

---

[1] [illegible] (مترجم)

[illegible] میں ایک [illegible] کو [illegible] کے ایک [illegible] پانچ افراد کو ان کی عورتوں اور بچوں کے سامنے برسر عام پھانسی دے دی گئی۔ اس ظلم کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ ۱۴ر جولائی [illegible] کے نیویارک ٹائمز نے اس طرح کی ظالمانہ حرکات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے۔

"ہیل سلاسی نے لوگوں کی نگاہوں سے اس قتل عام کو بھی چھپانے کے انتظامات کیے جو مارچ میں "اگرا الم" شہر میں کیا گیا۔ اس کی پولیس نے سیکڑوں کاشتکاروں کو اس جرم میں گولی مار دی کہ انھوں نے اپنے جاگیردار زمینداروں کے خلاف بغاوت کیوں کی تھی۔

صوبائی انتظام

حبشہ میں صوبائی ایڈمنسٹریشن حسب ذیل ڈویژنوں میں منقسم ہے۔ یہ پورا ملک بارہ صوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان تمام کے سربراہ یا تو شہزادے ہیں یا حکمران [illegible] کے نواب۔ اور یہ سب صرف بادشاہ کے سامنے جواب دہ ہیں۔ پھر یہ صوبے ۴۷ ذیلی صوبوں میں بٹے ہوئے ہیں جن کے حاکم گورنر ہوتے ہیں ان گورنروں میں بھی کوئی مسلمان نہیں ہے۔ یہ ذیلی صوبے ۱۲۲ اضلاعوں میں تقسیم کیے گئے ہیں۔ ضلع کے حاکموں میں صرف ۲۷ مسلمان ہیں۔

پڑوسیوں کے ساتھ تعلقات

بادشاہ کی پالیسی اپنے مشرقی پڑوسیوں اریٹریا، صومالیہ کے بارے میں بے بنیاد اندیشوں پر قائم ہے۔ انھوں نے ان ملکوں کی آزادی کی مخالفت کی۔ [illegible] میں انھوں نے چند ستمین نوآبادیاتی طاقتوں کے ساتھ مل کر یہ پلان بنایا کہ ان ملکوں کو ان کی مملکت میں شامل کر دیا جائے۔ ان کا پلان صرف اریٹریا کے بارے میں کامیاب ہوا۔ مغربی حکومتوں کے زیر اثر اقوام متحدہ نے ۲ر دسمبر [illegible] کو ایک ریزولیشن شائع کیا جس کا نمبر (۲) A ۳۹۰ ہے اس کے ذریعہ حبشہ کے ساتھ اس کا فیڈریشن قائم کیا گیا داخلی معاملات میں اریٹریا کی حکومت کو مکمل خود مختاری دی گئی اور ایک جمہوری نظام کے تحت فیڈریشن قائم کیا گیا ۱۱ر ستمبر [illegible] کو شاہ حبشہ نے اس ریزولیشن کی تصدیق کر دی۔ ۱۵ر ستمبر [illegible] کے بعد برٹش ایڈمنسٹریشن نے اریٹریا کے سربراہ اور شاہ حبشہ کے نمائندوں کو حکومت حوالہ کر دی۔ اسی دن سے اریٹریا کی حکومت ایک ایسے پھندے میں پھنس گئی ہے جس سے نکلنا مشکل ہو رہا ہے۔ وہاں اب تک کسی فیڈرل حکومت کا [illegible] کے مسائل پیدا ہو رہے ہیں جن کا کوئی حل نہیں ہے۔ حکومت حبشہ صرف اپنے کو فیڈرل حکومت سمجھ [illegible] کے ریزولیشن کی ان دفعات کو بالکل نظر انداز کر رہی ہے جو اس مسئلے سے بحث کرتی ہیں [illegible] میں [illegible] میں اریٹریا کے لیڈروں نے ایک شخص [illegible]

کی کہ حبشہ کی حکومت ان پہ اتنے مظالم ڈھارہی ہے کہ ۲۰ سال کی نوآبادیاتی حکومت میں بھی اتنے مظالم نہیں ڈھائے گئے لیکن افسوس کہ سکریٹری جنرل نے ان ریفرنڈم کو بہرے کانوں سے سنا۔ اس طرزِ عمل نے اقوام متحدہ پر اس اعتماد کو نقصان پہنچایا جو اریٹریا کے باشندوں کو تھا۔ اس ریفرنڈم کے سلسلے میں وہ لیڈر حبشہ کے جبر و تشدد کا شکار ہوئے جنھوں نے یہ جرأت کی تھی۔

صومالیہ کی آزادی کے خلاف بھی بادشاہ نے پوری کوشش کی لیکن وہاں کے عوام کی بیداری کی وجہ سے کامیاب نہیں ہوئے۔ آخرکار یکم جولائی ۱۹۶۰ء کو صومالیہ بالکل آزاد ہوگیا۔ اب حبشہ سے سرحد اور صوبہ اوگاڈن کے بارے میں کشمکش جاری ہے۔ اور امید نہیں کہ پرامن طور پر یہ مسئلہ حل ہو سکے بلکہ جب تک حبشہ پر ملوکیت مسلط ہے خود حبشہ کے داخلی و خارجی مسائل حل نہیں ہو سکتے۔

(اسلامک ریویو دسمبر ۱۹۷۶ء)

شاہ فیصل کے دو مشورے

حج کے بعد مکہ معظمہ میں رابطہ عالم اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس کے خطبۂ افتتاحیہ میں نجد و حجاز کے فرمانروا شاہ فیصل نے مسلم اکثریت اور مسلم اقلیت کو مشورہ دیتے ہوئے کہا:۔

جلالۃ الملک نے ان ملکوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور ان ملکوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں فرق کیا انھوں نے مسلم اکثریت والے ممالک پر زور دیا کہ وہ ایسے آئین بنائیں جن کی بنیاد کتاب و سنت پر ہو اور جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں ان کو مشورہ دیا کہ وہ ایک سچے مسلمان کی زندگی بسر کریں اور حکومت وقت کے خلاف بغاوت نہ کریں اور پرامن زندگی گزاریں جو اسلام کی تعلیم ہے۔

قومی آواز لکھنؤ ۔ ۲۰ اپریل ۱۹۶۵ء

سچے مسلمان کی زندگی بسر کرنے کا مشورہ مسلم اکثریت اور مسلم اقلیت دونوں کے لیے یکساں اہمیت رکھتا ہے جن ملکوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں کتاب و سنت پر مبنی آئین کی تدوین اور اس کی تنفیذ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو سچے مسلمان ہوں آج مسلم اکثریت والے ملکوں کی سب سے بڑی مصیبت یہی تو ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں ان ملکوں کی باگ ڈور ہے وہ سچے مسلمان کی زندگی بسر کرنا نہیں چاہتے، اگر وہ اس پر آمادہ ہوتے تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہاں غیر اسلامی آئین نافذ ہوتا۔ ان ملکوں کی صورت حال یہ ہے کہ با اقتدار گروہ صرف یہی نہیں کہ اسلامی آئین بنانے اور نافذ کرنے پر تیار نہیں بلکہ وہ ہر ایسی جماعت کو کچل رہا اور کچلنے پر آمادہ ہے جو اسلامی آئین نافذ کرنے کا مطالبہ کر رہی ہے اور اس کے لیے سرگرم عمل بھی ہے۔

مسلم اقلیت کو سچے مسلمان کی زندگی بسر کرنے کا مشورہ برمحل ہے اور ضروری ہے۔ سچا مسلمان بنے بغیر نہ مسلم اقلیت کو عزت کا مقام مل سکتا ہے اور نہ ان ملکوں میں خود اسلام کے فروغ اور اس کی تبلیغ کی راہ نکل سکتی ہے جہاں وہ مسلمان رہتے ہیں۔ حکومت کے خلاف بغاوت نہ کرنے کے مشورے سے شاید وہ لوگ کچھ

والے کسی مسلمان کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ ویسے شاہ فیصل کو مطمئن رہنا چاہیے کہ جہاں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہ اتنے دبکے ہوئے، مرعوب اور نیم جان ہیں کہ انہیں بغاوت کا خیال ہی نہیں آسکتا۔

شاہ فیصل نے دوسرا اہم زور مشورہ علما کو دیا ہے۔

> انھوں نے علما پر زور دیا کہ وہ اسلام کو عہد حاضر کے تقاضوں کے حل کی شکل میں پیش کریں تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ اسلامی طرز حیات لفظاً و معنیً میں دوسرے نظام ہائے حیات سے بہتر اور برتر ہے۔
>
> (قومی آواز، ۲۰ اپریل)

مشورے کا یہ ترجمہ پڑھ کر خیال ہوا کہ مشورہ دیتے وقت کہیں شاہ فیصل کے سامنے جماعت اسلامی کا لٹریچر تو نہیں تھا۔ اسلام کو پیش کرنے کی جس تعبیر کا انھوں نے مشورہ دیا ہے وہ تو جماعت اسلامی کی غلطیوں میں شمار ہوتی ہے۔ بہرحال مشورہ نیک ہے۔ اللہ علماء کو اسے قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

امریکہ میں نیگرو قوم کا مسئلہ

قانون کی بے بسی

امریکہ میں نیگرو قوم کا مسئلہ اب تک لاینحل ہے، وہ اب تک نیم غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں کتنے ہی شہری و ملکی حقوق ہیں جن سے وہ آج تک محروم ہیں یہاں تک کہ جنوبی امریکہ کی ریاستوں میں وہ عملاً ووٹ ڈالنے کے حق سے بھی محروم رکھے گئے ہیں۔ قومی عظمت و وقار کے لیے نیگرو سالہا سال سے جدوجہد کر رہے ہیں اور ادھر ان کی یہ جدوجہد بہت تیز و تند ہو گئی ہے۔ جیسے جیسے ان کی تحریک زور پکڑ رہی ہے ویسے ویسے وہاں سفید رنگ نسل پرست اپنے تشدد میں اضافہ کرتے جا رہے ہیں۔ امریکی کی سمجھ میں اب تک یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ ان کا موجودہ رویہ خود ان کے لیے مہلک ثابت ہوگا۔ نیگرو قوم کی آزادی اور اس کے وقار کو وہ زیادہ دنوں تک دبا نہیں سکیں گے۔ وہاں کی فیڈرل حکومت اب اس مسئلے کی نزاکت کو شدت سے محسوس کرنے لگی ہے موجودہ صدر جانسن نے شہری حقوق (سول رائٹس) کا [illegible] پیش کرنے سے پہلے ماہ مارچ [illegible] کو امریکی [illegible] پیش [illegible] چلنے [illegible]

[illegible] کہ [illegible] بہت [illegible] اور [illegible]

ہے۔ ایک طرف وہ نیگرو قوم کی مظلومانہ زندگی پر سب سے زیادہ مستند شہادت ہے اور دوسری طرف قوم کی بے بسی کا بلند آہنگ اعلان ہے۔ ذیل میں اس پیغام کے چند اقتباسات کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ہمارے سامنے اس پیغام کا وہ مکمل متن ہے جس کو یونائیٹڈ اسٹیٹس انفورمیشن سروس نیو دہلی نے پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا ہے۔ عنوانات ہم نے قائم کیے ہیں۔

سیلما میں کیا ہوا سیلما (الباما) میں عورتوں اور مردوں نے جو عرصۂ دراز سے نقصانات اور مصیبتیں برداشت کر رہے ہیں، اپنے ان حقوق کے انکار پر جو امریکی شہری ہونے کی جہت سے انہیں حاصل ہونے چاہییں، پرامن احتجاج کیا۔ لیکن ان میں سے بہتوں پر بے رحمی کے ساتھ حملے کیے گئے اور ان میں سے ایک اچھا آدمی ایک مذہبی آدمی مار ڈالا گیا۔ سیلما میں جو کچھ ہوا اس پر فخر نہیں کیا جا سکتا۔ لاکھوں امریکیوں کے مساویانہ حقوق کا عرصۂ دراز سے جو انکار کیا جا رہا ہے اس پر اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔

مسئلے کی نوعیت جس دور میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں وہ بڑا بحرانی دور ہے۔ ہماری زندگیاں بہت سے متنازع فیہ مسائل کے لیے موضوع بحث بنی رہی ہیں۔ جنگ اور امن کے مسائل کامیابی و خوش اقبالی اور ناکامی و بداقبالی کے مسائل لیکن کیا واقعی طور پر کسی زمانے میں بھی کسی مسئلہ نے خود امریکہ کی جرأت و ہمت کو کمزور کیا۔ کیا فی الواقع ہمارے سامنے کوئی چیلنج آیا۔ ہماری ترقی، ثروت فلاح یا تحفظ کے لیے نہیں بلکہ ہماری قوم کی اقدار اور مقصد و منشا کے لیے۔ امریکن نیگروز کے لیے مساویانہ حقوق کا مسئلہ ایک ایسا ہی مسئلہ ہے۔ اگر ہم ہر دشمن کو شکست دے دیں، اپنی دولت دگنی کر لیں اور ستاروں کو فتح کر لیں لیکن اس مسئلے کو حل نہ کر سکیں تو ہم بحیثیت قوم اور بحیثیت انسان ناکام ہو جائیں گے۔ کوئی ملک ہو یا کوئی فرد واحد اگر پوری دنیا بھی جیت لے لیکن اپنی روح کھو دے تو اسے کامیاب نہیں کہا جا سکتا۔ نیگرو کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ جنوبیوں کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ شمالیوں کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ صرف امریکہ کا مسئلہ ہے اور ہم صرف امریکی ہونے کی جہت سے اس کو حل کرنے کے [illegible]

ووٹ کا حق تمام شہری حقوق میں ایک بڑا [illegible] ہے کہ جمہوریت [illegible] حق حاصل ہو [illegible] [illegible] تاریخ ہے [illegible] حقوق [illegible]

ہو سکتا کہ ہر امریکی شہری کو ووٹ کا مساویانہ حق ملنا چاہیے اس حق کے انکار کو معاف کرنے کی کوئی دلیل ہے۔ ہم پر اس سے زیادہ وزنی کوئی ذمہ داری نہیں ہے کہ ہم ہر ایک کے لیے اس حق کے استعمال کو یقینی بنائیں

ار حقیقت

ابھی تک ناگوار و ناپسندیدہ حقیقت یہ ہے کہ اس ملک کے بہت سے مقامات میں۔ مرد و عورت ووٹ دینے کے حق سے محروم ہیں اور انہیں محض اس وجہ سے محروم رکھا گیا ہے وہ نیگرو ہیں۔ ہر وہ تدبیر جو انسانی ذہن اختراع کر سکتا ہے۔ ان لوگوں کو اس حق سے محروم رکھنے کے لیے عمل کی جاتی رہی ہے۔ اگر نیگرو اپنے کو رجسٹرڈ کرانے کے لیے جائیں تو ان سے صرف یہ کہہ دینا کافی سمجھا ہے کہ تم غلط دن آئے ہو یا دیر کرکے آئے ہو یا یہ کہ افسر انچارج حاضر نہیں ہے۔ اگر وہ انتظار کرے اور اپنے رجسٹرار کے سامنے حاضر کرنے کا انتظام کرے تو اسے محض اس بنیاد پر بھی نااہل قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس نے درخواست میں ایک لفظ کو مختصر کر دیا ہے اور اگر درخواست میں کوئی غلطی نہ نکالی جا سکے تو درخواست دہندہ کے لیے ایک امتحان کا قضیہ کھڑا کر دیا جاتا ہے اور رجسٹرار ہی کو اس کا پورا اختیار حاصل ہے کہ اس امتحان میں وہ کو کامیاب قرار دے یا ناکام۔ امتحان میں اس سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ وہ امریکی دستور پورا کا پورا سنائے یا ریاستی قانون کے کسی انتہائی پیچیدہ دفعہ کی تشریح کرے۔ کالج کی سند بھی اس بات کا ثبوت نہیں بن سکتی کہ وہ لکھنا پڑھنا جانتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان موانع سے بخیریت گزر جانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ اپنی سفید چمڑی دکھائی جائے۔

ن کی بے بسی

تجربے نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ قانون کا موجودہ طریق عمل منظم اور مکارانہ امتیازی پالیسی کو ختم نہیں کر سکتا۔ اگر مقامی افسر طے کر چکے ہوں کہ نیگروز کو ووٹ نہ دینے دیں گے تو پھر اس وقت ہماری کتاب قانون میں کوئی دفعہ ایسی نہیں ہے جو ان کے لیے اس حق کے استعمال کو یقینی اور محفوظ بنا سکے۔ ایک ایسے معاملے میں ہماری ذمہ داری واضح ہے۔ ہمارا دستور کہتا ہے کہ کوئی شخص رنگ یا نسل کی وجہ سے ووٹ دینے کے حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ ہم سب نے خدا کے سامنے عہد کیا ہے کہ اس دستور کی حمایت کریں گے اور اس کی قدر و قیمت کو بڑھائیں گے۔ لہٰذا ہمیں اس عہد کا پاس ... یہ کام کرنا چاہیے۔

اگر ہم اس بل پر ... جو ... پیش کرتا ہے) کو پاس کر لیں تو اس کے معنی یہ ... [illegible]

جس کا اثر ریاست امریکہ کے ہر حصے تک پہنچا ہوا ہے۔ یہ تحریک امریکن نیگروز کی یہ جدوجہد ہے کہ انھیں امریکی زندگی کی تمام سہولتیں اور برکتیں ملنی چاہییں۔ ان کے قضیے کو ہمیں اپنا قضیہ بھی سمجھنا چاہیے۔ صرف نیگروز کو نہیں بلکہ ہم سب کو اس تعصب اور ناانصافی پر غالب آنا چاہیے جو وراثۃً ہمیں ملی ہے۔

جرأت مندانہ اظہار و اعلان

ایک ایسے انسان کی حیثیت سے، جس کا جنوبی امریکہ کی سرزمین سے گہرا خاندانی تعلق ہے میں جانتا ہوں کہ خاندانی و نسلی احساسات کس قدر تکلیف دہ چیز ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ سوسائٹی کی ساخت اور اس کے انداز فکر کو نئی شکل دینا کتنا مشکل کام ہے۔ بایں ہمہ ایک صدی پہلے نیگرو آزاد کیا گیا تھا۔ مگر اب تک وہ پوری طرح آزاد نہیں۔ ایک صدی گزر گئی جبکہ اس سے مساوات کا وعدہ کیا گیا تھا مگر اب تک وہ مساوی نہیں ہے۔ وعدے کے دن پر سو سال گزر گئے مگر وعدہ اب تک پورا نہیں ہوا۔

انصاف کا وقت اب آ گیا ہے اور کوئی طاقت اس کو واپس نہیں کر سکتی۔ انسان اور خدا دونوں ہی کے نزدیک یہ وقت آنا چاہیے اور جب یہ آجائے گا تو تمام امریکنوں کی زندگیوں کو روشن کر دے گا۔

اور گورے بھی

صرف کالے نیگرو ہی مصیبت زدہ نہیں ہیں، کتنے ہی گورے بچے اعلیٰ تعلیم سے محروم ہیں کتنے ہی گورے خاندان غربت و افلاس میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کتنے ہی سفید فام باشندے خوف زدہ ہیں اس لیے کہ ہم نے اپنی قوت اور وسائل و ذرائع کو نفرت اور دہشت کی حدود کو برقرار رکھنے میں برباد کیا ہے۔ جو لوگ تم سے یہ کہتے ہیں کہ ماضی کی روایت کو مضبوطی سے تھامے رکھو وہ یہ بات اس قیمت پر کہتے ہیں کہ تم اپنے مستقبل کو برباد کر لو۔

کہیں بھی نہیں

امریکہ کا کوئی حصہ بھی ایسا نہیں ہے جہاں انسانی مساوات کے وعدے کو پوری طرح پورا کیا گیا ہو۔ سیلما یا دوسرے مقامات میں جو کچھ ہوا اس کا تعلق امریکہ کے ہر شہری سے ہے۔ اس کے باوجود ہم میں سے ہر شخص کو اپنی برادریوں اور اپنے دلوں کو دیکھنا چاہیے اور وہاں سے ناانصافی کو اکھاڑ پھینکنا چاہیے۔

صدر امریکہ کے اس زوردار بیان کے یہ چند اقتباسات بھی وہاں کی جو تصویر پیش کرتے ہیں وہ محتاج تعارف نہیں ہے۔ ان کا اپنا اعتراف یہ ہے کہ امریکہ کے کسی حصہ میں بھی نیگرو کو مساوات [illegible] [illegible]

وہاں کی ریاستوں کے حکام و عمال ان مظلوموں کو ووٹ تک کے حق سے محروم رکھنے کے لیے جو گھٹیا اور انتہائی مستبدانہ طریقے اختیار کرتے ہیں۔ وہ ان ملکوں میں بھی بہت کم استعمال کیے جاتے ہوں گے جن کو پس ماندہ کہا جاتا ہے سیاسی پہلو کے دوسرے حقوق کو بھی قیاس کرنا چاہیے۔ "انسانی مساوات" جو آج کل کے مہذب ممالک کا گویا کلمۂ ایمان و اسلام ہے اس کی حیثیت بھی واقعات کی دنیا میں منافقانہ اقرار کے سوا اور کچھ نہیں ہے جب گوری چمڑی رکھنے والے غریب افراد اور غریب خاندان بھی عدم مساوات کے شکار ہیں تو پھر نیگرو قوم کی تو لے دے وتری کا کیا ٹھکانا ہوگا صدر امریکہ کے بیانیں دستور و قانون کی بے بسی بھی بالکل کھلی ہوئی ہے۔ ممکن ہے تازہ بل سے جزوی طور پر کچھ فائدہ پہنچ جائے لیکن اس سے نیگرو کے مسائل حل نہیں ہوں گے جیسا کہ خود صدر کو بھی اس کا اعتراف ہے۔

دنیا میں جہاں کہیں بھی نسل و رنگ کی پرستش نے انسانوں کے درمیان فرق و امتیاز کی دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں اور انسانیت کو ذلیل و رسوا کر رکھا ہے اس کا خاتمہ صرف اسلامی تعلیمات سے ممکن ہے ــــ جب تک انسان ہر پرستش سے تائب ہو کر صرف ایک خدا کی پرستش پر جم نہ جائے جب تک انسان کو اس حقیقت کا یقین حاصل نہ ہو جائے کہ دنیا کے تمام انسان دراصل ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں اور جب تک انسان اس حقیقت پر ایمان نہ لائے کہ اسے مر کر پھر زندہ ہونا اور خدا کے سامنے اپنی زندگی کا حساب دینا ہے اور اسی دوسری زندگی کی کامیابی اصل کامیابی اور اس کی ناکامی اصل ناکامی ہے اس وقت تک دنیا سے نہ نسل پرستی کا ظلم ختم ہو سکتا ہے اور نہ کوئی اور ظلم۔

عدل کا قیام اور ظلم کا خاتمہ صرف اسلامی عقائد و تعلیمات ہی کے ساتھ وابستہ ہے۔

مدیر

تنقید و تبصرہ

پیغمبرِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم

مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی، صفحات ۶۲۰ مجلد گرد پوش کے ساتھ
قیمت :- دس روپیہ۔ ناشر :- ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور

اس کتاب پر "پاکستان و ہندوستان کے خادمانِ سیرت" کے عنوان سے مولانا احسن مثنیٰ ندوی نے ایک مقدمہ لکھا ہے۔ اس مقدمے میں اب تک سیرت نبوی پر اردو زبان میں جو کام ہوا ہے اس کا تاریخی جائزہ لیا گیا ہے۔ فاضل مقدمہ نگار کی نگاہ میں سیرت نبوی پر جو اہم کتابیں اردو میں لکھی گئی ہیں ان کا ایک ترتیب کے ساتھ انھوں نے ذکر کیا ہے اور آخر میں "پیغمبرِ انسانیت" کی خصوصیات پر اختصار کے ساتھ چند سطریں لکھی ہیں۔ یہ مقدمہ اپنی ایک مستقل افادیت رکھتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب سیرت نبوی پر ایک مفکرانہ کتاب ہے۔ فاضل مصنف نے اکثر واقعات کے آخر میں "لمحہ فکریہ" کے عنوان سے اپنے غور و فکر کے نتائج پیش کیے ہیں۔ زبان بڑی رواں اور دلکش ہے۔ اندازِ بیان تنا صاف اور واضح ہے کہ کہیں بھی طبیعت میں انقباض یا الجھن پیدا نہیں ہوتی۔ ہر مخلص مسلمان کے دل میں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت موجود ہے اور یہ محبت جب ادب کا لباس پہن لیتی ہے تو خود محبوب بن جاتی ہے۔ فاضل مصنف نے متعدد مقامات پر اپنی محبت رسول الفاظ کے خوبصورت پیالوں میں انڈیل دی ہے۔ تبصرہ نگار نے قلت فرصت کے باوجود اس کتاب کو بالاستیعاب پڑھا ہے۔ بڑا اچھا ہوتا اگر یہ کتاب تنقید و تبصرہ کی غرض سے نہ پڑھنی پڑتی۔ کیونکہ تنقید کا کام بڑا ہی ناخوشگوار کام ہے۔ دیانت کے نقطہ نظر سے اپنے نزدیک قابل گرفت مقامات کی نشان دہی ضروری۔ اور کتاب کو تبصرے کے لیے بھیجنے والوں کی تجارت کے نقطہ نظر سے یہ کام غیر ضروری۔ اس لیے بڑی کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ سے توقع یہ ہے کہ وہ تبصرہ نگار کو معذور سمجھ کر تبصرے کے تنقیدی حصے پر غور کرے گا

اس کتاب میں سب سے پہلے جو چیز کھٹکتی ہے وہ حوالوں کی بے حد کمی ہے۔ یہاں تک کہ مصنف نے اس انداز میں جو عبارتیں لکھی ہیں جیسے وہ کسی عبارت کا ترجمہ ہوں وہاں بھی حوالے نہیں ہیں۔ میں یہاں چند واقعات کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔

ایمان حمزہؓ ص۱۲۲ کے سلسلے میں انھوں نے لکھا ہے کہ ابوجہل نے ایک پتھر اٹھا کر زور سے حضور کی طرف پھینکا جس سے حضورؐ کا سر کھل گیا اور خون بہنے لگا۔ عام طور سے سیرت کی کتابوں میں ابوجہل کے پتھر مارنے اور سر کھل جانے کی بات نہیں ملتی۔ اسی سلسلے میں انھوں نے لکھا ہے کہ حضرت حمزہ نے ابوجہل کو سزا دینے کے بعد حضور سے جا کر اپنا کارنامہ بیان کیا اور حضورؐ نے فرمایا کہ میں آپ کی اس انتقامی کارروائی سے خوش نہیں ہوا۔ خوش تو جب ہوتا کہ تم اسلام لے آتے۔ معلوم نہیں یہ بات بھی مصنف نے کہاں سے لکھی ہے۔

حضرت عمرؓ کے اسلام میں انھوں نے لکھا ہے کہ ابوجہل نے تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ جو شخص محمدؐ کا سر کاٹ کر لائے گا میں اپنے پاس سے ایک ہزار اوقیہ چاندی اور ایک سو اونٹ انعام دوں گا۔ حضرت عمرؓ اس کی یہ تقریر سن کر حضورؐ کو قتل کرنے کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ ص۱۴۶ اس واقعہ کے بارے میں بھی مصنف نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ اسلام عمرؓ کے سلسلے میں یہ واقعہ معلوم نہیں کس نے بیان کیا ہے ——

سفرِ ہجرت کے بیان میں انھوں نے لکھا ہے کہ بریدہ بن خصیب اسلمی ستر آدمیوں کے ساتھ آپ کو گرفتار کرنے کے لیے نکلے لیکن سب کے سب مسلمان ہو گئے اور حضور کے آگے آگے اپنی سفید پگڑی کا جھنڈا لے کر چلنے لگے۔ حوالہ یہاں بھی نہیں ہے۔ ص۱۸۲ پر منافقین کے پاس آپ کے تشریف لے جانے کے بعد مصنف نے حضور کی جو مختصر تقریر نقل کی ہے اس کا حوالہ بھی نہیں ہے۔ ص۲۸۷ پر لکھا ہے: ”حضرت طلحہ کے پاؤں میں لنگ تھا لیکن اس موقع پر انھوں نے اپنے پاؤں پر پورا زور ڈال کر حضور کو اٹھا لیا اور اس دن سے ان کے پاؤں کا لنگ بھی دور ہو گیا“ غار سے حضورؐ کو باہر نکالنے میں حضرت طلحہ کا مدد دینا تو معلوم ہے لیکن ان کے پاؤں کا لنگ اس سے دور ہو گیا یہ معلوم نہیں مصنف نے کس کتاب سے لیا ہے۔ ص۲۹۱ پر شہدائے احد کے بارے میں لکھا ہے: ”بلکہ ایک ایک کفن میں دو دو تین تین لاشوں کو لپیٹ کر ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا“ ایک قبر میں کئی لاشوں کا دفن کرنا تو معلوم ہے لیکن یہ کہ کئی کئی لاشیں ایک کفن میں لپیٹی گئی تھیں یہ نہیں معلوم تھا۔ افسوس ہے حوالہ یہاں بھی نہیں ہے —— توقع یہی ہے کہ یہ نادر باتیں فاضل مصنف نے احادیث و سیرت کی مستند کتابوں سے لی ہوں گی۔ طبع ثانی میں اگر وہ ماخذ کا حوالہ دے دیں تو کتاب کی [illegible]

ایک قائف نے فیصلہ دے دیا تھا کہ ثابت کا فرزند ہے" یہ واقعہ بیان کرتے ہیں یقیناً مصنف کو دھ
ہو۔ واقعہ اسامہ بن زید کا ہے نہ کہ زید بن ثابت کا۔ صـ۲۸۲ پہ اذان کے بارے میں لکھا ہے "خود
کو اور بعض دیگر صحابہ مثلاً عبداللہ بن زید اور حضرت عمر بن خطابؓ وغیرہ کو خواب میں اذان کی آواز سن
حضورؐ کے بارے میں یہ لکھنا کہ آپ نے بھی خواب میں اذان کی آواز سنی تھی صحیح نہیں ہے۔ معلوم نہیں م
کا ماخذ کیا ہے۔ صـ۳۵۸ پر فتح مکہ کے بیان میں لکھتے ہیں "پھر ایک پانی سے بھرے برتن میں حضور اکرم اپنا
مبارک ڈال کر نکال لیتے اور پھر عورتیں اس میں ہاتھ ڈالتیں۔ یہ پختگی عہد کا طریقہ تھا" معلوم نہیں اس کا
کیا ہے — ان باتوں کے علاوہ اور باتیں بھی ایسی ہیں جن کے بارے میں حوالہ جاننے کی خواہش ہوتی
سب کی نشان دہی موجب طوالت ہے۔ یہ تو حوالوں کے لحاظ سے چند سطریں لکھی گئیں۔ فاضل مصنف
دعاوی' استدلال اور نتائج فکر کے پہلو سے مفصل اظہار خیال کیا جائے تو ایک مستقل رسالے کی ضرورت
میں نمونے کے طور پر یہاں دو ایک چیزیں پیش کروں گا۔ حضرت زینب بنت جحشؓ کے تعلق سے صـ۹
مصنف نے یہ زوردار دعویٰ کیا ہے :-

"اور ایک بات تو سخت حیرت میں ڈالتی ہے کہ ان کا نکاح حضور سے ۵ھ میں ہوا اور ان کی
رحلت ۲۰ھ میں ہوئی۔ گویا یہ چھ سال سے کچھ زیادہ حضورؐ کے ساتھ رہیں اور
حضورؐ کے بعد کم و بیش نو سال زندہ رہیں لیکن حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ ان سے کوئی روایت مروی نہیں۔
حضرت خدیجہؓ تو روایت کے دور سے پہلے ہی مکے میں وفات پا چکی تھیں۔ ام المومنین زینب بنت خزیمہ
صرف تین ماہ زندہ رہیں لہٰذا ان دونوں سے کسی کی روایت کا نہ ہونا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن زینب بنت
جحش سے کسی ایک روایت کا بھی نہ ہونا ہر صاحب عقل کو حیرت میں ڈالے گا اور اس سے ہم ایک
نتیجہ نکال سکتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جہاں ہزاروں جھوٹی روایتیں وضع ہوئیں وہاں بہت سی صحیح روایتیں
درج ہونے سے رہ بھی گئیں۔"

یہ عبارت پڑھ کر ہر شخص یہ سمجھے گا کہ فاضل مصنف نے تمام احادیث کا ذخیرہ چھان کر دعویٰ
اس پر ایک عمارت بھی تعمیر کر لی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ تبصرہ نگار جیسے شخص کو بھی جس کی نظر احادیث
ہے حضرت زینب بنت جحش کی چار احادیث کا علم ہے۔ ان کی دو حدیثیں تو بخاری و مسلم میں بھی موجود
دو حدیثیں نسائی اور ابن ماجہ میں موجود ہیں' ان کی ایک حدیث (جس سے احادیث کا کوئی اچھا طالب

ناواقفیت نہ ہوا یہ ہے کہ شوہر کے سوا کسی مرنے والے پر تین دن سے زیادہ سوگ منانا جائز نہیں ہے۔ ان کی یہ حدیث امام بخاری نے کتاب الجنائز اور کتاب الطلاق میں روایت کی ہے۔ امام مسلم اور ابو داؤد نے کتاب میں اور امام ترمذی نے کتاب النکاح میں۔ ان کی دوسری حدیث ویل للعرب من شر قد اقترب۔ امام بخاری نے کتاب الفتن، علامات نبوت اور احادیث الانبیاء میں روایت کی ہے اور امام مسلم نے کتاب الفتن میں۔ استحاضہ کے سلسلے میں ان کی ایک حدیث امام نسائی نے کتاب الطہارۃ باب الحیض والاستحاضہ میں روایت کی ہے اور ترجیل راس کے بارے میں ان کی ایک حدیث ابن ماجہ نے کتاب الطہارۃ میں روایت کی ہے طوالت کا خوف نہ ہوتا تو میں تمام حدیثیں اسناد کے ساتھ یہاں نقل کرتا۔ ابن ماجہ کی حدیث کا متن یہ ہے: —

عن زینب بنت جحش انہ کان لہا مخضب من صفر قالت کنت ارجل راس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیہ۔ (ابن ماجہ باب الوضوء فی الصفر) معلوم نہیں کس بنیاد پر مصنف نے [انا ز وردا] دعوی کر دیا کہ حضرت زینب سے ایک روایت بھی مروی نہیں ہے۔

ص ۲۱۳ پر لفظ شہید کے تحت مصنف نے جو نوٹ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ لفظ مقتول فی سبیل اللہ کے معنی میں قرآن میں استعمال نہیں ہوا ہے حالانکہ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۴۰ میں شہداء کا لفظ غزوۂ احد کے مقتول صحابہ کے لیے آیا ہے اور اگر اس کو تکونوا شہداء علی الناس کے معنی میں لیا جائے جب بھی شہدائے احد اس میں یقیناً داخل ہیں۔ اسی طرح سورۂ نساء کی آیت ۶۹ میں چار گروہوں کا ذکر ہے۔ انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین۔ یہاں بھی شہداء کے گروہ سے مقتولین فی سبیل اللہ خارج نہیں ہیں۔ اس لیے قرآن کی زبان میں بھی مقتولین فی سبیل اللہ کو شہداء کہنا صحیح ہے۔ انھوں نے اس نوٹ میں یہ بھی لکھا ہے کہ مقتول فی سبیل اللہ کے ساتھ شہادت کو مخصوص کر دینا بعد کی اصطلاح ہے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ شہادت کو مقتول فی سبیل اللہ کے ساتھ مخصوص کرنے کی اصطلاح کس نے بنائی ہے اور کب بنائی ہے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ مثال کے طور پر طاعون میں مرنے والے ڈوب کر مرنے والے یا پیٹ کی بیماری سے مرنے والے مسلمان کو بھی شہید کہا جاتا ہے اور اس لیے کہا جاتا ہے کہ انھیں شہید کہنا صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ البتہ اس مسلمان کے لیے جو اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے۔ شہید کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ لفظ اس کے ساتھ مخصوص ہے بلکہ یہ ہے کہ اسے دوسرے زندہ و مردہ مسلمانوں سے ممتاز کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی لفظ نہیں ہے اور یہ امتیاز اسے عہد رسالت ہی سے حاصل ہے۔

غزوۂ بدر کے سلسلے میں سورۂ انفال کی آیات ۷، ۹ اور ۸ ، ۹ کے بارے میں ایک نرالا دعویٰ کرکے مصنف نے جو پانچ چھ صفحوں کی بحث کی ہے وہ اس کتاب کا بہت ہی کمزور حصہ ہے اور ان کی نحوی بحث تو مضحکہ خیز حد تک نادرست ہے۔ اس پوری بحث میں ایک نرالا دعویٰ کرکے مصنف نے لغت اور نحو تک میں اپنے ہی عندیے کو آخری سند کی حیثیت دی ہے۔ اس میں نہ لغت کی کسی کتاب کا حوالہ ہے اور نہ نحو کی کسی کتاب کا۔ ان کے نزدیک اس سلسلے کی حدیثیں تو وہ بنالی گئی ہیں اور مفسرین تو ان میں سے کسی ایک نے بھی ان آیتوں کی صحیح تفسیر نہیں کی ہے۔ مصنف کی پوری بحث کی کمزوریوں کی طرف اس سلسلے میں اشارہ کرنا بھی موجب طوالت ہے اس لیے معذوری ہے۔

اب متعدد مقالے اور کتابیں پڑھ کر متجددین کی ایک نئی ٹکنیک کا انکشاف ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے بڑے زور سے مستشرقین اور متجددین پر تنقید کی جائے تاکہ پڑھنے والا یقین کرلے کہ لکھنے والا تجدد کو پسند نہیں کرتا اور وہ مستشرقین نیز دوسرے مغربی دانشوروں سے مرعوب بھی نہیں ہے اور اس مظاہرے کے بعد باتیں وہی کہی جائیں جو تجدد پسند حضرات کہتے ہیں اور جن کا ماخذ ان کے اپنے ذہن کے سوا اور کہیں نہیں ہوتا۔ مجھے بہت افسوس کے ساتھ یہ لکھنا پڑ رہا ہے کہ یہ کتاب بھی اس کا ایک نمونہ ہے۔ حد یہ ہے کہ اس میں عبادات تک میں ترمیم کو گوارا بنایا گیا ہے تاکہ وہ "روحِ عصر" کے مطابق ہو جائیں۔ اس کی ایک مثال یہاں پیش کی جاتی ہے زکوٰۃ کے بارے میں مصنف نے قرآن کی مکی آیتوں اور حضرت جعفر طیار کی تقریر حبشہ کا حوالہ دے کر یہ سوال اٹھایا ہے کہ مکے میں کس قسم کی زکوٰۃ تھی جبکہ نہ کوئی نصاب متعین تھا اور نہ کوئی مقدار متعین تھی۔ یہ سب تفصیلات مدینے میں طے ہوئیں۔ زکوٰۃ وہ بھی تھی جو مکے میں دی جاتی رہی اور زکوٰۃ وہ بھی تھی جو مدینے میں دی گئی۔ اس کے بعد جو نادر استدلال مصنف نے کیا ہے وہ یہ ہے:-

> یقینی بات ہے کہ مکی زندگی میں زکوٰۃ کا سسٹم کچھ اور ہوگا اور مدنی زندگی میں اس کا نظام کچھ اور ہوگیا لیکن زکوٰۃ دونوں ہی کو کہا گیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ قرآن کریم نے جو زکوٰۃ کی تفصیلات نہیں بتائیں اور مکی و مدنی زندگی کی زکوٰتوں کو زکوٰۃ ہی قرار دیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تفصیلات و شرائط متبدل قدریں ہیں۔ ابدی اور غیر متبدل اقدار نہیں۔ زمان و مکان اور احوال و ظروف کے تقاضوں سے ان کو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ زکوٰۃ کا حکم اور اس کی اسپرٹ تو وہی رہے گی جو شروع سے ہے لیکن اس کے سسٹم میں بوقت ضرورت رد و بدل کی گنجائش رہے گی۔ (ص ۱۴۲)

زکوٰۃ کے نصاب و مقدار میں ترمیم کی ضرورت پر تو متعدد متجددین کی رائے عالی پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن فاضل مصنف اس سے آگے کی بات بھی فرماتے ہیں :۔

نماز کے متعلق بھی یہی بیان کیا جاتا ہے کہ نماز پنجگانہ ہجرت سے ایک سال قبل شب اسریٰ میں فرض ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس سے بارہ سال پہلے تک نماز پنجگانہ نہ تھی، غالباً صبح و شام کی تھی اور وہ بھی نماز کی تھی۔ (ص ۱۲۸-۱۲۹)

اس کے معنی یہ ہوئے کہ آج کے مشغول ترین دور میں اگر کوئی شخص صرف صبح و شام کی نماز پڑھ لے تو اس کی گنجائش بھی شریعت میں موجود ہے۔ اب اس "اجتہاد" پر انا للہ کے سوا اور کیا عرض کیا جائے۔ اگر ابتدائی انتہائی احکام کے فرق نیز کی آیات کے اجمال اور مدنی آیات کی تفصیل کی یہی حیثیت ہو جو مصنف قرار دے رہے ہیں تو پھر پورے دین کا حلیہ بگاڑنے میں کونسی چیز مانع ہو سکتی ہے۔

کہنے کی باتیں تو ابھی بہت سی ہیں لیکن تبصرے کو مقالہ بنانے کی اس وقت گنجائش نہیں ——— یہ کتاب ان لوگوں کو پڑھنی چاہیے جو پہلے سے اسلامی تعلیمات اور سیرت نبوی پر نظر رکھتے ہوں۔ (ع ق)

خاتونِ پاکستان کا قرآن مجید نمبر

مرتبہ شفیق بریلوی۔ صفحات ۳۳۶۔ دیدہ زیب ٹائٹل۔ قیمت پانچ روپے
ملنے کا پتہ :۔ دفتر خاتون پاکستان ۵۔ گارڈن۔ کراچی۔

ماہنامہ خاتون پاکستان نے اپنے رسول نمبر کی وجہ سے خاصی شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ اس کے بعد فاضل مدیر نے یہ ضخیم نمبر شائع کیا ہے۔ تبصرہ نگار اس نمبر کے تمام مضامین پڑھنے کا وقت نہ پا سکا۔ سرسری جائزے سے بھی یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ نمبر قابل مطالعہ ہے۔ فاضل مدیر نے کتاب الٰہی سے متعلق قدیم جدید مضامین کا ایک اچھا مجموعہ تیار کیا ہے۔ اگر کوئی شخص سمجھ کر اس نمبر کو پڑھ لے تو قرآن مجید کے بارے میں اسے بہت کچھ واقفیت حاصل ہو جائے گی۔ اس نمبر کے مضامین میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ ضروری نہیں کہ تبصرہ نگار ان تمام باتوں سے متفق ہو۔ مضامین کا تنوع بھی اس کے مطالعہ کی رغبت پیدا کرتا ہے۔ (ع ق)

ہفت روزہ مرکز کا [illegible] سیرت نمبر

مدیرہ :۔ بیگم خورشید حسن صاحبہ۔ صفحات ۶۴۔ سائز [illegible]
قیمت :۔ ایک روپیہ پچاس پیسے۔

ملنے کا پتہ :- دفتر ہفتہ وار مسرکارہم ۔ شیخ حاجی شیخ حسین ناسہ ریٹ ۔ مدراس ۱۲

ہفتہ وار مسرکار چار سال سے جنوبی ہند میں اردو زبان وادب کی خدمت انجام دے رہا ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ خدمات اسلامی تعلیمات کی نشر واشاعت کے ذریعہ انجام دی جا رہی ہیں ۔ اب تک جو شمارے نظر سے گزرے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس اخبار کی فاضل مدیرہ بہت سلجھے ہوئے اور صحیح اسلامی خیالات رکھتی ہیں ۔ یہ شاندار سیرت نمبر نکال کر انھوں نے مفید خدمت انجام دی ہے ۔ مشہور لکھنے والوں کے مضامین شریک اشاعت ہیں اور سرسری مطالعہ سے معلوم ہوا کہ مضامین پڑھنے کے لائق ہیں ۔ خاص طور پر اس سیرت نمبر کے لیے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا بھی ایک خط اس میں چھپا ہے ۔ ہم امید کرتے ہیں کہ شمالی ہند کے لوگ بھی اس اخبار اور اس سیرت نمبر کی قدر کریں گے ۔ (ع ۔ ق)

سفر مصر و حجاز مولانا منت اللہ رحمانی ، صفحات ۲۳۲ ۔ کاغذ ، طباعت ، کتابت بہتر قیمت : دو روپیہ پچاس پیسے ۔ ملنے کا پتہ :- دارالاشاعت خانقاہ رحمانی ۔ مونگیر ۔ بہار ۔

مارچ ۱۹۶۴ء میں قاہرہ میں موتمر عالم اسلامی منعقد ہوئی تھی ۔ مولانا منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت صوبہ بہار نے حکومت مصر کی دعوت پر اس میں شرکت فرمائی تھی اور اس کے بعد حج کرتے ہوئے وطن واپس آئے تھے یہاں پہنچ کر آپ نے یہ سفرنامہ مرتب کر کے شائع کیا ۔ پیش لفظ میں آپ نے لکھا ہے کہ جس وقت یہ سفرنامہ مرتب کیا گیا ہے اس وقت آپ کے پاس نامکمل اور غیر مرتب روزنامچہ کے سوا کچھ نہ تھا ۔ اس کے باوجود یہ سفرنامہ بہت دلچسپ اور معلومات افزا ہے اسے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہ ایک حساس اور ذی علم شخصیت کا مرتب کیا ہوا سفرنامہ ہے ۔ راقم الحروف نے بڑی دلچسپی کے ساتھ اس سے استفادہ کیا اور امید ہے کہ میری ہی طرح بہت سے لوگ دلچسپی کے ساتھ اس کو پڑھیں گے اور اس سے استفادہ کریں گے ۔ یہ بات پورے اطمینان کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ ایک قابلِ قدر اور لائق مطالعہ سفرنامہ ہے ۔ (ع ۔ ق)

فہرست مندرجات زندگی از جنوری ۱۹۶۵ء تا جون ۱۹۶۵ء

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوع بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	ماہ
۳	شیخ الاسلام مولانا حسین مدنی	اسلام کا نظام عدل	۳۴	۳	مارچ
۴	جناب سلطان مبین صاحب ایم اے	آخرت کے حریف عقائد	۳۴	۱	جنوری
	"	" قسط ۲	۳۴	۲	فروری
	"	" قسط ۳	۳۴	۳	مارچ
	"	" قسط ۴	۳۴	۵	مئی
		قسط ۵	۳۴	٦	جون
	مولانا سلیمان فرخ آبادی	خلوص وللہیت	۳۴	٦	جون
۵	جناب شہاب مدراس	انسان بتا تیری قیمت کیا ہے	۳۴	۵	مئی
٦	ڈاکٹر عبدالحق انصاری	پاکستان کا صدارتی انتخاب اور عورت کی سربراہی کا مسئلہ	۳۴	۴	اپریل
			۳۴	۵	مئی
	جناب عبدالباری صاحب	حضرت یوسفؑ کا خریدار کون تھا؟	۳۴	٦	جون
۷	جناب محمد فاروق خاں صاحب	روزہ — ایک ضرورت	۳۴	۱	جنوری
۸	جناب وحیدالدین خاں صاحب	مذہب اور سائنس	۳۴	۵	مئی
۹	مولانا محمد یوسف اصلاحی	رسالت	۳۴	۲	فروری
	"	"	۳۴	۳	مارچ
	"	آخرت	۳۴	۴	اپریل

تراجم و اقتباسات

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوع بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	ماہ
۱	سید احمد قادری	حبشہ کے مسلمانوں کی حالت	۳۴	٦	جون
۲	جناب ش۔ ن۔ عثمانی	مذہب کمیونسٹ پارٹی کے دل میں کھٹکتا ہوا ایک کانٹا قسط ۳ ختم شد	۳۴	۳	[illegible]

رسائل و مسائل

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوع بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	ماہ
۱	سید احمد قادری	عورت کے سربراہ مملکت ہونے کا مسئلہ	۳۴	۱	جنوری
		جماعت اسلامی ہند کی تعریف و تحسین	۳۴	۲	فروری
		خاص جزئیہ کا مطالبہ / دو مسکوں کی مزید توضیح	۳۴	۳	مارچ

اخبار و افکار

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوع بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	ماہ
۱	مدیر	انتہائی مشکل کام	۳۴	۱	جنوری

Monthly 'ZINDGI' Rampur, June 1965 Regd. No L-688

تفہیم القرآن

از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

★ دور حاضر کے استدلالی ذہن کو زیادہ سے زیادہ مطمئن کرنے

★ مغربی افکار سے مرعوبیت کو دور کرنے

★ قرآن کی مرکزی دعوت اور تمام اہم مسائل حیات سے اس کے تعلق کو توضیح واضح کرنے

★ اسلام کے جامع نظام حیات کی طرف بصیرت افروز رہنمائی کرنے

★ قرآن کی انقلابی دعوت کو دلنشین انداز میں پیش کرنے کیلئے

تفہیم القرآن جیسی معرکۃ الآرا تفسیر کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

جلد اول

الفاتحہ ---------------- الانعام

Rs. 12/- ہدیہ مع پلاسٹک کور

جلد دوم

اعراف ---------------- بنی اسرائیل

Rs. 15/- ہدیہ مع پلاسٹک کور

جلد سوم

کہف ---------------- روم

Rs. 17/- ہدیہ مع پلاسٹک کور

— ملنے کا پتہ —

منیجر: مکتبہ زندگی و کانٹی - رامپور - یو - پی

Only Title printed at Shauker Press, Rampur

ہندی میں سیرت پاک کے بعد

اسلامی مملکت کے خلیفہ اول حضرت ابوبکر
کی مکمل سوانح حیات

❁ حضرت ابوبکر ❁

— مرتبہ —

کوثر یزدانی

قیمت — 90 روپے

ابتدائی اسلامی تاریخ سمجھنے کے لئے مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں
کے لئے انتہائی مفید اور کارآمد کتاب۔

★ عام فہم ★ موثر انداز بیان ★ بیش قیمت مواد

خود بھی پڑھئے دوسروں کو بھی پڑھائیے

منیجر مکتبہ زندگی و کانتی رامپور یو پی